Al-Risala

1985

No. 98-103, 105-109

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

سو سال کا سفر کبھی اس طرح طے نہیں ہوتا کہ
ہم اپنے کیلنڈر میں
۱۹۸۵ کے بجائے ۲۰۸۵ کا ہندسہ لکھ لیں

جنوری ۱۹۸۵ شمارہ ۹۸

[illegible]

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان
اردو، انگریزی میں شائع ہوتا ہے

جنوری ١٩٨٥ ◻ شمارہ ٩٨

زر تعاون سالانہ	٣٦ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دو سو روپیے
بیرونی ممالک سے:	
ہوائی ڈاک	٢٠ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	١٠ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے
ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی
'AL-RISALA MONTHLY' لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ
سی - ٢٩ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی ١١٠٠١٣

رسول کو ماننا

احد کی جنگ میں جب ایک غلطی سے مسلمانوں کو شکست ہوئی تو لوگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ مگر
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم انتہائی عزم و توکل کے ساتھ اپنی جگہ قائم رہے۔ آپ کے ساتھ چند دوسرے
بھی تیروں اور تلواروں کی بارش میں جمے رہے۔ اس وقت ایک مشرک عبداللہ بن قمیہ نے آپ کی طرف تیر
پھینکا۔ یہ دیکھ کر آپ کے ساتھیوں میں سے حضرت مصعب بن عمیر اس کی طرف بڑھے۔ دونوں میں جنگ
ہوئی۔ عبداللہ بن قمیہ نے حضرت مصعب بن عمیر کو قتل کر دیا۔ اس نے سمجھا کہ یہ خود رسول اللہ صلے اللہ
علیہ وسلم ہیں۔ اس نے سمجھا کہ اس نے آپ کو اپنی تلوار سے ہلاک کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ یہ آواز لگاتا ہوا واپس ہوا: الا ان
محمدا قد قتل الا ان محمدا قد قتل (سنو، محمد قتل کر دئے گئے۔ سنو، محمد قتل کر دئے
گئے)

یہ خبر پھیلی تو مسلمانوں میں سے جو لوگ ادھر ادھر بکھر گئے تھے وہ بھی اس سے متاثر ہوئے۔ صحیح
بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک طویل روایت ہے۔ اس میں یہ الفاظ آئے ہیں:

قال اناس من اهل النفاق ان كان محمد
قد قتل فالحقوا بدينكم الاول. فقال انس
بن النضر يا قوم ان كان قد قتل محمد فان
رب محمد لم يقتل (التفسير المظهري)

پھر اہل نفاق نے کہا کہ اگر محمد قتل کر دئے گئے ہیں
تو اب اپنے پہلے دین میں شامل ہو جاؤ۔ انس
بن نضر نے کہا اے لوگو، اگر محمد قتل کر دئے گئے ہیں
تو محمد کا رب تو قتل نہیں ہوا۔

ایک روایت کے مطابق ایک انصاری نے کہا: ان کان محمد قتل فقد بلغ فقاتلوا
عن دينكم (اگر محمد قتل کر دئے گئے ہیں تو وہ اپنا دین پہنچا چکے تو اب تم اس دین کے لئے لڑو، تفسیر ابن کثیر)
اس پر قرآن میں یہ آیت اتری کہ محمد تو صرف ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔
پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دئے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ اور جو شخص الٹے پاؤں پھر جائے تو وہ
ہرگز اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ اور اللہ شکر گزاروں کو بدلہ عطا فرمائے گا (آل عمران ۱۴۴)

کچھ لوگ وہ ہیں جو محمد کو اس حیثیت سے پہچانتے ہیں کہ انھوں نے دنیا کو فتح کیا۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو آپ
کو اس حیثیت سے پہچانتے ہیں کہ آپ نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا۔ حقیقی مومن وہ ہے جو محمد کو داعی کے روپ
میں پہچانے۔ جو لوگ آپ کو فاتح کے روپ میں پہچانیں ان کی پہچان صرف مورخ کی پہچان ہے نہ
کہ مومن کی پہچان۔

کائناتی نمونہ

ایمرسن Emerson کا قول ہے کہ فطرت اس اصول پر عمل کرتی ہے کہ سب ہر ایک کے لئے اور ہر ایک سب کے لئے:

Nature works on a method of 'all for each and each for all'

یہ ایک لفظ میں کائنات کے عمل کی نہایت جامع تعبیر ہے۔ کائنات میں بے شمار چیزیں ہیں۔ مگر ان کا عمل حد درجہ توافق کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر چیز اس طرح عمل کرتی ہے کہ اس کا عمل دوسری تمام چیزوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ اسی طرح تمام چیزیں اس طرح متحرک ہوتی ہیں کہ ان کی حرکت ہر واحد جزء سے کامل طور پر مطابق رہے۔

یہ گویا خدا کا ایک نمونہ ہے جو اس نے اپنی دنیا میں قائم کر رکھا ہے۔ انسان کو بھی اسی نمونہ پر چلنا ہے۔ انسانی آبادی میں بھی یہی نظام مطلوب ہے کہ ہر فرد اس طرح زندگی گزارے کہ اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچے اور مجموعی طور پر پوری انسانیت اس طرح کام کرے کہ اس کا کام فرد کی ترقی اور کامیابی میں معاون بن رہا ہو۔ فرد کامل جماعت سے ہم آہنگ ہو اور جماعت کامل فرد سے ہم آہنگ۔

کائنات کی صورت میں خدا نے ایک زندہ نمونہ قائم کر دیا ہے جو ہر صبح و شام لوگوں کو بتا رہا ہے کہ وہ کس طرح رہیں اور کس طرح نہ رہیں۔ کون سا انسان خدا کے یہاں قابل قبول ٹھہرے گا اور کون سا انسان خدا کے یہاں رد کر دیا جائے گا۔

ایک درخت اور کائنات کی مثال لیجئے۔ کائنات میں حرارت ہے، کشش ہے، ہوا ہے، پانی ہے ان میں سے ہر چیز درخت کی ضروریات کے عین مطابق ہے۔ بیکٹیریا سے لے کر سورج تک تمام چیزیں درخت کے لئے گویا کائناتی دسترخوان ہیں۔ ہر چیز درخت کو عین وہی چیز دے رہی ہے جو اس کی فطرت کے مطابق اسے ملنا چاہئے۔

دوسری طرف ایک درخت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ درخت اس دنیا کی کسی چیز سے ٹکرائے بغیر اپنا ارتقائی سفر طے کرتا ہے۔ اس کی لکڑی، اس کی پتی، اس کا پھول، اس کا پھل، غرض اس کی ہر چیز بقیہ دنیا کے لئے عین کارآمد ہے۔ حتی کہ اس کا نائٹروجن لینا اور آکسیجن نکالنا بھی عین خارجی دنیا کے تقاضوں کے مطابق ہے — جزء اور کل یا فرد اور اجتماع کے درمیان یہی کامل مطابقت انسان سے بھی مطلوب ہے۔ اس کے سوا انسان کی کامیابی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

الٹی چھلانگ

ایک واقعہ انگریزی اخبار میں ان الفاظ میں آیا ہے۔

In a daring escape from the Sydney, Australia, jail, a prisoner climbed underneath the hood of a truck. At the truck's next stop, he clambered out and found himself in the yard of another prison 6.5 kilometers from the first. (UPI)

آسٹریلیا کی سڈنی جیل کے ایک قیدی نے جیل سے بھاگنے کے لئے ایک جرأت مندانہ اقدام کیا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ایک ٹرک کے اندر داخل ہو گیا اور اس کے اندر چھپ کر بیٹھ گیا۔ ٹرک روانہ ہو کر اگلے مقام پر رکی۔ وہ بمشکل ٹرک سے باہر آیا۔ اس نے پایا کہ وہ دوبارہ ایک جیل میں ہے۔ یہ دوسرا جیل اس کی پہلی جیل سے تقریباً چھ کلو میٹر دور تھا۔

جیل کا مذکورہ قیدی جیل کی زندگی سے گھبرایا ہوا تھا۔ اس کے دماغ پر صرف ایک چیز سوار تھی۔ یہ کہ وہ کسی نہ کسی طرح جیل کی بند دنیا سے باہر پہنچ جائے۔ اس ذہنی کیفیت کے ساتھ جب اس کو ایک ٹرک نظر آیا تو اس نے یقین کر لیا کہ وہ ضرور جیل کے باہر کہیں جا رہا ہے۔ مگر وہ ٹرک ایک جیل سے دوسری جیل میں جا رہا تھا۔ آدمی اس ٹرک میں سوار ہو کر اپنی جیل سے نکلا۔ مگر اس کے بعد صرف یہ ہوا کہ وہ ایک اور جیل میں پہنچ گیا۔

یہ ایک دل چسپ مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات اقدام صرف الٹی چھلانگ کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ آدمی ناکام ہو کر دوبارہ اپنے سابقہ مقام پر واپس آجائے۔

زندگی کا سفر دو چیزوں کے ملنے سے طے ہوتا ہے۔ ایک "مسافر" اور دوسرا "ٹرک"۔ کسی مسافر کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ محض ذاتی چھلانگ کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جائے۔ اس کو لازماً اپنے سے باہر ایک سواری درکار ہوتی ہے۔ اگر آدمی محض اپنے ذاتی جوش کے تحت کود کر ایک سواری میں داخل ہو جائے۔ اور یہ تحقیق نہ کرے کہ وہ سواری کہاں جا رہی ہے تو ممکن ہے کہ اس کا انجام وہی ہو جو مذکورہ مثال میں آسٹریلیا کے قیدی کا ہوا۔ یعنی وہ ایک "قیدخانہ" سے نکل کر دوسرے "قیدخانہ" میں پہنچ جائے۔

دلیل اور شخصیت

قرآن میں حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ مختلف مقامات پر تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ فرعون نے جب مصر کے جادوگروں کو بلایا اور حضرت موسیٰ سے ان کا مقابلہ ہوا تو یہ واقعہ پیش آیا کہ جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں میدان میں ڈالیں۔ وہ جادو کے زور سے سانپ کی مانند چلتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ اس وقت حضرت موسیٰ نے خدا کے حکم سے اپنا عصا ڈالا تو وہ تمام سانپوں سے بڑا سانپ بن کر میدان میں دوڑنے لگا۔ اس نے جادوگروں کے جادو کو نگل لیا۔ وہ جدھر جدھر گیا، جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں بس رسیاں اور لاٹھیاں بن کر رہ گئیں۔

یہ دیکھ کر جادوگروں نے سمجھ لیا کہ حضرت موسیٰ کا معاملہ کوئی جادو کا معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ خدا کا معاملہ ہے۔ حضرت موسیٰ کے مظاہرے میں جادوگروں کو خدا کی معرفت حاصل ہو گئی۔ انھوں نے اسی وقت اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔ یہ فرعون کی کھلی ہوئی شکست تھی۔ اس نے غصہ میں آکر جادوگروں کے لئے مصر کی سخت ترین سزا کا اعلان کر دیا۔ وہ یہ کہ جادوگروں کے ہاتھ اور پاؤں کو مخالف سمتوں سے کاٹ کر انھیں تڑپایا جائے اور پھر انھیں کھجور کے تنوں پر لٹکا کر سولی دے دی جائے۔

اس سزا کو سن کر جادوگروں کی زبان سے نکلا ——— ہم تجھ کو ان دلائل پر ترجیح نہ دیں گے جو ہمارے پاس آئے ہیں (لن نؤثرك على ما جاءنا من البينات، طٰہٰ ۲۰)

جادوگروں کے سامنے ایک طرف عظیم شخصیت تھی اور دوسری طرف کھلی ہوئی دلیل۔ شخصیت اور دلیل کے اس مقابلہ میں انھوں نے وہی کیا جو ایک سچے انسان کو کرنا چاہئے۔ انھوں نے شخصیت کو نظر انداز کر دیا اور دلیل کو لے لیا۔

جب آدمی کے سامنے ایسی دلیل آجائے جو بات کو اس طرح ثابت شدہ بنا دے کہ وہ اس کی تردید کے لئے کوئی جوابی دلیل پیش کرنے سے عاجز رہے تو اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ دلیل کو لے لے اور اس کے خلاف شخصیتوں کو چھوڑ دے۔ دلیل کا اس طرح ظہور دراصل خدا کا ظہور ہے۔ جو لوگ دلیل کے مقابلہ میں شخصیت کو ترجیح دیں انھوں نے گویا خدا کے مقابلہ میں غیر خدا کو ترجیح دیا۔ ایسے لوگوں کے لئے زمین و آسمان کے اندر کوئی جگہ نہیں۔ یہ غیر خدا کو اپنا خدا بنانا ہے۔ پھر خدا کی دنیا میں جو لوگ غیر خدا کو اپنا خدا بنائیں وہ کیسے یہاں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

خدا کی نصرت

ابن ہشام نے اپنی سیرت میں مکی دور کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ قریش نے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو مدینہ بھیجا۔ وہاں وہ یہود کے علماء سے ملے اور ان سے پوچھا کہ ہم محمد کے بارے میں کیا کریں۔ علماء یہود نے کہا کہ ان سے تم اصحاب کہف اور ذوالقرنین کا حال پوچھو۔ اگر وہ بتا دیں تو وہ نبی مرسل ہیں اور اگر نہ بتا سکیں تو وہ متقول ہیں۔

یہ لوگ مکہ واپس آئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ ان چیزوں کے بارے میں ہمیں بتائیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے جو سوال کیا ہے اس کا جواب میں تم کو کل دوں گا (اخبرکم غدا بما سألتم عنہ) آپ نے یہ جملہ کہا مگر انشاء اللہ نہ فرمایا۔ آپ کو خیال تھا کہ کل کے دن جبریل آئیں گے تو میں ان سے پوچھ کر بتا دوں گا۔ مگر انشاء اللہ نہ کہنے کی وجہ سے اگلے دن وحی نہ آئی۔ یہاں تک کہ پندرہ دن تک وحی رکی رہی۔

وحی نہ آنے کی وجہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اگلے دن جواب نہ دے سکے۔ یہ مکہ کے مشرکین کے لئے سنہرا موقع تھا۔ انھوں نے لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ محمد نے وعدہ کیا تھا مگر وہ اپنے وعدہ کو پورا نہ کر سکے۔ دن پر دن گزرتے رہے اور آپ کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ مکہ کے مشرکین نے اس کو خوب استعمال کیا۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ اب ثابت ہو گیا کہ یہ پیغمبر نہیں ہیں۔ اگر وہ پیغمبر ہوتے تو ضرور اپنے وعدہ کے مطابق جواب دیتے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے رات دن سخت بے چینی میں گزر رہے تھے۔ ایک ایک لمحہ پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ بظاہر یہ سراسر آپ کے خلاف بات تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو زبردست طور پر آپ کے موافق بنا دیا۔ وہ یہ کہ پندرہ دن وحی رکنے کی وجہ سے قریش نے سارے شہر میں اتنا پروپیگنڈا کیا کہ ایک ایک آدمی اس معاملہ سے باخبر ہو گیا۔ ہر آدمی کو اشتیاق ہو گیا کہ وہ جانے کہ اس کی بابت محمدؐ کیا کہتے ہیں۔ گویا مکہ والوں نے بہت بڑے پیمانے پر سننے کی فضا بنا دی۔ چنانچہ پندرہ دن کے بعد جب سورہ کہف اتری اور اس میں اصحاب کہف اور ذوالقرنین کا قصہ تفصیل سے بیان ہوا تو سارے لوگ اس کو سننے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ سورہ کہف کے اترتے ہی وہ سارے شہر میں ایک ایک آدمی کی زبان پر تھی۔ جو تبلیغ مہینوں میں ہوتی وہ صرف ایک دن میں ہو گئی۔ اگر اللہ چاہے تو وہ اپنے کسی بندے کی غلطی کو بھی صحت کے خانہ میں ڈال دے۔ وہ اس کے ناموافق حالات کو موافق حالات میں تبدیل کر دے۔

بے آمیز دین

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورۂ ہود اور اس جیسی سورتوں نے مجھ کو بوڑھا کر دیا (شیبتنی ھود واخواتھا) سورہ ہود مکی دور کے آخر میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا:

فاستقم کما امرت ومن تاب معک ولا تطغوا انہ بما تعملون بصیر۔ ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار ومالکم من دون اللہ من اولیاء ثم لا تنصرون (ہود ۱۳-۱۱۲)

پس تو سیدھا رہ جس طرح تجھ کو حکم ہوا ہے اور وہ لوگ بھی جنھوں نے توبہ کی ہے تمہارے ساتھ، بے شک وہ دیکھتا ہے جو کچھ تم لوگ کرتے ہو۔ اور ان کی طرف نہ جھکو جو ظالم ہیں ورنہ تم کو آگ پکڑ لے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں پھر تم کہیں مدد نہ پاؤ گے۔

یہی بات سورہ بنی اسرائیل میں بھی ہے جو خود بھی مکی دور کے آخر میں نازل ہوئی۔

وان کادوا لیفتنونک عن الذی اوحینا الیک لتفتری علینا غیرہ واذاً لاتخذوک خلیلا۔ ولولا ان ثبتنک لقد کدت ترکن الیہم شیئاً قلیلا۔ اذاً لاذقنک ضعف الحیوٰۃ وضعف الممات ثم لا تجد لک علینا نصیرا

(بنی اسرائیل ۷۵)

اور قریب تھا کہ وہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس چیز سے ہٹا دیں جو ہم نے تم پر وحی کی ہے تاکہ تم اس سے مختلف ہم پر جھوٹ لگا کر پیش کرو اور اگر تم ایسا کرتے تو وہ تم کو اپنا دوست بنا لیتے۔ اور اگر ہم نے تم کو جمائے نہ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ تم ان کی طرف کچھ جھک پڑو۔ تب ہم تم کو ضرور چکھاتے دونا عذاب زندگی میں اور دونا عذاب مرنے میں پھر تم ہمارے مقابلہ میں اپنا کوئی مددگار نہ پاتے۔

وہ کیا چیز تھی جس نے آپ کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا۔ وہ ہے بے آمیز دین پیش کرنے کا حکم۔ لوگ چونکہ ہمیشہ ملاوٹی دین پر ہوتے ہیں اس لئے ایسی دعوت میں ہر ایک اپنے کو بے جگہ ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک اس کا مخالف بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ملاوٹی دین کا داعی بننا سب سے زیادہ آسان کام ہے اور بے آمیز دین کا داعی بننا سب سے زیادہ مشکل کام۔

کتنا فرق

برطانیہ نے سو سال پہلے ہانگ کانگ کو پٹہ کے تحت چین سے حاصل کیا تھا۔ اس پٹہ کی مدت ۱۹۹۷ میں ختم ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں دو سال تک چین کی کمیونسٹ حکومت اور برطانیہ کے درمیان بات چیت جاری رہی۔ ۲۴ نشستوں کے بعد آخر کار ۲۶ ستمبر ۱۹۸۴ کو ایک معاہدہ پر دونوں کے دستخط ہو گئے۔ اس کے مطابق یکم جولائی ۱۹۹۷ کو ہانگ کانگ چین کے حوالہ کر دیا جائے گا۔

جوائنٹ ڈیکلریشن (نہ کہ ٹریٹی) کے مطابق چین کے قبضہ میں آنے کے بعد بھی اگلی نصف صدی تک ہانگ کانگ اپنی موجودہ حالت پر باقی رہے گا۔ کمیونسٹ اصولوں کے سراسر خلاف یہاں اظہار رائے، اجتماع، اسٹرائک، عبادت اور سفر کی پوری آزادی ہوگی۔ برطانی باشندے یہاں کی سرکاری ملازمتوں میں لئے جا سکیں گے۔ ہانگ کانگ ڈالر بدستور باقی رہے گا، اس فرق کے ساتھ کہ اس پر سے ملکہ برطانیہ کی تصویر حذف کر دی جائے گی۔ معاہدہ بتاتا ہے کہ ہانگ کانگ ایک اسپیشل ایڈمنسٹریٹیو ریجن بن جائے گا۔ معاہدہ کے الفاظ ہیں:

> The colony will enjoy a high degree of autonomy. The Socialist system and Socialist politics shall not be practised—and Hong Kong's previous capitalist system and life-style shall remain unchanged for fifty years.

ہانگ کانگ کو اعلیٰ درجہ کی آزادی حاصل رہے گی۔ اشتراکی نظام اور اشتراکی پالیسی زیر عمل نہیں لائی جائے گی۔ ہانگ کانگ کا پچھلا سرمایہ دارانہ نظام اور اس کا طرز زندگی غیر متغیر طور پر ۵۰ سال باقی رہے گا۔

(انڈین اکسپریس، ۲۷ ستمبر ۱۹۸۴)

اس طویل معاہدہ میں اور بھی بہت سی باتیں طے کی گئی ہیں، مثلاً یہ کہ کمیونسٹ چین ہانگ کانگ کی ائر لائن (Cathay Pacific) میں شیئر نہیں خریدے گا۔ ہانگ کانگ کا انتظام ہانگ کانگ کے عوام چلائیں گے۔ البتہ چین کی طرف سے ایک چیف ایگزیکٹیو وہاں رہے گا۔ چین کے تحت ہانگ کانگ کو آزاد حیثیت (Autonomous status) حاصل رہے گی وغیرہ۔

اس کے عین برعکس مثال مصر کی ہے۔ نہر سوئز برطانیہ اور فرانس کے پاس پٹہ (۱۸۶۹) پر تھی۔ یہ پٹہ کچھ سالوں میں ختم ہونے والا تھا۔ مگر صدر ناصر نے یہ کیا کہ اچانک ۱۹۵۶ میں اس کو قومی ملکیت میں لینے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد مغربی طاقتوں نے اس کا انتقام اس طرح لیا کہ اسرائیل کے ذریعہ مصر کو فوجی حیثیت سے تہس نہس کر ڈالا۔

بلند کرداری

ہندستان میں مسلمان بادشاہ بھی آئے اور مسلمان صوفی بھی۔ مگر ہندستان کی غیر مسلم آبادی نے بادشاہوں کو اپنا رقیب سمجھا اور صوفیوں کو احترام کی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے بادشاہوں سے لڑائیاں کیں مگر صوفیوں کے آگے وہ عقیدت سے جھک گئے۔ حتی کہ ان میں سے لاکھوں لوگوں نے ان کے مذہب (اسلام) کو قبول کر لیا۔ آج بھی ہندستان کے لوگ مسلم صوفیوں کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ ان کے مزاروں اور درگاہوں پر حاضری دینے والوں میں ان کی تعداد مسلمانوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ جب کہ مسلمان بادشاہوں کے لئے ان کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مسلم بادشاہ ان کو اپنی سطح پر نظر آتے تھے اور مسلم صوفی اپنے سے اونچی سطح پر۔ لوگوں نے دیکھا کہ جس طرح وہ دولت کے حریص ہیں اسی طرح مسلم بادشاہ بھی دولت کے حریص ہیں۔ لوگ اقتدار کے لئے لڑتے ہیں اور مسلم بادشاہ بھی اقتدار کے لئے لڑتے ہیں۔ لوگ اپنی خواہش کے پیچھے چلتے ہیں اور مسلم بادشاہ بھی اپنی خواہش کے پیچھے چلتے ہیں۔ لوگ دوسروں کو لوٹتے ہیں اور مسلم بادشاہ بھی دوسروں کو لوٹتے ہیں۔ مسلم بادشاہ لوگوں کو اسی عام سطح پر نظر آئے جہاں وہ خود تھے۔ ایسی حالت میں مسلم بادشاہوں کے لئے ان کے دل میں کوئی اعلیٰ جذبہ ابھرتا تو کیسے ابھرتا۔

مگر مسلم صوفیوں کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ انھیں دولت کی تمنا نہ تھی وہ اپنی فقیری میں مگن تھے۔ اقتدار کو چاہنا تو درکنار وہ اقتدار سے دور بھاگنے والے لوگ تھے۔ انھوں نے اپنی خواہش کو معبود نہیں بنایا تھا۔ بلکہ ان کا حال یہ تھا کہ وہ سخت قسم کی نفسیاتی ورزشیں کرتے تھے تاکہ اپنی خواہش کے شیطان کو زیر کر سکیں۔ وہ دوسروں سے صرف محبت کرنا جانتے تھے۔ ان کے یہاں نفرت کا کوئی گزر نہ تھا۔

ان صوفیوں کا یہ حال تھا کہ اپنے دشمنوں اور مخالفوں کے لئے بھی ان کے پاس جو چیز تھی وہ دعا اور خیر خواہی تھی نہ کہ نفرت اور انتقام۔ ایک صوفی کو ایک شخص نے ایک بار پتھر مارا۔ صوفی کو چوٹ لگی مگر وہ غصہ نہیں ہوا بلکہ آگے بڑھ کر اس آدمی کو سینے سے لگا لیا۔ مارنے والے نے پوچھا کہ آپ نے مجھ کو سینے سے کیوں لگایا جب کہ میں نے آپ کو مارا تھا۔ صوفی نے جواب دیا کہ تمہارے اندر ایک بھلائی ہے اس لئے تم سب سے زیادہ اس کے مستحق تھے کہ تم کو سینے سے لگایا جائے۔ اس واقعہ کے بعد اس شخص نے توبہ کر لی اور صوفی کا مرید ہو گیا۔

دو قسم کے انسان

امام شافعی (۲۰۴ - ۱۵۰ھ) خلیفہ ہارون الرشید کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے تحصیل علم کے لئے مکہ کا سفر کیا اور وہاں انھوں نے سفیان بن عیینہ اور دوسرے محدثین سے استفادہ کیا۔

اس زمانہ میں امام شافعی بہت تنگ معاشی حالات میں تھے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں یمن کا والی مکہ آیا۔ قریش کے بعض ممتاز افراد نے والی یمن سے سفارش کی کہ شافعی کے اندر اہلیت اور صلاحیت موجود ہے۔ وہ اس قابل ہیں کہ ان کو کوئی سرکاری خدمت سپرد کی جائے۔ والی یمن نے اس سفارش کو قبول کرتے ہوئے انھیں نجران کا عامل بنا دیا۔

مگر امام شافعی کی غیر مصالحت پسندانہ طبیعت نے اس کے بعد ان کے لئے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا۔ مگر وہ والی یمن ایک ظالم آدمی تھا۔ امام شافعی نے بعض مواقع پر اس کو اس کی زیادتی اور بے انصافی پر ٹوکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ امام شافعی کا مخالف ہو گیا۔ وہ کوئی ایسا بہانہ تلاش کرنے لگا جس کے واسطے سے ان کو سزا دے سکے۔

بالآخر ایک تدبیر اس کی سمجھ میں آئی۔ اس نے امام شافعی کے اندر ایسے سیاسی "عقائد" دریافت کر لیے جن کا ذکر کر کے خلیفہ وقت کو ان کے خلاف مشتعل کیا جا سکے۔ چنانچہ اس نے خلیفہ ہارون الرشید کو خط میں لکھا کہ شافعی علوی سادات کے ساتھیوں میں سے ہے۔ علوی سادات وہ لوگ تھے جن پر یہ الزام تھا کہ وہ عباسی حکومت کے خلاف ہیں۔ ہارون الرشید نے یہ سنا تو اس نے سمجھا کہ شافعی کوئی خطرناک آدمی ہے۔ اس نے بگڑ کر والی یمن کو خط لکھوایا کہ شافعی کو اس کے تمام ساتھیوں کے ساتھ فوراً دارالخلافہ (بغداد) روانہ کرو۔ اس حکم کے مطابق امام شافعی کو گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا گیا۔

یہ بہت نازک معاملہ تھا۔ مگر اس زمانہ میں امام محمد بغداد میں موجود تھے۔ وہ خلیفہ کے قابل اعتماد لوگوں میں سے تھے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ امام شافعی ایک مجرم کے طور پر خلیفہ کے دربار میں لائے گئے ہیں تو وہ فوراً دربار میں پہنچے۔ انھوں نے خلیفہ کو بتایا کہ وہ ایک دیندار اور علمی آدمی ہیں۔ ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ امام محمد کی سفارش پر امام شافعی رہا کر دیے گئے۔ یہ واقعہ ۱۸۴ھ کا ہے جب کہ ان کی عمر ۳۴ سال تھی۔ ابھی وہ صرف "شافعی" تھے۔ اس وقت تک وہ "امام شافعی" نہیں بنے تھے۔

اس مثال میں ایک کردار والی یمن کا ہے اور دوسرا امام محمد کا۔ والی یمن نے پست اخلاق کا ثبوت دیا اور امام محمد نے اعلیٰ اخلاق کا نمونہ۔

حسن سلوک

سماج میں جو لوگ بے سہارا ہو گئے ہوں ان کا سہارا بننا بہت بڑی عبادت ہے۔ ماں باپ آخری عمر کو پہنچ جائیں۔ ایک بچہ یتیم ہو گیا ہو۔ ایک شخص اپنے وطن سے دور سفر کی حالت میں کسی مشکل میں پھنس جائے۔ اس طرح کی دوسری صورتیں جب کہ آدمی کی ضروریات تمام تر دوسروں کے اوپر منحصر ہوجاتی ہیں، اس وقت کسی کی مدد کرنا، ایسے نازک وقتوں میں کسی کے کام آنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے اور اس کا بہت ثواب ہے۔ اس کی اہمیت قرآن سے بھی ثابت ہے اور حدیث سے بھی۔

اس طرح کے عمل کی اتنی افضلیت کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ انسان کی عاجزانہ حیثیت کا عملی اقرار ہے۔ ہر انسان خدا کے سامنے کامل طور پر عاجز ہے۔ ہر آدمی کو خدا کے دینے سے ملتا ہے اور اسی کے چھیننے سے چھن جاتا ہے۔ اسی کی معرفت کا نام ایمان ہے اور اسی کو مراسم عبودیت کی شکل میں ادا کرنے کا نام پرستش ہے۔

لیکن آدمی اپنے ایمان اور اپنی عبادت میں سچا ہے یا نہیں، اس کی صحیح جانچ اس وقت ہوتی ہے جب کہ ایک کمزور اور بے سہارا انسان سے اس کا سابقہ پڑے۔ ایسے ہر موقع پر گویا ایک شخص ہمارے سامنے اسی حالت عجز میں لایا جاتا ہے جس حالت عجز میں خود ہم کو خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ اپنے جس احتیاج کی بنا پر ہم خدا سے اپنے لئے مدد کے طلب گار ہیں اسی احتیاج میں مبتلا ایک شخص ہمارے سامنے کر دیا جاتا ہے تاکہ ہم کسی استحقاق اور دباؤ کے بغیر اس کے ساتھ اچھا سلوک کر کے خدا سے کہیں کہ خدایا تو بھی ہمارے ساتھ بہتری کا معاملہ فرما جب کہ تیرے اوپر نہ ہمارا کوئی حق ہے اور نہ کوئی دباؤ۔

عاجز انسان کے ساتھ حسن سلوک دراصل خدا کے سامنے اپنی حیثیت عجز کا اقرار ہے۔ یہ اپنی دعا کو خدا کے آگے عمل کی صورت میں دہرانا ہے۔ یہ خدا کے سامنے اپنی بے یار و مددگار حیثیت کی ضیافت ہے ایک مومن جب کسی ایسے آدمی کو دیکھتا ہے تو اس کے روپ میں وہ خود اپنے آپ کو خدا کے مقابلہ میں دیکھنے لگتا ہے۔

یہ ادراک اس کو تڑپا دیتا ہے وہ چاہنے لگتا ہے کہ اس بے سہارا آدمی کو وہ سب کچھ دے دے جو اس کے پاس ہے۔ تاکہ وہ اپنے خدا سے وہ سب کچھ پا سکے جو خدا کے پاس ہے۔ دوسرے کی مدد کرنا گویا خدا سے یہ دعا کرنا ہے کہ خدایا تو بھی اسی طرح میری مدد کر۔

مردہ پرستی

قدیم مصر میں جب وہاں کے سرداروں نے حضرت موسیٰ کا انکار کر دیا تو وہاں کے درمیان ایک شخص (رجل مومن) اٹھا جس نے اپنی قوم کو درد مندانہ انداز میں نصیحت کی۔ اس مرد مومن کی تقریر قرآن کی چالیسویں سورہ میں درج ہے۔ اس تقریر کا ایک جملہ یہ ہے:

ولقد جاءکم یوسف من قبل بالبینات فما زلتم فی شک مما جاءکم بہ حتی اذا ہلک قلتم لن یبعث اللہ من بعدہ رسولا کذالک یضل اللہ من ہو مسرف مرتاب (المومن ۳۴)

اور اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس روشن نشانیوں کے ساتھ آئے۔ پھر جو کچھ وہ لائے تھے اس کی بابت تم شک ہی میں پڑے رہے یہاں تک کہ جب وہ ختم ہو گئے تو تم نے کہا کہ ان کے بعد اللہ ہرگز ایسا رسول نہ بھیجے گا۔ اس طرح اللہ ان کو بھٹکا دیتا ہے جو حد سے گزرنے والے اور شک کرنے والے ہیں۔

یعنی حضرت یوسف جب تک زندہ تمہارے درمیان موجود تھے تو تم ان کی صداقت پر شک کرتے رہے۔ اور جب وہ دنیا سے چلے گئے تو تم ان کے قائل ہو گئے۔ مگر صرف یہ کہنے کے لئے کہ اب ایسا رسول خدا کہاں بھیجے گا۔

قدیم مکہ کے لوگ حضرت ابراہیم کی عظمت کا اعلان کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ مگر وہ ہستی جس کی امامت میں حضرت ابراہیم نے بیت المقدس میں نماز ادا کی، اس کو وہ اس کی زندگی میں ناچیز کئے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ اس کو مذمم کہتے تھے۔

یہ مزاج لوگوں میں ہر زمانہ میں پایا گیا ہے۔ لوگ ہمیشہ اپنے مردہ اشخاص کے قصیدے پڑھتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ ان کو بڑھانے کے لئے جھوٹے قصے کہانیاں گھڑتے ہیں، مگر اپنے زندہ اشخاص کے لئے وہ سچے واقعات بھی سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ گزرے ہوئے لوگوں کو مبالغہ آمیز حد تک بڑا لکھتے ہیں۔ مگر جو افراد ان کے سامنے ہیں ان کی بڑائی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

قوم جب زندہ ہو تو وہ اپنے زندوں کی قدر کرتی ہے۔ مگر مردہ قوموں کو اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم کہ وہ اپنے مردوں کی خیالی تصویر بنا کر ان کو پوجتے رہیں۔ زندہ قوم زندہ لوگوں کی قدر کرتی ہے اور مردہ قوم مردہ لوگوں کی۔

پیلیڈر

مسٹر جناح اور پاکستان کے بارہ میں حال میں لندن سے ایک کتاب چھپی ہے۔ مصنف کا نام اور کتاب کا نام حسب ذیل ہے:

***Jinnah of Pakistan*, by Stanley Wolpert**

اس کتاب میں آزادی سے قبل کی ہندستانی سیاست پر بہت سی دلچسپ باتیں درج ہیں۔ اس کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:

> **Congress leaders had different views from Jinnah regarding the political set-up in the country. Before the demand of Pakistan, Jinnah was asking for a loose federation with the Centre having limited powers and residue powers resting with the states. On the other hand, the whole thrust of the nationalist politics of the Congress was in the direction of a strong Centre. Jinnah could not have gone along with Congress leaders.**

ملک کے سیاسی ڈھانچہ کے بارہ میں کانگرسی لیڈروں کا نقطۂ نظر جناح کے نقطۂ نظر سے مختلف تھا۔ پاکستان کے مطالبہ سے پہلے جناح کا مطالبہ ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مرکز کے اختیارات محدود ہوں اور بقیہ اختیارات ریاستوں کو حاصل رہیں۔ دوسری طرف کانگرس کی قومی سیاست کا پورا زور اس رخ پر تھا کہ مرکز مضبوط ہو۔ جناح کانگرسی لیڈروں کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے (ٹائمس آف انڈیا ۱۱ نومبر ۱۹۸۸)

مسٹر جناح کیوں آزاد ہندستان میں ایک کمزور سیاسی مرکز چاہتے تھے۔ اور کانگرسی لیڈر کیوں طاقتور مرکز پر زور دیتے تھے۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان لیڈروں کی نگاہ سیاسی پارٹیوں کے رزولیوشن کے الفاظ پر تو خوب تھی مگر ان میں سے کوئی لیڈران تاریخی حقیقتوں کو نہ دیکھ سکا جو کسی ملک کی تشکیل میں اصلاً فیصلہ کن ہوا کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں یہود کے دین کو برابر کے درجہ میں تسلیم کر لیا (للیہود دینہم وللمسلمین دینہم) اسی طرح صلح حدیبیہ کے وقت آپ ایسی دفعات پر راضی ہو گئے جو مکہ کے اوپر منکرین اسلام کی بالادستی کے اعتراف کے ہم معنی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی نظر حال پر نہیں تھی بلکہ مستقبل پر تھی آپ جانتے تھے کہ وقتی معاہدہ میں خواہ جو لفظ بھی لکھ دیا جائے، بالآخر مکہ اور مدینہ کا فیصلہ وہ تاریخ کرے گی جو اسلامی دعوت کے نتیجہ میں عرب میں بننا شروع ہوئی ہے۔ اسی پیغمبر کے ماننے والوں کا حال آج یہ ہے کہ وہ سامنے کی باتوں کے سوا کوئی اور بات جانتے ہی نہیں۔

ہجرت کے بعد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۳ سال مکہ میں رہے۔ آپ کی دعوت توحید سے [illegible]۔ انھوں نے یک طرفہ طور پر آپ کو ستانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ [illegible] آپ کے لیے [illegible]۔ اس وقت آپ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔

[illegible] سے اپنا سب کچھ چھوڑ کر نکلے تھے۔ تاہم اہل مکہ نے اب بھی دور تک آپ کا پیچھا کیا تاکہ آپ کو پکڑ کر واپس لائیں۔ واقعات بتا رہے تھے کہ مکہ چھوڑنے کے باوجود مکہ والوں نے آپ کو بھلایا نہیں ہے۔ اب بھی وہ آپ کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ وہ لوگ مدینہ کے اوپر جارحانہ کارروائی نہ کریں۔

ان حالات کے پیش نظر آپ نے مدینہ پہنچنے کے بعد مسلمانوں کے دستے مختلف مقامات پر بھیجنا شروع کیے جن کو سریہ کہا جاتا ہے۔ ان سرایا کا مقصد جنگ نہیں تھا۔ چنانچہ سیرت کی کتابوں میں ان سرایا کے تذکرہ میں اس قسم کے الفاظ آتے ہیں: ولم یلق کیداً۔ فلم یکن بینهم قتال۔ یعنی ان میں جنگ اور مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔

ہجرت کے بعد ابتدائی ایام میں ابواء، بُواط، عشیرہ وغیرہ نام کے سرایا پیش آئے۔ ان سرایا کے تذکرہ میں سیرت کی کتابوں میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں: لیس فیهم من الانصار احد (ان میں کوئی انصاری نہ تھا) انصار کو ان مہموں میں شامل نہ کرنے کی مصلحت غالباً یہ تھی کہ آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ جو مخاصمت قریش اور مہاجرین کے درمیان قائم ہو چکی ہے وہ قبل از وقت انصار تک وسیع ہو جائے۔

ان سرایا کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مقصد ابتداءً دو تھا۔ اول، مکہ کے اطراف کے قبائل سے صلح کے معاہدے کرنا تاکہ قریش کو ان قبائل سے کاٹا جا سکے۔ قریش اپنی جارحانہ کارروائیوں میں ان کو اپنا شریک نہ بنا سکیں۔ چنانچہ غزوہ العشیرہ کے ذیل میں یہ الفاظ آتے ہیں: فصالح فیها بنی مدلج وحلفاءهم من بنی ضمرة فوادعهم (سیرۃ ابن کثیر، جلد ثانی، صفحہ ۲۶۳)

ان سرایا کا دوسرا مقصد قریش کی نقل و حرکت کا پتہ لگانا تھا۔ چنانچہ سریہ سُفوان کے ذیل میں آتا ہے کہ آپ نے سریہ کے سردار کو یہ تحریری ہدایت کی کہ فترصد بها قریشا وتعلم لنا من اخبارهم (سیرۃ ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ ۲۳۹)

ان سرایا میں تیسرا سبب اس واقعے سے پیدا ہوا جس کو اہل مدینہ کے اوپر اہل مکہ کا پہلا

[illegible] کیا [illegible]

قریش کے ایک سردار کرز بن جابر فہری نے مدینہ کے قریب مسلمانوں کی ایک چراگاہ پر چھاپہ مارا اور مسلمانوں کے اونٹ اور بکریاں لے کر بھاگ گیا (سیرت ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ ۲۳۸)

اس واقعہ کے بعد قریش کی ہمت شکنی ضروری تھی۔ چنانچہ آپ نے قریش کے تجارتی قافلوں کا پیچھا کرنے کے لیے دستے بھیجے۔ یہ تجارتی قافلے مدینہ کے قریب سے گزر کر شام جاتے تھے۔ آپ نے ان تجارتی قافلوں پر دستے بھیج کر قریش کو تنبیہ کی کہ اگر تم ہماری معاشیات کو برباد کرنا چاہتے ہو تو تم بھی اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھو۔

ایک سریہ (عبداللہ بن جحش) میں ایسا ہوا کہ ایک مسلمان نے ایک کافر کو قتل کر دیا۔ اس قتل کے سلسلے میں بعض روایات میں یہ الفاظ آئے ہیں: فکان ابن الحضرمی اول قتیل قتل بین المسلمین والمشرکین (تفسیر ابن کثیر، جزء اول، صفحہ ۲۵۴)۔ اس بنا پر بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ مدینہ پہنچ کر اسلام نے صبر کا طریقہ چھوڑ کر جنگ کا طریقہ اختیار کر لیا۔ اور ابن الحضرمی کا قتل گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اب اسلام کی طرف سے مسلح جدوجہد کا آغاز ہو چکا ہے۔

مگر واقعہ کی تفصیلات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کا نظریہ سراسر بے بنیاد ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ رجب ۲ھ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن جحش کی سرکردگی میں ایک دستہ نخلہ کی طرف روانہ فرمایا۔ یہ کل بارہ آدمی تھے۔ روانہ کرتے ہوئے آپ نے سردارِ سریہ کو ایک بند تحریر دی اور فرمایا کہ اس کو اس وقت تک نہ کھولنا جب تک تم دو دن کا راستہ نہ طے کر لو۔ دو دن کا راستہ طے کرنے کے بعد اس کو کھولنا اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اس پر عمل کرنا۔

دو دن کے بعد جب حضرت عبداللہ بن جحش نے اس تحریر کو کھولا تو اس میں لکھا ہوا تھا: جب تم میرے اس مکتوب کو دیکھو تو چلتے رہو یہاں تک کہ تم مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ کے مقام پر پہنچ کر اترو اور وہاں قریش کو دیکھو اور ہم کو ان کی خبروں سے مطلع کرو (اذا نظرت فی کتابی ھذا فامض حتی تنزل نخلۃ بین مکۃ والطائف فترصد بھا قریشا وتعلم لنا من اخبارھم، سیرت ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ ۲۳۹)

اسی اثنا میں قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام سے مکہ کی طرف جا رہا تھا۔ دستہ کے ایک شخص واقد بن عبداللہ نے قافلہ کے سردار عمرو بن الحضرمی کو نشانہ لگا کر ایک تیر مارا۔ یہ تیر کسی نازک مقام پر لگا اور وہ مر گیا۔ دستہ جب مدینہ واپس آیا اور اس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مذکورہ قتل کا واقعہ بتایا تو آپ نے فرمایا: ما امرتکم بقتال فی الشھر الحرام (سیرت ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ ۲۴۱) میں نے تم کو ماہِ حرام میں جنگ کا حکم نہیں دیا تھا۔ بالفاظ دیگر، اگر جنگ مقصود ہوتی تو کیا میں تم کو حرام مہینہ میں روانہ کرتا۔

فطرت سے دور ہو کر

انسان کا بچہ تمام جانداروں کے بچے میں سب سے زیادہ کمزور ہوتا ہے۔ اس کو جسمانی پرورش اور ذہنی تربیت دونوں مقصد کے لئے بہت عرصہ تک اپنے ماں باپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے قدرت نے انسان کے اندر اپنے بچے کے لئے خصوصی کشش رکھی ہے۔

قدیم زمانہ میں کسی بچے کے لئے اپنے باپ یا ماں سے محروم ہونا صرف ہنگامی اسباب سے ہوتا تھا، جنگ یا کسی اتفاقی حادثے سے قبل از وقت موت۔ عام حالات میں یقین کیا جا سکتا تھا کہ بچوں کو اپنے والدین کی سرپرستی پختگی کی عمر تک حاصل رہے گی۔

جدید ترقی یافتہ سماج میں یہ استثناء اب عموم بن گیا ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے جدید تصور زندگی کا جس نے نکاح کے رشتہ کو غیر مقدس بنا دیا ہے۔ اب یا تو نکاح کے بغیر لڑکے پیدا ہوتے ہیں یا نکاح کے بعد طلاق کی شکل میں دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہے —— بچوں کی اپنے ماں باپ سے جدائی۔ بچوں کا اپنے والدین کے جیتے جی یتیم ہو جانا۔

اس بڑھتی ہوئی "یتیمی" نے جدید معاشرہ کے لئے طرح طرح کے پیچیدہ مسائل پیدا کر دئے۔ اس میں سے ایک وہ ہے جس کو محرومی کا بونا پن (Deprivation dwarfism) کا نام دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں مغرب کے طبی ماہرین کی ایک تازہ رپورٹ (ایوننگ نیوز، ۲۷ جون ۱۹۸۴) سامنے آئی ہے۔

یہ رپورٹ الرسالہ (انگریزی) میں مکمل طور پر دی جا رہی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ماں باپ سے محرومی کی بنا پر جن بچوں کو ابتدائی عمر میں محبت نہیں ملتی ان میں مختلف قسم کا نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً جسمانی نشوونما میں کمی۔ دماغ کا ہلکا پن۔ حتی کہ یہ چیزیں بعض اوقات ان کی قبل از وقت موت کا باعث ہو جاتی ہیں۔

محرومی کا بونا پن نامی بیماری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ ٹھیک طرح سو نہیں پاتا۔ اس کا نظام ہضم ٹھیک طرح کام نہیں کرتا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اسپتالوں میں جہاں چھوٹے بچے بیڈ پر ڈال دئے جاتے ہیں، پیٹھ کے بل دیر دیر تک پڑے رہنے سے ان کے سر کا پچھلا حصہ گنجا ہو جاتا ہے کیونکہ وہاں کوئی ان کو کروٹ بدلنے کے لئے موجود نہیں ہوتی۔ ماں باپ سے محروم ہو کر دار الاطفال میں پرورش پانے والے بچے اپنے ذہنی اور جسمانی ارتقاء سے محروم رہتے ہیں۔

[illegible]

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فطرت کے راستے سے ہٹنا کتنا مہلک ہے۔ انسان خدا کی بنائی ہوئی دنیا سے ہٹ کر اپنے لئے کوئی دوسری دنیا نہیں بنا سکتا۔ اس کے لئے لازم ہے کہ اسی دنیا کے ساتھ مطابقت کرے۔ اگر وہ فطرت کی شاہراہ کو چھوڑ کر اپنے لئے کوئی دوسری شاہراہ بنانا چاہے گا تو وہ صرف ناکامی اور بربادی پر ختم ہوگا۔ اس کے سوا اس کا کوئی انجام نہیں۔

پریس فنڈ

اسلامی مرکز کا اشاعتی کام اب خدا کے فضل سے کافی بڑھ گیا ہے۔ اس کو وقت پر اور معیار کے مطابق انجام دینے کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ اسلامی مرکز کا خود اپنا پریس ہو۔ اس سلسلہ میں اس سے پہلے بھی اعلان کیا جا چکا ہے۔ اب ہم نے اللہ کے بھروسہ پر فیصلہ کر لیا ہے کہ خود اپنا آفسٹ پریس قائم کریں۔

اس مقصد کے لئے اسلامی مرکز کی طرف سے ایک پریس فنڈ کھولا گیا ہے۔ ہم اپنے تمام ہمدرد اسلامی بھائیوں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ پریس فنڈ میں مالیاتی حصہ لے کر اس اسکیم کو کامیاب بنائیں۔

سکریٹری اسلامی مرکز

کہانی بن گئی

سر ونسٹن چرچل جو بعد کو برطانیہ کے وزیر اعظم بنے، افریقہ کے بوئروں کی جنگ (1899ء) میں برطانوی اخبار مارننگ پوسٹ کے جنگی نامہ نگار تھے۔ اس دوران ایک واقعہ پیش آیا جس کو جنوبی افریقہ کے سابق وزیر اعظم جان کرسچین سمٹس نے چرچل کی عمر ۷۵ کی تقریب کے موقع پر سنایا۔ وہ چرچل کی موجودگی میں وائٹ ہاؤس (واشنگٹن) کے ڈنر کے موقع پر تقریر کر رہے تھے۔

انھوں نے بتایا کہ بوئر وار کے دوران مسٹر چرچل برطانوی سپاہیوں کے ایک دستے کے ساتھ بوئروں کے ہاتھوں پکڑے گئے۔ بوئروں نے سپاہی اور اخباری نامہ نگار میں کوئی تمیز نہیں کی۔ انھوں نے سب کو ایک ساتھ جیل میں ڈال دیا۔

مسٹر چرچل نے جیل سے اس واقعہ کی رپورٹ مجھے بھیجی اور اپنی فوری رہائی پر زور دیا کیونکہ بین اقوامی رواج کے مطابق اخباری رپورٹر کو قید نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اس خط پر کارروائی شروع کی مگر اس سے پہلے کہ اس کیس کا فیصلہ ہو مسٹر چرچل کسی نہ کسی طرح جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

اس واقعہ کے کافی عرصہ بعد میری ملاقات مسٹر چرچل سے ہوئی جو اس وقت برطانوی کابینہ کے رکن تھے۔ میں نے وہ واقعہ یاد دلایا تو مسٹر چرچل بولے: "آپ نے اچھا کیا کہ میرے خط پر میری درخواست کے باوجود فوری کارروائی نہ کی۔ اگر آپ جلدی میں میری رہائی کا انتظام کرا دیتے تو میرا نو ہزار پونڈ کا نقصان ہو جاتا۔" "وہ کیسے" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "وہ اس طرح کہ میں نے اپنی جیل سے فرار ہونے کی داستان ایک رسالہ کے لئے لکھ کر نو ہزار پونڈ میں فروخت کیا۔"

مسٹر چرچل اگر آسانی سے رہا ہو جاتے تو یہ واقعہ ایک سادہ واقعہ ہوتا، وہ کہانی نہ بنتا۔ مگر گرفتاری اور اس کے بعد جیل سے فرار نے اس کو کہانی بنا دیا۔

اعلان

۱۔ خط و کتابت میں ہمیشہ اپنا پورا پتہ لکھیں۔
۲۔ ہمیشہ اپنا خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر تحریر فرمائیں۔

سیاحت

سیاحت موجودہ زمانہ میں ایک عظیم انڈسٹری ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مختلف قسم کے اعداد و شمار نہایت اہتمام کے ساتھ جمع کئے جاتے ہیں۔ ہر ملک کی وزارت سیاحت ان کا خصوصی مطالعہ کرتی ہے اور ان کی بنیاد پر ترقیاتی نقشے بناتی ہے۔

ایک تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ عرب ملکوں کے سیاح ہر سال سیاحت پر جو رقم خرچ کرتے ہیں اس کی مقدار گیارہ بلین ڈالر سے اوپر ہے۔ یعنی ہندستانی سکہ میں تقریباً ایک سو دس کھرب روپیہ۔ یہ رقم دنیا بھر میں سیاحی پر خرچ کی جانے والی کل رقم کا دس فی صد حصہ ہے۔ یورپ میں جانے والا ایک عرب اوسطاً ۸۶۰ پونڈ خرچ کرتا ہے۔ یہ دنیا کے کسی بھی ملک کی فی سیاح خرچ کی جانے والی رقم سے بہت زیادہ ہے۔

قرآن میں سیاحت کو اہل ایمان کی صفت بتایا گیا ہے۔ مگر اس سیاحت کا مقصد صرف دو ہوتا ہے۔ دنیا کے واقعات سے عبرت اور نصیحت لینا یا دعوت و تبلیغ کرنا۔ گویا مومن کی سیاحت دینی سیاحت ہوتی ہے نہ کہ تفریحی سیاحت۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں، خصوصاً عربوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ موقع دیا ہے کہ وہ دنیا بھر میں سفر کریں اور اس کی ہر ممکن قیمت ادا کر سکیں۔ اگر مسلمانوں کے اندر صحیح شعور زندہ ہو تو یہ موقع ان کے لئے زبردست دینی فائدہ کا ذریعہ بن جائے۔

مگر موجودہ حالت میں مسلمانوں کو بے پناہ رقم خرچ کرنے کے باوجود نہ پہلا فائدہ حاصل ہو رہا ہے اور نہ دوسرا فائدہ۔ دنیا بھر کی سیاحت کے باوجود نہ وہ دنیا سے عبرت اور نصیحت کی غذا حاصل کر سکے۔ اور نہ دنیا کے سامنے خدا کے دین کی گواہی دے سکے۔

اس کی وجہ مسلمانوں کی بے مقصدیت ہے۔ آج مسلمانوں کے سامنے کوئی اونچا مقصد نہیں، اس لئے وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ جدید مواقع کو وہ کس طرح اپنے حق میں استعمال کریں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے قائدین نے انہیں صرف جھوٹے فخر کی غذا دی ہے۔ اور جھوٹا فخر بلاشبہ سب سے زیادہ بری خوراک ہے جو اس دنیا میں کسی کو دی جا سکتی ہے۔ جن لوگوں کے ذہن میں جھوٹا فخر سما جاتا ہے وہ اپنے آپ کو کچھ کرنے سے فارغ سمجھ لیتے ہیں۔ وہ چاہنے لگتے ہیں کہ ان کے لئے کیا جائے نہ کہ وہ دوسروں کے لئے کریں۔

یہ انسان

لوگوں کو دیکھئے تو وہ یا تو "ملت" کے مسائل پر باتیں کرتے ہوئے ملیں گے یا زیادہ سے زیادہ دین کے ظاہری پہلوؤں پر۔ دین کے معنوی پہلوؤں پر بات کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ شاید انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ صرف دکھائی دینے والی چیزوں میں اپنی توجہ لگا پاتا ہے۔ جو چیز دکھائی نہ دے اس میں توجہ لگانا اس کے لئے سب سے زیادہ مشکل کام رہا ہے۔ ماضی میں بھی اور آج بھی۔

انسان ان چیزوں کو اپنا معبود بناتا ہے جو اس کو دکھائی دیتی ہیں اور جو چیز دکھائی نہیں دیتی، اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس طرح اس کو اپنا معبود بنائے۔ وہ ان کاموں میں بآسانی مشغول ہو جاتا ہے جو دکھائی دیں مگر جو کام بظاہر دکھائی نہ دیتے ہوں ان میں مشغول ہونا وہ نہیں جانتا۔ جو چیز محسوس طور پر سامنے موجود ہو اس کی اہمیت کو وہ خوب جان لیتا ہے مگر جو چیز محسوس طور پر اس کے سامنے موجود نہ ہو اس کو وہ اس طرح نظر انداز کر دیتا ہے جیسے وہ اس کو جانتا ہی نہیں۔

یہ ظاہر پرستی ہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس کمزوری کا آخری اظہار وہ ہے جس کو شرک کہا جاتا ہے۔ نیز اس کمزوری کا یہ نتیجہ بھی ہے کہ آدمی دین پر ایمان لانے کے باوجود دین میں ترقی نہیں کرتا۔

مشرک وہ ہے جو نہ دکھائی دینے والے خدا کو مانتے ہوئے کچھ دکھائی دینے والی چیزوں کو بھی خدا بنا لے۔ ملحد وہ ہے جو یہ کہہ کر سرے سے کسی خدا کا انکار کر دے کہ وہ اس کو دکھائی نہیں دیتا۔ یہ گمراہی کی زیادہ سنگین قسمیں ہیں۔

مگر یہاں ایک اور چیز ہے جو اپنے انجام کے اعتبار سے کم اہم نہیں۔ وہ ہے ایمان کے باوجود ایمان کا بے اثر رہنا۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب آدمی خدا پر ایمان لائے مگر وہ خدا کو دیکھ نہ سکے۔ وہ خدا کو ملنے مگر اس نے گہرائی کے ساتھ اس کا ادراک نہ کیا ہو۔ وہ خدا کا معتقد ہو مگر محسوسات سے بلند ہو کر وہ خدا کو اپنا مرکز توجہ نہ بنا سکے۔

مزید یہ کہ غیر محسوس خدا کو نہ پانا گویا چھپی ہوئی معنویت کو نہ پانا ہے۔ ایسا شخص انھیں انسانوں کو پہچان پاتا ہے جو اپنے گرد ظاہری اشیاء کا ڈھیر جمع کئے ہوئے ہوں۔ جو انسان اپنے اندر معنویت کا خزانہ لئے ہوئے ہو وہ اس کے لئے لامعلوم رہتا ہے۔ خدا کو کھونے والا بالآخر معنویت کو بھی کھو دیتا ہے۔

بلا تحقیق

۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کو مسز اندرا گاندھی کا قتل ہوا۔ لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ قتل کا یہ واقعہ وزیر اعظم کے حفاظتی دستہ کے دو سکھ جوانوں نے کیا ہے تو سکھ فرقہ کے خلاف تشدد پھوٹ پڑا۔ یکم نومبر اور ۲ نومبر کی درمیانی شب میں راقم الحروف دہلی (نظام الدین) میں اپنے مکان میں لیٹا ہوا تھا کہ گیارہ بجے رات کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ایک صاحب بتا رہے تھے کہ دہلی کے پانی میں زہر ملا دیا گیا ہے، اس لئے نل کا پانی استعمال نہ کیا جائے۔ چند منٹ بعد دوبارہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ایک اور صاحب نے یہی خبر سنائی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کی گھنٹی نے متوجہ کیا۔ باہر نکلا تو سڑک پر کئی نوجوان اسی خبر کو بتانے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر ایک وفد نے دروازہ کی گھنٹی بجا کر یہی خبر سنائی۔ جلد ہی بعد نظام الدین بستی کی مسجدوں میں لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر گونجے اور مسلسل یہ اعلان کیا جانے لگا کہ ــــــ خبر ملی ہے کہ پانی میں زہر ملا دیا گیا ہے، آپ لوگ نلوں کا پانی بالکل استعمال نہ کریں۔

تقریباً دو گھنٹے تک ان خبروں اور اعلانات کا ہنگامہ لوگوں کی نیند کو درہم برہم کرتا رہا۔

خبر ملتے ہی ہم نے فوری طور پر یہ کیا کہ ریڈیو کھولا اور بارہ بجے رات اور ایک بجے رات کو دہلی ریڈیو سے نشر ہونے والا پروگرام سنا۔ دونوں بار ریڈیو نے واضح لفظوں میں بتایا کہ یہ افواہ بالکل غلط ہے کہ پانی میں زہر ملا دیا گیا ہے۔ سرکاری طور پر باقاعدہ پانی کا ٹسٹ لیا گیا ہے اور مکمل طور پر درست پایا گیا ہے۔ اس کے بعد ہم نے دہلی پولس کو نمبر ۱۰۰ پر ٹیلیفون کیا۔ انھوں نے بھی کہا کہ پانی میں زہر ملانے کی افواہ سراسر غلط ہے۔ پانی بالکل ٹھیک حالت میں ہے۔ جانچ کے بعد اس میں کوئی خرابی نہیں پائی گئی۔

۲ نومبر کی صبح کو اخبارات دیکھے تو پہلے ہی صفحہ پر دہلی میونسپل کمشنر مسٹر پی پی سری واستو کا یہ بیان موجود تھا کہ دہلی میں نل کا پانی بالکل صحیح ہے۔ اس کا بار بار ٹسٹ لیا گیا ہے اور کسی طرح کی زہریلی آمیزش اس میں نہیں پائی گئی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ۳۱ اکتوبر ہی سے پانی کے تمام فلٹریشن پلانٹ پر سخت حفاظتی پہرہ بٹھا دیا گیا ہے۔

سماجی زندگی میں اکثر بگاڑ صرف اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ لوگ ایک خبر سنتے ہیں اور بلا تحقیق اس کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔ اگر اسلام کے حکم کے مطابق خبروں کی تحقیق کی جانے لگے تو اکثر جھگڑے اور فساد پیدا ہونے سے پہلے ختم ہو جائیں۔

موجودہ دینی مدارس

دینی مدارس، بلاشبہہ موجودہ زمانہ میں اہم دینی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان کے افادی پہلو پر اتنا زیادہ لکھا جا چکا ہے کہ میری طرف سے اس سلسلے میں صرف تصدیق کافی ہے۔ اس پر مزید اضافہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

تاہم دینی مدارس کی بعض علامات مثلاً ان میں باہمی اختلاف بلکہ تصادم یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان میں مسلمہ خوبیوں کے باوجود، کوئی کمی ہے۔ اگر کمی نہ ہو تو یہ ناممکن ہے کہ یہ مدارس مسلمانوں کی باہمی جنگ کا میدان بن جائیں۔ حالاں کہ مسلمانوں کی باہمی جنگ سراسر حرام ہے۔

میرے نزدیک وہ کمی یہ ہے کہ یہ مدارس اپنے افراد کو صرف داخلی نشانہ دیتے ہیں، وہ ان کو کوئی خارجی نشانہ نہیں دیتے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ داخلی نشانہ بالآخر باہمی ٹکراؤ پیدا کرتا ہے۔ جب کہ خارجی نشانہ یہ کرتا ہے کہ قوتوں کو خارج کی طرف موڑ کر لوگوں کو آپس کے تصادم سے بچالیتا ہے۔ وہ قوتوں کو خارجی محاذ پر لگا دیتا ہے۔

موجودہ دینی مدارس کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ تحفظ کی نفسیات کے زیر اثر وجود میں آئے۔ چنانچہ ان کا سارا نظام اور نصاب تحفظ کے مقصد کے تحت بنا۔ بالفاظ دیگر ان مدارس نے اول روز سے مسلمانوں کو صرف داخلی نشانہ دیا۔ وہ ان کو کوئی خارجی نشانہ نہ دے سکے۔ اور جس قوم کے افراد کے پاس صرف داخلی نشانہ ہو وہ ایک حد پر پہنچ کر ہمیشہ آپس میں ٹکرانا شروع کر دیتے ہیں۔

قرآن میں دینی تعلیم کا جو تصور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ایسے افراد تیار ہوں جو غیر مسلم اقوام پر انذار کا کام کریں (التوبہ ۱۲۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ دینی اداروں کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ وہ قوم کے افراد کو عمل کا خارجی نشانہ دے سکیں۔

تاہم خارجی نشانہ سے میری مراد پر امن خارجی نشانہ ہے نہ کہ اس قسم کا جارحانہ خارجی نشانہ جس کو موجودہ زمانہ کے جھوٹے قائدین نے دریافت کیا ہے۔

خارجی نشانہ سے میری مراد وہی چیز ہے جس کو قرآن میں انذار کہا گیا ہے۔ یعنی پر امن دعوت کے ذریعہ اہل عالم کو خدا کے پیغام سے باخبر کرنا۔ موجودہ مدارس میں اگر تعلیم کے ساتھ دعوت کو بھی اس کی صحیح اور موثر صورت میں شامل کر دیا جائے تو مدارس زیادہ با مقصد بن جائیں اور زیادہ مفید بھی۔

قومی نفسیات

اخبار الجمعیۃ (دہلی) کے اڈیٹر نے پاکستان کا سفر کیا تھا۔ وہاں وہ مولانا تھانوی کے خلیفہ مولانا احتشام الحق تھانوی (۱۹۸۰ - 1915) سے ملے تھے۔ مولانا مرحوم نے اڈیٹر صاحب سے دیوبند میں اپنی طالب علمی کا ذکر کیا۔ اس ضمن میں انھوں نے ایک واقعہ بیان کیا جس کو انھوں نے اپنے مطبوعہ سفر نامہ میں ان الفاظ میں نقل کیا ہے :

مولانا احتشام الحق تھانوی نے مولانا حسین احمد مدنی کی انگریز دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے یہ واقعہ بیان کیا کہ انگلستان کی موجودہ ملکہ الزبتھ کے دادا کی تاج پوشی تھی۔ مولانا حسین احمد مدنی کا (دارالعلوم) دیوبند میں حدیث کا درس ہو رہا تھا۔ کسی طالب علم نے مولانا مدنی کی خدمت میں ایک پرچہ بھیجا۔ اس میں لکھا تھا کہ آج بادشاہ کی تاج پوشی کا دن ہے۔ اس لئے برطانوی حکومت کے لئے بد دعا ہونی چاہئے۔ مولانا مدنی نے فوراً درس روک دیا۔ کتاب بند کر دی اور فرمایا کہ بالکل صحیح ہے۔ اور اس کے بعد مولانا نے کچھ اس انداز میں (بد) دعا کرانی شروع کی کہ طلبہ پر رقت طاری ہو گئی (روز نامہ الجمعیۃ دہلی، ۱۳ نومبر ۱۹۷۹)

یہ واقعہ موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین کی نفسیات کی نمائندگی کرتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں تقریباً تمام قائدین کا یہ حال رہا ہے کہ دوسری قومیں ان کے لئے نفرت اور عداوت کا موضوع بن گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسری قوموں کو انھوں نے اپنا حریف اور رقیب سمجھا۔ ان کو وہ اپنے دین کا مدعو نہ سمجھ سکے۔

قومی ذہن اور دعوتی ذہن دونوں بالکل الگ الگ ذہن ہیں اور دو مختلف نفسیات بناتے ہیں۔ قومی حریف کے لئے آدمی کے اندر نفرت اور دشمنی کے جذبات ابھرتے ہیں۔ اس کے برعکس جب یہ ذہن ہو کہ ہم خدا کے دین کے داعی ہیں اور دوسری قومیں خدا کے دین کی مدعو، تو ان کے لئے ہمارے دل میں خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبات امنڈنے لگیں گے۔

حریف کے لئے آدمی کے اندر سے بد دعا کے کلمات نکلتے ہیں اور مدعو کے لئے دعا کے کلمات۔ مگر اس قسم کی بد دعا سراسر خدائی منصوبہ کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے بزرگوں کی زبان سے نکلنے کے باوجود وہ آج تک خدا کی بارگاہ میں قبول نہ ہو سکی۔

اللہ کی یاد

حضرت عبد اللہ بن عباس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر جو چیز بھی فرض کی ہے اس کی کوئی معلوم حد ہے۔ پھر عذر کی حالت میں آدمی کے لئے رخصت ہے۔ مگر ذکر (یاد) کی کوئی حد مقرر نہیں۔ اور نہ اس کے چھوڑنے کے لئے کوئی عذر قابل قبول ہے۔ اسی لئے حکم ہے کہ ہر حال میں اللہ کا ذکر کرو۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۳، تحت سورۃ الاحزاب) یہاں ہم ذکر کے بارہ میں دو حدیثیں نقل کرتے ہیں:

أخرج الامام أحمد عن معاذ بن جبل مرفوعا قال : ألا أخبركم بخير أعمالكم و أزكاها عند مليككم و أرفعها فى درجاتكم ، و خير لكم من تعاطى الذهب والفضة ، و من أن تلقوا عدوكم غداً فتضربوا أعناقهم و يضربوا أعناقكم ، قالوا بلى يا رسول الله ، قال ﷺ : ذكر الله عز و جل * وروى أن رجلا سأل النبي ﷺ فقال : أى المجاهدين أعظم أجراً يا رسول الله ؟ قال ﷺ : أكثرهم لله تعالى ذكراً ، قال فأى الصائمين أكثر أجراً ، قال ﷺ : أكثرهم لله عز و جل ذكراً ، ثم ذكر الصلاة و الزكاة و الحج و الصدقة ، كل ذلك يقول رسول الله ﷺ : أكثرهم لله ذكراً ، فقال أبو بكر لعمر رضى الله عنهما : ذهب الذاكرون بكل خير ، فقال رسول الله ﷺ : أجل . (أخرجه الامام أحمد فى المسند)

رسول اللہ صلی اللہ نے حضرت معاذ بن جبل سے فرمایا کیا میں تم کو بتاؤں کہ تمہارے اعمال میں سب سے اچھا عمل کیا ہے۔ اور تمہارے مالک کے یہاں سب سے زیادہ پاکیزہ ہے اور تمہارے رتبہ کو سب سے زیادہ بڑھانے والا ہے اور تمہارے لئے سونا چاندی دینے سے بھی زیادہ بہتر ہے اور اس سے بہتر ہے کہ تم کل اپنے دشمن سے ملو، تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمہاری گردنیں ماریں۔ صحابہ نے کہا ہاں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا : اللہ تعالیٰ کا ذکر۔ اسی طرح روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے خدا کے رسول، مجاہدوں میں سب سے زیادہ اجر کس مجاہد کا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہو۔ پھر آدمی نے پوچھا کہ روزہ داروں میں سب سے زیادہ اجر کس روزہ دار کا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ شخص جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے۔ اسی طرح آدمی نے نماز اور زکوٰۃ اور حج اور صدقہ کے بارہ میں سوال کیا۔ ہر بار آپ یہی جواب دیتے رہے کہ وہ شخص جو سب سے زیادہ اللہ کا ذکر کرے۔ یہ سن کر حضرت ابو بکر نے حضرت عمر سے کہا، ذکر کرنے والے نیکی میں سب سے آگے بڑھ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں۔

ذکر تمام عبادتوں سے افضل کیوں ہے۔ اس لئے کہ ذکر تمام عبادتوں کا خلاصہ ہے۔ تمام عبادات و اعمال سے بالآخر جو چیز مطلوب ہے وہ یہی ہے کہ آدمی خدا کا ذکر کرنے والا بن جائے۔

ذکر دراصل معرفت خداوندی کا دوسرا نام ہے جب آدمی کو اپنے رب کی معرفت حاصل ہوتی ہے جب اس کا تصور ظاہر کے پردہ کو پھاڑ کر غیب کی حقیقتوں کو دیکھ لیتا ہے تو اس وقت اس کے ذہن قدرتی نتیجے کے طور پر، جو کیفیت آدمی پر گزرتی ہے اس کا نام ذکر ہے۔ ذکر دراصل ایک اعلیٰ ترین تجربہ ہے نہ کہ کسی قسم کی لفظی تکرار۔

ذکر کا تعلق کسی لفظ سے نہیں بلکہ حقیقت سے ہے۔ ذکر دراصل کسی انسان کا وہ قیمتی لمحہ ہے جب کہ وہ خدا کی عظمتوں کو اتنی گہرائی کے ساتھ پالے کہ اس کے دل میں معرفت الٰہی کا بھونچال آجائے اور اس کی زبان سے اس کے اعتراف و اظہار کا فوارہ پھوٹ نکلے۔

ذکر کسی بندۂ خدا کی اس حالت کا نام ہے جب کہ وہ خدا کے احسانات اور اس کے کمالات کو سوچتا ہے۔ اس سے اس کے قلب و دماغ میں ارتعاشں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی روح یاد خدا میں نہا اٹھتی ہے۔ اس کی زبان سے بے ساختہ خدا کی خدائی کے اعتراف میں ملکوتی الفاظ نکلنے لگتے ہیں۔ اس کو موت اور آخرت کی یاد آتی ہے۔ وہ زندگی کے آغاز و انجام پر غور کرتا ہے۔ یہ چیزیں اس کو تڑپا دیتی ہیں۔ وہ بیتابانہ ایسے الفاظ بولنے لگتا ہے جن میں جہنم کا خوف لپٹا ہوا ہو اور جس میں جنت کی خوشبو شامل ہو گئی ہو۔

جس آدمی کا رخ اللہ کی طرف ہو جائے تو اس پر ایسے خصوصی لمحات آتے ہیں جب کہ اس کے رب سے اس کا آمنا سامنا ہوتا ہے۔ جب بندگی اور خدائی ایک دوسرے سے بہت قریب آجاتے ہیں۔ جب بندہ اپنے رب کو دیکھنے لگتا ہے۔ ان خصوصی لمحات میں روح انسانی کے اندر جو تموج پیدا ہوتا ہے اور احساس بندگی اور اعتراف خداوندی کے دوطرفہ احساس کے تحت جو کلمات نکل پڑتے ہیں انہیں کو دین کی اصطلاح میں ذکر کہا جاتا ہے۔

ہم کسی ایسے سورج کو نہیں جانتے جس میں روشنی نہ ہو۔ ہم کسی ایسے کارخانہ سے واقف نہیں جس کا کوئی انجینئر نہ ہو۔ مگر دنیا کو دیکھئے تو یہاں بڑا عجیب منظر سامنے آتا ہے۔ یہاں آرٹ ہے مگر آرٹسٹ نہیں یہاں کارکردگی ہے مگر کارپرداز نہیں۔ یہاں حکمت ہے مگر حکیم نہیں۔ یہاں سرگرمیاں ہیں مگر کوئی محرک نہیں۔ یہاں زندگی ہے مگر کوئی زندگی بخش نہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہاں خدائی ہے مگر کوئی خدا نہیں۔

ذکر وہ ربانی لمحہ ہے جب کہ آدمی اس خلا کو عبور کر لیتا ہے۔ جب وہ "نہیں" سے گزر کر "ہاں" تک پہنچ جاتا ہے۔ جب کہ وہ مخلوقات کے پردہ میں اس کے خالق کو دیکھ لیتا ہے یہ تاریخ انسانی کی عظیم ترین

دریافت ہوتی ہے۔ اس دریافت کے وقت دریافت کرنے والے کے دل اور زبان پر جو تجربہ گزرتا ہے اسی کا دوسرا نام ذکر ہے۔

۲۱ جولائی ۱۹۶۹ کی رات تمام اخباروں کے دفتروں میں زبردست سرگرمیوں کی رات تھی۔ اس روز پہلا انسان (آرم اسٹرانگ) چاند پر اترا تھا اور اخباروں کے دفتر میں ٹیلی پرنٹر پر مسلسل خبریں آرہی تھیں۔ جن کو اخبارات کا اسٹاف کل صبح کے اخبار کے لئے تیزی سے لے رہا تھا۔

اس روز رات کو میں ایک اخبار کے دفتر میں گیا۔ اخبار کے نیوز اڈیٹر اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے میز پر کاغذات کا ڈھیر لگا تھا۔ میں نے تازہ واقعہ کے بارے میں دریافت کیا تو ان کی زبان سے نکلا :

"بڑی تھرلنگ نیوز آرہی ہیں"

میں نے سوچا کہ انسان زمین سے سفر کر کے آسمان تک پہنچ گیا تو اس خبر کو سن کر لوگوں کے اندر Thrill پیدا ہو رہا ہے۔ مگر زمین اور چاند کو دیکھ کر اور ان کے درمیان حیرت انگیز نظام کا مشاہدہ کر کے آدمی کے اندر تھرل پیدا نہیں ہوتا۔ انسانی واقعات پر تھرل مگر خدائی واقعات پر کوئی تھرل نہیں۔

انسانی کرشمہ کو دیکھ کر اڈیٹر کی زبان سے جو جملہ نکلا، اسی قسم کے الفاظ جب خدائی کرشمہ کو دیکھ کر نکلنے لگیں تو اسی کا نام دین کی اصطلاح میں ذکر ہے۔

مسئلہ کا حل

ایک کہاوت ہے —— خود کو بدل دو، قسمت خود بخود بدل جائے گی۔ اسی طرح ٹی ایس ایلیٹ نے کہا ہے: "اگر تم کسی گول چھید میں جا پڑو تو تمہیں اپنے آپ کو گیند بنا لینا چاہئے۔"

دونوں جملے ایک ہی بات کو دو مختلف پہلوؤں سے واضح کر رہے ہیں۔ سلامیہ کامیابی کا راز حالات سے مطابقت Adjustment میں ہے نہ کہ حالات سے ٹکراؤ میں۔ دنیا میں رہتے ہوئے بار بار مختلف قسم کے مسائل سامنے آتے رہتے ہیں۔ کبھی آدمی قدرت کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ کبھی ماحول کے مقابلہ میں اور کبھی کسی اور چیز کے مقابلہ میں۔ ایسے ہر موقع پر عقلمند آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ لڑنے کی کوشش نہ کرے بلکہ خارجی حالات کی رعایت کرتے ہوئے اپنی راہ نکالے۔

جاپان ایک ایسا ملک ہے جہاں اکثر زلزلے آتے ہیں۔ بے حساب جانی اور مالی نقصان ہوتا ہے۔ یہ ایک بعید شکل مسئلہ تھا۔ جاپان والوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ وہ پختہ مکانات کم بنائیں۔ وہ لکڑی اور بانس وغیرہ کے مکانات بنا کر اس میں رہنے لگے۔ لکڑی اور بانس کا مکان اگر گر بھی جائے تو اس کا نقصان کم ہوتا ہے نیز اس کے بقیہ اجزاء کسی حد تک دوبارہ استعمال ہو سکتے ہیں۔

زلزلہ میں انسان کا مقابلہ قدرت سے ہوتا ہے۔ یہاں انسان بالکل بے بس ہے۔ چنانچہ جاپان والے یہاں جھک گئے۔ انھوں نے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو جھکا کر اپنے مسئلہ کا حل نکال لیا۔

ٹویوٹا (Toyota) کا لفظ آج جاپانی کار کے ہم معنی بن گیا ہے۔ مگر پندرہ سال پہلے یہ لفظ جاپان میں ٹکسٹائل انڈسٹری کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ جاپان کی ٹویوٹا کمپنی نے ابتداءً ٹکسٹائل انڈسٹری (کپڑے کی صنعت) سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ مگر جاپان ٹکسٹائل انڈسٹری کے لئے موزوں ملک ثابت نہیں ہوا۔ کمپنی اس کاروبار میں کامیاب نہ ہو سکی۔ ٹویوٹا والوں نے اس تجربہ کے بعد نیا میدان اختیار کر لیا۔ وہ موٹر کار کی صنعت میں داخل ہو گئے۔ یہاں ان کو فضا اپنے موافق ملی۔ انھوں نے تھوڑے عرصہ میں زبردست ترقی کی۔ یہاں تک کہ تمام دنیا کی سڑکوں پر جاپانی کاریں دوڑنے لگیں۔

اس دوسری مثال میں جاپان کو ملکی اور جغرافی رکاوٹوں کا سامنا تھا۔ جاپانیوں نے یہ کیا کہ انہوں نے اپنے عمل کا میدان بدل دیا۔ اس کے بعد کامیابی ان کے لئے اسی طرح یقینی ہو گئی جس طرح کوئی شخص دیوار کی طرف سے نکلنے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ اور پھر وہ دروازہ کی طرف سے نکلنے کی تدبیر کرلے۔

جاپان کے چار بڑے اخباروں میں سے ایک اخبار خسارہ میں چلا گیا۔ ہاتھی کا ایک صفافت

جائے تو اس کے بعد اس کا بچنا سخت مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح اخبار اگر ایک بار خسارہ میں پڑ جائے تو اس کا سنبھلنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ مگر جاپان والے اپنی قومی صحافت کو زندہ رکھنا اپنا مقدس قرض سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد یہ ہوا کہ فوراً ایک بینک نے اس اخبار کو ایک بڑا قرض آسان شرطوں پر دے دیا۔ کمپنیاں اور نیم سرکاری ادارے اس کو مسلسل بڑے بڑے اشتہارات دینے لگے۔ اسی کے ساتھ اخبار کے کارکنوں نے بطور خود اخبار کے منتظمین سے کہہ دیا کہ ان کی ماہانہ تنخواہوں میں حسب قاعدہ جو اضافہ ہوتا ہے اس کو روک دیا جائے۔ یہ اضافہ اس وقت تک رکا رہے جب تک اخبار کی حالت سنبھل نہ جائے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اخبار دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔

کسی کا قول ہے کہ "کبھی دوسرے کی مدد کرنا خود اپنی مدد کرنا ہوتا ہے" یہ قول مذکورہ مثال سے پوری طرح واضح ہو رہا ہے۔ اخبار کو دیوالیہ ہوتے دیکھ کر اگر جاپان کے لوگ اس سے کھنچنے لگتے تو وہ اخبار کا بھی نقصان کرتے اور خود اپنا بھی۔ مگر جب اس نازک وقت میں وہ اس کی مدد کے لئے کھڑے ہو گئے تو انھوں نے اخبار کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود اپنے آپ کو بھی۔

کسی کا قول ہے ——— اگر آپ دوسروں کے مقابلہ میں کم ہوں تو اس کا رنج نہ کیجئے۔ کیونکہ کم ہونا بھی آدمی کو ایک چیز دیتا ہے۔ اور وہ ہے اپنی کمی کو دور کرنے کا جذبہ۔ اگر یہ جذبہ آپ اپنے اندر پیدا کر لیں تو آپ کی کمتری وہ زینہ بن جائے گی جو آپ کو اٹھا کر برتر مقام تک پہنچا دے۔ "مشہور باکسنگ چیمپین محمد علی کلے کا واقعہ اس کا ایک زندہ نمونہ ہے۔

امریکہ کی کالی نسل کا ایک لڑکا جس کی عمر تقریباً بارہ سال تھی۔ روزانہ دیکھتا تھا کہ سڑک سے خوبصورت کاریں گزر رہی ہیں۔ ایک روز اس نے اپنے باپ سے کہا "ابا، یہ چمکتی ہوئی کاریں ہمارے پاس کیوں نہیں"

"بیٹے، ہم لوگ کالے ہیں اور یہ حق صرف گوروں کو حاصل ہے کہ وہ خوب صورت کاروں پر چلیں" باپ نے بیٹے کی کالی جلد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ابا، کیا کالا ہونا جرم ہے" بیٹے نے اپنے باپ سے کہا۔

"بات یہ ہے کہ کالا ہونے کی وجہ سے ہمیں کوئی ایسا کام کرنے نہیں دیا جاتا جو ہماری آمدنی میں زیادہ اضافہ کرنے والا ہو۔ اور جو آدمی صرف اتنا کمائے کہ اپنا پیٹ بھر سکے وہ کار خریدنے کا بوجھ کیسے برداشت کرے گا" باپ نے اپنے بیٹے کو جواب دیا۔ تاہم جب اس نے دیکھا کہ اس جواب سے بیٹے کی افسردگی ختم نہیں ہوئی تو اس نے بیٹے کے لئے ایک بائیسکل خرید دی۔ بائیسکل دیتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے سے کہا: ہماری تو اتنی بھی سکت نہیں تھی مگر تم کو غمگین دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔

لڑکا بائیسکل پر سوار ہوا۔ وہ گھنٹی بجاتا اور ہینڈل اِدھر اُدھر گھماتا ہوا خوشی سے چل رہا تھا یہاں تک کہ وہ ایک دکان کے سامنے جاکر رکا۔ اس نے اپنی بائیسکل باہر کھڑی کی اور دکان کے اندر چلا گیا۔ جب وہ رومال خرید کر باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک سفید فام لڑکا اس کی بائیسکل پر سوار ہوکر دوڑا چلا جارہا ہے۔ اس نے دوڑ کر اس کو پکڑنے کی کوشش کی۔ مگر وہ ناکام رہا۔

پھولتی ہوئی سانس کے ساتھ جب اس نے ایک پولیس والے سے شکایت کی تو اس نے اس کے کالے رنگ کو دیکھ کر حقارت سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ یہ موقع تھا کہ لڑکے کے دل میں سفید فام لوگوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے اندر خود اپنے اس احساس کے خلاف شدید جذبہ ابھر آیا کہ ہم اپنے کالے رنگ کی وجہ سے اپنے کو کم کیوں سمجھتے ہیں۔ جس طرح سفید ایک رنگ ہے اسی طرح کالا بھی ایک رنگ ہے۔ پھر اس کی وجہ سے ہم احساس کمتری میں کیوں مبتلا ہوں۔

لڑکے نے پولیس والے سے کہا کہ اگر مجھ کو وہ سفید فام لڑکا مل گیا تو میں اس کی ناک توڑ دوں گا۔ پولیس والا ہنستا ہوا بولا "جاؤ، پہلے تم ناک توڑنے کی مشق کرو" اس جملہ میں جو طنز چھپا ہوا تھا اس نے لڑکے کو آخری حد تک جھنجھوڑ دیا۔ اس نے طے کرلیا کہ وہ اس چیلنج کا جواب دے گا۔ اس نے اسی دن سے باکسنگ کی مشق شروع کردی۔

یہ لڑکا محنت کرتے کرتے بالآخر ایک روز عالمی باکسنگ چیمپین بن گیا۔ اب خوب صورت کیڈلک کار اس کے گھر کے سامنے اس کی منتظر رہتی۔ وہ ان ہوٹلوں میں ٹھہرنے لگا جن میں صرف شہزادے اور سربراہان مملکت ٹھہرتے ہیں۔ وہ دنیا بھر کے اخبارات کے صفحہ اول میں جگہ پانے لگا —— یہ محمد علی کلے تھا جس نے تمام باکسروں کو ہرا کر باکسنگ کا عالمی اعزاز حاصل کیا ہے۔

محمد علی کلے نے ایک انٹرویو میں کہا "اگر میرا باپ اپنے کالے رنگ کی وجہ سے احساس کمتری کا اظہار نہ کرتا اور مجھ کو کار کے بجائے بائیسکل نہ دیتا تو آج میں عالمی باکسنگ کا چمپین بھی نہ بنتا۔ یہ دراصل اپنے پیچھے ہونے کا احساس تھا جس نے میرے اندر آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا کیا۔

نوٹ: ۱۳-۱۴ اکتوبر ۱۹۸۴ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کیا گیا۔

سائنسی ترقیاں اور روحانی عقائد

موجودہ زمانہ میں سائنسی ترقیوں کے دو دور ہیں۔ ایک آئزک نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) سے لے کر البرٹ آئن شٹائن تک۔ اور دوسرا البرٹ آئن سٹائن (۱۹۵۵ - ۱۸۷۹) کے بعد۔

سائنسی ترقی کا تعلق مادی ترقی سے ہے۔ یعنی ان چیزوں کی ترقی سے جو ہر دیکھنے والے کو نظر آتی ہیں۔ اس کے برعکس روحانیت ایک ایسی چیز ہے جو دکھائی نہیں دیتی۔ سائنس کی دنیا مرئی ہے اور روحانیت کی دنیا غیر مرئی۔ نیوٹن کے بعد سائنس کا جو دور شروع ہوا اس میں بے شمار سائنسی ترقیاں ظہور میں آئیں۔ مادہ نے تبدیل ہو کر ایک پررونق تہذیب کی صورت اختیار کرلی۔ اس کے مقابلہ میں روحانیت بدستور ایک غیر مرئی چیز بنی ہوئی تھی۔ ان حالات میں بہت سے لوگوں نے سمجھا کہ روحانیت ایک فرضی چیز ہے اور اس دنیا میں اصل وجود صرف مادہ کا ہے۔

مگر آئن سٹائن اور دوسرے سائنس دانوں کی تحقیقات نے اس نظریہ کو ختم کردیا۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ دنیا کی تمام چیزیں آخری طور پر جس چیز سے بنی ہیں وہ ایٹم ہے اور ایٹم ایک ٹھوس مادی ذرہ ہے جس کے مزید ٹکڑے نہیں کیے جاسکتے۔ جدید تحقیقات نے ایٹم کو توڑ دیا۔ اب معلوم ہوا کہ مادہ کوئی ٹھوس چیز نہیں، وہ صرف ایک قسم کی منجمد توانائی ہے۔ مادہ کو جیسے ہی توڑا جاتا ہے وہ توانائی کی صورت اختیار کرلیتا ہے جس کا دیکھنا ممکن نہیں۔

ایٹم کے ٹوٹنے کے بعد اب مادہ خود بھی اسی طرح غیر مرئی ہوچکا ہے جس طرح اس سے پہلے روحانیت کو غیر مرئی سمجھا جارہا تھا۔ چنانچہ جدید سائنس داں یہ کہنے پر مجبور ہورہے ہیں کہ ہماری دنیا امکانات کی لہروں (Waves of probabilities) کے سوا اور کچھ نہیں۔

اس طرح جدید سائنسی ترقیوں نے ثابت کیا ہے کہ حقیقت اپنی آخری صورت میں غیر مرئی ہے۔ پہلے روحانیت اور مادیت دو الگ الگ چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ اب مادہ خود روحانیت میں تبدیل ہوگیا۔ سائنس اپنے ابتدائی مرحلہ میں روحانیت کی تردید کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی، مگر سائنس اپنے آخری مرحلہ میں پہنچ کر روحانیت کی تصدیق کرنے والی بن گئی۔ اس نے روحانی حقیقت کو ہمیشہ سے زیادہ ثابت اور مضبوط بنادیا۔

روحانی عقیدہ دراصل معنوی حقیقتوں میں یقین کرنے کا دوسرا نام ہے۔ روحانیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یہ سمجھے کہ انسانی وجود میں جسم سے زیادہ اہمیت روح کو حاصل ہے۔ مادی

ترقیوں سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ اخلاقی قدروں کو ترقی حاصل ہو۔ ظاہری رونقوں سے زیادہ بڑی چیز یہ ہے کہ انسان کو اندرونی سکون ملے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو دکھائی نہیں دیتیں اور سائنس کے پہلے دور میں نہ دکھائی دینے والی چیزیں غیر واقعی سمجھی جانے لگی تھیں۔ اس بنا پر یہ سمجھ لیا گیا کہ سائنس اور روحانیت میں کوئی جوڑ نہیں ہے۔ مگر اب جب کہ سائنس خود بھی ایک قسم کا روحانی علم بن چکا ہے، روحانیت کے بارہ میں اس قسم کا خیال قائم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

یہ سائنس اور روحانیت کا نظریاتی پہلو تھا۔ اب اس موضوع کے عملی پہلو کو دیکھئے۔ یہاں بھی بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سائنس اور روحانیت میں ٹکراؤ ہے۔ دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ مگر یہ بات روحانیت کے غلط تصور کی پیدا کی ہوئی ہے۔ روحانیت کا صحیح تصور سامنے رکھا جائے تو سائنس اور روحانیت میں دوبارہ کوئی ٹکراؤ باقی نہیں رہتا۔

۱۹۶۱ میں نئی دہلی میں ایک بین اقوامی صنعتی نمائش ہوئی تھی۔ اس نمائش کو دیکھنے والوں میں میں بھی شامل تھا۔ اس موقع پر ہر ملک نے اپنی اپنی صنعتی ترقیاں دکھائی تھیں۔ امریکی پویلین سب سے زیادہ زائرین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کی وجہ وہ جدید طرز کی کار تھی جس کو "ہوائی موٹر کار" کہا جاتا تھا۔

میں اور دوسرے بہت سے لوگ ایک خاص میدان میں جمع تھے۔ اتنے میں ایک کار برآمد ہوئی۔ ڈرائیور نے پہلے اس کو زمین پر عام کار کی طرح چلایا۔ اس کے بعد کار اوپر اٹھی اور سطح زمین سے تقریباً چار فٹ بلند ہو کر چلنے لگی۔ اس طرح اس نے میدان کے چاروں طرف گول دائرہ میں چند چکر لگائے اور پھر نیچے آگئی۔

بتایا گیا کہ اس کار کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اوپر سے ہوا لے کر تیزی سے نیچے کی طرف پھینکتی ہے۔ یہاں تک کہ کار اور سطح زمین کے درمیان ایک طاقت ور ہوائی گدا بن جاتا ہے۔ کار اس ہوائی گدے پر تیرتی ہوئی چلتی ہے جس طرح کشتی پانی میں تیرتی ہوئی چلتی ہے۔

اس انوکھی کار کو دیکھنے والوں میں ایک نوجوان سادھو بھی تھا۔ گیروے کپڑے میں ملبوس اور لمبے بکھرے ہوئے بالوں والا یہ نوجوان ۲۰ منٹ تک امریکی کار کو دیکھتا رہا۔ اس کی محویت کو دیکھ کر ایک اخباری نمائندہ نے اس سے اس کا تاثر پوچھا۔ اس کا جواب یہ تھا:

"اس کو دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ کیا میں تیاگ

کی زندگی کو چھوڑ کر مادی ترقیوں کی دنیا میں اپنے حوصلے کی تسکین تلاش کروں۔ اس تامل نے مجھے اس سوچ میں ڈال دیا ہے کہ روحانی اور مادی دونوں دنیاؤں میں سے کون سی دنیا ہے جس کو میں اپنے لئے زیادہ بہتر سمجھ کر اس کو اختیار کروں" (ہندستان ٹائمس ۲۰ فروری ۱۹۶۱)

اس طرح کے واقعات سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سائنسی ترقی اور روحانیت کے درمیان ٹکراؤ ہے۔ ایک چیز کو لینا اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی دوسری چیز کو چھوڑ دے۔ مگر اس کا انحصار اس پر ہے کہ آپ روحانیت کے کیا معنی لیتے ہیں۔ اگر روحانیت کا مطلب یہ ہو کہ آدمی دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں چلا جائے اور دنیا کی چیزوں سے کوئی مطلب نہ رکھے تو البتہ سائنس اور روحانیت دو متضاد چیزیں معلوم ہوں گی۔

لیکن اگر روحانیت کا دوسرا مطلب لیا جائے تو سائنس اور روحانیت کے درمیان کوئی ٹکراؤ باقی نہیں رہتا۔ روحانیت کا دوسرا مطلب ہے ——— روح اور نفس کی پاکیزگی۔ اس دوسرے اعتبار سے روحانیت حسن تعلق کا نام ہے نہ کہ ترک تعلق کا۔

روحانیت سائنس کا الٹا لفظ نہیں ہے بلکہ مادیت کا الٹا لفظ ہے۔ روحانی آدمی غیر مادی ہوتا ہے نہ کہ غیر سائنسی۔ روحانیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی مادی چیزوں میں نہ جیتا ہو بلکہ روحانی چیزوں میں جیتا ہو۔ اس کی ایک ذہنی زندگی ہو جس کو اس سے کوئی چھین نہ سکتا ہو۔ اس کو ایک قلبی سکون حاصل ہو جو ظاہری نفع یا نقصان سے بے نیاز ہو۔ اس نے فکر کی سطح پر کوئی ایسی چیز پائی ہو جو اس کو دوسری تمام چیزوں سے اعلیٰ نظر آئے۔ وہ اپنے آپ پر قائم ہو نہ کہ اپنے سے باہر کی مادی چیزوں پر۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی ہمیشہ دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک مادیت اور دوسرے روحانیت۔ کوئی بھی شخص ان دو چیزوں سے خالی نہیں۔ دونوں ہی چیزیں ہر آدمی کی لازمی ضرورت ہیں۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ دونوں میں سے کس چیز کو اولین اہمیت دی جائے اور کس کو ثانوی درجہ میں رکھا جائے۔ جو شخص مادی چیزوں کو دوسرا درجہ دے اور روحانیت کو پہلے درجہ میں رکھے اس کا نام روحانی آدمی ہے۔ اور جو شخص اس کے برعکس کرے وہ مادی آدمی۔

اس کا سب سے اہم نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روحانیت کو آدمی کی زندگی میں مقصد کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اور جو مادی چیزیں ہیں وہ ضرورت کے خانہ میں چلی جاتی ہیں۔ اس سے سائنسی ترقیاں رکتی نہیں۔ وہ بدستور جاری رہتی ہیں۔ البتہ سائنسی یا مادی ترقیوں کو بنات خود مقصد سمجھ لینے

سے سماج میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ روحانیت آدمی کو ذہنی اور اخلاقی صحت عطا کرتی ہے۔ مادی خوراک سے آدمی کا جسم تندرست ہوتا ہے اور روحانی خوراک سے آدمی کے ذہن و فکر کو تندرستی حاصل ہوتی ہے۔

عام آدمی کے لئے مادی چیزیں مقصد ہوتی ہیں اور روحانی آدمی کے لئے ضرورت۔ نقطۂ نظر کا یہ فرق دونوں کی زندگیوں میں زبردست فرق پیدا کر دیتا ہے۔

اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ روحانی آدمی کے اندر مادی نقصان کو برداشت کرنے کی بے پناہ طاقت آجاتی ہے۔ موجودہ دنیا مقابلہ اور حادثات کی دنیا ہے۔ یہاں بار بار مختلف قسم کے نقصانات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اب جو شخص مادی چیزوں کو اپنا مقصد سمجھ رہا ہو وہ نقصان کو دیکھ کر گھبرا اٹھتا ہے اس کے اندر سخت جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات وہ خودکشی کر لیتا ہے۔ مگر روحانی آدمی اس قسم کی ناخوشگواریوں کو آسانی سے جھیل لیتا ہے۔ کیوں کہ مادی نقصان کے بعد بھی اس کے پاس ایک اعلیٰ چیز موجود رہتی ہے جس کے سہارے وہ جی سکے۔

اس طرح روحانی آدمی اس سب سے بڑی برائی سے خالی ہوتا ہے جس کو گھمنڈ کہا جاتا ہے۔ گھمنڈ ہمیشہ مادی چیزوں کے بل پر پیدا ہوتا ہے۔ لوگ چوں کہ مادی چیزوں کو سب سے بڑی چیز سمجھتے ہیں اس لئے وہ ان کو پاکر گھمنڈ میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ انسانوں کو مادی ساز و سامان سے ناپتے ہیں۔ اس لئے جس شخص کے پاس مادی ساز و سامان کم ہو اس کو نیچا خیال کرتے ہیں، اور جس شخص کے پاس مادی ساز و سامان زیادہ ہو اس کی بابت ان کا خیال ہو جاتا ہے کہ وہ اونچا آدمی ہے۔ اسی سے گھمنڈ کا جذبہ ابھرتا ہے اور انسانوں کے درمیان مصنوعی اونچ نیچ کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔

مگر روحانی آدمی مادی چیزوں کو دوسرے درجہ کی چیز سمجھتا ہے۔ وہ ان کو اپنا خادم سمجھتا ہے نہ کہ اپنا آقا۔ اس بنا پر وہ مذکورہ قسم کی نفسیات سے بچا رہتا ہے۔ نہ مادی سامان زیادہ ہونے کی بنا پر وہ اپنے کو اونچا سمجھتا۔ اور نہ ایسا ہوتا کہ جس کے پاس مادی چیزوں کی کمی ہو اس کو وہ حقیر اور نیچا سمجھنے لگے۔ روحانیت آدمی کو اپنے لئے بھی بہتر بنا دیتی ہے اور دوسروں کے لئے بھی۔

نوٹ : ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۴ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کیا گیا۔

علم نبوت

موجودہ زمانہ میں علوم فطرت (Natural science) کا بہت چرچا ہے۔ لوگ فطرت کی دنیا میں انسانی دریافتوں سے حیران ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علوم نے فطرت کے صرف کچھ ظاہری پہلوؤں کو ہمارے اوپر کھولا ہے۔ کائنات کی معنویت اس سے زیادہ ہے کہ وہ انسانی لفظوں میں بیان کی جاسکے۔

وسیع خلا میں پھیلی ہوئی دنیائیں اس سے زیادہ بڑی حقیقت کی ترجمان ہیں جو ہماری دوربینوں کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوتی ہے۔ پہاڑوں کے مناظر میں اس سے زیادہ گہری داستان چھپی ہوئی ہے جو کیمرہ کی آنکھ پکڑتی ہے اور ہمیں دکھاتی ہے۔ چڑیوں کے چہچے اس سے زیادہ بڑی کہانی سنا رہے ہیں جو ہوا کے ذریعہ ہمارے کانوں تک پہنچ رہی ہے۔ درخت اس سے زیادہ بڑا سبق دیتے ہیں جو لکڑی اور پھل کی صورت میں ہمیں حاصل ہوتا ہے۔

کائنات سے واقفیت کی ایک سطح وہ ہے جو انسانی علوم کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ پھر دوسری سطح کا علم حاصل کرنے کا ذریعہ کیا ہے۔ یہ ذریعہ وحی یا علم نبوت ہے۔ نبی ہمارے اوپر اس علم کو کھولتا ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک عظیم خدا ہے۔ اس کائنات کا نظام خدا کی طرف سے غیبی طور پر چلایا جارہا ہے۔ یہ دنیا عارضی ہے۔ اس کے بعد ایک اور دنیا آئے گی جو ابدی بھی ہوگی اور کامل بھی۔

اس پیغمبرانہ علم کی روشنی میں جب کائنات کو دیکھا جائے تو اب کائنات بالکل دوسری کائنات نظر آنے لگتی ہے۔ اب یہاں دیکھنے والے کو خالق کی تجلیاں نظر آتی ہیں۔ اب یہاں سننے والے کو خدائی آوازیں گونجتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔ اب یہاں کی سرگرمیوں میں فرشتے حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب یہاں کے مناظر میں آخرت لپٹی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

انسانی علم کی روشنی میں کائنات منزل نظر آتی ہے۔ مگر پیغمبرانہ علم کی روشنی میں وہ گزرگاہ بن جاتی ہے۔ انسانی علم کا استعمال ہمیں صرف کائنات کی چند روزہ خوراک دیتا ہے جب کہ پیغمبرانہ علم اس کو ہمارے لئے ابدی خوراک بنا دیتا ہے۔ انسانی علم ہمیں صرف مخلوقات سے ملاتا ہے۔ اور پیغمبرانہ علم ہم کو مخلوقات کے خالق سے ملا دیتا ہے۔

علم نبوت دراصل علم حقیقت کا دوسرا نام ہے۔

توہم پرستی

امریکہ کی ری پبلکن پارٹی کے ایک عہدیدار مسٹر سیلر (Sayler) نے بتایا کہ امریکی صدر رونالڈ ریگن ہر وقت اپنی جیب میں ایک چھوٹی سی سونے کی نعل رکھتے ہیں۔ یہ نعل ان کو صدر بننے سے تقریباً پانچ سال پہلے ان کے ایک دوست نے دی تھی۔ صدر ریگن کو یقین ہے کہ اس سنہری نعل میں طلسماتی اثرات چھپے ہوتے ہیں۔ وہ ان کو ہر آفت سے بچاتی ہے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۸۱ میں جب ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تو ان کے خیال کے مطابق اسی نعل نے ان کو اس سے محفوظ رکھا تھا۔

یہ نعل ہر وقت صدر ریگن کے ساتھ رہتی ہے۔ جون ۱۹۸۱ کی ایک ملاقات میں مسٹر سیلر نے ان سے پوچھا: کیا آپ اب بھی اس نعل کو اپنی جیب میں رکھتے ہیں۔ صدر ریگن نے کہا ہاں ضرور:

I sure do

اس کے بعد انھوں نے اپنی بائیں جیب میں ہاتھ ڈالا اور مذکورہ نعل نکال کر دکھائی (ٹائمس آف انڈیا، ۲۴ جون ۱۹۸۱)

یہ بلاشبہ توہم پرستی (Superstition) ہے۔ مگر اس توہم پرستی کا ایک معلوم سبب ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ دنیا میں انسان کے ساتھ جو واقعات پیش آتے ہیں وہ ایسے پراسرار ہوتے ہیں کہ آدمی پوری طرح ان کی توجیہہ نہیں کر پاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ چھپے ہوئے عوامل ہیں جو کسی کو کامیاب اور کسی کو ناکام کر دیتے ہیں۔ کوئی شخص ایک نتیجہ سے دوچار ہوتا ہے اور کوئی شخص دوسرے نتیجہ سے۔ اور دونوں میں سے کوئی بھی حقیقی معنوں میں نہیں بتا سکتا کہ اس کے ساتھ جو ہوا وہ کیوں ہوا۔ ایک بار میں نے ایک بڑے تاجر سے پوچھا کہ تجارت میں کامیابی کا راز کیا ہے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ آخر میں کہا کہ "قسمت" اگر کوئی شخص اس کا تین سبب بتائے تو میں کہوں گا کہ ــــ قسمت، قسمت، قسمت۔

یہ پراسراریت اس لئے ہے کہ سب کچھ کرنے والا خدا ہے۔ مگر انسان چونکہ غیبی خدا کو دیکھ نہیں پاتا اس لئے وہ کسی نہ کسی دکھائی دینے والی چیز کو اپنا خدا بنا لیتا ہے۔ خواہ وہ سونے کی ایک نعل ہو یا پتھر کی ایک انگوٹھی۔

انگریزی الرسالہ

الرسالہ کا انگریزی اڈیشن پابندی سے ہر ماہ نکل رہا ہے۔ زبان و بیان ہر لحاظ سے بفضلہ تعالیٰ وہ ایک معیاری پرچہ ہے۔ ایک امریکی نومسلم جو انگریزی الرسالہ شروع سے پڑھ رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ الرسالہ مجھ کو بہت پسند ہے۔ وہ مسلم دنیا کا واحد انگریزی رسالہ ہے جو خالص دعوتی اور تعمیری انداز میں نکلتا ہے۔ میں الرسالہ کو بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔

الرسالہ خالص دعوتی مقصد سے نکالا گیا ہے اور دعوت پوری امت کی مشترک ذمہ داری ہے۔ اس اعتبار سے الرسالہ (انگریزی) کسی خاص ادارہ کا پرچہ نہیں وہ پوری امت کا پرچہ ہے۔ اس کا تعاون کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کے سلسلے میں آپ اپنی ذمہ داری کو اس طرح پورا کر سکتے ہیں کہ:

اس کے خریدار بنائیں اور ایجنسی قائم کریں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔

اس کے لئے مالی تعاون کریں تاکہ اس کا خسارہ پورا کیا جاسکے۔

نوٹ: انگریزی الرسالہ کی خریداری اور ایجنسی کے شرائط وہی ہیں جو اردو الرسالہ کے ہیں۔

ادارہ الرسالہ ——

علاقائی زبانوں میں کتابیں

سچا راستہ (تلگو)	Rs. 3.50
دینی تعلیم (تلگو)	Rs. 4.50

پتہ: اسلامک سنٹر، 3-6-373/A حمایت نگر حیدرآباد 29

منزل کی طرف (مرہٹی)	Rs. 2.00

پتہ: فٹ ویل سیٹ سنٹر 1050 رویوار پیٹھ پونہ 2

Fitwel Seat Centre, 1050, Raviwar Peth, Poona 411002

ایک سفر

پہلی بار میں ۳۰ ستمبر ۱۹۷۱ کو پونہ آیا تھا۔ اس وقت دو روزہ قیام کے دوران میں نے یہاں کے مختلف مسلم اور غیر مسلم ادارے دیکھے تھے۔ لوگوں سے ملاقاتیں کی تھیں اور شہر میں کچھ تقریریں کی تھیں۔ اس پہلے سفر کی روداد اسی زمانہ میں الجمعیۃ ویکلی (۱۲ نومبر ۱۹۷۱) میں شائع ہوئی تھی۔

پونہ کے لئے میرا دوسرا سفر مارچ ۱۹۸۳ میں ہوا۔ اس سفر کی مختصر روداد الرسالہ (جون ۱۹۸۴) میں شائع ہو چکی ہے۔ اس سفر کے وقت پونہ میں الرسالہ کی ایک یا دو ایجنسی تھی اور اس کے پچاس پرچے یہاں آرہے تھے۔ اب خدا کے فضل سے یہاں دو سو سے زیادہ پرچے آرہے ہیں اور اسلامی مرکز کی مطبوعات بڑی تعداد میں شہر کے اندر پھیل چکی ہیں۔

پونہ کا تیسرا سفر ایک تربیتی اجتماع کے سلسلے میں ہوا جو یہاں ۲۹ - ۳۰ ستمبر ۱۹۸۴ کو رکھا گیا تھا۔ اس پروگرام کے تحت میں جہلم اکسپریس سے ۲۸ ستمبر کی سہ پہر کو پونہ پہنچا۔

حال میں میں نے سورہ الکہف کی تفسیر مکمل کی تھی۔ اس کے ۴۶ صفحات کے مسودہ کی نظر ثانی کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ یہ مسودہ میں نے اپنے ساتھ لے لیا۔ دہلی سے پونہ کے سفر میں پورے مسودہ کو باطمینان دو بار پڑھا اور جگہ جگہ اس کو درست کیا۔ میں نے سوچا کہ موجودہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ سفر کرتے ہوئے بھی آدمی ایسے نازک علمی کام کو جاری رکھ سکتا ہے۔ قدیم زمانہ کی سواریوں میں ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔

پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کی زبان سے یہ دعا کرائی گئی تھی: ربنا ولا تحمل علینا اصراً کما حملته علی الذین من قبلنا (خدایا ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پچھلی امتوں پر ڈالا تھا) مذکورہ واقعہ بھی شاید اسی کا ایک جزء ہے۔ امت محمدی کی بعثت ایسے زمانہ میں ہوئی جب کہ دعوت دین کے معاملہ کو، پہلے کے مقابلہ میں، بے حد آسان بنا دیا گیا ہے۔ یہ آسانیاں اسلام کی تعمیر کے لئے ظہور میں لائی گئی تھیں۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں ان مواقع کو اسلام کے نام پر صرف اسلام کی تخریب کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

پونہ میں لوگوں نے بتایا کہ الرسالہ یہاں کافی مقبول ہے۔ مگر اس میں بعض شخصیتوں پر جو تنقید شائع ہوتی ہے اس سے ان شخصیتوں کا حلقہ بہت مشتعل ہے۔ اس کے جواب میں میں نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ آپ اس حیثیت سے غور کیجئے کہ ان شخصیتوں کا جو حلقہ ہے، خدا کے فضل سے اتنا ہی الرسالہ کا حلقہ بھی ہندستان کے اندر اور ہندستان کے باہر ہے۔ اب آپ ایک تجربہ کیجئے۔ الرسالہ کے حلقہ میں

آپ صاحب الرسالہ پر تنقید کیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ الرسالہ کے حلقہ کا کوئی شخص اس پر مشتعل نہ ہوگا۔ بلکہ آپ کی تنقید کو صرف اس حیثیت سے جانچے گا کہ وہ دلیل کے اعتبار سے کیسی ہے۔ اس کے برعکس ان شخصیتوں کے حلقہ کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی محبوب شخصیت پر تنقید سنتے ہی مشتعل ہو جاتا ہے۔ وہ یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ تنقید بجائے خود کیا ہے۔ وہ دلیل کی بنیاد پر ہے یا بے دلیل ہے۔

اب آپ بتائیے کہ دونوں میں سے کون سا مزاج اسلامی مزاج ہے۔ کوئی بھی شخص جو پڑھا لکھا ہو اور قرآن و حدیث کو جانتا ہو وہ یہی کہے گا کہ الرسالہ کے حلقہ کا مزاج ہی اسلامی مزاج ہے اور ان شخصیتوں کے حلقہ کا مزاج یقینی طور پر غیر اسلامی۔ پھر ان شخصیتوں کو اور ان کے حلقہ کو یہ سوچنا چاہئے نہ انھوں نے اپنی کوششوں سے کون سی فصل تیار کی ہے۔ ایسی حالت میں انھیں خود اپنا احتساب کرنا چاہئے نہ کہ وہ الرسالہ یا صاحب الرسالہ پر برہم ہونے لگیں۔

پھر میں نے کہا کہ اسلام میں حرام چیزوں کی واضح فہرست ہے۔ مگر اس فہرست میں کہیں بھی "تنقید" کا لفظ درج نہیں۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں ایک دوسرے پر تنقید کی کھلی اجازت تھی۔ فقہاء و محدثین میں کھلی تنقیدیں ہوتی تھیں۔ امت مسلمہ کا جو معیاری زمانہ ہے اس میں تنقید سے روکنے یا برا ماننے کا کوئی مزاج نہ تھا۔ اب اگر کچھ لوگ تنقید سے روکیں تو گویا وہ بدعت کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اور بدعت ایک ایسی چیز ہے جس کے بارہ میں ہر جمعہ کو ہمارا امام بلند آواز سے اعلان کرتا ہے ——— کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار۔ میں نے کہا کہ آپ صرف یہ پابندی لگا سکتے ہیں کہ تنقید کو دلیل کی بنیاد پر ہونا چاہئے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ بے دلیل ایک دوسرے کے خلاف رائے زنی کی جانے لگے۔

اس اجتماع میں بمبئی سے بھی کچھ حضرات شریک ہوئے تھے۔ محمد شفیع گلزار سرگروہ نے بتایا کہ جناب عبد الغنی حسن سرگروہ (ایڈوکیٹ بمبئی) نے انگریزی الرسالہ دیکھ کر اس کو پسند کیا اور کہا کہ:

It is the need of the hour

(یہ وقت کی ضرورت ہے) اس طرح کی رائے بہت سے لوگوں نے ظاہر کی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے انگریزی داں طبقہ میں اور غیر مسلموں میں خالص تعمیری انداز میں اسلام کو پیش کرنے کے لئے ایک رسالہ کی ضرورت تھی اور انگریزی الرسالہ اس ضرورت کو بخوبی پورا کرتا ہے۔

مولانا مختار احمد قاسمی (بمبئی) نے بتایا کہ بمبئی (سیوڑی) میں ایک جماعت (اللہ اکبر) کی سرگرمیوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے دیکھا کہ انھوں نے الرسالہ کے ایک جملہ کو اپنے یہاں بطور موٹو

کے اختیار کر لیا ہے۔ اس کو وہ اپنے بورڈ پر، اپنے تجارتی کاغذات پر، اپنی رسیدوں پر، اپنے لیٹر پیڈ پر، غرض ہر جگہ درج کرتے ہیں۔ وہ جملہ یہ ہے:

اتحاد کیا ہے، اختلاف کے باوجود متحد ہونا

حیدر آباد اور بنگلور سے بھی کچھ صاحبان اس اجتماع میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ بنگلور میں خدا کے فضل سے الرسالہ کی تحریک بڑھ رہی ہے۔ اردو اور انگریزی دونوں الرسالہ وہاں معقول تعداد میں جارہے ہیں اور دن بدن ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

پونہ کے اجتماعات میں خلاف امید کافی لوگ شریک ہوئے۔ ۲۰ ستمبر کی شام کو نماز عشاء کے بعد پنشن والی مسجد میں خطاب عام ہوا۔ وسیع مسجد کے تمام حصے پوری طرح بھرے ہوئے تھے "اسلامی تاریخ کیا سبق دیتی ہے" کے موضوع پر میں نے ایک گھنٹہ تقریر کی۔ اسلام کے آغاز سے لے کر اسپین کے زوال تک کی تاریخ پر واقعات کی روشنی میں ایک جائزہ پیش کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ تاریخ بنانے کے لئے ہمیشہ جاندار افراد درکار ہوتے ہیں۔ خوش خیالیوں سے نہ پہلے تاریخ بنی اور نہ آج بن سکتی ہے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۸۴ کی شام کو ایک نشست میں پونہ میں اسلامی مرکز کی شاخ کے قیام کا اعلان کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ ہفتہ وار اجتماع کا نظم قائم کر کے یہاں باقاعدہ کام کیا جائے۔

پونہ کے عبد الصمد صاحب نے بتایا کہ ایک نوجوان حافظ ثناء اللہ صاحب جو حال میں گجرات سے عالم کی سند لے کر آئے ہیں اور پونہ کی ایک مسجد میں امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ وہ میری دکان پر سائیکل کا سیٹ کور خریدنے آئے تھے۔ شوکیس میں رکھی ہوئی آپ کی کتابوں پر نظر پڑی تو نور آ جولائی کا الرسالہ اٹھا لیا۔ اور کہا کہ میں گجرات میں مستقل خریدار تھا۔ اب سوچ رہا تھا کہ پونہ میں بھی اپنے نام الرسالہ جاری کراؤں لیکن آپ کے پاس دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔

دوران گفتگو میں نے ان سے کہا کہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ محلہ کی مسجد کے امام کا اثر اطراف کی آبادی میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ائمہ مساجد دعوت کا کام بڑی آسانی سے کر سکتے ہیں لیکن بڑا المیہ یہ ہے کہ اکثر ائمہ مساجد عصری اسلوب میں لٹریچر پڑھنے کے لئے تیار نہیں۔

عبد الصمد صاحب نے اپنی دکان کے سامنے "عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر" کا بورڈ لگایا ہے اور سامنے ہی شوکیس میں تمام کتابیں لگا رکھی ہیں۔ اس طرح آنے جانے والے اس کو دیکھتے ہیں۔ اس سے کام کو بڑھانے میں مدد ملتی ہے۔

ایک صاحب جو پونہ بمبئی کے درمیان ایک مقام بوناؤلہ میں امامت کرتے ہیں۔ وہ اکثر عربی خطبہ

سے پہلے الرسالہ کا کوئی مضمون پڑھ کر سناتے ہیں۔ پونہ کی ایک مسجد جس کو درگاہ والی مسجد کے نام سے جانا جاتا ہے وہاں ایک شخص ہیں عبدالکریم کورٹ والے۔ وہ ایک فریم میں الرسالہ کا مضمون ہر چار چار دن کو مسجد کے دروازے پر لگاتے ہیں اور لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔ اس طرح کی کوششیں مختلف حضرات اپنے مقامات پر کر رہے ہیں۔

ستمبر ۱۹۸۴ کو جناب ایس ایم یحییٰ صاحب (سابق وزیر مالیات کرناٹک) دہلی میں ہمارے مرکز میں آئے اور بھٹکل آنے کی دعوت دی۔ اس پروگرام کے تحت یکم اکتوبر ۱۹۸۴ کو پونہ سے بھٹکل کے لئے روانگی ہوئی۔ تقریباً چھ سو کلومیٹر کا یہ سفر کار کے ذریعہ طے کرنا ابتداءً بڑا وحشت ناک معلوم ہوتا تھا۔ مگر ایک واقعہ نے یہ وحشت ناکی دور کر دی۔ وہ تھا سفر کا راستہ۔ پونہ سے بھٹکل تک کی سڑک پوری کی پوری قدرتی حسن کے درمیان سے گزرتی ہے۔ مسلسل پہاڑی علاقہ اور سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے سرسبز مناظر نے سفر کی صعوبت بھلا دی۔ جو سفر ابتداءً تکلیف دہ سفر معلوم ہوتا تھا۔ قدرتی مناظر نے اس کو روح پرور ربانی سفر بنا دیا۔

پونہ سے بھٹکل کے راستہ میں سڑک کے کنارے بہت سے ٹرک الٹے ہوئے نظر آئے۔ کچھ گاڑیاں چکنی سڑک پر دوڑ رہی تھیں اور کچھ گاڑیاں الٹی پڑی تھیں۔ جن لوگوں کی گاڑیاں سڑک پر دوڑ رہی تھیں ان کے چہرے بتاتے تھے کہ وہ اپنے کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ ان کو نہیں معلوم کہ یہ صرف وقت کا سوال ہے۔ ہر ایک کی گاڑی آخر کار الٹنے والی ہے۔ کسی کی آج الٹ گئی ہے کسی کی کل الٹے گی۔ یہ الٹی ہوئی گاڑیاں اپنے انجام کی صورت میں دوسروں کو بتا رہی ہیں کہ تمہارا بھی یہی انجام ہونے والا ہے۔ مگر کوئی نہیں جو اپنے دائیں بائیں بکھری ہوئی ان نشانیوں سے سبق لیتا ہو۔ یہ انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو واقعات سے الگ کر لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ صرف دوسروں کے لئے تھا، میرے اپنے ساتھ ایسا ہونے والا نہیں۔

راستہ میں دو گھنٹے کے لئے ہم لوگ بلگام ٹھہرے۔ بلگام (کرناٹک) کی کل آبادی پونے تین لاکھ ہے۔ اس میں مسلمان تقریباً ۴۰ ہزار ہیں۔ ۱۹۳۸ میں یہاں مسٹر محمد علی جناح آئے تھے اور تقریر کی تھی اور اس کے بعد سے یہاں کے ایک چوک کا نام جناح چوک پڑ گیا تھا۔ سرکاری کاغذات میں اس کا یہ نام درج نہیں۔ البتہ مسلمانوں نے یہاں ایک بورڈ لگا دیا جس پر جناح چوک لکھا ہوا تھا اور اس کے اوپر اپنا سبز جھنڈا لہرا دیا۔ چند سال پہلے ہندو صاحبان نے اس جھنڈے اور بورڈ کو ہٹا دیا۔ اس کے بعد دونوں فرقوں میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ ہندو صاحبان کا مطالبہ تھا کہ اس کا نام ویرساورکر چوک رکھا

جاتے۔ یہ نزاع چل رہی تھی۔ حال میں معلوم ہوا کہ یہاں کی کارپوریشن نے "ڈیرسا ورکر چوک" کا نام منظور کر دیا ہے۔

مسلمان نام کی اس تبدیلی کو پسند نہیں کر رہے ہیں۔ تاہم یہاں کے مسلمان اس قدر خستہ حال میں کہ وہ غالباً اس کے خلاف کسی اقدام کی ہمت نہ کر سکیں گے۔ اگر یہاں کے مسلمان اچھے حال میں ہوتے تو یقیناً وہ اس پر جھگڑا کرتے اور بالآخر فساد ہو جاتا۔ اس کے بعد تمام لیڈر متفقہ طور پر یہ انکشاف کرتے کہ ـــــ سازش کے تحت ان مقامات کو فساد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے جہاں مسلمان اچھی حالت میں ہیں۔

معلوم ہوا کہ بلگام میں سڑک کے کنارے کی "مسجدوں پر پہلے یہ بورڈ لگا ہوا تھا "یہاں باجہ بجانے کی منہائی ہے"۔ کچھ سال پہلے تک شادی بیاہ اور پوجا وغیرہ کے جلوس والے اس پر عمل کرتے تھے۔ مگر اب اس پر عمل ختم ہو گیا ہے۔

ہندستان کا وہ ساحلی علاقہ جو گجرات سے لے کر ملابار تک بحر عرب سے ملتا ہے، اس علاقہ میں قدیم زمانہ سے عربوں کی آمد و رفت رہی ہے۔ پہلی صدی ہجری میں صحابہ اور تابعین اس میں داخل ہوئے اور بہت سے لوگ یہاں آباد ہو گئے۔ بھٹکل (کرناٹک) اسی علاقہ میں واقع ہے۔ یہاں کے مسلمان زیادہ تر انھیں قدیم عربوں کی نسل سے ہیں۔ ابن بطوطہ کے سفر نامہ میں بھی بھٹکل کا ذکر ملتا ہے۔

بھٹکل میں تقریباً ۲۵ ہزار مسلمان آباد ہیں۔ یہ یہاں کی آبادی کا تقریباً ۲۰ فی صد حصہ ہے۔ یہاں ۱۹۱۹ میں انجمن حامی مسلمین قائم ہوئی۔ ابتداءً وہ مدرسہ سے شروع ہوئی تھی۔ مگر آج وہ ایک وسیع ایجوکیشنل کامپلکس میں تبدیل ہو چکی ہے۔

بھٹکل کے مسلمانوں کی ایک جماعت "تنظیم و اصلاح" کے نام سے ہے۔ یہاں کے تمام مسلمان اس کے فیصلوں کی پوری پابندی کرتے ہیں۔ مقامی کارپوریشن کے الکشن میں یہی تنظیم مسلمانوں کا نمائندہ منتخب کرتی ہے۔ صرف یہی مسلمان الکشن میں حصہ لیتے ہیں۔ دوسرا کوئی شخص الکشن میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی کھڑا ہو تو اس کو مسلمان کا ایک بھی ووٹ نہیں ملے گا۔ اسی اتحاد کا نتیجہ ہے کہ کارپوریشن پر اکثر مسلمانوں کا قبضہ رہتا ہے۔

بھٹکل میں مسلمانوں نے پرائمری سے لے کر انجنیرنگ تک ہر قسم کی تعلیم کا انتظام کیا ہے۔ اب انھوں نے ستر ایکڑ کی ایک زمین حاصل کی ہے۔ یہ ایک سطح مرتفع (پلیٹو) ہے۔ جس کے چاروں طرف پہاڑیاں اور سبز سبز مناظر اس کو اس کو دلکش بنا رہے ہیں۔ اسی زمین میں اسلامک اینڈ عربک اسٹڈیز اکیڈمی قائم کی جا رہی ہے۔ اس کی مجوزہ وسیع عمارت اور مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے مجھے بلایا گیا تھا۔ ۲ اکتوبر

۱۹۸۲ اگست ۱۰ سہ پہر کو ایک تقریب کے تحت میں نے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کے بعد ایک جلسہ ہوا جس میں بھٹکل اور اس کے اطراف کے تعلیم یافتہ مسلمان بہت بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ یہاں میں نے اسلام ں علم کی اہمیت پر تقریر کی۔ نیز یہ دکھایا کہ موجودہ سائنسی ترقیوں نے کس طرح اسلامی دعوت کے نئے سیع امکانات کھول دئے ہیں۔

بھٹکل میں جو پروگرام ہوئے ان کی تفصیل الگ صفحہ پر درج ہے۔

بھٹکل غالباً ہندستان میں منفرد جگہ ہے جہاں مسلمانوں کی تعمیر کا کام کامیاب طور پر ہو رہا ہے۔ یہاں ہر قسم کے تعمیری کام کئے جا رہے ہیں۔ اس علاقہ میں سیکڑوں سال سے ملاح آباد تھے جو خستہ حالت میں رہتے تھے۔ اب سمندر کے کنارے ان کے بہت سے خوبصورت گاؤں بن گئے ہیں۔ وہ لوگ مشینی کشتیوں کے ذریعے مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ ان کی بستیوں میں مسجد اور مدرسے قائم ہیں۔ ان کے بچے تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ وغیرہ

بھٹکل کے مسلمانوں کی مزید خصوصیت ہے کہ یہاں کے سرکاری اسکولوں میں مسلمانوں کی اسلامی علیم کے لئے ایک گھنٹہ خاص کیا گیا ہے۔ اس میں انجمن کے اساتذہ جاتے ہیں اور مسلمان بچوں کو اسلام کی ضروری تعلیم دیتے ہیں۔

کسی کا قول ہے کہ خدا تجارت کو اپنا مبلغ بناتا ہے:

God is making commerce his missionary

س کا ایک نمونہ میں نے بھٹکل میں دیکھا۔ بھٹکل کے مسلمان نوائتی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ نوائتی برادری دری کی پوری تاجر برادری ہے۔ تجارت میں مشغولیت نے ان کے مزاج کو پر امن تعمیری مزاج بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے رہنما جو بھی اسکیم بناتے ہیں، پوری برادری فوراً اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ ہ ہر تعمیری منصوبہ میں اپنے رہنماؤں کا بھرپور تعاون کرتے ہیں۔ ان کی جماعتوں کے صدر اور سکریٹری معمولی کام بھی اسی شوق سے کرتے ہیں جس طرح بڑے کام۔ لکھ پتی اور کروڑ پتی خاندان کے وجوان سادہ لباس پہنے ہوئے قومی کاموں میں رضاکارانہ حصہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہی مزاج کسی قوم کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ شمالی ہند کے مسلمانوں میں یہ مزاج موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے یہاں کوئی تعمیری کام نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی شخص کسی تعمیری کام کا آغاز کرے تو اس کو معاون نہیں ملتے۔ وہ ہبت جلد اختلافات کا شکار ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ شمالی ہند کے مسلمان اگر "بھٹکل" جیسے علاقوں سے سبق لیں تو ان کا سئلہ بھی اسی طرح حل ہو جائے جس طرح ان کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔

پونہ کا پروگرام

۲۸ ستمبر ۱۹۸۴	بعد نماز مغرب، یونانی میڈیکل کالج کے افتتاح کی تقریب میں ایک گھنٹہ کی تقریر بعد نماز عشاء، مکہ مسجد میں خطاب عام
۲۹ ستمبر	مکہ مسجد میں درس قرآن اسلامی تربیت کے موضوع پر دن کے مختلف اوقات میں تقریریں نماز عصر کے بعد، طیبہ یتیم خانہ کا معائنہ، تقریر نماز عشاء کے بعد، ایک مکان پر تقریر
۳۰ ستمبر	نماز فجر کے بعد مکہ مسجد میں درس حدیث دن کے مختلف اوقات میں اسلامی تحریک کے موضوعات پر تقریریں "عربی کلاس" کا افتتاح پنشن والی مسجد میں خطاب عام (اسلامی تاریخ ہمیں کیا سبق دیتی ہے)
یکم اکتوبر	صبح ۱۰ بجے شیخ انور مختار کی رہائش گاہ پر تعلیم یافتہ اصحاب سے ملاقات

بھٹکل کا پروگرام

۲ اکتوبر	جامعۃ الصالحات کا معائنہ، تقریر تنظیم و اصلاح کا معائنہ، تقریر مدرسہ عربیہ تعلیم القرآن تینگن گنڈی کا معائنہ، تقریر انجمن ہائی اسکول کا معائنہ، تقریر اسلامک اینڈ عربک اسٹڈیز اکیڈمی کا سنگ بنیاد، تقریر جامع مسجد بھٹکل میں تقریر

پونہ اور بھٹکل کے سفر کے دوران لوگوں سے جو باتیں ہوئیں۔ ان میں سے بعض یہاں نقل کی جاتی ہیں

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ جن لوگوں کو کرنا نہیں ہے وہ پروگرام پوچھ رہے ہیں۔ اور جن لوگوں کو کرنا ہے انھیں معلوم ہے کہ ان کا پروگرام کیا ہے۔ پھر میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ انگریزی الرسالہ کا اجرا سب لوگوں کو ایک مکمل پروگرام دے رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انگریزی الرسالہ پورے عالم اسلام کا واحد پرچہ ہے جو انٹرنیشنل زبان میں خالص دعوتی انداز میں نکالا جا رہا ہے۔ وہ زبان اور بیان دونوں اعتبار سے پوری طرح قابل اعتماد ہے۔ اب لوگوں کا کام یہ ہے کہ اس کو غیر مسلموں اور انگریزی داں مسلمانوں تک پہنچائیں۔

جو لوگ واقعۃً کچھ کرنا چاہتے ہیں، وہ انگریزی الرسالہ کی صورت میں اپنا پروگرام پا گئے ہیں۔ اس کو وہ پوری کوشش سے انگریزی داں اور تعلیم یافتہ غیر مسلموں میں پہنچا رہے ہیں۔ اگر ان کو خریدار نہ بھی ملے تو وہ خود اپنی طرف سے اس کو خریدتے ہیں اور دعوتی ذمہ داری کے تحت اس کو پھیلا رہے ہیں۔ مگر جن کو کچھ کرنا نہیں ہے وہ ابھی تک پروگرام پوچھ رہے ہیں —— کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اپنی بے عملی کا الزام دوسروں کے سر ڈالنا چاہتے ہیں۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے اسلامی قائدین دو قسموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک وہ جو سمجھتے ہیں کہ شخصیتیں تاریخ بناتی ہیں۔ دوسرے وہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ تاریخ بنانے والی چیز نظام ہے۔ ایک گروہ انسانی شخصیتوں میں گم ہے اور دوسرا گروہ سیاسی نظامات میں۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں جس کو یہ دکھائی دیتا ہو کہ خدا تاریخ بنانے والا ہے۔ لوگ غیر خدا میں گم ہیں۔ کوئی نہیں جو خدا کو دیکھے اور اس میں ہمہ تن گم ہو جائے۔

فوج کے ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ بندوق اور شکار پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا "نشانہ لگاتے وقت پر آپ کو پتھر کی طرح ساکت ہو جانا چاہئے"۔ میں نے سوچا کہ یہی معاملہ زندگی کے بقیہ معاملات کا بھی ہے۔ آدمی اگر کسی "نشانہ" کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو بقیہ تمام چیزوں سے صرف نظر کرنا ہوگا۔ جو شخص دوسری چیزوں سے صرف نظر نہ کر سکے، اس کے حصہ میں صرف یہ آتا ہے کہ کارتوس خالی کرنے کے بعد بھی اس کی گولی نشانہ پر نہ لگے۔

اس سفر کے دوران ایک صاحب نے ایک مسجد کا واقعہ بتایا جس میں بڑی نصیحت ہے۔ ایک شخص نے اس مسجد میں نماز پڑھی۔ اس کے بعد مسجد کے موذن سے پوچھا کہ مجھے ایک نیا جوتا بنوانا ہے، کسی اچھے جوتے ساز کا پتہ بتاؤ تاکہ میں اس سے اپنا جوتا بنوا سکوں۔ موذن نے امام صاحب کی طرف اشارہ کیا جنھوں

نے ابھی ابھی وہاں نماز پڑھائی تھی۔

مسافر کو یقین نہیں ہوا۔ مگر جب وہ مسجد کے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ مسجد کے نیچے ایک دکان میں وہی شخص جوتا بنانے میں مشغول ہے جس نے ابھی نماز کے وقت مسجد میں امامت کی تھی۔ مسافر نے دکان میں جا کر امام صاحب سے گفتگو کی اور ان کو اپنے جوتے کا آرڈر دے دیا۔

بتانے والے نے بتایا کہ یہ امام صاحب عام جوتا سازوں سے کافی زیادہ قیمت پر جوتا بناتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے یہاں فرمائش کرنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ کیوں کہ ان کے متعلق لوگوں کو اطمینان ہے کہ ان کا بنا یا ہوا جوتا پوری طرح قابل اعتماد ہوگا۔

ہمارے ائمہ اور مدرسین جو امام ابوحنیفہ کے فقہی مسلک پر بہت زور دیتے ہیں اگر وہ امام ابوحنیفہ کے اس معاشی مسلک کو بھی اختیار کرلیں تو ملت کے آدھے جھگڑے اچانک ختم ہو جائیں اور اسی کے ساتھ اس کے آدھے مسائل بھی۔

۳ اکتوبر ۱۹۸۴ کو واپسی ہوئی۔ بھٹکل سے منگلور کا سفر سڑک سے طے ہوا۔ اور منگلور سے دہلی کا سفر ہوائی جہاز سے۔ بمبئی میں جہاز بدلنے کے لئے کچھ دیر رکنا پڑا۔

بمبئی کے ہوائی اڈہ پر مسافروں کی بھیڑ نظر آئی۔ یہ زیادہ تر وہ لوگ تھے جو خلیج کے ملکوں سے کما کر آرہے تھے اور اپنے وطن کو جانے کے لئے دوسری پرواز کا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں سے ہر شخص سب سے زیادہ ان سامانوں میں منہمک تھا جن کو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور اب ان کو لے کر جلد از جلد اپنے بیوی بچوں تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

زندگی ایک سفر ہے۔ ہر شخص اپنے آغاز سے انجام کی طرف جا رہا ہے۔ مگر ہر آدمی کے پاس اپنے ساتھ لے جانے کے لئے جاپان اور جرمنی کی مصنوعات ہیں۔ کسی کو بھی یہ معلوم نہیں کہ یہاں ایک اور چیز ہے جس کو آدمی اپنا زادِ سفر بنا سکے۔ یہ خدا کی یاد ہے۔ لوگ دنیا کے بازار سے انسانی چیزیں لینے میں اتنا مشغول ہیں کہ انھیں یہاں بکھری ہوئی لاتعداد خدائی چیزوں کو لینے کی فرصت نہیں۔ عظیم ترین خزانے سے حقیر ترین چیز لینے کی اس سے زیادہ عجیب مثال کوئی دوسری نہیں ملے گی۔

خبرنامہ اسلامی مرکز

۱. تقریری پروگرام کے تحت اسلامی مرکز میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۴ کو ایک اجتماع ہوا۔ یہ اجتماع نماز مغرب اور نماز عشاء کے درمیان تقریباً دو گھنٹہ تک رہا۔ اس اجتماع کے خصوصی مقرر جناب پروفیسر علی اشرف صاحب (وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی) تھے۔ تقریر کا عنوان تھا: حج کے تاثرات و مشاہدات تقریباً پچاس تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے جن میں کچھ خواتین بھی تھیں۔ تمہیدی تقریر ڈاکٹر شفیق احمد ندوی نے کی۔ اس کے بعد فاضل مقرر نے ایک گھنٹہ خطاب کیا۔ آخر میں صدر اسلامی مرکز نے پندرہ منٹ کی گفتگو میں موضوع سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۲. ۴ اکتوبر ۱۹۸۴ کو بستی نظام الدین (دہلی) کے ایک مکان میں اجتماع ہوا۔ بستی کے تقریباً ۲۰ آدمی شریک ہوئے اکثریت نوجوان طبقہ کی تھی۔ صدر اسلامی مرکز نے آدھ گھنٹہ تقریر کی۔ تقریر کا موضوع توحید و آخرت تھا۔ موصوف نے مختلف اسلامی واقعات بیان کر کے بتایا کہ توحید و آخرت کے نظریات کیسے انقلابی نظریات ہیں اور ان سے کیسی عظیم زندگیاں بنتی ہیں۔ آخر میں لوگوں کی خواہش کے مطابق یہ طے ہوا کہ اس طرح کا اجتماع بستی نظام الدین میں ہر ماہ کیا جاتا رہے۔

۳. ۲۶ - ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۴ کو ایس آئی ایم کی تیسری آل انڈیا کانفرنس نئی دہلی (رام لیلا گراؤنڈ) میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں پورے ملک سے تقریباً پندرہ ہزار تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ منتظمین کی خواہش پر صدر اسلامی مرکز نے کانفرنس کے ایک اجلاس میں تقریر کی۔ اس کا عنوان تھا: ہندستان کا سماجی بگاڑ اور امت مسلمہ کی ذمہ داریاں۔ لوگوں نے تقریر کو بہت پسند کیا۔ عام تاثر یہ تھا کہ پورے کانفرنس کی سب سے زیادہ پرمغز اور فکر انگیز تقریر یہی تھی۔ بہت سے لوگوں نے اس تقریر کو ٹیپ لیا۔

۴. ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کی شام کو مغرب اور عشاء کے درمیان نظام الدین بستی میں ایک نشست ہوئی تقریباً دس تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ کیا وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا جان و مال محفوظ نہیں۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ قرآن کے مطابق عصمت من الناس کا راز دعوت الی اللہ میں ہے۔ اور دعوت الی اللہ کا کام ہم نے چھوڑ رکھا ہے۔ موجودہ صورت حال اسی کا نتیجہ ہے۔

۵. ایس آئی ایم کی مذکورہ تین روزہ کانفرنس (۲۶ - ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۴) میں اسلامی مرکز کا اسٹال لگایا گیا۔ الرسالہ اردو، الرسالہ انگریزی اور دوسری تمام مطبوعات نہایت سلیقہ کے ساتھ

سجائی گئی تھیں۔ کثیر تعداد میں لوگوں نے دیکھا اور مطالعہ کیا۔ اس موقع پر کثیر تعداد میں کتابیں فروخت ہوئیں۔ بہت سے افراد الرسالہ کے خریدار ہوئے اور اس کی ایجنسی لی۔ اسی طرح پونہ کے تبلیغی اجتماع (۲۶ - ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۴) کے موقع پر اسلامی مرکز کی مطبوعات کا اسٹال لگایا گیا۔ اس موقع پر تقریباً ۱۵ ہزار افراد شریک ہوئے تھے۔ اس موقع پر بھی کافی کتابیں فروخت ہوئیں اور کثیر تعداد نے دیکھا اور مطالعہ کیا۔ اجتماعی مواقع پر اسٹال کا طریقہ بہت مفید طریقہ ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسا اسٹال ہر جگہ لگایا جائے۔

۶. ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۴ کو حسب معمول اسلامی مرکز کا ماہانہ اجتماع ہوا۔ یہ اجتماع ہر ماہ کے آخری اتوار کو بعد نماز مغرب ہوتا ہے۔ صدر اسلامی مرکز نے سورہ الصافات کی چند آیات کی روشنی میں درس قرآن دیا۔ اس درس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر شخص کے اندر ایک دوست انسان بھی ہے اور ایک دشمن انسان بھی۔ یہ ہمارا اپنا امتحان ہے کہ دوست انسان ہمارے حصہ میں آتا ہے یا دشمن انسان۔

۷. ۲۵ نومبر ۱۹۸۴ کو اتوار کا دن تھا۔ حسب معمول بعد نماز مغرب اسلامی مرکز کا ماہانہ اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز بیرونی سفر پر تھے۔ تاہم انھوں نے اپنا ایک درس ٹیپ کرا دیا تھا۔ موصوف کی غیر موجودگی میں یہ ٹیپ سنایا گیا۔ اس کا موضوع تھا: قرآن فہمی۔ صدر اسلامی مرکز نے ۵۲ منٹ کی گفتگو میں بتایا کہ قرآن کا ایک حصہ "سطور" میں ہے اور اس کا ایک حصہ "بین السطور" میں۔ قرآن کا جو حصہ سطور میں ہے وہ آپ الفاظ کا ترجمہ کر کے جان سکتے ہیں۔ مگر اس کا دوسرا زیادہ گہرا حصہ بین السطور میں ہے اور اس کو صرف تدبر کے ذریعہ جانا جا سکتا ہے۔

۸. دسمبر ۱۹۸۴ کو بستی نظام الدین (دہلی) میں ایک نشست ہوئی۔ بستی کے تقریباً ایک درجن تعلیم یافتہ اصحاب شریک ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا کہ موجودہ زمانہ میں تجدید ملت اور احیائے اسلام کے کام کا آغاز کہاں سے ہو۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ اس کا آغاز دعوت الی اللہ سے ہونا چاہئے۔

۹. "مذہب اور جدید چیلنج" کے اڈیشن ۱۹۸۳ میں نمبر ۵ اور ۷ کے درمیان کے صفحات بے ترتیب ہو گئے ہیں۔ یہ اوراق دوبارہ چھپوائے گئے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس کتاب کے مذکورہ نسخے ہوں وہ مکتبہ الرسالہ کے نام خط لکھ کر یہ صفحات دوبارہ منگوا لیں۔ یا کتاب کو واپس کر کے اس کی جگہ نیا صحیح نسخہ حاصل کر لیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مستول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R N. No. 28822/76

January 1985
Number 98

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اوّل	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	15/-
پیغمبرِ انقلاب	25/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	3/-
اسلام دینِ فطرت	3/-
تعمیرِ ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیاتِ اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-
اتحادِ ملت	3/-

سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبرِ اسلام	3/-
آخری سفر	3/-
حقیقتِ حج	2/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-

تعارفی سٹ

سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیاتِ طیبہ	3/-
باغِ جنت	3/-
نارِ جہنم	3/-

English Publications

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

جو کچھ کھویا گیا ہے اس کو بھول جاؤ
تاکہ جو کچھ باقی ہے اس کو حاصل کرسکو

فروری ۱۹۸۵
شمارہ ۹۹

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان
اردو، انگریزی میں شائع ہوتا ہے

فروری ۱۹۸۵ء ☐ شمارہ ۹۹

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دوسو روپے
بیرونی ممالک سے :	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے
ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی
'AL-RISALA MONTHLY' لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ
سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عجیب غفلت

مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ - ۱۹۱۴) نے اپنے زمانہ میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا ــــ ندوۃ العلماء کیا کر رہا ہے " اس مضمون میں انھوں نے کلکتہ کے اخبار حبل المتین (۱۰ اگست ۱۹۰۶) کا ایک اقتباس درج کیا تھا۔ یہ اقتباس " تاریخ ندوۃ العلماء " حصہ اول میں نقل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی مرحوم نے مرتب کی تھی۔ مولانا شبلی کا اقتباس بعض ضروری اضافہ کے ساتھ حسب ذیل ہے:

" جس زمانہ میں روسی قوم بت پرست تھی، شہنشاہ روس ولادی میر (Vladimir) نے (مذاہب کی تحقیق کے لئے) ایک جلسہ طلب کیا تھا جس میں علماء اسلام کو بھی بلایا تھا۔ جو صاحب اس غرض کے لئے قازان سے تشریف لائے تھے انھوں نے اسلام کے تمام عقائد اور فلسفہ میں سے صرف یہ مسئلہ منتخب کر کے پیش کیا کہ (اسلام میں) سور کا گوشت کھانا بالکل حرام ہے۔ مورخین روس لکھتے ہیں کہ شہنشاہ روس ولادی میر (۹۵۶ - ۱۰۱۵) اسلام کی طرف مائل تھا اور چاہتا تھا کہ تمام قوم روس کے لئے مذہب اسلام کا انتخاب کر دے۔ لیکن قازانی عالم نے شریعت اسلام کے تمام احکام میں سے صرف اس مسئلہ کو پیش کر کے اس پر اس قدر زور دیا کہ شہنشاہ نے غصہ میں آکر ان کو نکلوا دیا اور عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ (روس کے) ۶ کرور آدمی عیسائی ہو گئے "

بظاہر یہ غفلت بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ غفلت بدستور آج بھی جاری ہے۔ قازان کے عالم کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے مدعو سے غیر حکیمانہ گفتگو کی جس کی وجہ سے وہ بدک گیا۔ آج کے مسلمانوں کی غلطی بھی یہی ہے کہ وہ اپنے مدعو گروہوں سے بے فائدہ مقابلہ آرائی جاری کئے ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے مخاطبین کے دل اسلام کے بارہ میں سخت ہو گئے ہیں۔

مسلمانوں کی ذمہ داری تھی کہ وہ خدا کے بندوں کو خدا کے دین کی طرف بلائیں۔ مگر اس کے برعکس وہ یہ کر رہے ہیں کہ اپنے لایعنی جھگڑوں سے لوگوں کو اسلام سے بدکائے ہوئے ہیں۔ یہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم ہے۔ دنیا کی قوموں کو دین حق سے قریب کرنا تو درکنار وہ دنیا کی قوموں کو دین حق سے دور کر رہے ہیں۔ اس جرم کے ساتھ مسلمان کبھی خدا کی مدد کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

حادثات کیوں

ٹرین جب پلیٹ فارم سے روانہ ہونے والی ہوتی ہے تو سیٹی دیتی ہے۔ اس سیٹی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ آگاہ ہو جائیں۔ اگر کچھ مسافر پلیٹ فارم پر ہوں تو وہ فوراً پہنچے ڈبہ میں آکر بیٹھ جائیں۔ تاہم اس سیٹی کو دو زاویے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر آپ محض آواز کے معنی میں لے کر اس کو شور (Noise pollution) کہیں تو وہ بالکل بے معنی معلوم ہوگی۔ لیکن اگر آپ اس کو الارم کہیں تو وہی چیز آپ کی نظر میں بالکل درست اور بامعنی بن جائے گی۔

یہی معاملہ فطرت کے حادثات کا ہے۔ فطرت کے حادثات کو دو زاویۂ نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ہماری زمین پر قحط، زلزلے، طوفان آتے ہیں اور دوسری قسم کی آفتیں پیش آتی ہیں۔ بعض فلسفیوں نے ان کو مطلق طور پر دیکھا تو ان کو ان واقعات میں کوئی معنویت نظر نہیں آئی۔ ان کو انھوں نے مسئلہ فساد (Problem of evil) کا نام دے دیا۔

مگر پیغمبران واقعات کو ایک اور زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ دوسرا زاویہ نصیحت اور عبرت کا زاویہ ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے میں اس قسم کے تمام واقعات فطرت کا الارم بن جاتے ہیں۔

پیغمبر کی تشریح کے مطابق یہ واقعات بڑی قیامت سے پہلے چھوٹی قیامت ہیں۔ وہ انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ وہ ایک بڑے سخت دن کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جب کہ خدا اپنی عظیم طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ تمام انسان مجبور اور بے بس حالت میں اس کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ اس دن آدمی بھاگنا چاہے گا مگر کوئی جگہ نہ ہوگی جہاں وہ بھاگ کر پناہ لے سکے۔ اس دن آدمی مدد کے لئے پکارے گا مگر وہاں کوئی نہ ہوگا جو اس کی مدد کے لئے دوڑے۔

یہ واقعات جو زیادہ بڑی شکل میں قیامت میں پیش آئیں گے وہی بہت چھوٹی شکل میں موجودہ دنیا میں پیش آتے ہیں۔ وہ قیامت سے پہلے قیامت کی یاددہانی ہیں۔ کل کے دن جو پردہ کامل طور پر پھاڑا جانے والا ہے اس کو آج ان حادثات کے ذریعہ جزئی طور پر پھاڑ دیا جاتا ہے۔

عقلمند انسان وہ ہے جو اس قسم کے واقعات کو فطرت کا الارم سمجھے نہ کہ فطرت کا بگاڑ۔ ان کو الارم کی نظر سے دیکھا جائے تو تواضع اور اصلاح کا جذبہ ابھرے گا۔ اور اگر ان کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ یہ نظام فطرت کی خرابی ہے تو اس سے ذہنی انتشار اور بغاوت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ پہلا ذہن آدمی کو جنت کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا ذہن جہنم کی طرف۔

عجز کی تلافی

خدا قادرِ مطلق ہے اور انسان عاجزِ مطلق۔ خدا اور انسان کے درمیان جو تقسیم ہے وہ زیادہ اختیار و کم اختیار کی نہیں ہے بلکہ اختیار اور بے اختیاری کی ہے۔ یہاں سارا اختیار خدا کی طرف ہے اور ساری بے اختیاری انسان کی طرف۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ایسی تخلیق کا کیا جواز ہے جس میں انسان کو حقیقی طور پر کچھ دیا ہی نہ گیا ہو۔ خدا کے لئے کیوں کر جائز تھا کہ وہ ایسے انسان پیدا کرے جو سراسر عاجز ہوں۔ جن کو نہ اپنے آپ پر کوئی اختیار حاصل ہو اور نہ اپنے سے باہر کی دنیا پر۔

اس سوال کا صحیح جواب صرف وہ ہو سکتا ہے جس میں انسان کے عجز کی کامل تلافی موجود ہو۔ کامل تلافی سے کم کوئی چیز اس سوال کا حقیقی جواب نہیں بن سکتی۔ کامل تلافی کا مطلب یہ ہے کہ جو جواب دیا جائے وہ اسی سطح پر ہو جو سوال کی سطح ہے۔ یعنی انسان کا عجز بذاتِ خود اس کی بے اختیاری کی تلافی ہو جائے۔

اس سوال کا جواب قرآن میں اور پیغمبر کی تعلیمات میں واضح طور پر موجود ہے۔ اور وہ خدا کی یہ رحمت خاص ہے کہ اس نے صرف مانگنے کو پانے کے لئے کافی بنا دیا ہے۔ آدمی اگر حقیقی طور پر خدا سے مانگنے والا بن جائے تو یقینی طور پر وہ اپنے لئے پانے والا بھی بن جائے گا۔ انسان جب ذاتی اقتدار کا مالک نہیں تو وہ دئے ہی سے پا سکتا ہے۔ چنانچہ خدا نے اس کو اپنی طرف سے دے دیا۔ حقیقی دعا کے لئے قبولیت کی ضمانت ہونا یہی گویا اس کو دے دینا ہے۔

حدیث میں یہی بات ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ الدعوۃ لا ترد۔ یعنی بندہ اپنے خدا کو اگر حقیقی طور پر پکارے تو اس کی پکار کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ حضرت مسیح نے اسی بات کو ان لفظوں میں فرمایا:

مانگو تو تم کو دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔ کیوں کہ جو کوئی مانگتا ہے اسے ملتا ہے اور جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے۔ اور جو کھٹکھٹاتا ہے اس کے واسطے کھولا جائے گا۔ تم میں ایسا کون سا آدمی ہے کہ اگر اس کا بیٹا اس سے روٹی مانگے تو وہ اسے پتھر دے۔ یا اگر مچھلی مانگے تو اسے سانپ دے دے۔ پس جب کہ تم برے ہو کر اپنے بچوں کو اچھی چیزیں دینا جانتے ہو تو تمہارا باپ جو آسمان پر ہے اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دے گا۔

(متی ۷ : ۷ — ۱۱)

محرومی نہیں

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا کیس احساس مظلومی (Persecution complex) کا کیس بن گیا ہے۔ تقریباً ساری دنیا کے مسلمانوں پر کسی نہ کسی قسم کی محرومی کا احساس چھایا ہوا ہے۔ ان کو یہ شکایت ہے کہ دوسری قومیں ان پر ظلم کر رہی ہیں۔ دوسری قومیں ان سے ان کی چیزیں چھینے ہوئے ہیں۔

وہ کیا چیزیں ہیں جو دوسری قومیں مسلمانوں سے چھینے ہوئے ہیں۔ وہ ہیں — سیاسی اقتدار، سرکاری ملازمتیں، معاشی وسائل، سماجی ادارے، مادی مفادات۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کے متعلق مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ غیر مسلم اقوام نے ان سے انھیں محروم کر رکھا ہے۔

اگرچہ یہ "محرومی" سراسر مسلمانوں کی اپنی غفلت کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں سے حقیقۃً چھینا نہیں گیا ہے بلکہ مسلمانوں نے خود کھویا ہے۔ گویا یہ اپنی نااہلی کا کیس ہے نہ کہ دوسروں کے ظلم کا۔ تاہم اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ایک چیز کھونے کے بعد بھی انھیں دوسری چیز حاصل ہے۔ انھوں نے "دنیا" کھوئی ہے۔ مگر "دین" اب بھی ان کے پاس پوری طرح موجود ہے۔ خدا کی آخری کتاب ان کے پاس ہے۔ خدا کا دین محفوظ حالت میں ان کے یہاں موجود ہے۔ وہ ایک ایسے زندہ رسول کے وارث ہیں جس کی نبوت ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ یہ جو چیز انھیں حاصل ہے یہ زیادہ بڑی چیز ہے۔ پھر کیسی عجیب بات ہے کہ چھوٹی چیز کے کھوئے جانے کا تو وہ غم کریں اور جو بڑی چیز اب بھی حاصل ہے اس کا انھیں کوئی احساس نہ ہو۔

ہمارے نزدیک دنیوی ترقی کا دروازہ بھی مسلمانوں پر بند نہیں۔ تاہم عام ذہن کے مطابق اگر یہ مان لیا جائے کہ ان پر دنیوی ترقی کے دروازے بند ہیں تب بھی عین اسی وقت آخرت کی ترقی کے دروازے ان پر کھلے ہوئے ہیں جو یقیناً زیادہ بہتر ہے اور ابدی بھی۔ پھر کیسے عجیب ہوں گے وہ لوگ کہ چھوٹی چیز کی محرومی انھیں تڑپائے مگر بڑی چیز کا حاصل رہنا ان کے اندر کوئی جوش پیدا نہ کرے۔

بندوں سے اگر مسلمانوں کو نہیں مل رہا ہے تو خدا سے ملنے کے دروازے ان کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ خدا کے کام میں مشغول ہو کر خدا سے وہ سب کچھ مزید اضافہ کے ساتھ پالیں جس کو وہ بندوں سے نہ پا سکے اور نہ کبھی وہ ان سے پا سکتے۔

عجیب یادگار

مسز اندرا گاندھی پہلی بار ۱۹۶۶ میں ہندستان کی وزیر اعظم بنیں۔ اس وقت ان کی سرکاری رہائش گاہ کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ صفدر جنگ روڈ (نئی دہلی) کے دو مکانات کو ملا کر ایک بڑا مکان بنا یا گیا۔ یہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کی سرکاری رہائش گاہ تھی۔ اس رہائش گاہ میں اور اس کے آس پاس بہت دور تک وزیر اعظم کی حفاظت کے لئے انتہائی غیر معمولی حفاظتی انتظامات کئے گئے تھے۔ مگر ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کو مسز گاندھی کا خاتمہ سادہ طور پر اس طرح ہوا کہ مسز گاندھی کے حفاظتی دستہ کے دو آدمیوں (بینت سنگھ اور ستونت سنگھ) نے انھیں اسی ہتھیار کا نشانہ بنا کر ختم کر دیا جو وزیر اعظم کی جان کی حفاظت کے لئے انھیں خصوصی طور پر مہیا کئے گئے تھے۔

صفدر جنگ روڈ کے اس مکان کو اب مسز اندرا گاندھی کی یادگار میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت کے منصوبہ کو بتاتے ہوئے اخباری رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۱۰ نومبر ۱۹۸۴) میں یہ الفاظ درج تھے:

> --- that the house should be maintained people could come and pay their tributes to the memory of the most powerful woman in the world who died a martyr.

حکومت کا خیال ہے کہ اس گھر کو ایک ایسے مقام کی حیثیت سے باقی رکھا جانا چاہئے جہاں لوگ آئیں اور اس خاتون کو خراج عقیدت پیش کریں جو دنیا کی سب سے زیادہ طاقت ور خاتون تھیں اور یہاں ایک شہید کی حیثیت سے مریں۔

مسز اندرا گاندھی کی زندگی کے دو رخ ہیں۔ ایک ان کا ہندستان کا وزیر اعظم ہونا۔ دوسرا ان کا بے یار و مددگار انسان کی حیثیت سے مارا جانا۔ دونوں کو ملا کر دیکھئے تو مسز اندرا گاندھی کی زندگی انسان کے کمال عجز کی داستان سنا رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ایک وزیر اعظم بھی اتنا ہی کمزور ہے جتنا ایک معمولی انسان۔ مگر جن لوگوں نے مسز گاندھی کے پہلے رخ کو ان کے دوسرے رخ سے الگ کر کے دیکھا ان کے لئے یہ واقعہ بالکل الٹے مفہوم کا حامل بن گیا۔

کیسی عجیب بات ہے۔ جو واقعہ انسانی عجز کا سبق دے رہا ہے، اس سے نادان لوگ انسانی کبریائی کا سبق لے رہے ہیں۔ جو واقعہ انسان کے بے طاقت ہونے کا ثبوت ہے اس کو اس بات کی یادگار بنایا جا رہا ہے کہ انسان کس قدر طاقت ور ہے۔

آگ سے بچاؤ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
من استطاع ان یقی وجهه من النار ولو بشقة من تمر فلیفعل. ومن لم یجد فبکلمة طیبة فان بها تجزی الحسنة عشر امثالها

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص اپنے چہرہ کو آگ سے بچا سکے تو اس کو چاہئے کہ وہ ایسا کرے خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو۔ اور جو شخص یہ بھی نہ پائے تو وہ ایک پاکیزہ بول کے ذریعہ اپنے آپ کو آگ سے بچائے۔ کیوں کہ انسان کے عمل کا خدا کے یہاں دس گنا بدلہ دیا جاتا ہے

اس کا مطلب یہ نہیں کہ کھجور کا ٹکڑا یا پاکیزہ بول بذات خود جہنم کی آگ سے بچنے کا سرٹیفکیٹ ہے۔ خدا کے یہاں جو قیمت ہے وہ دراصل اس بے قراری کی ہے جس کے تحت مذکورہ قسم کے اعمال کسی بندہ خدا سے صادر ہوتے ہیں۔

خدا انسان کی اس بے قراری کو دیکھنا چاہتا ہے جب کہ وہ جہنم کے عذاب کو سوچ کر تڑپ اٹھے اور اس سے بچنے کے لئے جو کچھ اس کے بس میں ہے اسے کر ڈالے۔ آدمی کے سامنے ایک ضرورت مند آتا ہے اور اس سے سوال کرتا ہے۔ آدمی کو اس کی بے بسی دیکھ کر آخرت میں اپنی بے بسی یاد آجاتی ہے۔ شدت احساس سے اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپک پڑتے ہیں۔ وہ اپنی جیب کے چند پیسے یہ کہتے ہوئے سائل کو دے دیتا ہے کہ خدایا میرے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ تو اسی حقیر انفاق کو میرے لئے قبول کرلے اور مجھ کو آخرت کے عذاب سے نجات دے دے۔

اسی طرح ایک اور شخص ہے جس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جو وہ اپنے بھائی کو دے۔ مگر جب بھی موقع آتا ہے وہ دوسرے کے حق میں خیر خواہی کا کلمہ بولتا ہے۔ اس کی زبان سے نہ گھمنڈ کے الفاظ نکلتے اور نہ حسد کے الفاظ۔ اس کا کلام اللہ کے ڈر سے نہایا ہوا ہوتا ہے۔ ہر موقع پر وہ وہی کہتا ہے جو عدل وانصاف کا تقاضا ہو۔ ایسا انسان بھی دوسروں کو کچھ دے رہا ہے۔ اس سے اس کے بھائیوں کو بہتر جذبات مل رہے ہیں۔ وہ لوگوں کو اپنے شر سے بچائے ہوئے ہے۔ ایسا شخص بھی ان لوگوں میں ہے جس کے لئے آخرت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

قرآن سے تعلق

امام شافعی (۲۰۴ - ۱۵۰ھ) کو اصول فقہ کا موسس کہا جاتا ہے۔ علم و فضل کے علاوہ دینداری اور تقویٰ میں بھی وہ ممتاز مقام رکھتے تھے۔ امام احمد بن حنبل کا قول ان کے بارہ میں ہے کہ ـــــ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس کی نسبت اسلام سے اس درجہ قوی ہو جتنی اپنے زمانہ میں امام شافعی کی تھی۔

امام شافعی کی عمر ابھی دس سال سے بھی کم تھی کہ انھوں نے قرآن کا حفظ مکمل کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر تین دن میں قرآن کی ایک تلاوت مکمل کر لیتے تھے۔ ان کو قرآن سے بہت تعلق تھا۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ ہر مسئلہ کی اصل قرآن سے معلوم ہو جائے۔

تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ امت کا اجماع دین میں حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ امام شافعی کو یہ تلاش ہوئی کہ اجماع کے حجت ہونے کی دلیل قرآن سے معلوم کریں۔ چنانچہ انھوں نے یہ کیا کہ قرآن کو بار بار پڑھتے اور کوئی ایسی آیت تلاش کرتے جس سے اجماع کا حجت ہونا ثابت ہو سکے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کوشش میں امام موصوف نے ۳۰۱ بار پورے قرآن کو پڑھ ڈالا۔ بالآخر انھوں نے اجماع کے حجت ہونے کی دلیل قرآن سے معلوم کر لی۔ ایک روز وہ تلاوت کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۵ پر پہنچے تو اچانک ان پر منکشف ہوا کہ اس آیت میں اجماع کے حجت ہونے کی شرعی دلیل موجود ہے۔ وہ آیت یہ ہے :

ومن یشاقق الرسول من بعد ماتبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المومنین نوله ماتولیٰ ونصله جهنم وساءت مصیرا	اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس پر حق ظاہر ہو چکا اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ چلا تو جو کچھ وہ کرتا ہے اس کو ہم کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

امام شافعی نے اس آیت کو پڑھ کر کہا کہ یہاں سبیل المومنین سے وہی چیز مراد ہے جس کو ہم اجماع امت کہتے ہیں۔

دور اول کے اہل ایمان کا حال یہ تھا کہ وہ ہر مسئلہ کو قرآن سے معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ خواہ اس کی خاطر انھیں سینکڑوں بار پورا قرآن پڑھنا پڑے۔ ان کو اس وقت تک چین نہیں آتا تھا جب تک وہ کسی چیز کے بارہ میں قرآن کا حکم دریافت نہ کر لیں۔ مگر اب لوگوں کا حال یہ ہے کہ قرآن کا استعمال ان کے یہاں یا تو برکت کے لئے ہوتا ہے یا صرف تلاوت کے لئے۔

فطرت کی تلاش

ایک آدمی جس کے پاس دولت اور اقتدار ہو اس کے گرد پر رونق سازوسامان جمع رہتے ہیں۔ باہر سے دیکھنے والوں کو وہ اپنے سے مختلف بڑی چیز دکھائی دیتا ہے مگر خود اس شخص کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے۔ وہ جب اپنی تنہائیوں میں جاتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی ویسا ہی ایک کمزور انسان ہے جیسا کہ دوسرے انسان۔

امریکہ کی مشہور فورڈ کمپنی کے موجودہ وارث مسٹر الفرڈ فورڈ (۳۴) بے پناہ دولت کے مالک ہیں۔ مگر ان کی روح کو تی اور چیز پانے کے لئے بے چین تھی۔ اس دوران ان کا تعارف ہرے کرشنا مومنٹ سے ہوا جس کے مراکز امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں موجود ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کی روح یہاں تسکین پا سکتی ہے۔ وہ اس میں شریک ہو گئے۔ مسٹر فورڈ نے ۲۷ دسمبر ۱۹۸۴ کو کرشنا مومنٹ کی ہندو لڑکی شرمیلا بھٹاچاریہ (۲۹) سے شادی کر لی۔ شادی کی یہ رسم ہرے کرشنا مومنٹ کے آسٹریلیا کے ایک مرکز میں انجام پائی۔ ٹائمس آف انڈیا (یکم جنوری ۱۹۸۵) کی ایک تصویر میں مسٹر فورڈ سادھوؤں جیسے بغیر سلے ہوئے کپڑے میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ اے پی کے نامہ نگار نے اس سلسلہ میں جو رپورٹ دی ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے:

> Mr. Alfred Ford said he was only a Ford by name. "I'm not a car. I'm a spiritual soul, just like anyone else," he said.

مسٹر فورڈ نے کہا کہ وہ بس نام کے اعتبار سے فورڈ ہیں۔ "میں ایک کار نہیں ہوں۔ میں ایک روحانی وجود ہوں ویسے ہی جیسے کہ کوئی دوسرا شخص (ہندستان ٹائمس ۲۸ دسمبر ۱۹۸۴)

کسی آدمی کو دولت اور اقتدار کی خواہ کتنی ہی بڑی مقدار حاصل ہو جائے۔ وہ اس کی ہستی کا جزء نہیں بنتی۔ سازوسامان کے ہجوم میں وہ اپنے آپ کو اکیلا اور بے سہارا محسوس کرتا ہے۔ اس کے باوجود وہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں رہتا ہے جو اس کی ہستی میں شامل ہو جائے۔ جس کو وہ اپنے داخلی وجود کی سطح پر اپنا بنا سکے۔ اس تلاش کا جواب صرف وہ کامل اور برتر خدا ہے جو انسان کا خالق اور مالک ہے۔ مگر انسان جب حقیقی خدا کو نہیں پاتا تو وہ غیر خدا میں مشغول ہو جاتا ہے تاکہ وہ مصنوعی طور پر اپنے اس مطلوب کو حاصل کر سکے جس کو وہ حقیقی طور پر نہ پا سکا۔

ہوشیار رہئے

حضرت عمر فاروق کی خلافت کے زمانہ میں ۲۰ھ میں مصر فتح ہوا۔ چار ہزار کے جس لشکر نے مصر کو فتح کیا اس کے سردار اعلیٰ حضرت عمرو بن العاص تھے۔

فتح مصر کے سلسلے میں جو واقعات تاریخ کی کتابوں میں آئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے فتح کے بعد مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ نصیحتیں کیں۔ ان میں سے ایک نصیحت یہ تھی:

انتم فی رباط دائم   تمھیں ہر وقت تیار رہنا ہے

حضرت عمرو بن العاص نے بظاہر یہ بات اس وقت کے سیاسی حالات کے پس منظر میں کہی تھی۔ اس وقت کی رومی اور ایرانی حکومتیں ابھی اپنی شکست کو ہضم نہیں کرسکی تھیں۔ ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ وہ کوئی موقع پاکر مسلم علاقہ پر چڑھائی کردیں اور مسلمانوں کی فتح کو دوبارہ شکست میں تبدیل کردیں۔

تاہم یہ نصیحت صرف وقتی نہیں۔ اس میں زندگی کی ایک ابدی حقیقت بیان ہوگئی ہے۔ وہ یہ کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہاں جس طرح نیکوں کو عمل کرنے کا موقع ہے اسی طرح برے انسانوں کی رسی بھی دراز ہے۔ یہاں جس طرح فرشتے آزاد ہیں اسی طرح شیطان کو بھی یہاں پوری آزادی حاصل ہے۔ اس لئے مومن کو ہر وقت اپنے کو دشمن کے محاذ پر محسوس کرنا چاہئے۔

مومن کو ہر وقت اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہئے تاکہ اس کا نفس شرارت نہ کرسکے۔ اس کو ہر وقت شیطان کی راہوں کو دیکھتے رہنا ہے کہ وہ کسی طرف سے اس کے اندر گھس نہ آئے۔ اس کو خدا کے دشمنوں سے ہر آن چوکنا رہنا ہے کہ وہ اس کی کسی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اسے مغلوب نہ کرلیں۔

دنیا میں آدمی کو چوکیدار کی زندگی گزارنی ہے۔ اپنی چوکیداری بھی اور خدا کے دین کی چوکیداری بھی۔ اس کا بدلہ اس کو آخرت میں یہ ملے گا کہ وہاں ہر قسم کے غم اور اندیشہ سے آزاد ہو کر وہ جنت کے باغوں میں داخل کردیا جائے گا۔ تاکہ ابدی طور پر عیش وراحت کی زندگی گزارتا رہے۔

خدا کی دنیا میں

ایک نومسلم انگریز نے اپنے حالات بیان کرتے ہوئے کہا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے ۱۹۷۴ میں حج کا فریضہ ادا کیا یہ سفر میں نے اپنے وطن انگلینڈ سے بذریعہ موٹر کار کیا تھا۔

دسمبر ۱۹۷۳ کی کوئی تاریخ تھی۔ میں اپنی گاڑی چلاتا ہوا سوئزرلینڈ پہنچا۔ وہاں زیورک میں میری بہن تھی جس سے مجھے ملنا تھا۔ انگلینڈ میں بائیں چلو (Keep left) کا اصول ہے اور سوئزرلینڈ میں دائیں چلو (Keep right) کا اصول۔ میں جب زیورک میں داخل ہوا تو مجھے یاد نہ رہا کہ یہاں مجھ کو اپنی گاڑی سڑک کے دائیں طرف چلانا چاہئے۔ سابقہ عادت کے مطابق میں سڑک کے بائیں طرف اپنی گاڑی دوڑانے لگا۔

جلد ہی ایک مقام پر ٹریفک کانسٹبل نے وسیل دے کر مجھے روکا جب میں رکا تو وہ میرے قریب آیا۔ اس نے میری گاڑی کی پلیٹ دیکھی۔ میرا حلیہ دیکھا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ یہ انگلش آدمی ہے اور انگلش ہونے کی وجہ سے بائیں طرف گاڑی دوڑا رہا ہے۔ اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا جناب، اس وقت آپ انگلینڈ میں نہیں ہیں:

(Sir, you are not in England now)

یہ واقعہ بظاہر ایک ٹریفک کا واقعہ ہے۔ مگر اس میں آخرت کا ایک بہت بڑا سبق چھپا ہوا ہے۔ موجودہ دنیا جس میں ہم ہیں وہ خدا کی دنیا ہے۔ مگر انسان اکثر اوقات اس کو اپنی دنیا سمجھ لیتا ہے۔ وہ خدا کی مرضی کی پیروی کرنے کے بجائے اپنی مرضی اور خواہش کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔

جس طرح سڑک کے کنارے ٹریفک کانسٹبل کھڑا ہوا لوگوں کو بتاتا ہے کہ "تم اپنے ملک میں نہیں ہو بلکہ دوسرے کے ملک میں ہو" اسی طرح خدا کے پیغمبر لوگوں کو یہ وارننگ دے رہے ہیں کہ "تم انسان کی دنیا میں نہیں ہو بلکہ خدا کی دنیا میں ہو"۔ کامیاب انسان وہ ہے جو اس وارننگ پر دھیان دے۔ وہ خود سری کو چھوڑ دے اور خدا کی دنیا میں خدا کے حکم کا پابند بن کر رہے۔ اس کے برعکس ناکام انسان وہ ہے جو خدا کو بھول جائے اور خدا کی دنیا میں اپنی خواہش کے رخ پر دوڑنے لگے۔

دنیا میں ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی کا انجام فوراً سامنے آجاتا ہے۔ اس لئے آدمی یہاں ٹریفک کانسٹبل کی وارننگ پاتے ہی اپنے کو درست کر لیتا ہے۔ مگر خدا کے قانون کی خلاف ورزی کا انجام آخرت میں سامنے آئے گا اس لئے اس معاملہ میں وہ وارننگ سن کر بھی اس کی پروا نہیں کرتا مگر اس سے بڑی بھول اور کوئی نہیں۔

سارا خون

پروفیسر پال ڈیراک (Paul Dirac) ۱۹۰۲ میں پیدا ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۸۴ میں انھوں نے ۸۲ سال کی عمر میں فلوریڈا میں وفات پائی۔ وہ جدید دور میں نیوٹن اور آئن شائن کے بعد سب سے زیادہ ممتاز سائنس داں سمجھے جاتے ہیں۔ ان کو نوبل انعام اور دوسرے بہت سے اعزازات حاصل ہوئے۔

پال ڈیراک کے نام کے ساتھ کوانٹم میکانیکل تھیوری منسوب ہے۔ یہ سائنسی نظریہ ایٹم کے انتہائی چھوٹے ذرات سے بحث کرتا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اینٹی میٹر کی پیشین گوئی کی جو بعد کو مزید تحقیقات سے ثابت ہو گیا۔ چنانچہ گارڈین (۴ نومبر ۱۹۸۴) نے پال ڈیراک پر مضمون شائع کرتے ہوئے اس کی سرخی حسب ذیل الفاظ میں قائم کی ہے:

Prophet Of the Anti-Universe

پال ڈیراک نے ایٹم میں پہلا اینٹی پارٹیکل دریافت کیا جس کو پازیٹران (Positron) کہا جاتا ہے۔ اس دریافت نے نیوکلیر فزکس میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ لوگ جب پال ڈیراک سے پوچھتے کہ آپ نے تحت ایٹم مادہ کی نوعیت کے بارہ میں اپنا چونکا دینے والا نظریہ کیسے دریافت کیا تو وہ بتاتے کہ وہ اپنے مطالعہ کے کمرہ میں اس طرح فرش پر لیٹ جاتے تھے کہ ان کا پاؤں اوپر رہتا تاکہ خون ان کے دماغ کی طرف دوڑے:

When people asked him how he got his startling ideas about the nature of sub-atomic matter, he would patiently explain that he did so lying on his study floor with his feet up so that the blood ran to his head.

بظاہر یہ ایک لطیفہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کوئی بڑا فکری کام وہی شخص کر پاتا ہے جو اپنے سارے جسم کا خون اپنے دماغ میں سمیٹ دے۔

بیشتر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوت کو تقسیم کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک مرکز پر یکسو نہیں کرتے اسی لئے وہ ادھوری زندگی گزار کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ ہر کام آدمی سے اس کی پوری قوت مانگتا ہے۔ وہی شخص بڑی کامیابی حاصل کرتا ہے جو اپنی پوری قوت کو ایک کام میں لگا دے۔

جمہوریت کی قیمت

اسرائیل کا ایک دلچسپ واقعہ نظر سے گزرا۔ اس کے اصل الفاظ یہ تھے:

Worn out after an interminable meeting, a Tel Aviv company director said with a sigh, "If the children of Israel had been led by a committee instead of by Moses, they'd still be in Egypt."

تل ابیب کی ایک کمپنی کا ڈائرکٹر لا تناہی میٹنگوں سے سخت اکتا چکا تھا۔ اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا کہ اگر بنی اسرائیل کی رہنمائی حضرت موسیٰ کے بجائے ایک کمیٹی کر رہی ہوتی تو بنی اسرائیل ابھی تک مصر ہی میں ہوتے (ریڈرز ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۸۴)

مجلس اور کمیٹی کی بحثوں کا جن لوگوں کو تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں کس قدر بے فائدہ باتیں ہوتی ہیں۔ لفظی نکتے، دور از کار امکانات، غیر اہم پیش بندیوں پر لوگ اس قدر بحثیں کرتے ہیں کہ الاماں والحفیظ۔ راقم الحروف اس دنیا میں جن چیزوں سے پناہ مانگتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ خدا اس کو کبھی کسی مجلس یا کمیٹی کا ممبر نہ بنائے۔

کوئی بڑا کام اجتماعی کوشش سے ہوتا ہے۔ اور اجتماعی کوشش میں ہمیشہ بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی صورت کیا ہو۔ اختلاف رائے کو اتحاد عمل کے ساتھ کس طرح مطابق کیا جائے۔

اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک شخصی اعتماد اور دوسری جمہوریت۔ اول الذکر میں یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنی اپنی رائے دیتے ہیں مگر بالآخر مرکزی قائد کی رائے کو تمام لوگ بلا بحث مان لیتے ہیں۔ ثانی الذکر میں یہ ہوتا ہے کہ جو معاملہ پیش آتا ہے اس پر ہر شخص کی الگ الگ رائے لی جاتی ہے اور جس طرف رایوں کی کثرت ہوتی ہے اس کو اختیار کر لیا جاتا ہے۔

بظاہر ثانی الذکر طریقہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس طریقہ میں کام کم ہوتا ہے اور بحث مباحثہ زیادہ۔ اسلام میں درمیان کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ ابتدائی مرکزی قائد کو منتخب کرنے میں عوامی رائے کا پورا لحاظ کیا جاتا ہے مگر جب عوامی رائے سے ایک امیر کا انتخاب ہو جائے تو اس کو اسی طرح مکمل اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں جیسے موجودہ زمانہ میں امریکہ کے صدر کو۔

انسان کی تلاش

فلپ جان بائر (Philip John Bayer) امریکہ کا ایک بڑا تاجر تھا۔ وہ کویکر اسٹیٹ ریفائننگ کمپنی (Quaker State Refining Co.) کا بانی تھا۔ اس کے یہاں صرف ایک لڑکا تھا۔ لڑکا مرا تو اس نے بھی صرف ایک لڑکی چھوڑی جس کا نام الینر رٹشی (Eleanor Ritchey) تھا۔

الینر رٹشی کے پاس بے پناہ دولت تھی مگر وہ انسانوں سے اس قدر متنفر تھی کہ اس نے شادی نہیں کی اور تمام عمر اکیلی رہی۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۸ کو اس کا انتقال ہوا تو اس کی عمر ۵۸ سال تھی۔ انسانوں سے بے رغبت ہو کر اس نے اپنی دل چسپی کے لئے عجیب وغریب عادتیں بنا رکھی تھیں۔ مثلاً وہ کثرت سے جوتے خریدتی۔ مگر ہر جوتے کو وہ صرف ایک بار پہنتی تھی۔ چنانچہ اس کی موت کے بعد اس کے گھر میں ۱۰۷۰ جوڑے جوتے موجود تھے۔ اسی طرح اس کے گھر میں اسٹیشنری کے ۲۲۴۱ بکس پائے گئے۔ وغیرہ

اس کی سب سے عجیب دل چسپی کتے تھے۔ وہ جب اپنی کار سے باہر نکلتی اور کوئی آوارہ کتا اس کو نظر آتا تو وہ پکڑوا کر اس کو اپنے گھر لاتی اور ان کو خصوصی اہتمام سے پالتی۔ اس طرح اس کے یہاں ۱۵۰ کتے جمع ہو گئے۔ اس کا گھر کتوں کی اس فوج کے لئے ناکافی معلوم ہوا تو اس نے اولاً بارہ ایکڑ اور اس کے بعد ۱۸۰ ایکڑ زمین صرف اس لئے خریدی کہ وہاں کتوں کو خصوصی اہتمام کے ساتھ رکھنے کا انتظام کیا جا سکے۔

الینر رٹشی نے اپنی موت سے پہلے ایک وصیت نامہ تیار کرایا۔ اس وصیت میں اس نے لکھا کہ میری دولت میرے پالتو کتوں کے لئے وقف ہے۔ جب ایک ایک کرکے تمام کتے مر جائیں تو میری پوری دولت الباما (امریکہ) کے مدرسہ حیوانات (School of Veterinary Science) کو دے دی جائے۔

اب اس کے کتوں میں صرف آخری کتا رہ گیا ہے جس کا نام مسکٹیر (Musketeer) ہے۔ یہ تیرہ سالہ کتا اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ جب وہ چلتا ہے تو اس کا پاؤں کانپتا ہے اور جب وہ چھینکتا ہے تو زمین میں گر پڑتا ہے۔ یقینی طور پر وہ بہت جلد مر جائے گا اس کے بعد مذکورہ مدرسہ حیوانات کو بارہ ملین ڈالر کی رقم اچانک حاصل ہو جائے گی (ٹائمس آف انڈیا ۲ جنوری ۱۹۸۴)

آدمی کو اگر آئیڈیل انسان نہ ملے تو اس کو آئیڈیل نظریہ تلاش کرنا چاہئے۔ الینر رٹشی اگر ایسا نظریہ پالیتی تو انسان اس کے لئے محبت کا موضوع بن جاتا نہ کہ مجبت کا موضوع۔

حج کا پیغام

کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کو اس میں تردد تھا کہ اسلامی عبادتوں میں کون سی عبادت افضل عبادت ہے۔ جب انھوں نے حج ادا کیا تو اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اب مجھے یقین ہوگیا کہ حج تمام عبادتوں میں سب سے افضل عبادت ہے۔

حج کی اس فضیلت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ حج کا تعلق ایک عظیم خدائی منصوبہ سے ہے۔ حج ایک پیسے خدائی منصوبہ کی یادگار ہے جس کا آغاز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کی آخری تکمیل ہوئی۔

حج کے مختلف مناسک اسی خدائی منصوبہ کے مختلف مراحل ہیں جن کو حاجی علامتی طور پر دہراتا ہے۔ حاجی اپنے گھر سے نکل کر حجاز کے لئے روانہ ہوتا ہے جس طرح حضرت ابراہیم عراق سے نکل کر حجاز آئے۔ وہ مکہ کے قریب پہنچ کر سلے ہوئے کپڑے اتار دیتا ہے اور اپنے جسم پر دو چادریں لپیٹ لیتا ہے۔ یہ اسی قسم کی سادہ پوشاک ہے جو اس زمانہ میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی ہوتی تھی۔ حاجی مکہ پہنچتا ہے تو کعبہ کے گرد گھوم کر اس کا چکر لگاتا ہے۔ یہ وہی طواف ہے جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے عہد خداوندی کی توثیق کے لئے کیا تھا۔ حاجی صفا و مروہ کے درمیان سات بار سعی کرتا ہے۔ یہ حضرت ہاجرہ کی اس دوڑ کی نقل ہے جو انھوں نے اس بیابان میں پانی کی تلاش کے لئے کی۔ حاجی منی جا کر قربانی کرتا ہے، یہ اس قربانی کا علامتی اعادہ ہے جو حضرت ابراہیم نے اولاً بیٹے کے لئے اور اس کے بعد خدا کے حکم سے مینڈھے کے لئے کی تھی۔ حاجی جمرات پر جا کر شیطان کو کنکریاں مارتا ہے۔ یہ اس عمل کی یادگار ہے جو حضرت اسماعیل نے شیطان کی طرف کنکریاں مار کر کیا تھا۔ جب کہ اس نے انھیں بہکانے کی کوشش کی۔ پھر تمام حاجی عرفات کے میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ یہ اس عمل کی آخری صورت ہے جو لبیک اللھم لبیک کی صورت میں ہر حاجی کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ یہاں تمام حاجی کھلے میدان میں جمع ہو کر اپنے خدا سے اجتماعی عہد کرتے ہیں کہ وہ وہی کریں گے جس کا سبق انھیں حج کی صورت میں دیا گیا ہے۔ وہ اسی میں جئیں گے جس میں وہ لوگ جئے جن کی یادگار ربیں حج کی عبادت ادا کی جاتی ہے۔

حج کے مناسک کو قرآن میں شعائر کہا گیا ہے یعنی علامتی چیزیں۔ یہ سب دراصل حضرت ابراہیم اور ان کے خاندان پر گزرنے والے واقعات ہیں جو مذکورہ منصوبہ الٰہی کی تکمیل کے دوران پیش

آئے۔ ان واقعات کو حاجی علامتی طور پر دہراتا ہے اور اس طرح یہ عہد کرتا ہے کہ وہ بھی اسی تاریخ کا جزء بنے گا۔

حاجی گویا یہ عہد کرتا ہے کہ اگر ضرورت پیش آئی تو وہ اپنی دنیا کو اجاڑ کر حق کی طرف بڑھے گا۔ وہ آرام و راحت کو چھوڑ کر قناعت اور سادگی پر اپنے آپ کو راضی کرے گا۔ وہ خدا کے لئے دوڑے گا اور خدا کے گرد گھومے گا۔ وہ شیطانی بہکاؤں کو پتھر مار کر اپنے سے دور بھگائے گا۔ خدا کا دین اس کو جہاں لے جائے وہاں وہ جائے گا۔ اور جس چیز کا تقاضا کرے گا اس کو وہ اس کے حوالے کر دے گا۔ وہ عمل کی زبان میں خدا سے کہتا ہے کہ اگر دوبارہ دین کے لئے ضرورت پیش آئی تو وہ اس آخری حد تک جانے کے لئے تیار ہے کہ اپنی اولاد کو ذبح کر کے دین کی ضرورت پوری کرے۔

حضرت ابراہیم کا عراق سے چل کر مکہ آنا اور یہاں مذکورہ واقعات کا پیش آنا ایک عظیم خدائی منصوبہ تھا جو ڈھائی ہزار سال میں بروئے کار لایا گیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اب سے پانچ ہزار سال پہلے انسانی ذہنوں پر شرک کا اتنا غلبہ ہوگیا تھا کہ زندگی کا کوئی شعبہ شرک سے خالی نہ تھا۔ یہ صورت حال نسل در نسل جاری رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی نسلوں میں شرک کا تسلسل قائم ہوگیا۔ اس زمانہ کی آبادیوں میں جو شخص بھی پیدا ہوتا وہ شرک کا ذہن لے کر پیدا ہوتا اور اسی پر اس کی پوری اٹھان ہوتی۔ اس بنا پر پیغمبروں کی توحید کی دعوت کسی طرح لوگوں کو اپیل نہیں کرتی تھی۔

اب خدا نے یہ منصوبہ بنایا کہ انسانوں کی ایک ایسی نسل تیار کی جائے جو مشرکانہ ماحول سے الگ ہو کر پرورش پائے تاکہ وہ مشرکانہ تسلسل سے آزاد ہو کر سوچ سکے۔ اس کے لئے شہری آبادیوں سے دور ایک غیر آباد مقام ہی مناسب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے عرب کے خشک علاقہ کا انتخاب کیا گیا جو اس زمانہ میں آباد دنیا سے الگ تھلگ بالکل غیر آباد حالت میں پڑا ہوا تھا۔

اب اس بے آب و گیاہ علاقہ میں ایک نئی نسل تیار کرنے کے لئے وہ پہلا انسان درکار تھا جو موت کی قیمت پر وہاں بسنے کے لئے تیار ہو۔ اس نازک موقع پر حضرت ابراہیم کو خواب دکھایا گیا کہ آپ اپنے نوجوان بیٹے اسماعیل کو ذبح کر رہے ہیں۔ یہ جسمانی ذبح حقیقۃً صحرائی ذبح کی تمثیل تھی۔ اس کے ذریعہ یہ دیکھنا مقصود تھا کہ کیا ابراہیم اس کے لئے تیار ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خدائی منصوبہ میں اس طرح شامل کریں کہ اپنی محبوب اولاد کو لے جا کر حجاز میں بسا دیں جہاں خشک پہاڑوں اور ریتیلے صحراؤں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس زمانہ میں حجاز میں بسنا موت کی وادی میں بسنے کے ہم معنی تھا۔

قدیم زمانہ میں حجاز اسی لئے غیر آباد پڑا رہا کہ وہاں پانی اور سبزہ نہ تھا۔ قدیم حجاز کا مشرکانہ تمدن

سے پاک رہنا اسی لئے ممکن ہوا کہ وہ زندگی کے سامان سے خالی تھا۔ قدیم حجاز کی وہ خصوصیت جس نے اس کو مشرک انسانوں سے خالی رکھا تھا، اسی نے اس کو اس قابل بنا دیا کہ وہاں موحدین کی ایک نئی نسل تیار کی جائے۔ حضرت ابراہیم کا اپنے نوجوان بیٹے (اسماعیل) کے گلے پر چھری رکھنا اس بات کا اظہار تھا کہ وہ اس قربانی کے لئے آخری طور پر تیار ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کو اس منصوبہ خداوندی کے لئے چن لیا گیا اور ان کو قدیم حجاز کے الگ تھلگ علاقہ میں بسا کر نئی نسل تیار کرنے کا عمل شروع کر دیا گیا۔

حضرت ابراہیم نے اسماعیل کی نسل میں ایک پیغمبر پیدا ہونے کی دعا کی تھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسی دعا کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، دعا اور اس کی قبولیت کے درمیان ڈھائی ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ اس تاخیر کا سبب یہ ہے کہ اس مدت کے دوران وہ نسل تیار کی جا رہی تھی جو شرک کے تسلسل سے منقطع ہو کر سوچ سکے اور صحرائی تربیت کے نتیجہ میں جس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ پیغمبر کا ساتھ دے کر اس کا مشن کو تکمیل تک پہنچا سکے۔ اسی لئے اس گروہ کو "خیر امت" کہا گیا۔ یہ امت تاریخ کی انوکھی امت ہے۔ ابتداءً ضرور اس کی ایک تعداد پیغمبر کی دشمن ہو گئی۔ مگر جب اس کی سمجھ میں آگیا تو اس نے بھرپور طور پر آپ کا ساتھ دیا۔

اس طرح جو نسل بنائی گئی اس کے اندر اگرچہ بعد کو اطراف کی دنیا سے کچھ شرک کے اثرات آگئے۔ مگر بنیادی طور پر وہ ایک محفوظ نسل تھی۔ کچھ ناقص افراد کو چھوڑ کر وہ لوگ صحیح فطرت پر قائم تھے۔ انھوں نے ابتداءً پیغمبر کی مخالفت بھی کی۔ مگر اس کا سبب زیادہ تر ناسمجھی تھا۔ جب ان کی سمجھ میں آگیا کہ واقعی یہ پیغمبر ہیں اور ان کا دین برحق ہے تو ان کی مخالفت دوبارہ موافقت میں تبدیل ہو گئی۔ وہ بھرپور طور پر آپ کے ساتھی بن گئے۔

حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے کو "ذبح" کر کے جو نسل تیار کی اس کا سب سے زیادہ نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ آزاد ذہن کے ساتھ حقیقت کو دیکھ سکتی تھی اور اس کا اعتراف کر سکتی تھی۔ حقیقت واقعہ کو مان لینے کی صلاحیت اس کے اندر کامل درجہ میں موجود تھی۔ یہاں اس سلسلہ میں تین مختلف مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔ ایک شخص وہ جس نے حق کو سنتے ہی اسے مان لیا۔ دوسرا وہ جس نے ابتداءً انکار کیا مگر جب بات سمجھ میں آگئی تو اس نے اعتراف میں دیر نہیں کی۔ تیسرا وہ جس نے اگرچہ اپنی سرداری کی خاطر اعتراف نہیں کیا مگر وہ بھی اس صفت عام سے خالی نہ تھا۔

۱۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جو لوگ ابتدائی مرحلہ میں ایمان لائے ان میں سے ایک خالد بن سعید بن العاص تھے۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ: اے محمد، آپ کس چیز کی طرف بلاتے

ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں تم کو ایک اللہ کی طرف بلاتا ہوں جس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ اور یہ کہ تم پتھروں کی عبادت چھوڑ دو جو نہ سنتے اور نہ دیکھتے ہیں اور نہ نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کس نے ان کی عبادت کی اور کس نے ان کی عبادت نہیں کی (ولا یدری من عبدہ ممن لا یعبدہ) خالد نے یہ سن کر کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

حضرت خالد کے والد جو مشرک تھے جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کے بیٹے نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ تو انھوں نے ان کو پکڑا اور انھیں مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ مارتے مارتے لکڑی ٹوٹ گئی۔ جب حضرت خالد اسلام سے پھرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے تو باپ نے کہا کہ میں تمہارا کھانا پینا بند کر دوں گا اور تجھے گھر سے نکال دوں گا۔ حضرت خالد نے جواب دیا، خدا کی قسم محمد نے جو کہا سچ کہا اور میں ان کا پیرو ہوں (قد صدق واللہ واتبعتہ) دوسرے لفظوں میں یہ کہ محمد جب ایک حق بات کہہ رہے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ میں اسے نہ مانوں۔

۲۔ دوسری مثال سہیل بن عمرو کی ہے۔ صلح حدیبیہ کے وقت وہ مخالفین اسلام کے نمائندہ تھے۔ طویل گفت و شنید کے بعد جب معاہدہ لکھا جانے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو املا کراتے ہوئے یہ الفاظ کہے:

ھذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللہ

سہیل بن عمرو نے ان الفاظ پر سخت اعتراض کیا۔ انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم اگر ہم جانتے کہ آپ خدا کے رسول ہیں تو ہم آپ کو بیت اللہ سے نہ روکتے اور نہ آپ سے لڑائی کرتے (واللہ لو کنا نعلم انک رسول اللہ ما صددناک عن البیت ولا قاتلناک

بعد کی تاریخ نے بتایا کہ سہیل بن عمرو ان الفاظ میں پوری طرح صادق تھے۔ وہ واقعۃً نہ سمجھنے کی وجہ سے مخالفت کر رہے تھے۔ چنانچہ بعد کو جب ان کی سمجھ میں آگیا کہ آپ سچے پیغمبر ہیں تو وہ ایمان لائے اور اس کے بعد اپنی پوری زندگی اسلام کی حمایت اور تائید میں وقف کر دی۔

۳۔ تیسری مثال ابوجہل کی ہے۔ ابوجہل نے اگرچہ اسلام قبول نہیں کیا۔ مگر اس کے یہاں بھی اس عرب کردار کا ایسا نمونہ ملتا ہے جس کی مثال مشکل سے کہیں دوسری جگہ ملے گی۔

مکی دور کا واقعہ ہے کہ ایک روز ابوجہل کی ملاقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔ اس نے آپ کو بہت برا بھلا کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ یہ واقعہ مکہ کی ایک عورت

دیکھ رہی تھی۔ اس نے آپ کے چچا حمزہ بن عبد المطلب سے کہا کہ آج ابوجہل نے آپ کے بھتیجے سے بہت نازیبا انداز میں کلام کیا ہے۔ اس وقت حمزہ کے ہاتھ میں لوہے کی کمان تھی۔ وہ اس کو لئے ہوئے ابوجہل کے پاس آئے اور کمان سے اس کے سر پر اس طرح مارا کہ اس کا سر بری طرح زخمی ہو گیا۔ ابوجہل کے قبیلہ (بنو مخزوم) کے کچھ لوگ حمزہ کو مارنے کے لئے دوڑے۔ ابوجہل نے اپنے آدمیوں کو روک دیا اور کہا کہ حمزہ کو چھوڑ دو کیوں کہ خدا کی قسم میں نے ان کے بھتیجے کو آج بہت برا بھلا کہہ دیا تھا (دَعُوا اباعُمارة فانی واللہ قد سببت ابن اخیہ سباً قبیحاً)

ہرقل کے مشہور واقعہ میں آتا ہے کہ اس نے ابوسفیان سے پوچھا کیا نبوت کے اعلان سے پہلے تم لوگوں نے محمد کو کبھی جھوٹ بولتے ہوئے پایا ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ نہیں۔ یہ واقعہ نقل کرکے ابن کثیر لکھتے ہیں:

وکان ابوسفیان اذ ذاک رأس الکفرة وزعیم المشرکین ومع هذا اعترف بالحق.
(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۱۴۰)

ابوسفیان اس وقت کافروں کے سردار اور مشرکوں کے لیڈر تھے، اس کے باوجود انھوں نے حق کا اعتراف کیا۔

یہ تھی وہ انسانی نسل جو حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کو "ذبح" کرکے بنائی۔ اور پھر اس کے منتخب افراد کے ذریعہ وہ "خیرامت" بنی جس نے دل وجان سے توحید کو قبول کیا اور پھر بے مثال قربانی کے ذریعہ دور شرک کو ختم کرکے دور توحید کو برپا کیا۔

حضرت ابراہیم سے لے کر حضرت محمد تک یہ ایک ڈھائی ہزار سالہ منصوبہ تھا۔ اس کا مرکز عرب کا وہ علاقہ تھا جس کو حجاز کہا جاتا ہے اور جس میں مکہ واقع ہے۔ حج اسی تاریخ کا علامتی اعادہ ہے۔ حج کے ذریعہ مسلمان دوبارہ یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ اس منصوبہ خداوندی میں اپنے آپ کو شامل کریں گے۔ وہ لبیک اللھم لبیک (ہم حاضر ہیں خدایا ہم حاضر ہیں) کہتے ہوئے ابراہیم اور اسماعیل کی سرزمین میں جمع ہوتے ہیں۔ جو کچھ ان لوگوں پر حقیقی طور پر گزرا تھا اس کو چند دن میں علامتی طور پر دہراتے ہیں۔ اس طرح وہ خدا سے کہتے ہیں کہ اگر ضرورت ہو تو وہ دوبارہ اس تاریخ کو دہرانے کے لئے تیار ہیں جو یہاں اس سے پہلے دہرائی گئی۔

آج زمانہ گھوم کر دوبارہ وہیں پہنچ گیا ہے جہاں وہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں تھا۔ اس وقت سارے عالم پر شرک کا غلبہ تھا، آج سارے عالم پر الحاد کا غلبہ ہے۔ قدیم زمانہ کا انسان اگر مشرکانہ طرز پر سوچتا تھا تو آج کا انسان ملحدانہ طرز پر سوچتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کا مسئلہ بھی وہی ہے جو قدیم زمانہ کا مسئلہ تھا۔ اس

فرق کے ساتھ کہ قدیم زمانہ میں مشرکانہ شاکلہ لوگوں کے اوپر چھایا ہوا تھا۔ آج لوگوں کے اوپر الحادی شاکلہ چھایا ہوا ہے۔ اس شاکلہ (ذہنی سانچہ) کو توڑنا ہی آج اسلام کا اصل کام ہے۔ آج بھی اسلامی مہم اسی نہج پر طے ہوگی جس نہج پر قدیم زمانہ کی اسلامی مہم طے ہوئی تھی۔

اب دوبارہ کچھ لوگوں کو ذبح ہونا ہے۔ اب پھر کچھ لوگوں کو اپنی اولاد کو صحرا میں ڈالنا ہے تاکہ دین کی تاریخ دوبارہ زندہ ہو۔ ماضی میں دور شرک کو ختم کرنے کے لئے ایک نسل کی قربانی درکار تھی۔ آج دور الحاد کو ختم کرنے کے لئے دوبارہ ایک نسل کی قربانی درکار ہے ـــــ یہی حج کا سب سے بڑا سبق ہے۔ اسی کا حج آج حج مبرور ہے۔ جو حج کے بعد یہ عزم لے کر وہاں سے واپس آئے۔

یہ مقالہ ایک تقریر پر مبنی ہے جو اسلامی مرکز دہلی کے ماہانہ اجتماع ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۱ میں کی گئی۔

لعنت کیا ہے

یہود میں جب بگاڑ آیا تو پیغمبروں کے ذریعہ ان پر لعنت کی گئی۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا اُن پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے نکل جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو اپنے درمیان ہونے والی بُرائی سے روکتے نہ تھے۔ کیسا بُرا کام تھا جو وہ کر رہے تھے۔ تم اُن میں سے بہتوں کو دیکھو گے کہ کفر کرنے والوں سے دوستی رکھتے ہیں۔ کیسی بُری چیز ہے جس کو وہ اپنے آگے بھیج رہے ہیں جس سے اللہ ان پر ناراض ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔ اور اگر وہ اللہ پر اور رسول پر اور جو کچھ اس پر اترا ہے اس پر ایمان لاتے تو وہ ان کو دوست نہ بناتے، مگر ان میں سے اکثر نافرمان ہیں (مائدہ ۸۱-۷۸)

لعنت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیغمبروں نے آکر یہود کے سامنے یہ الفاظ دہرائے کہ "تم پر لعنت ہے" یا "تم ملعون ہو"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ان کے مذہبی بھرم کو کھولا۔ یہود عملاً اپنی خواہشات اور اپنے قومی تعصبات پر چل رہے تھے مگر اپنی اس روش کو مذہب کا نام دیتے تھے۔ انھوں نے خدائی تعلیمات کی خود ساختہ تشریح کرکے اس کو اپنے حسب حال بنا لیا تھا۔ پیغمبروں نے یہ کیا کہ ان کے اس فریب کو بے نقاب کیا۔ ان کا تجزیہ کرکے کھول دیا کہ وہ کیا ہیں اور اپنے کو کیا ظاہر کر رہے ہیں۔

مذکورہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ یہود پر یہ لعنت حضرت داؤد اور حضرت مسیح کے ذریعہ کی گئی۔ ان پیغمبروں کی تقریریں آج بھی بائبل میں موجود ہیں۔ ان کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس "لعنت" کی عملی صورت کیا تھی۔ یہاں ہم حضرت داؤد کے اقوال کا کچھ حصہ نقل کرتے ہیں:

خدا شریر سے کہتا ہے۔ تجھے میرے آئین بیان کرنے سے کیا واسطہ۔ اور تو میرے عہد کو اپنی زبان پر کیوں لاتا ہے۔ جب کہ تجھے تربیت سے عداوت ہے۔ اور تو میری باتوں کو پیٹھ پیچھے پھینک دیتا ہے۔ تو چور کو دیکھ کر اس سے مل گیا۔ اور تو زانیوں کا شریک رہا ہے۔ تیرے منہ سے بدی نکلتی ہے۔ اور تیری زبان فریب گھڑتی ہے۔ تو بیٹھا بیٹھا اپنے بھائی کی غیبت کرتا ہے۔ اور اپنی ہی ماں کے بیٹے پر تہمت لگاتا ہے۔ تو نے گمان کیا کہ میں بالکل تجھ ہی سا ہوں۔ لیکن میں تجھے ملامت کرکے ان کو تیری آنکھوں کے سامنے ترتیب دوں گا۔ اب اے خدا کو بھولنے والو اسے سوچ لو۔ ایسا نہ ہو کہ میں تم کو پھاڑ ڈالوں اور کوئی چھڑانے والا نہ ہو۔ جو شکرگذاری کی قربانی گزرانتا ہے وہ میری تمجید کرتا ہے۔ اور جو اپنا چال چلن درست رکھتا ہے اس کو میں خدا کی نجات دکھاؤں گا (زبور ۵۰)

فکری توجیہہ

انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں دو مفکرین نے امریکہ میں بہت مقبولیت حاصل کی۔ یہ تھے ہربرٹ اسپنسر (۱۹۰۳ - ۱۸۲۰) اور ولیم گراہم سمنر (۱۹۱۰ - ۱۸۴۰) اس مقبولیت کا راز ایک لفظ میں یہ تھا کہ وہ سوشل ڈارونسٹ (Social Darwinist) تھے۔ یعنی انھوں نے ڈارون کے بقاء اصلح (Survival of the fittest) کے نظریہ کو سماجی زندگی پر منطبق کیا۔

چارلس ڈارون (۱۸۸۲ - ۱۸۰۹) نے انواع حیات کے ارتقاء کے سلسلے میں یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین پر ابتداءً زندگی کی مختلف قسمیں ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد ان میں بقاء کی جدوجہد شروع ہوتی ہے پھر جو نوع زیادہ صالح ثابت ہوتی ہے وہ باقی رہتی ہے اور جو انواع کمتر درجہ کی ہوتی ہیں وہ ختم ہو جاتی ہیں۔ اس طرح زندگی ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔

یہ نظریہ جس کو ارتقاء کا نظریہ کہا جاتا ہے، خالص علمی اعتبار سے ثابت شدہ نظریہ نہ تھا۔ مگر انیسویں صدی کی دنیا میں مغربی قوموں کے لئے وہ بہت سود مند ثابت ہوا۔ کیونکہ وہ دوسری قوموں پر ان کے معاشی اور تہذیبی غلبہ کے لئے فطری جواز فراہم کرتا تھا۔ اس نظریہ کے حوالے سے وہ کہہ سکتے تھے کہ دنیا کی قوموں کو ہماری برتری تسلیم کرنا چاہئے۔ کیوں کہ وہ ہم کو عین قانون قدرت کے تحت حاصل ہوئی ہے۔ وہ ہمارا فطری حق ہے نہ کہ ظلم یا استحصال کا کوئی واقعہ۔

اسپنسر (Herbert Spencer) اور سمنر (W.G. Sumner) کو مغربی قوموں، خصوصاً امریکہ میں جو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی وہ اس کی قیمت تھی کہ انھوں نے اپنے آپ کو اس راہ میں استعمال کیا کہ وہ مغربی قوموں کو یہ مطلوب ذہنی غذا فراہم کریں۔ وہ اپنی فلسفیانہ صلاحیت اور اپنی معاشی قابلیت سے یہ ثابت کریں کہ جو کچھ ہے یہی از روئے حق ہونا چاہئے تھا۔

اس سلسلے میں اسپنسر کے خیالات کا خلاصہ اس کے ان الفاظ میں ملتا ہے:

I am simply carrying out the views of Mr. Darwin in their applications to the human race ... all (members of the race) being subject to the increasing difficulty of getting a living ... there is an average advance under the pressure, since only those who do advance under it eventually survive, and ... these must be the select of their generation.

Herbert Spencer, The Study of Sociology.
New York, D. Appleton and Co., 1891 p. 438

میں سادہ طور پر سمنر ڈارون کے خیالات کو انسانی نسل پر چسپاں کر رہا ہوں۔ نسل کے تمام افراد اپنی معاش حاصل کرنے کے سلسلے میں بڑھتی ہوئی مشکل سے دوچار ہوتے ہیں۔ دباؤ کے زیر اثر ایک اوسط ترقی ہوتی ہے۔ آخر صرف وہ لوگ زندہ رہتے ہیں جو اس کے تحت ترقی کریں، اور یہ لازماً ان کی نسلوں کا انتخاب ہوتا ہے۔

سمنر نے جس طرح اس کی تعبیر کی ہے اس کا ایک نمونہ یہ ہے:

> The millionaires are a product of natural selection . . . It is because they are thus selected that wealth—both their own and that entrusted to them—aggregates under their hands . . . . They may fairly be regarded as the naturally selected agents of society for certain work. They get high wages and live in luxury, but the bargain is a good one for society.

William Graham Sumner, quoted in Richard Hofstadter, Social Darwinism in American Thought 1860-1915, Philadelphia, University of Pennsylvania Press 1945, p. 44

کروڑ پتی لوگ انتخابِ فطرت کی ایک پیداوار ہیں۔ یہ اس لئے کہ اس طرح انھوں نے اس دولت کو چنا ہے۔ خود بھی اور سونپے جانے کے اعتبار سے بھی۔ وہ ان کے ہاتھوں میں بڑھتی ہے۔ وہ واضح طور پر سماج کے کارندے سمجھے جا سکتے ہیں جن کو فطری طور پر متعین کام کے لئے منتخب کیا گیا ہو۔ وہ زیادہ بڑی اجرت لیتے ہیں اور عیش کی زندگی گزارتے ہیں۔ مگر یہ سودا سماج کے لئے مفید ہے۔

موجودہ زمانہ میں نظریۂ ارتقاء کی مقبولیت (اور اسی طرح دوسرے بہت سے نظریات کی مقبولیت) کا راز یہ نہ تھا کہ یہ نظریات بذاتِ خود حق تھے۔ بلکہ ان کی مقبولیت کا اصل راز یہ تھا کہ وہ ان لوگوں کی قومی خواہشات سے مطابقت رکھتے تھے جن کے درمیان وہ پیش کئے گئے۔ یہ نظریات ان قوموں کی کارروائیوں کے لئے فکری جواز فراہم کرتے تھے۔

اکثر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک چیز کو یہ کہہ کر لیتا ہے کہ وہ اس کو حق سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ اس کو صرف اس لئے لیتا ہے کہ وہ اس کی خواہشات کے مطابق ہے نہ کہ علم و عقل کے مطابق۔

اسلام کیا ہے

موجودہ زمانہ میں جب یہ کہا گیا کہ "مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے" تو اس کے جواب میں پرجوش طور پر یہ اعلان کیا گیا کہ "مذہب ایک مکمل اجتماعی نظام ہے" بظاہر دونوں گروہ ایک دوسرے سے الگ نظر آتے ہیں۔ مگر دونوں کے درمیان ایک چیز مشترک ہے۔ دونوں ہی گروہ مذہب کا تصور ایک "ڈھانچہ" کی صورت میں کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلا گروہ اس کو انفرادی ڈھانچہ کے معنی میں لیتا ہے۔ اور دوسرا گروہ اجتماعی ڈھانچہ کے معنی میں۔

مگر مذہب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے نہ انفرادی ڈھانچہ ہے اور نہ اجتماعی ڈھانچہ۔ وہ ایک ربانی طریقہ ہے۔ مذہب (اسلام) کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے خدا کی معرفت حاصل کرے۔ وہ غیبی حقیقت کو اپنے لئے مشہود حقیقت بنائے۔ اس کے قلب و دماغ پر خدا اور آخرت کا اتنا غلبہ ہو کہ وہ ہر وقت اسی کی بابت سوچے۔ اس کی زندگی کا ہر رویہ اسی رنگ میں رنگا ہوا ہو۔

اسلام کا اصل مقصد ربانی انسان کو وجود میں لانا ہے۔ ایک ایک فرد کو خدا کی محبت اور خوف میں ڈھالنا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان اپنے وجود کے اندر اس ربانی انسان کی تخلیق کرے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرے۔ جو سب سے زیادہ آخرت کے لئے فکر مند ہو۔ جو اپنے روزمرہ کے معاملات میں سب سے زیادہ خدا کی مرضی کا لحاظ کرے، جو نفس اور شیطان کو چھوڑ کر ایک خدا کے آگے جھک جائے۔

ایمان و اسلام کیا ہے۔ یہ دراصل ایک دریافت (Discovery) ہے۔ خدا کی دریافت۔ ایک بندہ جب ظاہری چیزوں سے گزر کر حقیقت کو دیکھ لیتا ہے، جب وہ مخلوقات سے اوپر اٹھ کر خالق کو پالیتا ہے تو اسی کا نام ایمان و اسلام ہے۔ یہ ایک ایسا دیکھنا ہے جس کو لوگوں نے نہیں دیکھا۔ یہ ایک ایسا پانا ہے جس کو لوگوں نے نہیں پایا۔ ایمان و اسلام ایک تجربہ ہے جو انسانی روح میں ایک بھونچال پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت کی زد میں آنا ہے جو آدمی کے پورے وجود کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ یہ پیدا شدہ انسان کا دوبارہ پیدا ہونا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا مخاطب فرد ہے نہ کہ اجتماع۔ اجتماع کے اندر وہ نفسیاتی واقعات ظہور ہی میں نہیں آتے جو اسلام کا اصل مقصود ہیں۔ اجتماع کو اسلام کا مخاطب بنانا اسلام کو گھٹانا ہے نہ کہ اس کو مکمل کرنا۔

ایمان بڑھتا ہے

ومن یقترف حسنۃ نزد لہ فیہا حسناً (الشوریٰ ۲۳) — اور جو شخص نیکی کرے گا ہم اس کے لئے اس کی خوبی بڑھائیں گے۔

نیکی کرنے والے کی خوبی میں اضافہ کرنے کا مطلب کیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ نیکی کے ثواب میں سے یہ ہے کہ نیکی کے بعد نیکی کی توفیق حاصل ہو اور برائی کے بدلہ میں سے یہ ہے کہ برائی کے بعد آدمی کو اور برائی کا موقع دیا جائے (قال بعض السلف ان من ثواب الحسنۃ الحسنۃ بعدھا و من جزاء السیئۃ السیئۃ بعدھا، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث صفحہ ۱۱۳)

نیکی کرنا انسان جیسی مخلوق کے لئے ایک شعوری واقعہ ہے۔ آدمی جب ایک نیکی کرتا ہے تو وہ ایک برائی کو ارادی طور پر چھوڑتا ہے اور ایک نیکی کو ارادی طور پر اختیار کرتا ہے۔ اس طرح ایک حقیقی نیکی کرنے والا آدمی نیکی کرکے اپنے شعور اور ارادہ کو متحرک کرتا ہے۔ وہ اپنی نفسیات کو جگاتا ہے اور اپنی روح کے اندر آمادگی کی فضا پیدا کرتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر نیکی آدمی کو ایک نیا انسان بنا دیتی ہے۔ ہر نیکی کے بعد آدمی مزید اور نیکی کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ نیکی موجودہ دنیا میں ایک عمل ہے اور اسی کے ساتھ مزید عمل کا محرک بھی۔

دنیا میں ایک جمادات ہیں اور دوسرے نباتات۔ پتھر ایک جامد چیز ہے۔ وہ بس ایک حال میں پڑا رہتا ہے۔ اس کے برعکس درخت ایک نمو پذیر چیز ہے۔ وہ برابر بڑھتا رہتا ہے۔ قرآن میں مومن اور ایمان کی مثال درخت سے دی گئی ہے (ابراہیم ۲۴) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کا معاملہ پتھر جیسا معاملہ نہیں ہے کہ بس ایک حالت پر پڑا رہے۔ وہ برابر بڑھتا رہتا ہے۔ اس پر کبھی ٹھہراؤ نہیں آتا۔

قرآن میں مختلف مقامات پر بتایا گیا ہے کہ ایمان ایک اضافہ پذیر حقیقت ہے۔ یہاں قرآن کے چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں:

جب قرآن کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو مومنین کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے (الانفال ۲)

خدا کے لئے قربانی کے مواقع کو دیکھ کر مومنین کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے (آل عمران ۱۷۳)

اہل ایمان کے تقویٰ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے (محمد ۱۷)

ہدایت پانے والوں کی ہدایت برابر بڑھتی رہتی ہے (مریم ۷۶)

ایمان والوں کے خشوع میں اضافہ ہوتا ہے (الاسراء ۱۰۹)

اہل ایمان کی معرفت بڑھتی رہتی ہے (طہٰ ۱۱۴)

جو لوگ واقعی ایمان کی دولت پائیں ان کا ایمان اسی طرح بڑھتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ [illegible] کے ساتھ نہ پائیں ان کے لئے ایمان بس ایک جامد چیز ہوتی ہے، وہ بڑھنے اور ترقی کرنے والی چیز نہیں بنتی۔

قال البیہقی عن عطاء بن یسار ان عبد اللہ بن رواحۃ قال لصاحب لہ تعال نؤمن بربنا ساعۃ۔ فغضب الرجل وقال اولسنا بمؤمنین قال بلیٰ ولکنا نذکر اللہ فنزداد ایمانا

عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ آؤ ہم کچھ دیر کے لئے اپنے رب پر ایمان لائیں۔ ساتھی یہ سن کر غصہ میں آگیا اس نے کہا کہ کیا ہم مومن نہیں ہیں۔ حضرت ابن رواحہ نے کہا کہ ہاں ہم مومن ہیں۔ مگر ہم اللہ کو یاد کرتے ہیں تو اس سے ہمارے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

مذکورہ آدمی کے نزدیک ایمان کا مطلب یہ تھا کہ توحید کا کلمہ (لا الٰہ الا اللہ) پڑھ لیا جائے۔ کلمہ کی ادائیگی کے بعد اس کے نزدیک بات پوری ہو جاتی تھی۔ مگر حضرت عبد اللہ بن رواحہ خدا کو اس کے ان کمالات کے ساتھ پائے ہوئے تھے جس کی کوئی حد وانتہا نہیں۔ پہلے آدمی کے نزدیک اگر کلمہ پڑھ کر بات ختم ہوتی تھی تو حضرت عبد اللہ بن رواحہ کے نزدیک اس کے بعد بات شروع ہوتی تھی۔ خدا کا تصور ان کے ذہن میں اس طرح آتا تھا کہ وہ لامحدود کمالات کا خزانہ ہے۔ اس لئے اس کا ذکر بھی ان کے نزدیک ایسی چیز تھی جو لامحدود طور پر جاری رہے۔ وہ خدا میں جینے والے تھے۔ اور جو شخص خدا میں جئے وہ برابر خدا کی یاد کرتا رہے گا، اس کو کبھی یہ احساس نہیں ہوگا کہ وہ اس کی آخری حد پر پہنچ گیا ہے۔

قال عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، لو طہرت قلوبکم ما شبعتم من کلام ربکم

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اگر تمہارے دل پاک ہو جائیں تو اللہ کی بات سے تم کو سیری نہ ہو۔

کسی بات سے سیر ہونے یا نہ ہونے کا تعلق آدمی کے ظرف سے ہوتا ہے۔ چھوٹا کٹورا تھوڑے سے پانی سے بھر جاتا ہے۔ مگر سمندر کو پانی کی بڑی سے بڑی مقدار بھی بھرنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ یہی حال انسان کا ہے۔ اگر آدمی کے اندر کا ظرف یا اس کی سمائی کم ہو تو وہ ذرا سی بات سے بھر جائے گا۔ اور اگر اس کی سمائی بہت زیادہ ہو تو اس کو کبھی سیری حاصل نہیں ہوگی۔

ایک عام آدمی توحید کا مطلب صرف یہ جانتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ لیا جائے۔ "کلمہ توحید" کا تلفظ کرنے کے بعد اس کو ایسا لگتا ہے کہ بات ختم ہو گئی۔ اس کے بعد اس کے پاس کچھ اور نہیں رہتا جس کو وہ سوچے یا اپنی زبان سے کہے۔ مگر جو شخص "توحید" کی حقیقت کو پا لے اس کے [illegible]

موضوع پر لکھنے کے لئے اتنی زیادہ بات ہوگی جو کبھی ختم نہ ہو۔

موجودہ زمانہ میں سائنس دانوں نے کائنات کو دریافت کیا ہے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک ایسی دنیا کو دریافت کیا ہے جس کے ایک ایک ذرہ کی تفصیلات اتنی زیادہ ہیں جو کبھی بیان نہ کی جا سکیں۔ پھر جو شخص کائنات کے خالق کو دریافت کرے اس کے پاس تو علم کا ایسا سمندر ہونا چاہئے جو سارے انسانی الفاظ بولنے کے بعد بھی ختم نہ ہو۔ جو دنیا کے تمام قلم اور دنیا کی تمام سیاہی کو استعمال کرنے کے بعد بھی لکھنے سے رہ جائے۔

اگر آپ نے خدا کو دریافت نہیں کیا ہے تو آپ کے پاس خدا کے نام سے بس چند الفاظ ہوں گے۔ لاالٰہ الا اللہ کا فقرہ زبان سے ادا کرنے کے بعد آپ کو ایسا محسوس ہوگا گویا بات ختم ہوگئی۔ اس کے بعد آپ اگر مزید کچھ جانیں گے تو وہ بس اسی فقرہ کی بے سوچی سمجھی تکرار ہوگی۔ لیکن اگر آپ واقعۃً خدا کو پالیں تو خدا کے بارہ میں آپ کے پاس اتنی زیادہ باتیں ہوں گی جو لکھنے اور بولنے سے کبھی ختم نہ ہوں۔ جن کے بارہ آپ کبھی سیر نہ ہو سکیں۔

خدا کی کوئی انتہا نہیں۔ اس لئے خدا کی معرفت کی بھی کوئی انتہا نہیں ہو سکتی۔ جس طرح خدا لامحدود ہے اسی طرح خدا کی معرفت بھی لامحدود ہے۔ جس آدمی کی معرفت خداوندی لامحدود نہ ہو، اس نے ابھی حقیقی خدا کو نہیں پایا ہے۔ وہ کسی "محدود" میں اٹکا ہوا ہے، وہ ابھی "لامحدود" تک نہیں پہنچا۔

اسلام اور عصر حاضر

اسلامی مرکز کی تازہ پیشکش

اس کتاب میں اسلامی تعلیمات کو جدید اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔

قیمت ۲۰ روپئے

مکتبہ الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۳

زور والے بے زور ہوں گے

دیا سلائی بنانے والے نے جب دیا سلائی بنائی تو اس نے جاننا چاہا کہ اس کی دیا سلائی کس حد تک جلانے کی طاقت رکھتی ہے۔ اس نے کچھ لکڑی جمع کی اور اس کو جلا کر اس کا تجربہ کیا۔ اس کے بعد وہ وقت آیا جب جانوروں پر طرح طرح کے تجربے کئے جانے لگے۔ جانوروں کو زہریلی چیزیں کھلانا، جانوروں کے جسم کے کسی حصہ کو بیکار کرنا، جانوروں کو مار کر ان کا جائزہ لینا، وغیرہ۔ اب تجربات کا یہ سلسلہ اپنے تیسرے دور میں داخل ہوگیا ہے۔ یہ انسانوں پر تجربہ ہے۔ دنیا کی کچھ قومیں جنھوں نے "بڑی طاقت" کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ وہ ہلاکت خیز ہتھیار بناتی ہیں اور ان کی ہلاکت خیزی کا تجربہ کرنے کے لئے ان کو کمزور قوموں پر استعمال کرتی ہیں۔ نیٹو (NATO) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اسپین کی سول وار میں ہٹلر نے اپنے ٹینک اور بمبار ہوائی جہازوں کو بے تکلف استعمال کیا۔ اس کے نتیجہ میں ہزاروں لوگ ہلاک یا معذور ہوگئے۔ تاہم ہٹلر نے فتح کی خوشی منائی۔ کیوں کہ اس کا مقصد اپنے ہتھیاروں کی ہلاکت خیزی کو جاننا تھا اور وہ حاصل ہوگیا۔ اسی طرح ویٹ نام کی جنگ میں امریکہ نے اپنے ہیلی کوا پٹر اتنی زیادہ تعداد میں اڑائے کہ زمین پر ان کے سایہ سے اندھیرا چھا گیا۔ یہ تاریخ کی پہلی جنگ تھی جس میں جنگی ہیلی کوا پٹر استعمال کئے گئے۔ ویٹ نام کا چھوٹا سا ملک تباہ ہوگیا۔ تاہم امریکہ اپنے مقصد میں کامیاب تھا۔ وہ اپنے ہیلی کوا پٹروں کی جنگی قوت کا اندازہ کرنا چاہتا تھا اور ویت نام کو قبرستان بنا کر اس نے یہ اندازہ کر لیا۔ اب روس یہی کام افغانستان میں کر رہا ہے۔

روس نے بھاری قسم کے جنگی ہیلی کوا پٹر بنائے ہیں۔ وہ ان کی مار کا اندازہ کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس کو کمزور افغانستان کی سرزمین حاصل ہوگئی ہے۔ اس نے افغانستان کو اپنے جدید ترین جنگی ہتھیاروں کی تجربہ گاہ بنا دیا ہے۔ لاکھوں لوگ قتل اور برباد ہو رہے ہیں۔ بے شمار لوگ اپنے وطن کو چھوڑ کر پڑوسی ملک میں پناہ لے رہے ہیں۔ تاہم روس کا مقصد حاصل ہے۔ افغانوں کی زمین کو قبرستان بنا کر وہ اپنے جنگی ہتھیاروں کا تجربہ کر رہا ہے (ہندستان ٹائمس یکم اپریل ۱۹۸۰)

یہ دنیا کیا اندھیر نگری ہے۔ کیا خدا نے یہاں کچھ لوگوں کو طاقت ور بنا کر بھیج دیا کہ وہ اپنے طاقت ور ہونے کا انعام پائیں۔ اور کچھ لوگوں کو کمزور بنا کر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے کمزور ہونے کی سزا

سمجھیں۔ اس قسم کا خیال کرنا خدائی کو باطل کرنے کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بیکار نہیں بنایا۔ یہ ان لوگوں کا گمان ہے جو منکر ہیں۔ ایسے منکرین کے لئے بربادی ہے جہنم کی آگ سے۔ کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیا اور ان کو جو زمین میں فساد کرتے ہیں یکساں کر دیں گے۔ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں گے (ص)

جو لوگ اپنے ان ظالمانہ مشغلوں میں لطف لے رہے ہیں ان کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اس دنیا کے مالک وہ نہ تھے بلکہ اس دنیا کا مالک خدا تھا۔ موت کا فرشتہ جب ان کو پچھاڑے گا تو وہ دیکھیں گے کہ وہ چیونٹی سے بھی زیادہ بے حقیقت تھے۔ وہ چیزیں جن کے بل پر وہ اپنے کو طاقت ور سمجھے ہوئے تھے وہ ان کے کچھ کام نہ آئیں گے وہ اوندھے منہ اپنے کو آخرت کی خندق میں گرا ہوا پائیں گے وہ پکاریں گے مگر وہاں کوئی نہ ہوگا جو ان کی پکار کو سنے، وہ مدد چاہیں گے مگر وہاں کوئی نہ ہوگا جو ان کی مدد کے لئے دوڑے۔

ایجنسی : ایک پروگرام

الرسالہ اس لئے نہیں ہے کہ آپ اس کو پڑھ کر اس کی تعریف کر دیں۔ الرسالہ آپ کی ذمہ داری کا عنوان ہے۔ الرسالہ آپ سے کچھ کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ کرنا یہ ہے کہ آپ اس کی ایجنسی لیں۔

اردو الرسالہ اردو داں طبقہ کے لئے ہے اور انگریزی الرسالہ انگریزی داں طبقہ کے لئے۔ مگر الرسالہ اپنے امکانی قارئین تک آپ ہی کے ذریعہ پہنچے گا۔ اگر آپ الرسالہ کی ایجنسی لئے ہوئے ہیں تو اس کو بڑھائیے۔ اور اگر آپ نے ابھی تک الرسالہ کی ایجنسی نہیں لی ہے تو فوراً ہم کو ایک خط لکھ کر ایجنسی شروع کر دیجئے۔

ادارہ الرسالہ

ایک سفر

ایک اسلامی کانفرنس میں شرکت کے سلسلہ میں مراکو کا سفر ہوا۔ جولائی ۱۹۸۴ میں ملیشیا جانا ہوا تھا۔ اب نومبر ۱۹۸۴ میں مراکو جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ گویا اس مسلم دنیا کا ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف سفر تھا جو ملیشیا اور انڈونیشیا سے لے کر مراکو تک پھیلی ہوئی ہے۔

مراکو مغرب کی سمت میں افریقہ کا آخری ملک ہے جو اسپین کے قریب واقع ہے۔ چنانچہ اس ملک کا دوسرا نام مغرب ہے۔ مراکو کا رقبہ دو لاکھ ۷۰۵ ہزار مربع میل ہے۔ اور آبادی ۲۰ ملین سے کچھ زیادہ ہے جس میں بیشتر تعداد مسلمانوں کی ہے۔ اس کی راجدھانی رباط ہے اور شاہ حسن ثانی اس کے موجودہ حکمراں ہیں۔

مراکو کو بنو امیہ کے دور میں عقبہ بن نافع نے فتح کیا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عقبہ بن نافع نے اپنا مشہور جملہ کہا تھا۔ جب وہ خشکی کو فتح کرتے ہوئے مراکو کی آخری سرحد پر پہنچے جس کے آگے اٹلانٹک سمندر موجیں مار رہا تھا تو انھوں نے اسلامی جوش کے تحت اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا اور پانی کے اندر کھڑے ہو کر کہا:

واللہ لو علمت ان وراء ھذا البحر بلدا لخضتہ حتی لا یعبد احد دون اللہ	خدا کی قسم اگر میں جانتا کہ اس سمندر کے پار بھی کوئی ملک ہے تو میں سمندر کو عبور کر کے وہاں پہنچتا یہاں تک کہ ایک خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے۔

دور اول کے مسلمان جس مقصد کے لئے سرشار ہو کر اٹھے تھے وہ لوگوں کو خدائے واحد کا عبادت گزار بنانا تھا۔ نہ کہ ملکی فتوحات حاصل کرنا۔ مگر بعد کی نسلیں اس راز کو بھول گئیں۔ انھوں نے فتوحات اور سیاسی کارناموں ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ اسی وقت سے مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا۔

۲۵ نومبر کو جب میں نے یہاں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں کھڑے ہو کر اٹلانٹک کی لہروں کو موجیں مارتے ہوئے دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ موجیں آج بھی عقبہ بن نافع کے اس تاریخی قول کی امانت لئے ہوئے ہیں اور اس کو توحید کا نام لینے والوں تک پہنچا دینا چاہتی ہیں۔

مراکو کی فتح کے بعد طارق بن زیاد کو یہاں کا حاکم مقرر کیا گیا۔ یہ وہی طارق بن زیاد ہے جس کے نام سے جبل الطارق (جبرالٹر) موسوم ہے۔ اس نے آبنائے جبرالٹر کے مقام پر سمندر کو عبور کیا اور اندلس میں داخل ہو کر اس کا بڑا حصہ فتح کر ڈالا۔ اس کے بعد اسپین کی تقریباً آدھی آبادی مسلمان ہو گئی مگر بعد کو جب

مسلمانوں کے باہمی اختلاف کے نتیجہ میں مسیحی دوبارہ اسپین میں غالب آ گئے تو انھوں نے چاہا کہ اسپین سے اسلامی تاریخ کو بالکل مٹا دیں۔ انھوں نے زبردست مظالم کئے چنانچہ مجبور ہو کر یہاں کے مسلمان یا تو ملک چھوڑ کر بھاگ گئے یا دوبارہ مسیحی بن گئے۔

مراکو میں فرانسیسی ۱۹۰۱ میں داخل ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۱۲ تک مراکو پر باقاعدہ قبضہ کر لیا۔ اسی دوران اسپینی بھی مراکو کے اس حصہ میں داخل ہو گئے جو ان کے تقریب سمندر کی دوسری طرف تھا۔ تاہم ۱۹۵۶ میں فرانس اور اسپین دونوں سلطان کے حق میں اپنے اقتدار سے دست بردار ہو گئے۔ اب مراکو مکمل طور پر ایک آزاد ملک ہے۔

راقم الحروف نے مراکش (مراکو) کا نام سب سے پہلے بچپن میں شبلی نعمانی کی نظموں کے ذریعہ سنا تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں مراکش پر مغربی قوموں کا قبضہ ہو گیا تو شبلی نعمانی نے ایک نظم میں کہا تھا:

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

مراکش (مراکو) اور فارس (ایران) اگرچہ آج مغربی اقوام کے سیاسی قبضہ سے آزاد ہو چکے ہیں۔ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے مغربی تہذیب کے قبضہ سے نکلنے میں بھی کامیابی حاصل کر لی ہے۔

مراکش (بتشدید الراء) یہاں کا ایک قدیم شہر ہے۔ یورپی لوگ اکثر اسی نام کی نسبت سے یہاں کی حکومت کو حکومت مراکش کہتے تھے۔ اس طرح مراکش پورے ملک کے لئے بھی بولا جانے لگا۔ یہی لفظ بعد کو خود یورپینوں کے اثر سے بگڑ کر مراکو (Morocco) بن گیا۔ مراکو دراصل مراکش کی بدلی ہوئی مغربی شکل ہے۔ مراکو ہی وہ ملک ہے جہاں سے گزر کر مسلمان یورپ میں داخل ہوئے تھے۔

۲۴ نومبر ۱۹۸۴ کو صبح سویرے ایر انڈیا (۱۳۱) کے ذریعہ دہلی سے روم کے لئے روانگی ہوئی۔ ہوائی جہاز کی ایجاد نے موجودہ زمانہ میں دور دراز مقامات کے سفر کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ مگر خود ہوائی کمپنی کے لئے یہ صنعت براہ راست نفع بخش نہیں۔ بالواسطہ نفع کی بنیاد پر آج تقریباً تمام ملکوں نے اپنی ہوائی کمپنیاں قائم کر رکھی ہیں۔ مگر اکثر ہوائی کمپنیاں خسارہ پر چل رہی ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہوائی مسافروں کی کمی ہے۔ چنانچہ اکثر جہاز اپنی وسعت سے کم مسافر لے کر چلتے ہیں۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ ہوائی جہاز ہیں جو خلیج کے مسافروں کو لے کر چلتے ہیں۔ کیوں کہ اس علاقہ میں پچھلے برسوں میں سفر بہت بڑھ گیا ہے۔

جہاز کے اندر مختلف اخبار و رسائل پڑھنے کو ملے۔ ٹائم میگزین (۱۹ نومبر ۱۹۸۴) کو الکشن اسپیشل طور پر چھاپا گیا ہے۔ اس میں بہت سی دل چسپ باتیں تھیں صفحہ ۴۹ پر امریکی لیڈر مانڈیل (Mondale) کا ایک قول درج تھا:

We're dealing with real problems, and we want real answers. This is not Hollywood.

ہم حقیقی مسائل سے نمٹ رہے ہیں اور ہم حقیقی جوابات چاہتے ہیں۔ یہ ہالی ووڈ نہیں ہے۔

ہالی ووڈ امریکہ کی فلمی دنیا کا نام ہے۔ فلم کی دنیا میں طرح طرح کے کردار ادا کئے جاتے ہیں مگر وہ سب کے سب غیر حقیقی ہوتے ہیں۔ امریکہ کے لوگ ہر قسم کی طاقت رکھنے کے باوجود یہ جانتے ہیں کہ فلمی دنیا والی کارکردگی دکھانے سے حقیقی دنیا میں نتائج نہیں نکل سکتے۔ مگر اسی دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ اس کے باوجود وہ فلمی دنیا جیسے ڈرامے دکھا کر یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ حقیقی زندگی میں کامیابی کا ہمالیہ پہاڑ بنا لیں گے۔

ان دنوں روس کے بچوں کے تھیٹر کے ڈائرکٹر پچنیکوف (Gennady M. Pechnikov) ہندستان آئے ہوئے تھے۔ پٹریاٹ (۲۴ نومبر ۱۹۸۴) میں ان کا ایک بیان شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے رامائن اور مہابھارت پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ جملہ بھی تھا:

Ramayana is much more than a religious book. It reflects man's eternal quest for truth.

رامائن کی حیثیت مذہبی کتاب سے بہت زیادہ ہے۔ وہ خارجی دنیا میں انسان کی تلاش حق کی عکاسی کرتی ہے۔

پچنیکوف نے یہ بات اس لئے کہی کہ وہ اپنے اشتراکی ذہن کی وجہ سے مذہب کو صرف ایک مفروضہ روایت سمجھتے ہیں۔ اگر وہ مذہب کی حقیقت کو جانتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ مذہب اور سچائی دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ انسان کی تلاش حق کے صحیح جواب ہی کا دوسرا نام مذہب ہے۔

دہلی سے ٹھیک ساڑھے چھ بجے صبح کو روانگی ہوئی۔ نو گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد ہمارا جہاز روم میں اترا۔ دہلی سے روم کا فاصلہ سات ہزار کلومیٹر سے کچھ زیادہ ہے۔

میں اگلے جہاز کے انتظار میں روم کے بین اقوامی ہوائی اڈہ پر تھا۔ میرے سامنے ہوائی اڈہ کا وسیع میدان پھیلا ہوا تھا۔ ایک کے بعد ایک جہاز روانہ ہو رہے تھے۔ ابتداءً وہ کھڑے ہوئے نظر آتے پھر وہ متحرک ہو کر تیز دوڑنے لگتے۔ پھر وہ فضا میں بلند ہو کر اڑنے لگتے۔ بظاہر جہاز ایک بے جان مادہ کا مجموعہ ہے مگر یہی بے جان مادہ متحرک ہو کر تیزی سے چلنے لگتا ہے۔

"یہ واقعہ بھی موسیٰ کے عصا سے کم عجیب نہیں،" میں نے سوچا "وہ اندھے لوگ تھے جن کو عصا کا معجزہ دکھانے کی ضرورت پیش آئی۔ ورنہ یہاں کائنات کی ہر چیز معجزہ ہے۔ حضرت موسیٰ کی لاٹھی کا متحرک

ہوکر زمین پر چلنے لگنا جتنا عجیب ہے اتنا ہی عجیب یہ بھی ہے کہ بے حرکت مادہ ایسی سواریوں میں تبدیل ہو جائے جو دوڑتی ہیں، جو اڑتی ہیں۔ جو تیز رفتاری کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو بھی وہی خدا چلا رہا ہے جس نے موسیٰ کے عصا کو چلایا تھا۔

اس حقیقت کی طرف خود قرآن میں اشارہ موجود ہے۔ حضرت موسیٰ کے عصا کے بارہ میں قرآن میں یہ الفاظ ہیں کہ : فاذا ھی حیۃ تسعیٰ اور عام چیزوں کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ یخرج الحی من المیت۔ ان دونوں آیتوں کے الفاظ الگ الگ ہیں۔ مگر دونوں آیتیں ایک ہی حقیقت کو بتا رہی ہیں۔ روزمرہ کے مشاہدہ میں مادہ کا زندہ چیز بن کر چلنے لگنا بھی اسی خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے جس کے حکم سے ایک لاٹھی سانپ بن کر چلنے لگی تھی۔

روم میں چند گھنٹے قیام کے بعد ایرمراک (۹۵۵) کے ذریعہ آگے کے لئے روانگی ہوئی۔ شام کو میں کیسا بلانکا پہنچا۔ یہ مراکو کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کا کچھ حصہ پرانے وضع کا ہے اور کچھ جدید وضع پر بنایا گیا ہے۔ یہ اس ملک کا تجارتی مرکز ہے۔ بیرونی ملکوں کے لوگ کثرت سے یہاں آتے ہیں، تجارت کے لئے بھی اور سیاحت کے لئے بھی۔

کیسا بلانکا اٹلانٹک کے عین ساحل پر واقع ہے۔ اس کا قدیم عربی نام الدار البیضاء ہے۔ مغربی استعمار کے زمانہ میں وہ کیسا بلانکا (Casablanca) کے نام سے مشہور ہوا۔ دونوں لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی سفید گھر۔ الدار البیضاء عربی لفظ ہے اور کیسا بلانکا اسی کا اسپینی مترادف ہے۔

کیسا بلانکا میں میرا قیام ہوٹل سفیر (روم ۱۲۰۷) میں تھا۔ یہ ہوٹل اٹلانٹک کے ساحل کے قریب ہے۔ یہاں سے اٹلانٹک کی موجیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ جب اس پر نظر پڑی تو یہ سوچ کر میری عجیب کیفیت ہوئی کہ یہی وہ سمندر ہے جس کے دوسری طرف کھڑے ہو کر طارق بن زیاد نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا : البحر وراءکم والعدو امامکم (سمندر تمہارے پیچھے ہے اور دشمن تمہارے آگے ہے) پھر یہیں سے گزر کر طارق بن زیاد اسپین میں داخل ہوا اور یورپ میں اسلام کی تاریخ کا آغاز کیا۔ اگرچہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے یہ پیش قدمی زیادہ دور تک نہیں پہنچ سکی۔ تاہم یہ تاریخ مسلمانوں کو بہت بڑا سبق دے رہی ہے۔ یہ کہ انھیں کیا کرنا چاہئے اور یہ بھی کہ انھیں کیا نہیں کرنا چاہئے تاکہ ان کی قوتیں اسباب کی اس دنیا میں بے نتیجہ ہو کر نہ رہ جائیں۔

۲۵ نومبر کو میں ہوٹل کے باہر کی سڑک پر ٹہل رہا تھا کہ پولس کے ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے عربی میں بات شروع کی۔ مجھے اس کے لہجہ کو سمجھنے میں دقت پیش آئی۔ میں نے اس سے اپنا کلام دہرانے کے

سے کہا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا کہ یہ تو ہم فصیح عربی زبان میں بولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ہم مراکو کے لہجہ میں عربی بولیں تو وہ آپ بالکل نہیں سمجھ سکیں گے۔ اس کے بعد وہ مراکو کے لہجہ میں بولنے لگا تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا عربی کے علاوہ کوئی اور زبان بول رہا ہے۔

حضرت علی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف عرب قبائل سے ان کی اپنی بولی میں گفتگو کرتے تھے اور ہم اس کو بالکل سمجھ نہیں پاتے تھے۔ یہ صورت حال اسی لہجہ کے فرق سے پیدا ہوتی تھی۔ لہجہ کا فرق سننے والے کے لئے ایک زبان کو ایسی زبان بنا دیتا ہے جیسے وہ کوئی دوسری زبان ہو۔

ہندستان میں میں پچھم کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتا تھا۔ مراکو میں اس کے برعکس پورب کی طرف رخ کرکے نمازیں ادا کیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مراکو قبلہ کے دوسری سمت میں واقع ہے۔ اس سفر نے مجھے زمین کے ایک طرف سے اٹھا کر اس کی دوسری طرف پہنچا دیا تھا۔ مراکو میں اس طرح نماز پڑھتے ہوئے اچانک یہ احساس ہوا کہ مسلمان "پورب" اور "پچھم" کا پابند نہیں، وہ صرف "قبلہ" کا پابند ہے۔ دنیا اس رخ پر جارہی ہو یا اس رخ پر، ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم خدا کے رخ پر قائم رہیں، ہم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے کبھی نہ ہٹیں۔

کیسابلانکا میں شہر کے اندرونی حصوں میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی جو یہاں کا باشندہ ہے۔ مگر وہ صرف فرانسیسی میں بول سکتا تھا۔ عربی زبان بولنے پر قادر نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں کچھ ایسے خاندان بھی ہیں جو فرانسیسی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے۔ یہ فرانس کے دور اقتدار کی نشانی ہے۔ یہاں ٹیلی وژن سے لے کر زبان اور فرنیچر ہر چیز پر فرانسیسی تہذیب کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام پس منظر میں جاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کہ وہ ایک تاریخی روایت بن گیا ہو۔

کیسابلانکا کی مختلف سڑکوں سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ مگر سڑک پر کوئی مسجد یا مینار دکھائی نہیں دیا۔ اذان کی آواز بھی کسی وقت سننے میں نہیں آئی۔ سڑکوں پر ہوٹل اور بینک اور دفاتر کی بڑی بڑی عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں۔ مگر ان کے درمیان کہیں مسجد ابھری ہوئی نظر نہ آئی۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ مسجدیں سڑکوں کے پیچھے پائی جاتی ہیں۔ تاہم وہ زیادہ شاندار نہیں ہیں۔

ہندستان سے نکل کر ہم بہت سے ملکوں سے گزرتے ہوئے مراکو پہنچے۔ مثلاً خلیج عرب کے ممالک، شام ترکی، یونان، اٹلی وغیرہ۔ ان ملکوں میں سے کسی کا میرے پاس ویزا نہیں تھا۔ جب کہ مراکو میں داخلہ کے لئے مجھے نئی دہلی کے سفارت خانہ سے باقاعدہ ویزا لینا پڑا۔

اس فرق کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مراکو میں میں زمینی مسافر تھا اور یہاں مجھ کو قیام کرنا تھا۔

ہے کہ دوسرے ملکوں کا میں نے صرف ہوائی سفر کیا اور ان کی زمین پر نہیں اترا ــــــ اگر آپ کسی شخص یا قوم سے اوپر اوپر گزر جائیں تو وہ آپ سے تعرض نہیں کرتا لیکن اگر آپ اس کی حقیقی زندگی میں داخل ہونے کی کوشش دیں تو وہ تعرض کرے گا اور آپ کے خلاف رکاوٹیں ڈالے گا۔

قوموں کا یہ مزاج زندگی میں کامیابی کا نہایت گہرا اصول دیتا ہے۔ یہ کہ آدمی لوگوں کو چھیڑے بغیر اپنا کام کرے۔ وہ اپنا منصوبہ اس طرح پورا کرے کہ وہ لوگوں کو بالکل بے ضرر معلوم ہو۔ شاید یہی وہ بات ہے جس کو حضرت مسیح نے ان لفظوں میں فرمایا تھا "تم سانپ کی مانند ہوشیار اور کبوتر کی مانند بے آزار ہو"

بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے مسلمان اس کے برعکس ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے لیڈر ضرر رسانی سے اپنے کام کا آغاز کرتے ہیں۔ دین کے نام پر قتل، دین کے نام پر نفرت، دین کے نام پر جھگڑوں اور ہنگاموں نے اکثر ملکوں میں دینی کام کرنے کو انتہائی دشوار بنا دیا ہے۔

افریقہ کے ایک صاحب جو کیسابلانکا کی اسلامی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے ملک میں مسلمان چوں کہ عام طور پر پرامن ہیں اور وہ بڑی حد تک سیاست سے الگ رہتے ہیں، اس لئے وہاں تبلیغ اسلام کے کام پر کوئی پابندی نہیں۔ یہاں اگرچہ عیسائی حکومت ہے مگر وہ اس کی پرواہیں کرتی۔ چاہے سارے لوگ اسلام سے نکل جائیں یا سارے لوگ اسلام میں داخل ہو جائیں (الحکومة لاتھتم بذالك فليخرجوا كلهم اويدخلوا كلهم) یہی صورت حال تقریباً پورے افریقہ میں ہے۔

اس صورت حال نے افریقہ کے عظیم بر اعظم میں اس کا امکان پیدا کر دیا ہے کہ یہاں بغیر روک ٹوک اسلام کی اشاعت کی جاسکے۔ اگرچہ عملاً ابھی اس امکان کو بہت کم استعمال کیا جاسکا ہے ــــــ کچھ ملکوں میں مسلمان اپنے خلاف جھوٹی رکاوٹیں کھڑی کرکے دینی کام کی راہ میں مشکلات پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اور کچھ ملکوں میں اپنی غفلت کی وجہ سے مواقع کو استعمال کرنے سے محروم ہیں۔ نتیجہ دونوں جگہ یکساں ہے۔ اگرچہ ایک مقام پر ایک سبب سے اور دوسرے مقام پر دوسرے سبب سے۔

میرے پاس کانفرنس کی طرف سے جو ٹکٹ آیا تھا اس میں ۲۴ نومبر کا پیشگی رزرویشن تھا۔ میں نے سمجھا کہ شاید ۲۵ نومبر سے کارروائی شروع ہونے والی ہے۔ چنانچہ رزرویشن کے مطابق ۲۴ نومبر کو دہلی سے روانہ ہو کر اسی دن شام کو کیسابلانکا پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اصل کارروائی ۲۸ نومبر سے شروع ہوگی۔ اس طرح مجھے تین دن (۲۵ - ۲۶ - ۲۷ نومبر) غیر ضروری طور پر کیسابلانکا میں گزارنے پڑے۔ یہ تین دن اگرچہ مجھے "فائو اسٹار ہوٹل" میں گزارنا تھا۔ مگر یہ تین دن آتنی مشکل سے گزرے کہ ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ تین صدیاں گزر گئیں ۔ میں نے آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میرے بالوں کی سفیدی میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔ جن لوگوں کے سامنے کوئی برتر مقصد نہ ہو ان کے لئے اس طرح کے ایام تفریح کے ایام ہوتے ہیں۔ مگر ایک با مقصد انسان کے لئے تین دن یقیناً تین صدیوں سے کم نہیں۔

وہ چیز جس کو فائیو اسٹار ہوٹل کہتے ہیں حقیقۃً ایئر کنڈیشنڈ جیل خانہ کا دوسرا نام ہے۔ ایسے ہوٹلوں میں آدمی کو ایک ایسے ماحول میں بند کر دیا جاتا ہے جہاں ہر چیز مصنوعی ہوتی ہے۔ دھوپ کی جگہ بجلی، ہوا کی جگہ ایر کنڈیشنر، گھاس کے فرش کی جگہ قالین، سبزہ کی جگہ پلاسٹک کے پھول اور پودے۔ چڑیوں کے نغمے کی جگہ انسانی موسیقی، نیلے آسمان کی جگہ منقش چھت، غرض ہر چیز مصنوعی طور پر فراہم کی جاتی ہے۔ آدمی بڑے بڑے شیشوں کے پیچھے سے قدرت کے مناظر دیکھتا ہے مگر وہ ان سے براہ راست مربوط نہیں ہو سکتا۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ قدرت کے مشینی بدل کے اندر محبوس ہو کر اپنے صبح و شام گزارتا رہے۔

ہوٹل سفیر میں میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ اس کے اندر کوئی کھلی ہوئی جگہ ہے جہاں قدرتی ہوا اور دھوپ مل سکے۔ انھوں نے مسکرا کر کہا کہ میرا خیال ہے کہ نہیں۔ انھوں نے ہر قدرتی چیز کو بند کر رکھا ہے (ھم قفلوا کل شئ) تلاش و جستجو کے بعد بالآخر میں نے ایک جگہ ڈھونڈ نکالی اور وہاں جا کر دھوپ اور کھلی ہوا میں بیٹھنے لگا۔ میرے ساتھ ایک اور صاحب تھے انھوں نے کہا آپ کو اس قسم کا ماحول بہت پسند ہے۔ میں نے کہا، اس میں مجھے ایک قسم کا ربانی لمس محسوس ہوتا ہے۔

اس کانفرنس میں مختلف ملکوں اور براعظموں کے لوگ شرکت کے لئے آئے تھے۔ میں نے افریقہ کے ایک صاحب سے افریقہ کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کے بارہ میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم ان میں آئی ہے مگر ابھی اس معاملہ میں وہ اپنے پڑوسی عیسائیوں سے بہت پیچھے ہیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ ماضی میں ہمارے لوگوں کا خیال یہ ہو گیا تھا کہ تعلیم ایک ایسی چیز ہے جو آدمی کو ایمان سے دور کر دیتی ہے (التعلیم شئ یبعد الرجل من الایمان)۔ یہی حال ہندستان میں بھی مسلمانوں کا ہوا ہے۔

جن بزرگوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روکا وہ اگرچہ نیک نیت تھے۔ مگر ان کی غلطی یہ تھی کہ وہ جدید تعلیم کی نوعیت کو سمجھ نہ سکے۔ مثال کے طور پر اگر وہ کمیونزم کی تعلیم سے روکتے تو یہ صحیح ہوتا کیونکہ کمیونزم ذہن کے فساد کا دوسرا نام ہے۔ مگر انھوں نے سائنس کی تعلیم سے بھی مسلمانوں کو دور رکھنے کی کوشش کی۔ حالانکہ سائنس موجودہ زمانہ میں قوت کے ہم معنی تھی۔ سائنس کی تعلیم میں پیچھے ہونے کی وجہ سے مسلمان دور جدید میں کم از کم سو سال پیچھے ہو گئے۔ مسلمانوں کے پاس اگرچہ قدرتی ذخائر کی کثرت ہے۔ مگر دوسری قومیں ان کا

استقلال کھو رہی ہیں اور اپنی تعلیمی پس ماندگی کی وجہ سے وہ ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔

کیسا بلانکا میں شراب اور نائٹ کلب تک کی آزادی ہے۔"پورک" کی دکان بھی نظر آئی۔ اس لئے یہاں مغربی سیاح کثرت سے آتے ہیں۔ یہ سیاحوں کا شہر بن گیا ہے۔ ایک عرب اپنی بیوی اور دو چھوٹے بچوں کے ساتھ آئے اور ہوٹل سفیر میں مقیم ہوئے۔ وہ غالباً سیاحت کی غرض سے یہاں آئے تھے۔ میں نے دیکھا تو ان کے بیوی بچے فیشن کے سامان اور جدید طرز کے کھلونوں سے لدے ہوئے تھے۔ ایک موقع پر ان عرب صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ جدید مادی تہذیب کے خلاف بے تکان بولنے لگے۔ میں نے سوچا کہ وہ لوگ بھی کیسے عجیب ہیں جو خود تو عملاً اپنے پورے خاندان کے ساتھ مادی تہذیب میں غرق ہیں اور زبان سے اس کے خلاف تقریر کرنے میں مشغول ہیں۔

یہی موجودہ زمانہ میں اکثر پڑھے لکھے مسلمانوں کا حال ہو گیا ہے۔ وہ جدید مادی تہذیب کے خلاف خوب لکھتے اور بولتے ہیں مگر ان کے گھر کو اور ان کے بیوی بچوں کو دیکھئے تو سراپا مادی تہذیب میں ڈوبے ہوئے نظر آئیں گے۔ حتی کہ ایک مسلمان جو میرے ساتھ ہوائی جہاز میں میرے بغل کی سیٹ پر تھے، انھوں نے ہوائی جہاز کی ضیافت کو قبول کرتے ہوئے شراب لی۔ اتفاق سے وہ بھی اسی ہوٹل سفیر میں آکر ٹھہرے۔ ایک ملاقات کے دوران ان سے گفتگو ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ" آجکل مسلمانوں کے معاملات بالکل غیر اسلامی ہو گئے ہیں"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ مسلمانوں کے لئے اسلام بھی مختلف فیشنوں میں سے ایک فیشن بن گیا ہے۔

ہر مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ وہ خود جو چاہے کرے۔ اس کو اپنے آپ پر اسلام کو نافذ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی اسلامیت کے ثبوت کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ دوسروں کی غیر اسلامی روش پر لکھنے اور بولنے کی لامتناہی صلاحیت رکھتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسلام پر لکھنے اور بولنے والے بے شمار تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں مگر لوگوں کا یہی وہ تضاد ہے جس نے ان کی تمام کوششوں کو بالکل بے نتیجہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

کیسا بلانکا میں چڑیاں کافی نظر آئیں۔ مگر یہ سب سمندری چڑیاں تھیں۔ جانور ہمیشہ اپنے ماحول کی مناسبت سے جمع ہوتے ہیں۔ سمندری ماحول میں سمندری چڑیاں، صحرائی ماحول میں صحرائی چڑیاں اور سرسبز پہاڑوں کے ماحول میں پہاڑی چڑیاں۔ یہی حال انسانوں کا بھی ہے۔ وہ بھی اپنے اپنے ذوق کے مطابق جمع ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی تحریک کے ساتھ سیاست کی چاشنی لگا دیں تو سیاسی ذوق کے لوگ جوق در جوق آپ کے پاس اکٹھا ہو جائیں گے۔ اگر آپ کی تحریک کے ساتھ تصوف کی غذا موجود ہو تو برکت تلاش کرنے والوں کی بھیڑ آپ کے گرد نظر آنے لگے گی۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو کینیا سے اس اجتماع میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ ان کی

عمر ابھی ۴۷ سال ہے۔ مگر کم عمر ہونے کے باوجود انھوں نے وہ کام کیا ہے جو بڑوں کے کام سے زیادہ قیمتی ہے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Shariff Salim Shariff Hussein
P.O. Box 128, Marsabit, Kenya. E. Africa

آجکل کی زبان میں وہ کوئی معروف و مشہور آدمی نہیں مگر انھوں نے بہت قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ جناب شریف سالم شریف حسین نے بتایا کہ وہ پہلے راجدھانی نیروبی میں رہتے تھے۔ وہاں ان کے لئے ذاتی اعتبار سے بہت مواقع تھے۔ مگر انھوں نے محسوس کیا کہ شہروں سے کام کرنا مکان کو گویا چھت کی طرف سے تعمیر کرنا ہے۔ وہ نیروبی چھوڑکر ایک ہزار کلو میٹر دور ایک گاؤں مرسابت چلے گئے۔ وہاں اس وقت ان کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے بنیاد کھود کر ایک مدرسہ اور مسجد بنایا۔ انھوں نے کچھ ساتھیوں کو جوڑ کر یہ کوشش کی کہ لوگوں کے ذہن کو جگائیں۔ انھوں غریب بچوں کے کپڑے فراہم کئے۔ انھوں نے ضرورت مند کسانوں کو مویشی خرید کر دئے۔ اس علاقہ کے لوگ بہت غریب ہیں۔ مگر انھوں نے لوگوں کے اندر حوصلہ پیدا کیا کہ تمہارے ہاتھ پاؤں تمہاری سب سے بڑی دولت ہیں مثلاً وہ ایک گاؤں میں گئے۔ وہاں وعظ کیا۔ گاؤں والوں نے کہا ہمارے یہاں نہ مسجد ہے اور نہ مدرسہ۔ انھوں نے کہا کہ تمہارے پاس سب کچھ ہے۔ تمہارے پاس پانی ہے۔ مٹی ہے پتھر ہے لکڑیاں ہیں۔ اور خدا کے دئے ہوئے ہاتھ ہیں ان کو استعمال کرو۔ چنانچہ ان کی تحریک سے لوگوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اینٹ تیار کی اور لکڑیاں جمع کیں اور تھوڑی سی سیمنٹ خرید کر خود اپنی محنت سے ایک مسجد اور مدرسہ کھڑا کر دیا۔

یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا "یہ مسجد اور مدرسہ اگر کسی بیرونی ملک کے ڈالر سے بنا ہوتا تو کسی کو اس سے دلچسپی نہ ہوتی۔ مگر آج گاؤں والوں کو اس کی ایک ایک اینٹ سے محبت ہے کیونکہ اس اینٹ کو انھوں نے خود اپنا پسینہ بہا کر بنایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ پورا علاقہ اس سے پہلے پس ماندہ ت میں پڑا ہوا تھا مگر آج اس کو ہمارے گاؤں نے جگا دیا ہے (ولٰکن قرصتنا ھذا الاٰن ایقظتھم)

وہ تعلیم، تعمیر، دعوت اور اصلاح ہر میدان میں کام کر رہے ہیں انھوں نے اس کی جو تفصیل بتائی اس کو لکھنے کے لئے ایک پورا مضمون چاہئے تاہم اس کو سن کر میرے دل نے کہا کہ یہی غیر معروف لوگ ہیں جو دراصل اسلام کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ورنہ جہاں تک معروف اور مشہور لوگوں کا تعلق ہے انھوں نے تو اسلام کے نام پر اپنی شخصیت کی تعمیر کی ہے نہ کہ خود اسلام کی۔

۲۷ نومبر کو جب میں صبح ۴ بجے سو کر اٹھا تو اچانک خیال آیا کہ اگر دنیا سے ہوائی جہاز کا نظام ختم ہو جائے پانی کے مشینی جہاز بھی موجود نہ رہیں تو میں کیسا بلا نکاسے دہلی کس طرح واپس جاؤں گا۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہو جائے تو اتنا دور دراز سفر طے کر کے دوبارہ میرے لئے اپنے وطن واپس پہنچا ممکن نہ ہوگا۔ اگر میں کسی طرح سے واپس روانہ ہوں تو شاید راستہ ہی میں مر جاؤں گا۔ غالب گمان یہ ہے کہ میرے مرنے کی خبر بھی میرے گھر والوں کو نہ مل سکے گی۔

ہمارے وہ اسلاف کیسے عجیب لوگ تھے جنھوں نے مشینی انقلاب سے پہلے خدا کے دین کو سارے عالم میں پہنچایا۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے کیا کیا مشقتیں اٹھائی ہوں گی۔ آج کے ایک انسان کے لئے ان کا اندازہ کرنا بھی ممکن نہیں ——— دین کا جو کام انھوں نے محنتوں کے ذریعہ کیا اس کو آج ہم سہولتوں کے ذریعہ بھی کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

ریاض کے اخبار الشرق الاوسط (۲۸ نومبر ۱۹۸۴) میں ایک مضمون اسرائیل کے بارہ میں تھا۔ اس میں یہ قصہ درج تھا کہ ایک عرب خاتون اسرائیل کے زیر قبضہ علاقہ سے باہر جا رہی تھی۔ سرحد پر ایک واقعہ گزرا جو اخبار کے الفاظ میں یہ تھا:

قال لها الضابط الاسرائيلي: وين رايحة يا هاي (الى اين انت ذاهبة يا امرأة)	اسرائیلی فوجی نے کہا کہ اے عورت تو کہاں جا رہی ہے۔
قالت له انها ذاهبة الى الكويت لزيارة ابنائها.	اس نے جواب دیا کہ میں کویت جا رہی ہوں، اپنے بچوں سے ملنے کے لئے۔ فوجی نے کہا کہ ان سے میرا سلام
قال لها: سلمي عليهم وقولي لهم سنكون عندهم	کہنا اور ان سے کہنا کہ ہم جلد ہی ان کے یہاں ہوں گے۔

ایک صاحب لندن سے آئے تھے۔ وہ خود تو اردو نہیں جانتے تھے مگر وہ میرے لئے کچھ اردو اخبارات کا تحفہ لائے تھے جو پاکستانی حضرات لندن سے شائع کرتے ہیں۔ ان کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ اخبارات نہیں ہیں بلکہ قوم کی موت کا مرثیہ ہیں۔ دو سرخیاں ملاحظہ ہوں:

۱. جشن میلاد النبی پر لندن میں فرزندان توحید کا فقید المثال جلوس
عاشقان رسول کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر (وطن ۲۶ نومبر ۱۹۸۴)

۲. پاکستان بھارت سے مرعوب نہیں ہوگا۔
بھارت کو فوج کشی کا شوق ہے تو اسے پورا کر کے دیکھ لے (جنگ ۲۶ نومبر ۱۹۸۴)

یہ دونوں سرخیاں ان اخبارات کی شاہ سرخیاں ہیں۔ جس قوم کے دانشور اتنے سطحی ہو جائیں کہ اس قسم کی سرخیوں کے ساتھ اخبار نکالیں اور جس قوم کے عوام اتنے بےشعور ہوں کہ اس قسم کی خبروں اور سرخیوں کو

پڑھ کر خوش ہوتے ہوں ان کو تاریخ کے تھیٹر میں شاید جگہ مل سکتی ہو، مگر حقیقی دنیا میں بہر حال وہ جگہ پانے کے مستحق نہیں ہیں۔

یہ کانفرنس " اسلام کی عالمی دعوت " کے موضوع پر تھی۔ اس موقع پر مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے لوگوں پر یہ بات واضح نہیں ہے کہ اسلامی دعوت خود کیا چیز ہے۔ تفصیلات سے قطع نظر، سب کی باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ انھوں نے " مشاکل العالم اور مشاکل المسلمین " کے میدان میں کام کرنے کو اسلامی دعوت کا کام سمجھا اور اسی کے بارہ میں تقریریں کیں۔

میں نے اپنے مختصر اظہار خیال میں کہا کہ وہ چیز جس کو " الدعوۃ الاسلامیۃ " کہا جاتا ہے، اس کا تعلق دنیا کے مسائل سے نہیں بلکہ آخرت کے مسائل سے ہے۔ خدا نے جس منصوبہ کے تحت انسان کو پیدا کیا ہے اور اس منصوبہ کے مطابق بالآخر انسان کو جس فیصلہ الٰہی کا سامنا کرنا ہے اس سے لوگوں کو باخبر کرنا وہ چیز ہے جس کو اسلامی دعوت کہا گیا ہے۔ مسلمان موجودہ دنیا میں جن مشکلوں سے دوچار ہیں یا قومیں جن مسائل میں مبتلا ہیں ان کے سلسلے میں بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر اس کام کا عنوان دعوت الی اللہ نہیں۔

کانفرنس جس ہال کے اندر ہوئی وہاں جلی حرفوں میں قرآن کی یہ آیت لکھی ہوئی تھی : یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس۔ میں نے اس آیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آیت کے مطابق عصمت من الناس کو حاصل کرنے کا ذریعہ دعوت الی اللہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہمارے لئے جو یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ ہم دوسری قوموں کے ظلم و تعدی سے محفوظ نہیں ہیں، وہ اس آیت کے مطابق دعوت الی اللہ کے کام کو چھوڑنے کا نتیجہ ہیں۔ بذات خود اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ اس لئے مسلمانوں کی مشکلات کو حل کرنے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ دعوت الی اللہ کے اصل کام کو جاری کیا جائے۔

ایک صاحب سوئزرلینڈ سے آئے تھے۔ ان کے یہاں انگریزی الرسالہ پابندی سے بھیجا جا رہا ہے۔ وہ خود بھی سوئزرلینڈ سے ایک انگریزی ماہنامہ شائع کرتے ہیں۔ انھوں نے الرسالہ انگریزی کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے کہا کہ میں اور میرے ساتھی آپ کا میگزین شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس میں مغز (Substance) ہوتا ہے۔ جب کہ مسلمانوں کے انگریزی اور عربی جرائد میں یہی چیز سب سے کم ملتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلم دنیا کا کوئی بھی پرچہ مجھے نہیں معلوم جس میں اتنا مغز (Substance) ہوتا ہو جتنا آپ کے انگریزی الرسالہ میں ہوتا ہے۔

ایک صاحب گامبیا سے آئے تھے۔ ان کو ہمارے یہاں کا چھپا ہوا تعارفی سٹ (انگریزی) بھیجا گیا

تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں کئی لوگوں نے اس کو پڑھا اور اتنا زیادہ پسند کیا کہ ان کو بے حد اشتیاق ہو گیا کہ مصنف کو دیکھیں۔ وہ لوگ مزید انگریزی کتابوں کا شدت کے ساتھ تقاضا کر رہے ہیں۔ ان کے نام الرسالہ انگریزی جاری کر دیا گیا ہے۔

ایک صاحب یوگوسلاویہ سے آئے تھے۔ انھوں نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ دنیا بھر میں پناہ گزینوں (لاجیئن) کی جو تعداد ہے، اس میں ۹۰ فی صد سے زیادہ مسلمان ہیں۔ یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر وہ چیز طاری کر دی گئی ہے جس کو قرآن میں "ذلت و مسکنت" کہا گیا ہے۔ ہم کو گہرائی کے ساتھ سوچنا چاہئے کہ مسلمانوں کا یہ حال کیوں ہے۔ مسلمان موجودہ زمانہ میں دوسری قوموں سے پیچھے کیوں ہو گئے۔

ایک صاحب جو کویت سے آئے تھے۔ انھوں نے موجودہ زمانہ کی مسلم تنظیموں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ تنظیمیں قرآن و سنت کی بنیاد پر اٹھی ہیں اس لئے ان کے پاس اچھے افکار کی کمی نہیں۔ مگر اس دنیا میں صرف فکر کافی نہیں بلکہ نظم اور منصوبہ بندی بھی لازمی طور پر ضروری ہے۔ اس اعتبار سے ان تنظیموں کی حالت افسوس ناک ہے۔ انھوں نے کہا کہ مغربی ممالک اسی لئے ہم سے آگے بڑھ گئے ہیں کہ وہ منظم انداز سے کام کرتے ہیں۔ اور ہم اس لئے پیچھے ہو گئے ہیں کہ ہمارا کام نظم و ترتیب سے خالی ہوتا ہے (وما تفوق الغرب منا الا بالنظام وما تاخرنا منه الا بالفوضى وعدم النظام)

ایک صاحب جو کناڈا سے آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ کناڈا کی کل ۲۵ ملین آبادی میں ڈیڑھ لاکھ مسلمان ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کناڈا میں مکمل آزادی ہے۔ کسی قسم کا کوئی تعصب نہیں ہے۔ وہاں اسلامی دعوت کا کام کرنے کے زبردست مواقع ہیں۔ مگر ہندستان اور پاکستان کے لوگوں نے وہاں آکر آپس کے مذہبی جھگڑے کھڑے کر دئے ہیں۔ وہاں دوسروں کی طرف سے ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں۔ مگر اپنوں کی طرف سے مشکلات پیش آرہی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہاں ایک نئی مسجد بنائی گئی ہے جس کی مالیات کی فراہمی میں نے ۸۰ فی صد تک تعاون کیا تھا۔ مگر جب مسجد بن گئی تو اس کے اندر شدید مذہبی جھگڑے کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ میں نے اور میری طرح بہت سے لوگوں نے اس مسجد میں جانا ہی چھوڑ دیا۔

انھوں نے بتایا کہ مغرب میں مسلمانوں کی تصویر بہت خراب ہے۔ ان کو امکانی دہشت پسند (Potential terrorists) کہا جاتا ہے۔ اس میں اگرچہ یہودی پروپیگنڈے کا دخل ہے۔ مگر خود مسلمانوں نے اپنے عمل سے بھی اس کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اور یہ دوسرا پہلو یقیناً زیادہ افسوس ناک ہے۔

رابطۃ الجامعات الاسلامیہ (ص ۔ ب ۲۴۲، الرباط) ایک ششماہی مجلہ شائع کرتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۵ میں "کتاب العدد" کے عنوان کے تحت حیات الصحابہ (مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ) پر تبصرہ تھا۔ کتاب کے ابواب کی تفصیل دیتے ہوئے تبصرہ نگار نے لکھا تھا کہ علماء کا قول ہے کہ قرآن کے بعد پیغمبر اسلام کا سب سے بڑا معجزہ آپ کے اصحاب کرام ہیں (ان اعظم معجزۃ للرسول بعد القرآن ھم صحابتہ الکرام)

چنانچہ اصحاب رسول کے حالات پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر حیات الصحابہ اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ مصنف نے زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے صحابہ کی زندگی کو بطور نمونہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح یہ ایک ایسی کتاب بن گئی ہے جس کی مثال کسی بھی دوسری کتاب میں نہیں ملتی (ھکذا عالج سیرۃ الرسول وصحابتہ الکرام بطریقۃ لانجدھا فی ای کتاب غیرہ)

تبصرہ نگار نے مزید لکھا ہے کہ ایک عرب شیخ اپنے طالب علموں کو مستقل طور پر اس کتاب کے مطالعہ پر ابھارتے رہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ: ان ھذا الکتاب لم یؤلف علی منوالہ فی بابہ یعنی اس موضوع پر اس اسلوب میں اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

ایک صاحب بڑے پرجوش تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے تمام مسائل کا حل جہاد ہے۔ جہاد سے ان کی مراد قتال تھی۔ میں نے کہا کہ امت کے رہنما اسی قسم کے جہاد میں تو سو سال سے لگے ہوئے ہیں۔ پھر مسائل حل کیوں نہیں ہوئے۔ انھوں نے قرآن سے قتال کی آیتیں پڑھنا شروع کیں۔ میں نے کہا کہ جن لوگوں نے قرآن میں صرف قتال اور جہاد کی آیتوں کو پڑھا ہے انھوں نے قرآن کو پڑھا ہی نہیں۔ قرآن اعراض کی بھی تعلیم دیتا ہے جس کی مثال مکی دور کی زندگی ہے۔ قرآن ایڈجسٹمنٹ کی بھی تعلیم دیتا ہے جس کی ایک مثال صلح حدیبیہ ہے۔ قرآن قتال کی بھی تعلیم دیتا ہے جس کی مثال بدر اور احد کے واقعات ہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ پہلی دونوں قسم کی تعلیمات بھول جائیں اور صرف قتال اور جہاد کی تعلیمات کو زور وشور کے ساتھ پیش کریں، ان کا یہ پیش کرنا ویسا ہی ہے جیسے بہت سے غیر اسلامی ذہن کے لوگ قرآن کی ایک آیت کو لے لیتے ہیں اور اس سے اپنا مدعا ثابت کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ہمارے جنگجو رہنماؤں کا قرآن کو پانا ایسا ہی ہے جیسے مذکورہ غیر اسلامی لوگوں کا قرآن کو پانا۔

ایک عالی شان ہوٹل تھا ایک بہت بڑے سجے ہوئے کمرہ میں لوگ قیمتی صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگ ہنس رہے تھے۔ سگرٹ اور مشروبات پی رہے تھے۔ بےفکری کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کسی چیز میں حصہ نہیں لیا۔ بالکل خاموشی میں ایک نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک صاحب نے مجھ سے اس

مالی میں دیکھ کر پوچھا کہ آپ کیوں اس طرح چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں پھر بھی چپ رہا۔ ان کے بار ار سوال پر میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے لوگوں کا حال دیکھ کر اکثر میرا دل یہ کہنے لگتا ہے کہ: الناس فرحون لکی لا یفرحوا بعد ذالک ابداً۔ الناس یضحکون لکی لا تیسر لہم الضحک بعد ذالک ابداً۔

ایک موقع پر افریقہ میں قحط اور بھوک کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب جو آجکل کی زبان ں "چین اسموکر" تھے۔ وہ ایک کے بعد ایک قیمتی سگریٹ سلگا رہے تھے۔ انھوں نے دھواں اڑاتے سے کہا کہ آج کا اصل مسئلہ بھوک نہیں۔ آج کا اصل مسئلہ اسراف ہے۔ عرب دنیا میں آج جس طرح مسرفانہ طور ر خدا کی دولت خرچ کی جا رہی ہے۔ اگر اس کو صحیح ڈھنگ پر خرچ کیا جائے تو ساری دنیا میں بھوک کا مسئلہ ل ہو جائے۔ میں خاموش بیٹھا ہوا لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو مطمئن چہروں کے ساتھ بھوک کے مسئلہ پر بے تکان ول رہے تھے۔ میرے دل نے کہا۔

"ہر آدمی دوسرے کی کمیوں سے آخری حد تک باخبر ہے اور اپنی کمیوں سے آخری حد تک بےخبر"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام موجودہ زمانہ میں ایک فیشن بن گیا ہے۔ یہ بھی شاید ایک عالمی ظاہرہ کا ایک حصہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ٹیکنیکل ترقیوں سے پیدا شدہ سنگین مسائل نے بہت سے لوگوں میں یہ ردعمل پیدا کیا ہے کہ وہ "ماضی کی طرف واپسی" کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ انھیں میں سے ایک طبقہ وہ ہے مذہب کی طرف واپسی کی باتیں کرتا ہے۔ اس قسم کے لوگ ہر مذہب میں کثرت سے پیدا ہو گئے ہیں اسی طرح سلمانوں میں بھی ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے جو اسلام کی طرف واپسی کی باتیں کرنے لگا ہے۔ مگر یہ سب کچھ فیشن ہے۔ ان میں سے کوئی حقیقی معنوں میں سنجیدہ نہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ لوگ جو "واپسی" کی باتیں کرتے ہیں ان کا تعلق صرف دوسروں کی واپسی سے ہوتا ہے۔ خود اپنی واپسی سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں۔

فاس (Fes) یہاں کا سب سے مشہور تاریخی شہر ہے۔ اس کو ادریس بن عبداللہ نے ۲۰۲ء ں آباد کیا تھا۔ اس وقت یہاں اسلام عمومی طور پر نہیں پھیلا تھا۔ ادریس بن عبداللہ جو عباسی دار و گیر سے بھاگ کر یہاں آئے تھے۔ انھوں نے اپنی دعوتی کوششوں سے تقریباً پورے ملک کو مسلمان بنا ڈالا۔

۳۰ نومبر ۱۹۸۴ کو فاس کا سفر ہوا۔ صبح کے وقت کانفرنس کے شرکا خصوصی طیارہ کے ذریعہ کیسابلانکا سے فاس لے جائے گئے۔ اور اسی دن شام کو کیسابلانکا واپس آ گئے۔ فاس کا شہر کیسابلانکا سے بذریعہ ہوائی جہاز پون گھنٹہ کی مسافت پر ہے

فاس قدیم زمانہ میں علم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں دور دور سے طلبہ آتے تھے۔ مشہور ہے

کہ ایک شخص کی عالمانہ باتوں کو سن کر کسی نے اس سے پوچھا: کیا تم نے فاس میں علم حاصل کیا ہے۔ اس نے کہا نہیں علم آدمی کے سر میں ہوتا ہے نہ کہ شہر فاس میں (هل تعلمت في فاس. قال لا. العلم في الرأس لا في الفاس)

جدید فاس موجودہ زمانہ کے شہروں کی طرح ہے۔ مگر قدیم فاس تاریخی آثار سے بھرا ہوا ہے۔ سڑکوں سے گزرتے ہوئے متعدد مسجدیں دکھائی دیں۔ یہاں کی مسجدوں کا طرز بالکل مختلف ہے۔ مینار صرف ایک ہوتا ہے جو ایک کونہ پر بنایا جاتا ہے۔

فاس مکمل طور پر ایک تاریخی شہر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں قدیم طرز کی عمارتیں۔ شاہانہ نشست گاہیں، اور قلعے اس کی گزری ہوئی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔ یہاں کی مشہور جامعۃ القرویین بھی دیکھی۔ یہ بہت بڑے رقبہ میں یونیورسٹی کے انداز پر بنائی گئی تھی۔ یہاں عظیم الشان مدرسہ اور اس کے ساتھ عظیم الشان مسجد ہے۔ قدیم زمانہ میں مسلمانوں کی بنائی ہوئی گھڑیاں، اصطرلاب وغیرہ آج بھی سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ تعمیرات قدیم اسپینی محلات کے طرز کی نظر آئیں۔

ہمارے گائڈ نے جامعۃ القرویین کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ اس تعلیم گاہ کا معیار اتنا بلند تھا کہ یہاں صرف وہی شخص داخل ہو سکتا تھا جس کو مہارت حاصل ہو (ولا يدخل في هذا المركز الا من كان له مهارة العلم) یورپ کے آئے ہوئے ایک صاحب سے میں نے ان کا تاثر پوچھا تو انھوں نے کہا:

The glory which was Islam, has now become a tourist attraction.

جو چیز ماضی میں اسلام کی عظمت تھی وہ آج صرف سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بن کر رہ گئی ہے۔

ہم نے جمعہ کی نماز یہاں کی قدیم جامع مسجد میں پڑھی۔ اس کا طرز تعمیر بالکل وہی تھا جو اسپین کے الحمراء میں پایا جاتا ہے۔ فاس میں یہودیوں کا بھی ایک محلہ موجود ہے۔ یہ لوگ پہلے قدیم فاس میں تھے اب وہ جدید فاس میں آباد ہو گئے ہیں۔

اس سفر کی ایک "دریافت" روم ایرپورٹ کے ایک اطالوی افسر تھے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Mr. Marchetti,
Bartolomeo, Via Scarperia 9, 00146 Rome, Italy

انھوں نے جاتے ہوئے اور واپسی میں روم ایرپورٹ پر غیر معمولی تعاون کیا۔ ساری تفصیل بیان کرنا مشکل ہے۔ صرف دو باتوں کا تذکرہ مناسب ہوگا۔ دہلی سے روم کے سفر میں ایر انڈیا کی بوئنگ ۷۴۷ کی اکانومی کلاس اگرچہ بڑی حد تک بھری ہوئی تھی۔ مگر ۱۶ سیٹ کے فرسٹ کلاس کیبن میں میں اکیلا مسافر تھا۔ مگر واپسی

میں عجیب صورت پیش آئی۔ میرا رزرویشن روم سے کنفرم نہیں تھا۔ اور آج اتفاق سے گورنمنٹ آف انڈیا کے افسروں کی ایک جماعت اسی جہاز سے سفر کررہی تھی، اس لئے بظاہر سیٹ حاصل کرنا مشکل تھا۔ مگر مسٹر مارٹنگی دوبارہ لگ گئے انھوں نے مجھ کو لاونج میں بٹھا دیا اور میرا ٹکٹ لے کر ایر انڈیا کے دفتر میں گئے اور رزرویشن کنفرم کرا کر لے آئے۔

میری واپسی کی تاریخ کی دہلی خبر نہیں ہوسکی تھی۔ ان سے میں نے ذکر کیا تو فوراً انھوں نے میرا ٹیلیفون نمبر لیا اور کہا کہ ابھی میں دہلی کو ٹیلیکس بھیج دیتا ہوں کہ آپ کے گھر پر اطلاع دے دی جائے کہ آپ اتوار کی صبح کو ایر انڈیا کی فلائٹ ۱۳۱ سے دہلی پہنچ رہے ہیں۔

مسٹر شیٹی نے جس اخلاق اور ذمہ داری کا ثبوت دیا وہ اس قدر معیاری تھا کہ مجھے تعجب ہوا کہ خود غرضی اور سطحیت کی اس دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ موصوف کے نام الرسالہ (انگریزی) اعزازی طور پر جاری کر دیا گیا ہے۔

یکم دسمبر ۱۹۸۴ کو کیپا بلانکا سے واپسی کے لئے روانہ ہوا۔ الیتالیا (۸۲۵) پر سفر کرتے ہوئے لندن کے اخبار ڈیلی گراف (۲۹ نومبر ۱۹۸۴) میں یہ خبر پڑھی کہ آکسفورڈ کے ۳۲ سالہ جان لیمبرٹ (John Lambert) نے اپنی تین لڑکیوں کو قتل کر دیا۔ اس نے اپنی بیوی کے نام آخری خط میں لکھا تھا کہ تم نے مجھ کو ایک محبت کرنے والے وفادار شوہر سے بدل کر قاتل بنا ڈالا۔ میں ہر چیز کا الزام صرف تم کو دیتا ہوں قاتل پکڑا گیا۔ اس کے بعد اس نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا:

It's all to do with my wife going with other men.

خبرنامہ اسلامی مرکز ـ ۵

ادھیاتمک فاؤنڈیشن ایک ہندو مشن ہے جس کے صدر ڈاکٹر سوامی پورن ہیں۔ اس کا بہت بڑا مرکز سوئزرلینڈ میں قائم ہے۔ نیز دنیا کے مختلف ملکوں میں اس کی شاخیں ہیں۔ ڈاکٹر سوامی پورن کا ٹیلیفون کئی بار صدر اسلامی مرکز کے نام آیا کہ وہ موصوف سے ملنا چاہتے ہیں۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۸۴ کی شام کو نئی دہلی کے ہوٹل سنتور (سوئٹ نمبر ۲۰۲۵) میں سوامی جی اور صدر اسلامی مرکز کے درمیان تفصیلی ملاقات ہوئی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی گفتگو میں دونوں کے درمیان تبادلہ خیال ہوا۔ گفتگو کا موضوع خاص طور پر یہ تھا کہ "سچائی" کیا ہے اور وہ کون سا معیار (کرائٹیرین) ہے جس سے جانچ کر کسی سچائی کا سچائی ہونا معلوم کیا جا سکے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس طرح کی ملاقاتوں کا پروگرام دہلی کی دوسری مذہبی اور روحانی شخصیتوں کے ساتھ بھی بنایا جائے گا۔

۲. انگریزی الرسالہ خدا کے فضل سے دن بدن مقبولیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ تقریباً ہر روز کسی نہ کسی حلقہ کی طرف سے اس کی مثال سامنے آتی ہے۔ ۳ جنوری ۱۹۸۵ کو اچانک مصری سفارت خانہ کے کلچرل اتاشی مسٹر الطیب حفنی اسلامی مرکز آئے۔ انھوں نے کہا کہ کل میں نے آپ کے انگریزی الرسالہ کا ایک اشو دیکھا۔ مجھ کو وہ اتنا پسند آیا کہ میں آپ سے ملنے اور مرکز دیکھنے کے لئے آ گیا۔ انھوں نے الرسالہ کے پیغام سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا۔ ان کو عربی اور انگریزی مطبوعات کا ایک سٹ بطور ہدیہ دیا گیا۔

۳. ایس آئی ایم کے اجلاس (اکتوبر ۱۹۸۴) کے موقع پر نئی دہلی (رام لیلا گراؤنڈ) میں اسلامی مرکز کی مطبوعات کا اسٹال لگایا گیا تھا۔ اس موقع پر ایک رجسٹر بھی رکھا گیا تھا۔ اس رجسٹر میں بہت سے لوگوں نے اپنے تاثرات قلم بند کئے۔ یہاں ان میں سے صرف ایک تبصرہ نقل کیا جاتا ہے:

> 'The Introduction to Islam Series' publications have been found useful but it was observed that these are printed in English and Urdu languages only. With the view-point of the propagation of Islamic teachings all the useful handbook or book-let should also be released in the rest of the modern Indian languages. On the whole, the rest of the publications displayed here are excellent and bearing the upto date information about Islam. Thanks for the endeavour in this regard.
>
> Chander Mohan, D-917, Netaji Nagar, New Delhi 23

۴. ۳۰ دسمبر ۱۹۸۴ کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔ حسب معمول شام کو بعد نماز مغرب اسلامی مرکز کا ماہانہ اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے حم سجدہ (آیت ۵۳) اور النمل (آیت ۹۳) کی روشنی میں

۴۵ منٹ کا درس دیا۔ ان آیات میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا آئندہ ایسی نشانیاں ظاہر کرے گا جن سے لوگ قرآن اور قرآنی تعلیمات کی صداقت کو جان لیں گے۔ موصوف نے آیات کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز نزول قرآن کے وقت ایک الہامی خبر معلوم ہوتی تھی وہ بعد کے دور میں خود انسانی علوم کے ذریعہ ثابت شدہ بن جائے گی۔ اس بات کو مختلف علمی اور تاریخی مثالوں کے ذریعہ واضح کیا گیا۔ اس درس کا ٹیپ لے لیا گیا ہے اور وہ اسلامی مرکز میں محفوظ ہے۔

۵ ۔ الرسالہ کی تحریک خدا کے فضل سے لوگوں کے دلوں میں تاثیر پیدا کر رہی ہے۔ جگہ جگہ اس کے حلقے قائم ہو رہے ہیں۔ اور لوگ خالص دینی جذبہ کے تحت اس تعمیری مہم میں حصہ لے رہے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ لوگوں کی اپنی زندگیوں میں انقلاب آرہا ہے جس کا اندازہ خطوط اور ملاقاتوں کے ذریعہ مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ ۳ جنوری ۱۹۸۵ کو ایک صاحب نے صدر اسلامی مرکز سے کہا —— "میں ایک انانیت پسند آدمی تھا مگر الرسالہ نے میری انا کو مجھ سے چھین لیا۔ میں جہنم کے رخ پر کھڑا تھا، الرسالہ نے مجھ کو جنت کے رخ پر کھڑا کر دیا۔"

۶ ۔ اسلامی مرکز کی تحریک اب تک زیادہ تر مطبوعات اور اجتماعات کے ذریعہ چل رہی تھی۔ اب اس میں انشاء اللہ کیسٹ کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ بہت جلد انشاء اللہ صدر اسلامی مرکز کی تقریروں کے کیسٹ بڑے پیمانہ پر فراہم کئے جا سکیں گے۔ اس سے تحریک کی وسعت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد وہ لوگ بھی اس کے دائرہ دعوت میں آ جائیں گے جو اردو سمجھتے ہیں مگر وہ اردو پڑھ نہیں سکتے۔

۷ ۔ الرسالہ اردو اور انگریزی میں پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اب انشاء اللہ اس کا عربی اور ہندی اڈیشن بھی زیر تجویز ہے۔ اور اس کے لئے ایک آفسٹ پریس کا قیام عمل میں لانا طے کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں جو لوگ تعاون فرمائیں وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں انشاء اللہ اس کا اجر پائیں گے۔

۸ خدا کا فضل ہے کہ اسلامی مرکز کے لٹریچر کا وزن اب ملحدانہ ادارے بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ مولانا محمد ہاشم النظامی نے حیدرآباد سے اطلاع دی ہے کہ اردن کا ایک وفد حیدرآباد آیا تھا۔ اس کے دو ارکان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اشتراکی روس نے کتاب الاسلام یتحدیٰ (مذہب اور جدید چیلنج) پر قانونی پابندی عائد کر دی ہے۔ روس جانے والا کوئی شخص اس کتاب کو لے کر روس کے اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ روس میں اس کتاب کی فروخت اور اشاعت کی اجازت حاصل نہیں ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط وکتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

Number 99
February 1985

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

کبھی جاننا اس کا نام ہوتا ہے کہ آدمی
یہ کہہ دے کہ ـــــ میں نہیں جانتا

مارچ ۱۹۸۵ شمارہ ۱۰۰

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

مارچ ۱۹۸۵ □ شمارہ ۱۰۰

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دو سو روپے
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لیے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی AL-RISALA MONTHLY لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ
سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدا کی یافت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔ حالانکہ قیامت کے دن پوری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔ وہ پاک اور برتر ہے اس شرک سے جو لوگ کرتے ہیں (الزمر ۶۷)

اس سلسلے میں ایک حدیث مختلف روایات میں مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ امام احمد نے حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک روز منبر پر سورہ زمر کی مذکورہ آیت پڑھی:

ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ھکذا بیدہ یحرکھا یقبل ویدبر۔ یمجد الرب نفسہ انا الجبار انا المتکبر انا الملک انا العزیز انا الکریم (این ملوک الارض) فرجف برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المنبر حتی قلنا لیخرن بہ (تفسیر ابن کثیر)

اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ کو حرکت دے رہے تھے اور آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ اللہ اپنی بزرگی بیان کرے گا۔ اور کہے گا کہ میں جبار ہوں۔ میں متکبر ہوں، میں بادشاہ ہوں، میں عزیز وکریم ہوں۔ کہاں ہیں زمین کے بادشاہ، یہ کہتے ہوئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر لرزہ طاری ہوگیا حتیٰ کہ ہم نے کہا کہ آپ منبر کے ساتھ گر پڑیں گے۔

جب ایک آدمی خدا کا حقیقی ادراک کرتا ہے تو اس کا حال وہی ہو جاتا ہے جو اوپر کی مثال میں خدا کے رسول کا نظر آتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خدا کو اس وقت حسی طور پر نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ تصوراتی طور پر دیکھ رہے تھے۔ مگر خدا کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے آپ کا جسم ہل گیا۔ دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوا کہ آپ زمین پر گر پڑیں گے۔

اسی کا نام خدا کی معرفت ہے۔ خدا کی معرفت اس مالک کائنات کی معرفت ہے جو سب سے بڑا ہے۔ جو سب سے طاقت ور ہے۔ ایسے خدا کو پانا محض سادہ پانا نہیں ہوتا۔ وہ آدمی کی پوری شخصیت کو ہلا دیتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر بھونچال کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ خدا کی معرفت خدا کو دیکھے بغیر دیکھ لینا ہے۔ یہ اس وقت خدا کے سامنے ڈھ پڑنا ہے جب کہ خدا ابھی زمین و آسمان کا پردہ پھاڑ کر عیاناً انسان کے سامنے نہیں آیا ہے۔

آہ کس قلم سے لکھا جائے

کوئی جہاز مشکل میں پھنس جائے تو وہ ریڈیو کے ذریعہ خاص سگنل بھیجتا ہے۔ اس کو اصطلاح میں ایس او ایس (SOS) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم مصیبت میں ہیں، ہماری مدد کرو مگر اس قسم کے سگنل کی قیمت اسی وقت ہے جب کہ اس کو وصول کرنے والا اسٹیشن اسے اہمیت دے اگر وصول کرنے والا اسٹیشن اسے اہمیت نہ دے تو وہ فضا میں ٹکرا کر رہ جائے گا۔ وہ ایسا کلام بن جائے گا جس کو بولنے والے کے سوا کسی اور نے سنا ہی نہ ہو۔

موجودہ زمانہ میں ہمارے لکھنے اور بولنے والے بھی خدا کے نام گویا "ایس او ایس" بھیج رہے ہیں وہ کہہ رہے ہیں کہ خدایا ظالموں کے خلاف ہماری مدد کر۔ مگر سو سالہ پکار کے باوجود ہماری مصیبت ختم نہیں ہوتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہم جس خدائی اسٹیشن کو اپنا ایس او ایس بھیج رہے ہیں اس کے نزدیک ہمارے ایس او ایس کی کوئی قیمت ہی نہیں۔

ہم خدا سے دوسروں کی بربادی مانگ رہے ہیں مگر خدا اس کا منتظر ہے کہ ہم اس سے دوسروں کی ہدایت مانگیں۔ ہم اپنے قومی مقاصد کے لئے خدا کو پکار رہے ہیں۔ مگر خدا صرف اس پکار کو سنتا ہے جو دینی مقاصد کے لئے کی گئی ہو۔ ہم لوگوں کو آگ میں ڈالنے کی دعا کر رہے ہیں حالانکہ خدا کی مرضی یہ ہے کہ ہم لوگوں کو آگ سے بچانے کی دعا کریں۔ ایسی حالت میں ہمارا "ایس او ایس" خدا کے یہاں کیسے قابل لحاظ ہو سکتا ہے۔ جو فائر بریگیڈ پانی لئے ہوئے بیٹھا ہو اس سے ہم کہیں کہ آگ برساؤ تو وہ کیسے ہماری بات سنے گا۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی جنتیں رزرو ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہیں دوسروں کو جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر نہیں۔ اگر لوگوں کو اللہ کا ڈر ہو تو وہ جان لیں کہ قیامت میں اللہ کی پکڑ سے وہی شخص بچے گا جس نے دوسروں کو اللہ کی پکڑ سے بچانے کی فکر کی ہو۔

لوگوں کے پاس الفاظ ہیں، صرف اس لئے کہ وہ قیامت کی ہولناکی کو دوسروں کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ اگر وہ جانیں کہ وہ خود بھی قیامت کی ہولناکی کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں تو ان کی زبانیں بند ہو جائیں۔ خدا کی پکڑ کا خوف ان کو اتنا ہلکان کر دے کہ وہ ہنسنے سے زیادہ روئیں۔ وہ بولنے سے زیادہ خاموش دکھائی دینے لگیں۔

جنازہ کو دیکھ کر

مرحوم کا جنازہ لوگ کاندھوں پر اٹھائے ہوئے قبرستان کی طرف جا رہے تھے۔ اور میرے ذہن میں ایک پوری تصویر جاگ رہی تھی۔ مرحوم کے اس آخری سفر میں مجھے انسان اپنے آغاز سے اپنے انجام کی طرف جاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

آدمی پیدا ہو کر دنیا میں آتا ہے تو فوراً ہی اس کو ماں کی شفقت اور باپ کی سرپرستی حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ عزیزوں اور دوستوں کے درمیان پرورش پاتا ہے۔ پھر وہ بڑا ہو کر ایک با اختیار انسان کی حیثیت سے زمین پر اپنی زندگی بناتا ہے۔

آدمی کا یہ سفر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ اب اس کے وہی دوست اور رشتہ دار جو دنیا میں اس کے مددگار بنے ہوئے تھے، اس کو اٹھا کر لے جاتے ہیں اور زمین کے ایک ایسے گڑھے میں ڈال کر بند کر دیتے ہیں جہاں آدمی بالکل اکیلا ہوتا ہے۔ جہاں وہ ہوتا ہے اور اس کا خدا۔

آدمی اب تک اپنے جیسے انسانوں کے سامنے تھا، اب وہ برتر خدا کے سامنے ہوتا ہے۔ اب تک وہ اختیار کی دنیا میں تھا، اب وہ بے اختیاری کی دنیا میں اپنے آپ کو پاتا ہے۔ کیسا عجیب ہوگا وہ لمحہ جب ایک عاجز مطلق ایک قادر مطلق کے سامنے کھڑا ہوگا۔

موت کا یہ واقعہ ہر روز زمین کے اوپر ہوتا ہے۔ ہر روز آدمی کسی نہ کسی کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مگر اس کو کچھ احساس نہیں ہوتا۔

"احساس تو جب ہو جب کہ آدمی کے دماغ میں جنت اور جہنم ہو" میں نے سوچا۔ لوگوں کی سوچ بالکل دوسرے رخ پر چل رہی ہے۔ لوگوں کے ذہن میں دوستی، رشتہ داری، کمانا اور گھر بنانا، جیسے مسائل بھرے ہوئے ہیں۔ وہ کسی آدمی کو اسی حیثیت سے جانتے ہیں۔ جب کوئی آدمی مرتا ہے تو وہ اس کے متعلق بس اتنا سوچ پاتے ہیں کہ ایک ساتھی بچھڑ گیا۔ ایک کمانے والا فرد ہم سے رخصت ہو گیا۔ وہ صرف دنیا کے ساتھ انسان کے تعلقات کو جانتے ہیں۔ وہ آخرت کے ساتھ انسان کے تعلقات کو نہیں جانتے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ وہ جنازہ میں انسان کی خدا کے سامنے حاضری کو دیکھیں۔ وہ موت کے سفر میں انسان کے آخرت کی طرف سفر کا مشاہدہ کریں۔

کارخانۂ کائنات

آپ کسی انسانی کارخانہ میں داخل ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ وہاں ہر چیز کے بارہ میں بتایا جارہا ہے۔ اس کے ہر شعبہ میں تعارفی تختیاں لگی ہوئی ہیں۔ ہر جگہ آدمی کھڑا ہوا ہے جو آپ کے ہر سوال کا پورا جواب دیتا ہے۔ کارخانہ کی طرف سے آپ کو ایسا تعارفی لٹریچر بھی دیا جائے گا جس میں ضروری معلومات درج ہوں۔

کائنات تمام کارخانوں سے زیادہ بڑا کارخانہ ہے۔ مگر یہاں نہ کہیں کوئی تعارفی بورڈ نظر آتا اور نہ کوئی گائڈ۔ یہاں منصوبہ بندی بھی ہے اور تعمیرات بھی۔ یہاں پیداوار بھی ہے اور پیکنگ اور سپلائی کا انتظام بھی۔ یہاں رسد اور طلب میں تناسب کا لحاظ بھی کیا جارہا ہے اور صنعتی فضلات کو دوبارہ استعمال میں لانے کا اہتمام بھی۔ یہاں ضبط اور توازن کا نظام بھی ہے اور خام سامانوں کی مسلسل فراہمی کا بندوبست بھی۔ یہ سب کچھ ہے مگر نہ کہیں کوئی اعلان کرنے والا ہے اور نہ بتانے والا۔

پہاڑوں کی بلندیاں کائناتی اسٹیج کی مانند نظر آتی ہیں مگر وہاں کوئی بولنے والا نہیں۔ چڑیاں چہچہاتی ہیں تو شبہہ ہوتا ہے کہ وہ شاید کسی بات کی خبر دے رہی ہیں مگر ان کی بولی سمجھ میں نہیں آتی۔ بجلی چمکتی ہے اور بادل گرجتے ہیں تو گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ کائنات کا آلۂ مکبر الصوت ہے جس کے ذریعہ کچھ اعلان کیا جارہا ہے مگر اس کے الفاظ آدمی کے لیے قابل فہم نہیں ہوتے۔

"ایمان" کسی آدمی کے اندر اسی خلا کو پُر کرتا ہے۔ وہ آدمی کو کائنات کے بھیدوں کا رازداں بناتا ہے۔ مومن ایک قسم کا سائنس داں ہے۔ سائنس داں بکھرے ہوئے کروں میں نظام شمسی کا پتہ لگاتا ہے وہ مادہ کے اندر چھپی ہوئی توانائی کو دریافت کرتا ہے۔ وہ غیر متحرک دھات میں متحرک مشین کو دیکھ لیتا ہے۔ اسی طرح مومن عالم ظاہر میں عالم غائب کو دیکھتا ہے۔ وہ مخلوقات میں اس کے خالق کو پالیتا ہے۔ وہ نظم کو دیکھ کر اس کے ناظم کا پتہ لگا لیتا ہے۔

ایمان جب اپنی آخری انتہا کو پہنچتا ہے تو وہ دعوت بن جاتا ہے۔ دعوت دوسرے لفظوں میں کائنات کے غیر ملفوظ نغمہ کو الفاظ کی صورت دینا ہے۔ داعی خدا کی خاموش نشریات کو باآواز اعلان میں منتقل کرتا ہے۔ وہ خدائی پیغام کو سن کر اسے انسانوں تک پہنچاتا ہے دعوت خدا کی دنیا میں خدا کی نمائندگی ہے۔

زندہ قبرستان

میں اسپتال کے اندر کھڑا تھا۔ میرے سامنے طرح طرح کے مریض تھے۔ ہر مریض درد والم کی تصویر بنا ہوا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں تکلیف تھی اور کسی کے پاؤں میں۔ کسی کے پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔ کسی کی پیٹھ حادثہ کا شکار ہو گئی تھی۔ اسپتال کی دنیا کا ہر آدمی مصیبت زدہ تھا۔ یہاں کا ہر باشندہ انسانی بے بسی کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔

میں نے سوچا "جسم کی کوئی ایک بات بگڑ جاتی ہے تو آدمی کا یہ حال ہو جاتا ہے۔ پھر اس وقت آدمی کا کیا حال ہوگا جب کہ اس کی ساری بات بگڑ جائے گی۔ جب انسان سے اس کی ہر وہ چیز چھن جائے گی جس کو وہ اپنی چیز سمجھ کر سرکشی کر رہا تھا۔

پہلے زمانہ میں آدمی عبرت کے لئے قبرستان جاتا تھا۔ اب اس کو عبرت کے لئے اسپتال جانا چاہئے۔ قبرستان میں مصیبت زدہ "زمین کے نیچے" ہوتا ہے۔ اور اسپتال میں مصیبت زدہ زمین کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ قبرستان میں عبرت کی چیز کو سوچ کر تصور میں لانا پڑتا ہے۔ اور اسپتال میں عبرت کی چیز بالکل زندہ صورت میں آنکھ کے سامنے موجود ہوتی ہے۔

اسپتال گویا زندہ قبرستان ہے۔ اسپتال کی دنیا سراپا عبرت کی دنیا ہوتی ہے۔ کوئی آدمی حادثہ کا شکار ہو کر یہاں آیا ہے۔ کوئی سخت بیماری میں مبتلا ہے۔ کسی کے جسم میں کوئی ضروری چیز کم ہو گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کراہ رہا ہے۔ کوئی چیخ رہا ہے۔ غرض بے بسی و بے چارگی کے عبرت ناک مناظر ہیں جو وہاں ہر طرف بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ مناظر اس لئے دکھائے جاتے ہیں کہ آدمی ان سے سبق لے۔ وہ دوسروں کی تکلیف میں اپنی تکلیف کا عکس دیکھے۔ وہ جزئی واقعہ میں کلی حقیقت کا مشاہدہ کرے۔ وہ دنیا کے واقعہ میں آخرت کے واقعات کا احساس کر لے۔

ایسے مناظر ہر آدمی کے سامنے آتے ہیں۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو ان سے سبق لیتے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سبق لینے کے لئے غیر کی حالت کو اپنے اوپر طاری کرنا پڑتا ہے۔ جو کچھ ابھی پیش نہیں آیا اس کا احساس اس طرح کرنا پڑتا ہے کہ گویا وہ پیش آ چکا ہے۔ یہ مستقبل کو حال کے اندر دیکھنا ہے اور کتنے لوگ ہیں جو مستقبل کو حال کے اندر دیکھنے والی نظر رکھتے ہیں۔

خدا کا داعی

ایک سائنس داں ایک بلڈنگ کے اندر ہے۔ اس کے آلات اس کو بتاتے ہیں کہ چند منٹ کے اندر یہاں بھونچال آنے والا ہے۔ دوسری طرف وہ دیکھتا ہے کہ بلڈنگ کے اندر بعض دوسرے انسانی مسائل بھی ہیں۔ ایسی حالت میں سائنس داں کیا کرے گا۔ اس وقت دوسرے مسائل اس کی نظر میں چھوٹے ہو جائیں گے۔ وہ ان کو بھول جائے گا۔ وہ صرف ایک ہی آواز دے گا ـــــ لوگو، چند لمحہ میں بھونچال اس بلڈنگ کو ڈھا دینے والا ہے۔ تم لوگ فوراً بلڈنگ سے نکل کر باہر آجاؤ۔ سائنس داں اس وقت بلڈنگ کے مسائل پر تقریر نہیں کرے گا بلکہ وہ بلڈنگ کو چھوڑنے کا مبلغ بن جائے گا۔

اب دوسری مثال لیجئے۔ ایک ایسے آدمی کا تصور کیجئے جو کائنات میں ایسے مقام پر کھڑا ہوا ہے جہاں سے وہ ایک طرف ہماری موجودہ دنیا کو دیکھ رہا ہے اور دوسری طرف جنت کے باغ اور جہنم کی آگ کے مناظر بھی اس کو بخوبی طور پر نظر آرہے ہیں۔ ایسا آدمی اس وقت کیا کرے گا۔ وہ کون سی بات ہوگی جس کے متعلق وہ چاہے گا کہ لوگوں کو اس کی خبر دے۔

یقینی طور پر وہ ایسا نہیں کرے گا کہ دنیا کے مسائل پر تقریر شروع کر دے یا فلاح تمدن کا نسخہ لوگوں کو بتانے لگے۔ اس کے پاس کہنے کی جو سب سے بڑی بات ہوگی وہ صرف یہ ہوگی کہ لوگو، جہنم کی آگ سے بھاگو اور اپنے آپ کو جنت کا مستحق بناؤ۔

ایک شخص اگر اس سے بے خبر ہو کہ ایک سخت بھونچال اگلے لمحہ عمارت کو ڈھا دینے والا ہے تو وہ دوسری باتوں کو مسئلہ سمجھ سکتا ہے۔ مگر جو شخص بھونچال کو آتے ہوئے دیکھ رہا ہو اس کو بھونچال کے سوا کوئی اور بات یاد نہیں رہے گی۔ حتیٰ کہ وہ ادبی تقاضے کے مطابق شاید یہ جملہ کہنا بھی بھول جائے کہ لوگو، بھونچال آرہا ہے، تم لوگ اپنے آپ کو بھونچال سے بچاؤ۔ وہ سب کچھ بھول کر صرف یہ پکارتا ہوا بھاگے گا کہ ـــــ بھونچال، بھونچال۔

خدا کے داعی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ خدا کا داعی وہ ہے جس کو پردہ کے اس پار سے جنت کی خوشبو آرہی ہو اور وہ جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہو۔ ایسا شخص یقینی طور پر صرف آخرت کی باتیں کرے گا۔ دوسری چیزیں اس کے ذہن سے اس طرح نکل جائیں گی۔ جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔

عجیب کرشمہ

انسان کا جسم چند مادی چیزوں سے مل کر بنتا ہے۔ پانی، کاربن، آکسیجن اور کچھ مزید کیمیائی عناصر۔ ظاہری تجزیہ کے اعتبار سے انسان بس اسی قسم کی چند چیزوں کا مجموعہ ہے۔ رابرٹ پیٹسن (R. Pattison) نے انسانی جسم کے ان مادی عناصر کا حساب لگایا تو اس نے پایا کہ بازار کی شرح کے لحاظ سے ان کی کل قیمت ساڑھے چھ ڈالر ہے۔ یعنی ہندستانی سکہ میں تقریباً ستر روپیہ۔

مگر اسی "ستر روپیہ" کے سامان سے اللہ تعالیٰ نے ایسا انمول آدمی بنایا ہے جو اتنا قیمتی ہے کہ سکہ میں اس کی قیمت مقرر نہیں کی جا سکتی۔ ستر کھرب روپے بھی ایک انسان کی قیمت نہیں ہو سکتے۔

انسان کے انتہائی قیمتی ہونے کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کا کوئی عضو اس سے چھن جائے۔ انسان کا ایک ہاتھ کٹ کر اس سے جدا ہو جائے تو اربوں ڈالر ادا کر کے بھی دوبارہ ویسا ہاتھ اس کو نہیں مل سکتا۔ انسان کی آنکھ اگر بے نور ہو جائے تو ساری دنیا کی دولت بھی اس کو وہ آنکھ نہیں دے سکتی جس سے وہ دوبارہ دیکھنے لگے۔ انسان کی زبان اگر جاتی رہے تو کوئی بھی قیمت ادا کر کے وہ بازار سے ایسی چیز نہیں پا سکتا جس سے وہ بولے اور اپنے خیالات کا اظہار کر سکے۔

کیسی عجیب ہے خدا کی کاریگری کہ وہ بے قیمت چیزوں سے انتہائی قیمتی چیز بناتا ہے۔ وہ مردہ چیز کو زندہ چیز میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ بے شعور مادہ سے باشعور مخلوق وجود میں لاتا ہے۔ وہ نہیں سے ہے کی تخلیق کرتا ہے۔

کسی جادوگر کی چھڑی سے ایک پتھر کوئی آواز نکالے تو اس کو دیکھ کر سارے لوگ حیران رہ جائیں گے۔ مگر خدا بے شمار انسانوں کو مادہ سے بنا بنا کر کھڑا کر رہا ہے۔ اور وہ نہایت بامعنی الفاظ میں کلام کر رہے ہیں۔ مگر اس کو دیکھ کر کسی پر حیرانی طاری نہیں ہوتی۔ کیسے اندھے ہیں وہ لوگ جن کو جادوگر کے کرشمے دکھائی دیتے ہیں مگر خدا کے کرشمے دکھائی نہیں دیتے۔ کیسے بے عقل ہیں وہ لوگ جو جھوٹے کرشمے دکھانے والوں کے سامنے سراپا عقیدت مند بن جاتے ہیں مگر جو ہستی سچے کرشمے دکھا رہی ہے اس کے لئے ان کے اندر عقیدت و محبت کا جذبہ نہیں امڈتا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر خدا کو پالے تو وہ اس کے کمالات میں گم ہو جائے۔ خدا کے سوا کسی دوسری چیز کا اس کو ہوش نہ رہے۔

کائنات کی شاہراہ

انسان ایک کامل دنیا کے اندر غیر کامل وجود ہے۔ ستارے اور سیارے، ہوا اور پانی، درخت اور جانور سب ویسے ہی ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہئے۔ وہ فطرت کی مقرر شاہراہ سے نہیں ہٹتے۔ اس کے برعکس انسان فطرت کی شاہراہ سے ہٹ جاتا ہے۔ انسان ویسا بنتا ہے جیسا اسے نہیں بننا چاہئے۔ انسان وہ کرتا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہئے۔

انسان کا یہ تضاد سوال بھی ہے اور اسی کے اندر اس کا جواب بھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے تمام مسائل کا سبب یہ ہے کہ وہ کائنات کی شاہراہ سے ہٹ گیا ہے۔ اور اس کے تمام مسائل کا حل یہ ہے کہ وہ کائنات کی شاہراہ کو دوبارہ اختیار کرلے۔

فطرت کی جو شاہراہ بقیہ چیزوں کے لئے اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ ان کو ایک معیاری دنیا میں ڈھال دے، وہی شاہراہ یقینی طور پر اس بات کی بھی ضمانت ہے کہ وہ انسانی معاشرہ کو معیاری معاشرہ میں تبدیل کرسکے۔

ہماری غیر معیاری دنیا کے باہر جب ایک وسیع تر معیاری دنیا موجود ہے تو یقینی طور پر ہمارے لئے پہلا صحیح ترین انتخاب یہی ہوسکتا ہے کہ ہم اس دنیا کو سمجھیں اور اس کے اصولوں کو اپنی زندگی پر منطبق کریں۔

کائنات کے مطالعہ سے جو واضح ترین بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ پوری مادی کائنات ایک متعین قانون فطرت میں جکڑی ہوئی ہے۔ وہ کسی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتی۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے مالیکیول سے پانی بننے کا جو اصول ہے وہ ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ مختلف عناصر کے امتزاج سے کیمیائی مرکبات ہمیشہ ایک ہی لگے بندھے اصول کے تحت بنتے ہیں۔ معدنیات کا پگھلنا اور پانی کا بھاپ بننا ہمیشہ ایک ہی معلوم قانون فطرت کے مطابق وقوع میں آتے ہیں۔ یہی انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کے کردار کو اس حد تک معلوم اور متعین ہونا چاہئے کہ اس کی پیشین گوئی کی جاسکے۔ انسان کا کردار قابل پیشین گوئی کردار ہونا چاہئے، نہ یہ کہ خواہشات کے تحت وہ کبھی ایک قسم کے کردار کا مظاہرہ کرے اور کبھی دوسرے قسم کے کردار کا ——— اخلاقیات کا ایک ہی صحیح معیار ہے، انسان کے لئے بھی اور بقیہ کائنات کے لئے بھی۔

خدا کا وجود

ممتاز ریاضی داں سر مائیکل فرانسس اتیا حال میں بمبئی آئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ خدا ایک ریاضی داں ہے۔ خدا کو ریاضی داں قرار دینے کا نظریہ نیا نہیں ہے۔ تقریباً ۵۰ سال پہلے سر جیمس جینس نے کہا تھا کہ کائنات ایک ریاضی داں کا عمل ہے۔ اس سے بھی صدیوں پہلے فیثاغورث نے کہا تھا کہ تمام چیزیں دراصل گنتیاں ہیں۔ پکاسو کے نزدیک خدا ایک آرٹسٹ ہے۔ اس نے کہا کہ خدا فی الواقع دوسرا آرٹسٹ ہے۔ اس نے زرافہ ایجاد کیا۔ اس نے ہاتھی بنایا۔ اس نے بلی بنائی۔ آئن شائن نے کہا تھا کہ خدا لطیف ہے اور اگرچہ وہ کسی کو برا چاہنے والا نہیں مگر وہ بہت ہوشیار ہے:

The distinguished mathematician, Sir Michael Francis Atiyah, who was recently in Bombay said that "God was a mathematician." The idea of God being a mathematician is not new. About 50 years ago, Sir James Jeans suggested that the universe was the handiwork of a mathematician. And centuries before him Pythagoras said all things are numbers. To Picasso God was an artist. "God is really another artist," he said. "He invented the giraffe, the elephant and the cat." Einstein has said that the Lord is subtle and, though not malicious, very clever.

جو شخص بھی کائنات کو زیادہ گہری نظر سے دیکھتا ہے اس کو ایک چیز کا یقینی احساس ہوتا ہے —— یہاں کوئی اور ہے جو سب سے بڑا ہے اور خود اس کی اپنی ذات سے بھی۔ ریاضی داں کو کائنات میں ایسی اونچی ریاضی نظر آتی ہے جہاں اس کو اپنی ریاضی بھول جاتی ہے۔ وہ پکار اٹھتا ہے کہ خدا بہت بڑا ریاضی داں ہے۔ ایک آرٹسٹ جب کائنات کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے تو یہاں اس کو اتنا اعلیٰ آرٹ نظر آتا ہے کہ اس کا اپنا آرٹ اس کی نگاہ میں ہیچ ہو جاتا ہے۔ اور وہ کہہ اٹھتا ہے کہ خدا سب سے بڑا آرٹسٹ ہے۔ ایک عقل والا آدمی جب کائنات کی حکمتوں پر نظر ڈالتا ہے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ یہاں کوئی اور ہے جو تمام عقلوں سے زیادہ بڑی عقل والا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا سب سے بڑا ریاضی داں، سب سے بڑا آرٹسٹ، سب سے بڑا عاقل ہے اور اسی کے ساتھ وہ مزید بہت کچھ ہے۔ جو شخص کائنات میں خدا کے نشان کو نہ دیکھے وہ اندھا ہے اور جو شخص دیکھ کر بھی اس کو نہ مانے وہ مجنون ہے۔

مستقبل کا یقین

ڈارلنگٹن ہال (Darlington Hall) انگلینڈ کا ایک ممتاز اسکول ہے۔ وہاں ایک طالب علم کو سالانہ پانچ ہزار پونڈ تعلیمی فیس دینی پڑتی ہے۔ اس کے پرنسپل بلیکشا (Dr. Lyn Blackshaw) نے ۱۱ جولائی ۱۹۸۳ کو اسکول اسٹاف کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ حالات میں طلبہ کو اپنی ڈگری بے قیمت معلوم ہونے لگی ہے۔ ان کو یقین نہیں ہے کہ وہ تعلیم کے حصول کے بعد اپنی پسند کے مطابق کوئی روزگار حاصل کر لیں گے۔ اس بے یقینی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اندر جھنجھلاہٹ کی نفسیات پیدا ہو رہی ہے۔ اور وہ کثرت سے جرائم کرنے لگے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ:

The worst thing we can do for our children
is to destroy their faith in the future

سب سے بری چیز جو ہم اپنے بچوں کے لیے کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ مستقبل کے بارہ میں ان کے یقین کو برباد کر دیں (سنڈے ٹائمس، لندن، ۴ ستمبر ۱۹۸۳)

پرنسپل کے اس جملہ پر ہم یہ اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ تعلیم کے بعد روزگار حاصل کرنے کا مسئلہ انسان کے "مستقبل" کا صرف ایک چھوٹا سا جزء ہے۔ مستقبل کا مسئلہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کے موجودہ مرحلہ سے لے کر موت کے بعد کی ابدی زندگی تک چلا گیا ہے۔

انسان کو کامل اطمینان اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس کو اس کے پورے مستقبل کے بارہ میں پر امید نقطہ نظر مل جائے۔ جدید انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے جتنے غالب افکار ہیں سب نے موت کے بعد ابدی مستقبل کے بارہ میں انسان کے یقین کو برباد کر دیا ہے۔ یہی جدید انسان کے عدم اطمینان کی سب سے بڑی نفسیاتی وجہ ہے۔

انسان کو جب تک ایک ایسا کامل نقطہ نظر نہ دیا جائے جو اس کے حال اور مستقبل کو ابدی طور پر پر امید بناتا ہو وہ کبھی حقیقی معنوں میں مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ایک نوجوان کو اپنے دنیوی مستقبل کا مسئلہ پریشان کرتا ہے مگر جب وہ اپنا دنیوی مستقبل تعمیر کر چکا ہوتا ہے تو اس کے بعد مسئلہ ختم نہیں ہوتا۔ اب دوسرے سوالات اس کو پریشان کرنے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پریشانیوں سے آدمی اسی وقت نجات پا سکتا ہے جب کہ وہ ابدی عمر تک کے لئے اپنے سوالات کا جواب پالے نہ کہ صرف وقتی عمر تک کے لئے۔

خدا سے بغاوت

خدا نے اپنی دنیا کا ایک منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ کے مطابق وہ اپنی دنیا کو چلا رہا ہے۔ جو لوگ اس منصوبہ سے مطابقت کرکے اس دنیا میں رہیں وہ خدا کے فرماں بردار بندے ہیں۔ خدا ان کو اپنے ابدی انعامات سے نوازے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ اس منصوبہ سے مطابقت نہ کریں وہ خدا کی دنیا میں فساد پھیلانے کے مجرم ہیں۔ خدا انھیں عنقریب پکڑ لے گا اور ان کو ایسی سزا دے گا جس سے ابد تک نکلنا ان کے لئے ممکن نہ ہو۔

خدا ہر صبح سورج کو روشن کرتا ہے تاکہ اس کے بندے اس کی روشنی میں چلیں۔ مگر ایک انسان دوسرے انسان کو اندھیرے میں دھکیل دینا چاہتا ہے۔ خدا زمین سے رزق اگاتا ہے تاکہ اس کے بندے اس سے اپنی بھوک مٹائیں۔ مگر ایک انسان دوسرے انسان کو بھوک سے تڑپا کر خوش ہوتا ہے۔ خدا اپنے پاس سے بارش برساتا ہے تاکہ تمام انسان اور جاندار اس سے سیراب ہوں۔ مگر انسان اپنے مفروضہ دشمنوں کو پیاس سے تڑپا کر کامیابی کے قہقہے لگاتا ہے۔

خدا لوگوں کے لئے مواقع کھولتا ہے تاکہ وہ ان مواقع کا استعمال کرکے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ مگر انسان یہ منصوبہ بناتا ہے کہ وہ لوگوں سے ان کے ملے ہوئے مواقع کو چھین لے۔ خدا ایک انسان کو اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے۔ مگر دوسرا انسان حسد میں مبتلا ہو کر چاہتا ہے کہ اس کو بے عزت کرے اور اس کو ناکام بنا کر چھوڑ دے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں فساد فی الارض کہا گیا ہے۔ یعنی خدا نے اپنی دنیا کا نقشہ جس ڈھنگ سے بنایا ہے اس میں بگاڑ پیدا کرنا۔ خدا کی دنیا میں خدا کے منصوبہ کے خلاف زندگی گزارنا۔ خدا کی زمین میں خدا کی پسند کو چھوڑ کر وہ روش اختیار کرنا جو آدمی کی پسند اور خواہش کے مطابق ہو۔

انسان خدا کی اسکیم کی نفی کرتا ہے۔ انسان خدا کے فیصلہ کو بدل دینا چاہتا ہے۔ یہ خدا کی دنیا میں خدا کے خلاف بغاوت ہے۔ یہ سب سے بڑا جرم ہے جو کوئی انسان اس زمین پر کر سکتا ہے۔ آج یہ سب سے بڑا جرم خدا کی زمین پر سب سے بڑے پیمانہ پر ہو رہا ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس بغاوت کے مرتکب وہ لوگ بھی ہیں جو خدا کی بغاوت کو خدا کی زمین سے ختم کرنے کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں۔

کائناتی مشین

۱۹۶۵ کی جنگ میں پاکستان کے پاس زیادہ بہتر ہتھیار تھے۔ ہندستان کے وجینت ٹینک کے مقابلہ میں پاکستان کا برطانی پیٹن ٹینک زیادہ اعلیٰ تھا۔ ہندستان کے نیٹ جہازوں کے مقابلہ میں پاکستان کے فرانسیسی سیبر جیٹ زیادہ طاقت کے ساتھ مار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ پھر بھی ہندستان کو جیت ہوئی اور پاکستان ہار گیا۔

اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندستان کے ہتھیار اس کے اپنے بنائے ہوئے تھے۔ وہ ان کو استعمال کرنے کی مکمل مہارت رکھتا تھا جب کہ پاکستان کے ہتھیار بیرونی ملکوں کے بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ پاکستانی سپاہی ان کو مہارت کے ساتھ استعمال نہ کر سکے اور ہار گئے۔ ایک جنگی تبصرہ نگار نے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

Even the most sophisticated technology of warfare is handled ultimately by men engaged in the profession of soldiering. Its use in combat depends therefore greatly on their skill, training, morale and ingenuity. The doctrine of the supremacy of the man behind the gun thus remains valid even in this age of push-button wars.

جنگ کی انتہائی پیچیدہ مشینری بھی آخر کار متعلقہ فوجی آدمیوں ہی کے ذریعہ چلائی جاتی ہے۔ اس لئے جنگ میں ان کا استعمال بہت بڑی حد تک ان کی مہارت، تربیت، جرأت اور تدبیر پر منحصر ہوتا ہے۔ قدیم اصول کے مطابق بندوق کا استعمال کرنے والے آدمی کی اہمیت آج بھی بدستور باقی ہے، حتی کہ اس بٹن دبانے والے دور میں بھی (ٹائمس آف انڈیا ۲ فروری ۱۹۸۴ء)

مذکورہ قسم کے واقعات کائنات کی مشینی تعبیر کی تردید ہیں۔ ہماری مشینوں کو چلانے کے لئے ہمیشہ ایک "انسان" درکار ہوتا ہے۔ پھر کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ کائنات کی عظیم مشین کسی چلانے والے کے بغیر چل رہی ہے۔ اس قیاس کے لئے کوئی نظیر موجود نہیں۔ کائنات ایک سائنس دان کے الفاظ میں بالفرض ایک "گریٹ مشین" ہو تب بھی اس کو چلانے کے لئے ایک "گریٹ مائنڈ" چاہئے۔ انسان مجبور ہے کہ خدا کو مانے، خواہ مذہبی زبان میں خالق و مالک کی حیثیت سے یا سائنسی الفاظ میں مشین کو چلانے والے انجینئر کی حیثیت سے

قانون کی زد

ہمارے ملک میں قانون کی پکڑ سے بچنے کا یقینی ذریعہ رشوت ہے۔ رشوت کے زور پر یہاں سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔ جس آدمی کی جیب میں کافی پیسہ موجود ہے اس کے لئے کوئی بھی غلط کام کرکے اس کے قانونی انجام سے دوچار ہونے کا اندیشہ نہیں۔

مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں اگرچہ اس قسم کی رشوت کا رواج نہیں۔ مگر اصل برائی وہاں بھی پوری طرح موجود ہے۔ ان ملکوں میں قانون کی پکڑ سے بچنے کے لئے ایک مستقل "کاروبار" قائم ہے جس کو لوپ ہول کاروبار (Loophole business) کہا جاتا ہے۔

امریکہ کے دارالسلطنت واشنگٹن میں ایک شخص نے دیکھا کہ شہر میں بہت سی نئی آفس بلڈنگیں کھڑی ہو رہی ہیں۔ اس کو تعجب ہوا۔ کیوں کہ حال میں اس نے اخبار میں پڑھا تھا کہ صدر امریکہ نے دفتری کارکنوں میں کمی کا اعلان کیا ہے۔ اس نے ایک عمارتی ٹھیکیدار سے پوچھا کہ ان عمارتوں کو کس قسم کے لوگ کرایہ پر لے رہے ہیں۔ ٹھیکیدار نے کہا کہ وہ لوگ جو لوپ ہول بزنس سے تعلق رکھتے ہیں۔ آدمی نے حیران ہو کر پوچھا کہ یہ لوپ ہول بزنس کیا ہے۔ ٹھیکیدار نے جواب دیا، کیا آپ نہیں جانتے۔ واشنگٹن میں دنیا کی سب سے بڑی لوپ ہول انڈسٹری ہے:

Washington has the largest loophole industry in the world

اس نے مزید بتایا کہ امریکی مجلس قانون ساز قانون بناتی ہے۔ اب کچھ لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے اوپر ان قوانین کی زد پڑ رہی ہے۔ انھیں تلاش ہوتی ہے کہ ان میں ایسے قانونی شگاف (Legal loopholes) دریافت کریں جن کے ذریعے وہ ان کی پکڑ سے بچ سکیں۔ ان دفاتر میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے اعلیٰ دماغ بیٹھے ہوئے ہیں جن کا کام یہی قانونی شگاف تلاش کرنا ہے۔ چنانچہ لوپ ہول بزنس آج امریکا کا بہت بڑا اور منظم بزنس بن چکا ہے (دی ہندو ۱۶ دسمبر ۱۹۸۴)

دنیا میں انسان کا مقابلہ انسان سے ہے۔ یہاں وہ جرم کرتا ہے اور پھر رشوت دے کر یا قانون میں لوپ ہول تلاش کرکے اس کی زد سے بچ جاتا ہے۔ پھر اس وقت انسان کا کیا حال ہوگا جب کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے مقابلہ میں پائے گا جہاں نہ کوئی مال کسی کے کام آنے والا ہے اور نہ کسی قسم کی قانونی مہارت۔

محسوس پرستی

قرآن میں خدا کے مقبول بندوں کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں (یومنون بالغیب) اور غیر مقبول بندوں کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ وہ صرف دنیا کے ظاہر کو جانتے ہیں (یعلمون ظاهرا من الحیاۃ الدنیا)

اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ شرک کیا ہے اور توحید کیا۔ اگر لفظ بدل کر کہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ ــــ شرک نام ہے حقائق کو محسوسات کی سطح پر پہچاننے کا، اور توحید نام ہے حقائق کو معنویت کی سطح پر پہچاننے کا۔ مشرک انسان صرف ان خداؤں کو جانتا ہے جو محسوس طور پر اس کو اپنی آنکھوں سے نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس موحد انسان اس خدا کو جان لیتا ہے جو صرف تصور کی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ موحد مومن بالغیب ہوتا ہے اور مشرک مومن بالشہود۔

غیر مومن دکھائی دینے والی چیزوں میں جیتا ہے اور مومن نہ دکھائی دینے والی چیزوں میں۔ غیر مومن کی یافت عضویاتی یافت ہوتی ہے اور مومن کی یافت ذہنی یافت۔ غیر مومن کی پہنچ صرف ان چیزوں تک ہوتی ہے جن کو دیکھ کر جانا جاتا ہے اور مومن کی پہنچ ان چیزوں تک ہو جاتی ہے جن کو صرف سوچ کر جانا جا سکتا ہے۔

تاریخ کے ہر دور میں یہی انسان کی سب سے بڑی گمراہی رہی ہے۔ پیغمبر لوگوں کو خدا کی طرف بلاتے تھے مگر خدا چونکہ دکھائی نہیں دیتا اس لئے بہت کم لوگ ایسے نکلے جو خدا کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ بیشتر لوگوں نے انھیں محسوس چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بنا لیا جن کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے۔ روشن ستاروں کی پرستش سے لے کر دریاؤں اور پہاڑوں کی پرستش تک ہر جگہ یہی ذہنیت کارفرما رہی ہے۔ پیغمبروں کی دعوت کو نہ ماننے کی سب سے بڑی وجہ ہر دور میں یہ تھی کہ ان کے مخاطبین صرف محسوس خداؤں سے آشنا تھے، اس لئے پیغمبروں کی زبان سے غیر محسوس خدا کی پکار کو سن کر وہ متاثر نہ ہو سکے۔

بزرگوں اور ممتاز شخصیتوں کی پرستش کی نفسیات بھی یہی ہے۔ خدا چونکہ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا اس لئے لوگ خدا کی عظمت کو پکڑ نہیں پاتے۔ بزرگ اور ممتاز شخصیتیں دکھائی دیتی ہیں اس لئے لوگ ان کی عظمت کو پکڑ لیتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ بزرگ پرستی نام ہے محسوس پرستی کا، اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

کم سمجھنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے ایک غیر امیر خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ ابھی ماں کے پیٹ میں تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ پیدائش کے جلد ہی بعد آپ کی والدہ بھی اس دنیا سے چلی گئیں۔ آپ کو حلیمہ سعدیہ نے دودھ پلایا۔ حلیمہ کے شوہر کو ابو کبشہ کہا جاتا تھا۔ یہ ایک نہایت غریب خاندان تھا جو محنت مزدوری پر گزر کرتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں ایک یتیم بچہ کی حیثیت سے پرورش پائی۔ وہ قلیل معاوضہ پر مکہ والوں کی بکریاں چراتے تھے۔ آپ کے ساتھ کوئی عظیم ماضی شامل نہ تھا۔ چنانچہ مکہ والوں کی نظر میں آپ کی تصویر ایک حقیر تصویر بن گئی۔ آپ کا شمار مکہ کے بڑے لوگوں میں نہ تھا۔ بلکہ ان لوگوں میں تھا جو لوگوں کے نزدیک قابل تذکرہ نہیں ہوتے۔

اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ چالیس سال کی عمر کو پہنچ کر جب آپ پر وحی آئی اور آپ نے مکہ میں اپنی پیغمبری کا اعلان کیا تو لوگوں کو یہ ایک مذاق کی بات معلوم ہوئی۔ مکہ والوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ شخص جو کل تک ایک معمولی آدمی تھا وہ آج خدا کا رسول کیسے بن گیا۔ انھوں نے حقارت کے ساتھ کہا کہ یہ ابو کبشہ کے لڑکے کو دیکھو، وہ کہتا ہے کہ اس کو آسمان سے وحی آتی ہے (ھٰذا ابن ابی کبشۃ یکلم من السماء)

یہی چیز ہر دور میں پیغمبروں کے ہم زمانہ لوگوں کے لئے پیغمبروں کے انکار کا سبب بن گئی۔ خدا نے کبھی بادشاہوں یا وقت کی عظیم شخصیتوں کو پیغمبر نہیں بنایا۔ بلکہ غیر معروف لوگوں میں سے ایک شخص کو پیغمبری کے لئے چن لیا۔ اب جن لوگوں نے اس شخص کو پیغمبری سے پہلے کم سمجھا تھا وہ پیغمبری کے بعد بھی اس کو کم سمجھتے رہے۔ خدا نے انھیں بڑا کر دیا مگر جو لوگ انھیں پہلے چھوٹا دیکھ چکے تھے ان کے لئے ممکن نہ ہوا کہ وہ ان کی بڑائی کو پہچانیں اور ان کو اپنا بڑا بنائیں۔

یہ سب سے بڑا نفسیاتی فتنہ ہے جو ہر دور میں لوگوں کے لئے حق کو ماننے میں رکاوٹ بنا رہا ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ حقیقت کو "غیب" کی سطح پر پالے۔ وہ سچائی کو اس کے مجرد روپ میں پہچان سکے۔ لوگ عظمتوں کی سطح پر اعتراف کا ثبوت دے رہے ہیں۔ حالاں کہ اعتراف کا ثبوت وہاں دینا پڑتا ہے جہاں بظاہر دیکھنے والوں کو عظمت دکھائی نہیں دیتی۔ لوگ رونقوں کے مقام پر خدا پرستی کا مظاہرہ کر رہے ہیں حالانکہ خدا اکثر وہاں ہوتا ہے جہاں کسی قسم کی رونق نظر نہیں آتی۔

ناتمام کہانی

مسٹر پی۔ این۔ پاٹھک ایک بے حد محنتی آدمی تھے۔ وہ انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (نئی دہلی) میں ایک معمولی ملازم کے طور پر ۱۹۵۸ میں داخل ہوئے اور آخر میں اس کے کمپوزنگ شعبہ کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بن گئے۔ وہ غالباً مزید ترقی کرتے مگر ۲۷ دسمبر ۱۹۸۴ کو حرکت قلب بند ہونے سے ان کا انتقال ہوگیا۔ مرنے کے وقت ان کی عمر صرف ۵۰ سال تھی۔

ہندستان ٹائمس (۲۸ دسمبر ۱۹۸۴) میں ان کی اچانک موت کی خبر دیتے ہوئے یہ الفاظ درج ہیں کہ وہ اپنے موجودہ عہدہ پر محض سخت محنت کے ذریعہ پہنچے تھے:

He rose to the present position by sheer hard work

مسٹر پاٹھک نے الٰہ آباد میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد چند سال تک وہ ٹائمس آف انڈیا اور انڈین اکسپریس میں رہے۔ اس کے بعد ۱۹۵۸ میں وہ ہندستان ٹائمس کے عملہ میں داخل ہوئے۔ یہاں انھیں جم کر کام کرنے اور محنت کرنے کا موقع ملا۔ ۲۵ سال محنت کے بعد وہ اخبار میں ایک بڑے عہدہ پر پہنچ گئے۔ مگر ابھی وہ اس عہدہ سے متمتع بھی نہیں ہوسکے تھے کہ اچانک موت کا وقت آگیا۔

یہ ایک مثال ہے جو بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کیسے عجیب المیہ سے دوچار رہے۔ انسان بے پناہ محنت کرتا ہے۔ وہ اپنی پوری طاقت خرچ کرکے ترقی کے اعلیٰ مقام پر پہنچتا ہے۔ مگر اپنی کوششوں کے آخری انجام سے فائدہ اٹھانے کا ابھی آغاز بھی نہیں ہوتا کہ اس کی موت آجاتی ہے۔

زندگی کا یہ خاتمہ کیسا دردناک ہے۔ مگر کوئی شخص اس پر غور نہیں کرتا۔ ہر آدمی دوبارہ اسی دردناک کہانی کو لکھنا چاہتا ہے جس کو اس کے پیشرو نے لکھنا چاہا تھا اور وہ اس کو لکھنے میں کامیاب نہ ہوا۔ تمام انسانوں کی کہانی نامکمل کہانی ہے۔ مگر کوئی نہیں جس کو یہ سوال بے چین کرے کہ اس کا راز کیا ہے اور وہ کون سا طریقہ ہے جس کو اختیار کرکے انسان کی کہانی مکمل کہانی بن سکے۔

ہر انسان اس دنیا میں ایک ناتمام کہانی ہے۔ ہر انسان اپنی منزل پر پہنچ کر اچانک بے منزل ہو جاتا ہے۔ زندگی کی یہ بے انجامی کیسی عجیب ہے۔ اور اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ کسی کو اپنی بے انجامی کی فکر نہیں۔

مقبولیت کا راز

بنجمن فرینکلن (Benjamin Franklin) اپنے بچپن میں (Tactless) مشہور تھا۔ مگر بعد کو اس نے اتنا مقام پیدا کیا کہ وہ امریکہ کی طرف سے فرانس میں سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ اس کی کامیابی کا راز کیا تھا۔ صرف یہ کہ تجربات سے اس نے جانا کہ لوگ اپنے خلاف تنقید سے بہت برہم ہوتے ہیں۔ اس نے طے کیا کہ میں کبھی کسی کی کوئی خرابی نہیں بیان کروں گا۔ میں ہر ایک کی صرف خوبیاں بیان کروں گا:

I will speak ill of no man, and speak
all the good I know of everybody.

یہی وجہ ہے کہ با اصول آدمی ہمیشہ سب سے زیادہ مبغوض ہوتا ہے اور بے اصول آدمی کو لوگوں کی نظر میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ با اصول آدمی ہمیشہ حق کہتا ہے، خواہ وہ کسی کے موافق ہو یا کسی کے خلاف۔ جب کہ بے اصول آدمی ہر موقع کے لحاظ سے وہ بات کہتا ہے جس کو سن کر لوگ خوش ہو جائیں۔ سب کی پسند کی بات کہنے کی اسے یہ قیمت ملتی ہے کہ وہ سب کی نظر میں پسندیدہ شخص بن جاتا ہے۔

یہ طریقہ تاجر کے لئے یقیناً مفید ہے مگر وہ داعی اور مصلح کے لئے زہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح بولنے والے کے اندر وہ کردار ابھرتا ہے جس کو شریعت کی زبان میں منافق کہا گیا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو اندر سے کچھ ہوتا ہے اور باہر سے کچھ۔ وہ دل میں ایک چیز کو حق سمجھتا ہے اور زبان سے اس کے خلاف بولتا ہے۔ اس کی عقل اس کو ایک طریقہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے مگر محض اپنی قیادت کو باقی رکھنے کی خاطر وہ لوگوں کے سامنے دوسرے طریقہ کی وکالت کرتا ہے۔ اس کی آنکھ اس کو جو چیز اندھیرے کی صورت میں دکھاتی ہے اس کو وہ اپنی زبان سے اجالا بنا کر پیش کرتا ہے۔ ایسا انسان باعتبار حقیقت ایک مردہ انسان ہے۔ اگرچہ بظاہر وہ زندہ اور خوش پوش دکھائی دیتا ہو۔

داعی خدا کا سفیر ہوتا ہے۔ مگر دنیوی حکومتوں کے سفیر میں اور خدا کے سفیر میں بہت بڑا فرق ہے دنیوی حکومت کا سفیر وہ بات کہنے کے لئے بھیجا جاتا ہے جس سے لوگ خوش ہوں۔ مگر خدا کا سفیر لوگوں کے سامنے اس لئے آتا ہے کہ انھیں وہ بات بتائے جس سے خدا خوش ہوتا ہے۔ ایک مصلحت کو سامنے رکھ کر بولتا ہے۔ دوسرا حق کے تقاضے کو سامنے رکھ کر بولتا ہے۔ خواہ اس کی وجہ سے وہ لوگوں کے درمیان غیر مقبول ہو جائے۔

ناکام موت

مسٹر بی ڈی کھوبراگاڑے ۹ اپریل ۱۹۸۴ کو دہلی کے پنت اسپتال میں مر گئے۔ وہ ایک ہریجن لیڈر تھے۔ انھوں نے اپنی قوم کے ساتھ اونچی ذات والوں کے امتیازی سلوک کو دیکھا۔ ان کے اندر اس کے خلاف آگ بھڑک اٹھی۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ اس امتیاز کی بنیاد خود اس ہندستانی مذہب میں ہے جس سے وہ اب تک اپنے کو منسوب سمجھے ہوئے تھے تو انھوں نے مذہب کی تبدیلی کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر امبیدکر اور لاکھوں دوسرے ہریجنوں کے ساتھ وہ بدھزم میں داخل ہو گئے۔ مگر اس کے باوجود ہریجنوں کے ساتھ سماجی امتیاز ختم نہیں ہوا۔

اب کھوبراگاڑے اور ان کے ساتھیوں نے دوسری تدبیر کی۔ انھوں نے ری پبلکن پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنائی۔ انھوں نے چاہا کہ جو مسئلہ تبدیلی مذہب سے حل نہیں ہوا اس کو تبدیلی حکومت کے ذریعہ حل کیا جائے۔ مگر یہ اقدام بھی کامیاب نہیں ہوا۔ خود ری پبلکن پارٹی میں اندرونی اختلافات پیدا ہو گئے۔ وہ کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ مایوس کھوبراگاڑے ۵۹ سال کی عمر میں اس دنیا سے چلے گئے۔

مسٹر کھوبراگاڑے اپنی اس زندگی کے مسئلہ کا حل تلاش کرتے رہے جو "۵۹ سال" میں ختم ہو جانے والی تھی۔ آج اگر کوئی شخص ان سے پوچھے تو یقیناً وہ کہیں گے ——— افسوس کہ میں وقتی زندگی کے مسائل میں الجھا رہا اور اپنی اس زندگی کے لئے کچھ نہیں کیا جس سے ابدی سابقہ پیش آنے والا تھا۔

لوگ آج کے مسائل میں اتنا مشغول ہیں کہ انھیں کل کے مسائل پر سوچنے کی فرصت نہیں۔ وہ حال کے اندر اتنا گم ہیں کہ ان کو یہ پروا نہیں کہ وہ مستقبل کے بارہ میں سوچیں۔ لوگ اسی طرح غفلت میں پڑے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی موت آجاتی ہے۔ انسانوں میں الجھا ہوا آدمی اچانک اپنے آپ کو خدا کے سامنے کھڑا ہوا پاتا ہے۔ دنیا کے مسائل کو سب کچھ سمجھنے والا آدمی وہاں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں صرف آخرت کے مسائل کسی آدمی کے لئے سب کچھ ہوں گے۔ ظواہر کو اہمیت دینے والا آدمی اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں حقیقت کے سوا کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔

انسان کو دیکھئے تو وہ کتنا حیرت انگیز وجود معلوم ہوتا ہے۔ انسان کی صلاحیتیں اتنی عجیب ہیں کہ ساری کائنات میں اس سے زیادہ عجیب کوئی چیز نہیں۔ مگر کیسا دردناک انجام انسان کے حصہ میں آیا ہے۔ کیسی قیمتی زندگی کیسے بے قیمت انجام پر ختم ہو جاتی ہے۔ مگر کوئی نہیں جو اس کو سوچے، کوئی نہیں جو زندگی کو بامعنی بنانے کے لئے فکر مند ہو۔

داعی کون

داعی پیغمبر نہیں ہوتا مگر وہ خدا کا پیغام دینے والا ہوتا ہے۔ اس کو وہ بات کہنی پڑتی ہے جو خدا کی بات ہے۔ اس کو وہ حق پیش کرنا ہوتا ہے جس میں غیر حق کی کوئی ملاوٹ شامل نہ ہو۔ دعوت خدا کے بندوں کے سامنے خدا کی نمائندگی ہے اور خدا کی نمائندگی کبھی مصلحت اور ملاوٹ کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔

ریڈیو سٹ ایک ایسا آلہ ہے جو بکھری ہوئی خاموش نشریات کو قابل سماعت آواز کا روپ دیتا ہے۔ وہ فضا کی غیر مرئی لہروں کو الفاظ میں تبدیل کرتا ہے۔ یہ ایک مادی مثال ہے جس سے حق کے داعی کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جو کام ریڈیو سٹ کرتا ہے وہی داعی بھی کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اول الذکر اپنا کام بے روح مشین کی صورت میں انجام دیتا ہے اور داعی زندہ انسان کی صورت میں۔

داعی وہ شخص بنتا ہے جس کے اوپر قرآن کے معانی اس طرح کھلیں جیسے کہ قرآن اس کے اوپر ازسرنو اتر رہا ہے۔ داعی وہ شخص ہے جس کے لئے کائنات جبریل امین کی قائم مقام بن جائے۔ وہ خدا کی دنیا میں اسی طرح خدا کا پیغام اخذ کرنے لگے جس طرح ریڈیو سٹ نشرگاہ کے پیغام کو اخذ کرتا ہے۔ سائنس داں کائنات میں قانون فطرت کو پڑھتا ہے، داعی وہ ہے جو کائنات میں قانون ربانی کو پڑھنے لگے۔

دعوت خدا کے کلام کو انسانی کلام میں ڈھالنا ہے۔ دعوت خدا کی اس تسبیح کو الفاظ کا روپ دینا ہے جو کائنات میں خاموش صورت میں بیان ہو رہی ہے۔ دعوت وہی دعوت ہے جس میں حق کو بالکل برہنہ صورت میں دکھا دیا جائے۔ مگر حق کو برہنہ کرنے کے لئے داعی کو خود بھی "نذیر عریاں" بن جانا پڑتا ہے۔ داعی بننا ہمیشہ اپنی ہلاکت کی قیمت پر ہوتا ہے۔ ماں کے پیٹ سے پیدا شدہ انسان ہلاک ہو جاتا ہے اور اس کے اندر سے ایک نیا انسان ظہور میں آتا ہے اسی کا نام داعی ہوتا ہے۔ داعی انسان کے روپ میں غیر انسان ہوتا ہے۔ داعی لوگوں کے درمیان رہ کر اپنے آپ کو لوگوں سے جدا کرتا ہے، اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ خدا کا داعی بنے۔

داعی بننے کے لئے اپنے آپ کو حذف کرنا پڑتا ہے۔ دین کو اپنا فخر بنانے کے بجائے دین کو اپنا درد بنانا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی کسی کو داعی کا مقام ملتا ہے۔ دوسرے انسانوں کو اس دین سے دلچسپی ہو سکتی ہے جو آپ کا درد ہو۔ ان کو اس دین سے دلچسپی نہیں ہو سکتی جو آپ کا فخر ہو۔ دعوت اور فخر دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

خوراک

والٹر ڈی لا میر (Walter De La'Mare) ایک انگریز شاعر ہے۔ وہ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۵۶ء میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے انسان کے بارہ میں ایک طنزیہ نظم کہی ہے جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

It is a very odd thing
As odd as can be
That whatever Miss T eats
Turns into Miss T

یہ ایک نہایت عجیب بات ہے، اتنی عجیب جتنی کہ کوئی چیز عجیب ہو سکتی ہے۔ مس ٹی جو کچھ بھی کھاتی ہے وہ سب مس ٹی بن جاتا ہے۔

ہر آدمی کی اپنی ایک منفرد شخصیت ہوتی ہے۔ اس کا رنگ، اس کے بدن کی ساخت، اس کے بولنے کی زبان، اس کا طرز فکر، سب اس حد تک دوسروں سے مختلف ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے مقابلہ میں پہچانا جا سکے۔ آدمی روزانہ طرح طرح کی چیزیں کھاتا ہے۔ مگر وہ جو کچھ کھاتا ہے وہ اس کے اندر جا کر اس کی اپنی شخصیت میں ڈھل جاتا ہے۔ کوئی کھانے کی چیز باہر خواہ کچھ بھی ہو مگر وہ آدمی کے اندر داخل ہونے کے بعد وہی بن جاتی ہے جو وہ خود ہوتا ہے۔ ہر آدمی جو خوراک کھاتا ہے یا جو پانی وہ اپنے جسم میں داخل کرتا ہے اس کو وہ تحلیل کر کے اپنے وجود کا حصہ بنا لیتا ہے۔

یہی معاملہ خیالات و نظریات کا بھی ہے۔ آدمی بہت کم ایسا کرتا ہے کہ جو کچھ وہ دیکھے یا سنے اس کو اس طرح دیکھے یا سنے جیسا کہ فی الواقع وہ ہے۔ اکثر وہ چیزوں کو اس شکل میں دیکھتا ہے جیسا کہ وہ خود دیکھنا چاہتا ہے۔ ہر بات جو آدمی کے اندر داخل ہوتی ہے وہ اس کے اپنے ذوق کے مطابق بدل کر اس کی فکر کا جزء بن جاتی ہے۔

اسی مثال میں مومن اور غیر مومن کا فرق دیکھا جا سکتا ہے۔ دنیا طرح طرح کے واقعات و حقائق سے بھری ہوئی ہے۔ یہ واقعات وحقائق مومن کے سامنے بھی آتے ہیں اور غیر مومن کے سامنے بھی۔ مگر دونوں انھیں اپنے اپنے زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک کے لئے وہ اس کے ایمان کی غذا بن جاتے ہیں۔ مگر دوسرے کو ان سے اس کے سوا کچھ اور نہیں ملتا کہ اس کی سرکشی اور گمراہی میں اضافہ ہو جائے

قومی ہیرو

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ناظم دینیات کے دفتر میں بی ایس سی کا ایک مسلمان طالب علم
داخل ہوا "یہ مسلم یونیورسٹی ہے"۔ اس نے پرجوش انداز میں کہنا شروع کیا "یہاں آپ دینی امور کے
ذمہ دار ہیں۔ میں آپ کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ یہاں کی آزاد لائبریری میں انگریزی کی
ایک کتاب ہے جس میں ہمارے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی تصویر ہے۔ آپ اس کتاب کو فوراً لائبریری
سے ہٹوا دیں ورنہ ... "

ناظم دینیات نے کہا "تم جانتے ہو کہ آزاد لائبریری بہت بڑی لائبریری ہے۔ یہاں دنیا کے
مختلف اداروں سے کتابیں آتی رہتی ہیں۔ ایسی حالت میں یہاں ایسی کتابیں بھی آسکتی ہیں جن میں اللہ میاں
کا مذاق اڑایا گیا ہو۔ کیا تم ایسی سب کتابوں کو دیکھ کر مشتعل ہوتے رہو گے"

"سر اللہ میاں تو سب کے ہیں اور رسول اللہ تو ہمارے ہیں" (احتساب علی گڑھ ۱۵ مئی ۱۹۸۴)

مسلمان طالب علم کو کیوں خدا سب کا نظر آیا اور رسول صرف اپنا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے رسول
کو اپنا قومی ہیرو سمجھ لیا۔ ہر قوم کا اپنا الگ ایک ہیرو ہوتا ہے جس پر وہ دوسری قوموں کے مقابلہ
میں فخر کرتی ہے۔ خدا میں اشتراک ممکن ہے مگر قومی ہیرو میں اشتراک ممکن نہیں۔ یہی قومی نفسیات تھی جس
کی وجہ سے مسلمان طالب علم خدا کے خلاف بات پر نہیں بھڑکا مگر رسول اللہ کے خلاف بات کو دیکھ کر بھڑک
اٹھا۔

مذکورہ طالب علم کا واقعہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی صحیح نمائندگی کر رہا ہے۔ موجودہ زمانہ کے
مسلمان کبھی "جشن خداوندی" نہیں مناتے۔ البتہ وہ "جشن محمدی" خوب دھوم کے ساتھ ساری دنیا میں
مناتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اپنی قومی نفسیات کی بنا پر انھیں خدا میں کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ کیونکہ
خدا میں وہ اپنے لئے ذاتی فخر کا سامان نہیں پاتے۔ البتہ "محمد" تاریخی طور پر چونکہ ان کے ہیرو یا ان کا
قومی فخر بن چکے ہیں اس لئے ان کے نام پر خوب دھوم مچاتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنے پر فخر قومی
جذبات کی تسکین حاصل کر سکیں۔

آج ہر طرف الحاد کا غلبہ ہے مگر مسلمانوں کے اندر یہ جوش نہیں ابھرتا کہ وہ الحاد کے فکری
غلبہ کو ختم کر کے توحید کا فکری غلبہ قائم کریں۔ البتہ پیغمبر کی تصویر دیکھ کر وہ فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔
یقینی طور پر یہ ہیرو پرستی ہے نہ کہ خدا پرستی۔

گروہی اعتراف

یہود تورات کو خدا کی کتاب مانتے تھے۔ اسی طرح عیسائی انجیل کو خدا کی کتاب مانتے تھے۔ مگر جب قرآن ان کے سامنے آیا تو اس کو انھوں نے خدا کی کتاب ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا ماننا گروہی ماننا تھا نہ کہ حقیقی ماننا۔ وہ حق کو صرف اپنے گروہ کی بنیاد پر پہچانتے تھے نہ کہ اس کے جوہر کی بنیاد پر چنانچہ انھوں نے اپنے گروہی حق کو مانا اور گروہ سے باہر جو حق تھا اس کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ یہی بات قرآن میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے:

وإذا قيل لهم آمنوا بما أنزل الله قالوا نؤمن بما أنزل علينا ويكفرون بما وراءه وهو الحق مصدقا لما معهم (البقرہ ۹۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو (قرآن) بھیجا ہے اس کو مانو تو کہتے ہیں کہ ہم اس کو مانتے ہیں جو ہمارے اوپر اترا ہے۔ اور وہ اس کا انکار کرتے ہیں جو اس کے سوا ہے حالانکہ وہ حق ہے اور اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو ان کے پاس ہے۔

یہ نفسیات جس کے تحت یہود و نصاریٰ نے قرآن کا انکار کیا تھا، وہ آج پوری طرح مسلمانوں میں پائی جاتی ہے۔ آج مسلمانوں کا بھی یہ حال ہو رہا ہے کہ وہ صرف گروہی صداقت کو جانتے ہیں۔ وہ چیزوں کو اپنے گروہ کی نسبت سے پہچانتے ہیں۔ ان کے گروہ سے باہر اگر کوئی خوبی پائی جاتی ہو تو اس کی انھیں کوئی خبر نہ ہوگی۔

مسلمان آج بے شمار گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہر گروہ کا یہ حال ہے کہ وہ صرف اس عالم کو عالم جانتا ہے جو اس کے اپنے گروہ کا ہو۔ باہر کے عالم کی اسے خبر نہیں۔ ہر گروہ اپنے گروہ کے متقی کو متقی سمجھتا ہے۔ باہر کے متقیوں کی اس کی نظر میں کوئی قیمت نہیں۔ وہی مصنف مصنف ہے جو اپنے حلقہ کا ہو۔ اپنے حلقہ سے باہر کی کسی چیز کو وہ اس طرح نظر انداز کر دیتا ہے جیسے وہ اس کو دکھائی ہی نہیں دیتی۔

خدا کے یہاں اس انسان کی قیمت ہے جس نے حق کو جوہر کی بنیاد پر پہچانا ہو۔ جو شخص گروہ کی بنیاد پر حق کو پہچاننے کی مہارت دکھائے اس کی قیمت صرف اس کے اپنے گروہ میں ہے، خدا کے یہاں اس کی کوئی قیمت نہیں۔

غلط اقدام

لیما (Lima) جنوبی امریکہ کا ایک شہر ہے۔ یہاں ایک غریب عورت اپنے چار بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ مقامی طور پر وہ کوئی اچھا روزگار پانے میں ناکام رہی۔ اس نے سنا تھا کہ شمالی امریکہ (USA) بہت خوش حال ملک ہے۔ اس نے حصول معاش کے لئے وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ مگر اس کے پاس ہوائی جہاز کا کرایہ نہیں تھا۔ اس نے یہ تدبیر کی کہ اپنے آپ کو ایک سوٹ کیس میں بند کیا اور اس سوٹ کیس کو کسی نہ کسی طرح لیما سے لاس انجلس جانے والے ہوائی جہاز پر بطور لگیج سوار کرادیا۔

جہاز لاس انجلس پہنچا۔ اس کا سامان حسب معمول نکال کر مخصوص مقام پر لایا گیا جہاں ہر آدمی پہچان کر اپنا سامان لے لیتا ہے۔ مگر ایک سوٹ کیس کا کوئی لینے والا نہیں ملا۔ بالآخر پولس نے اس سوٹ کیس کو کھولا تو اس کے اندر مذکورہ عورت کی لاش بند تھی۔ یو پی آئی کی خبر کا آخری فقرہ یہ تھا:

Detectives said the woman may have been crushed
by the weight of other luggage.

تفتیش کرنے والوں نے کہا کہ عورت غالباً دوسرے سامانوں کے بوجھ کے نیچے کچل کر مر گئی۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ جنوری ۱۹۸۵)

یہ واقعہ زندگی کی ایک حقیقت کو بتاتا ہے۔ یہ حقیقت کہ منزل تک پہنچنے کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ آدمی کسی نہ کسی طرح ایک اقدام کر ڈالے۔ اقدام کی کامیابی کے لئے بہت سے دوسرے اسباب کی موافقت ضروری ہے۔ یہ دوسرے اسباب اگر موافقت کے لئے موجود ہوں تو اقدام کامیاب ہوگا اور اگر دوسرے اسباب موافقت نہ کریں تو اقدام سراسر ناکام ہو کر رہ جائے گا۔

مذکورہ واقعہ میں عورت کا اقدام ایک انفرادی اقدام تھا۔ اس غلط اقدام کا نتیجہ اسے انفرادی طور پر بھگتنا پڑا۔ مگر ایک لیڈر جب کسی قوم کو اقدام کی طرف لے جاتا ہے تو یہ ایک اجتماعی اقدام ہوتا ہے اس کا انجام پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔ لیڈر کو مذکورہ خاتون کے مقابلہ میں کروروں گنا زیادہ محتاط ہونا چاہئے۔ لیڈر کے لئے غلط اقدام صرف غلط اقدام نہیں بلکہ وہ ایسا سنگین جرم ہے جس کے مقابلہ میں کوئی عذر قابل سماعت نہیں ہوسکتا۔

غلط اقدام سے کروروں گنا زیادہ بہتر ہے کہ آدمی کوئی اقدام ہی نہ کرے۔

بے معنی اچھل کود

یوپی کی ایک مسلم خاتون بیوہ ہوگئیں۔ ان کی تین چھوٹی لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکا تھا جو باپ کے انتقال کے وقت نویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ خاتون نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے لڑکے کو انجنیئر بنائے گی۔ اس نے شوہر کا پراویڈنٹ فنڈ خرچ کر کے اور خود بارہ بارہ گھنٹے روزانہ سلائی کا کام کر کے اپنے لڑکے کو پڑھانا شروع کیا۔

گھر کے حالات نے لڑکے کے اندر محنت کا جذبہ پیدا کیا۔ ہائی اسکول میں اس کو ۸۰ فی صد نمبر ملے۔ انٹرمیڈیٹ میں لڑکے نے ۷۶ فی صد نمبر حاصل کئے۔ اس کے بعد خاتون نے ہمت کر کے اپنے لڑکے کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں انجنیئرنگ میں داخل کرا دیا۔ یہاں بھی لڑکا انتہائی محنت کے ساتھ پڑھتا رہا۔ انجنیئرنگ کے پہلے سال سے لے کر چوتھے سال تک اس نے اس طرح پاس کیا کہ ہر سال اس کو ۸۰ فی صد سے زیادہ نمبر ملتے رہے۔

لڑکے کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے خاتون کا یہ منصوبہ بہت مہنگا تھا۔ اس مدت میں گھر کا اثاثہ ختم ہوگیا مکان گروی رکھنا پڑا۔ رات دن سلائی کا کام کرتے کرتے خاتون کی آنکھیں خراب ہوگئیں۔

۱۹۸۱ اس لڑکے کا فائنل ایئر تھا۔ اگر وقت پر امتحان ہو جاتا تو لڑکا انجنیئر بن جاتا۔ اس کی ماں نے اسی دن کی امید میں دس نہایت مشقت کے سال گزار دئے تھے۔ وہ اس امید میں جی رہی تھی کہ میرا لڑکا انجنیئر بنے گا۔ پھر وہ کما کر گھر کا خرچ چلائے گا۔ قرضے ادا کرے گا۔ بہنوں کی شادی کروائے گا۔ اس کے بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔ مگر اس سال یونی ورسٹی کے لیڈر لڑکوں نے یونی ورسٹی میں ایسے ہنگامے شروع کئے کہ امتحان ہی نہ ہو سکے۔ خاتون کی دنیا بنتے بنتے اپنے آخری مقام پر پہنچ کر اجڑ گئی (حسب روایت احمد رشید شروانی مطبوعہ الجمعیۃ ۳ جون ۱۹۸۱)

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی کے مسائل کتنے نازک ہوتے ہیں۔ یہاں بے شمار مسائل ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہوتے ہیں کہ ایک کو چھیڑنے میں دوسرا متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے اجتماعی معاملات میں پڑنا صرف ان لوگوں کے لئے جائز ہے جو معاملات کو دوراندیشی کی نگاہ سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جو دوسرے کے پھٹنے کا درد اپنے سینہ میں محسوس کریں۔ جن لوگوں کے اندر یہ دونوں صفات نہ ہوں وہ اگر اجتماعی اصلاح کے میدان میں کودتے ہیں تو وہ صرف جرم کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے واحد صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ خاموش رہیں۔ نہ یہ کہ احمقانہ اقدام کر کے مسائل میں اور اضافہ کرنے کا سبب بن جائیں۔

نوجوانوں کے نام

جدید صنعتی دنیا کی ایک اصطلاح ہے جس کو کنجی گھماؤ منصوبہ (Turn-key project) کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد ایک ایسا مکمل طور پر بنا بنایا گھر یا کارخانہ ہے جس میں آدمی کا کام صرف کنجی گھمادینا ہو۔ مسلمان موجودہ زمانہ میں جس طرح عمل کر رہے ہیں اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا دنیا کو وہ اپنے لئے اسی قسم کی جگہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال شاید یہ ہے کہ ان کے خدا نے ایک تیار شدہ دنیا ان کے حوالے کر دی ہے اور اب ان کا کام صرف یہ ہے کہ ایک کنجی گھما کر وہ اس کو اپنی مرضی کے موافق چلادیں۔

مگر یہ سراسر نادانی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا عمل اور مسابقت کی دنیا ہے۔ یہاں ہمیں اول سے آخر تک سارا کام خود کرنا ہے۔ ہمیں دوسروں کا مقابلہ کرتے ہوتے زندگی کا ثبوت دینا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ اسباب کی اس دنیا میں ہم کو اپنی مطلوبہ جگہ مل سکے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو سب سے پہلے جو چیز جاننا چاہئے وہ یہ حقیقت ہے کہ وہ تاریخ کے آغاز میں ہیں، تاریخ کے اختتام میں نہیں ہیں۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ اگر وہ جنوری ۱۹۸۵ میں ہو تو دسمبر ۱۹۸۵ کے زمانہ میں پہنچنے کے لئے اس کو بارہ مہینے تک انتظار کرنا پڑے گا۔ زمین اپنے محور پر ۳۶۰ بار گھومے گی اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ہمارا ایک سال پورا ہو اور ہم تکمیل سال کے مرحلہ میں پہنچ سکیں۔

یہ اس دنیا کی انتہائی معلوم حقیقت ہے۔ مگر اسی معلوم حقیقت کو مسلمان ملت کی تعمیر کے معاملہ میں بالکل بھول جاتے ہیں۔ وہ عملاً پہلے مہینہ میں ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ چھلانگ لگا کر آخری مہینہ میں جا پہنچیں۔ وہ بنیاد کی تعمیر نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ وہ اپنے خیالی مکان کی بالائی چھت پر کھڑے ہوئے نظر آئیں۔ واقعہ کے اعتبار سے وہ اپنے سفر کے آغاز میں ہوتے ہیں۔ اور ایسے انتہائی الفاظ بولتے ہیں گویا کہ وہ درمیانی راستہ طے کئے بغیر اپنی آخری منزل پر پہنچ گئے ہیں۔

یاد رکھئے، ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ہم ایک بامقصد قوم تیار کریں۔ ہمیں قوم کے افراد کو وہ تعلیم دینا ہے جس سے وہ ماضی اور حال کو پہچانیں۔ ان کے اندر وہ شعور پیدا کرنا ہے کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہونا جانیں۔ ان کے اندر وہ حوصلہ ابھارنا ہے کہ وہ شخصی مفاد اور وقتی جذبات سے اوپر اٹھ کر قربانی دے سکیں۔ یہ سارے کام جب قابل لحاظ حد تک ہو چکے ہوں گے اس کے بعد ہی کوئی ایسا اقدام کیا جا سکتا ہے جو فی الواقع ہمارے لئے کوئی نئی تاریخ پیدا کرنے والا ہو۔ اس سے پہلے اقدام کرنا صرف موت کی خندق میں چھلانگ لگانا ہے نہ کہ زندگی کے چمنستان میں داخل ہونا۔

جھوٹا فخر

جس قوم کا ایک شاندار ماضی ہو اس کا بگاڑ ہمیشہ صرف ایک ہوتا ہے۔ یہ کہ اس کے اندر وہ نفسیات پیدا ہو جاتی ہے جس کو پدرم سلطان بود کہا جاتا ہے۔ آج مسلمانوں کا معاملہ یہی ہے۔ مسلمان جب دین کو کھو دیں تو اس کے بعد ان کے پاس صرف تاریخ باقی رہ جاتی ہے۔ ذاتی طور پر اسلام سے خالی ہونے کے بعد وہ یہ کرتے ہیں کہ گزرے ہوئے بڑے بڑے لوگوں کا نام لے کر فخر کرتے ہیں کہ ہم فلاں اور فلاں شخصیتوں سے نسبت رکھتے ہیں۔ ہم ایسے اور ایسے لوگوں کے وارث ہیں۔ یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ خود پیغمبر تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ ان چیزوں کو بھی اپنے فخر کے خانہ میں لکھ لیتے ہیں جن کا تعلق خالصۃً نبوت سے ہے۔ مثال کے طور پر معراج کے واقعہ کے بارہ میں مسلم شاعروں کے یہ اشعار پڑھئے:

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفٰی سے مجھے — کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں
در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

ان اشعار میں بلند پروازی کا جو مضمون ہے وہ معراج کے واقعہ سے بطور تلمیح پیدا کیا گیا ہے۔ یہ توجیہ درست نہیں کیوں کہ معراج کے واقعہ کا تعلق پیغمبر سے ہے نہ کہ عام مسلمانوں سے۔ مگر مسلمانوں کی فخر پسندی ان کو یہاں تک لے گئی کہ جو چیز استثنائی طور پر صرف پیغمبر کو دی گئی تھی اس کو "ہمارے پیغمبر" کی منطق سے انھوں نے اپنے خانہ میں ڈال لیا۔ حتی کہ اس معاملہ میں اپنے آپ کو پیغمبر سے بھی آگے بڑھا دیا۔ معراج کا واقعہ پیغمبر کے لئے عبدیت کا ایک تجربہ تھا۔ مگر مسلمانوں کے لئے وہ گردوں کو زد میں لینا، خدا پر کمند ڈالنا، ستاروں کو گرد راہ بنانا بن گیا۔ اسی کا نام جھوٹا فخر ہے اور جھوٹا فخر حقائق کی اس دنیا میں سب سے بڑی ہلاکت ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصل مرض یہی جھوٹا فخر ہے۔ جھوٹے فخر کی یہ نفسیات کبھی خاندان کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔ کبھی قوم اور مذہب کی بنیاد پر اور کبھی پیغمبر کا امتی ہونے کی بنیاد پر۔ مگر فخر کی تمام قسمیں سراسر باطل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی صرف وہ ہے جو وہ خود ہے نہ کہ وہ جو اس کے باپ دادا کبھی تھے۔

خود فریبی

بہت سے لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ کسی کو "شہید" کا لقب دے کر اس کی دھوم مچا رہے ہیں۔ اگر آپ ان صاحب کو شہید کے بجائے مقتول کہہ دیں تو وہ آپ سے اس طرح بگڑ جائیں گے جیسے کہ نعوذ باللہ آپ نے خدا کی شان میں کوئی گستاخی کر دی ہے۔ حالانکہ خود ان لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے ایسی زندگی کو پسند کئے ہوئے ہوں گے جس کا شہادت اور قربانی سے کوئی تعلق نہیں۔

بہت سے لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ کسی کو "بزرگ" بنا کر اس کی بزرگی کی جھوٹی کہانیاں خوب بیان کریں گے۔ اگر آپ ان بزرگ کے ساتھ مصنوعی القاب نہ لکھیں یا ان کا نام ایک عام آدمی کی طرح لے لیں تو وہ آپ پر اس طرح برس پڑیں گے جیسے کہ آپ نے کسی حرام فعل کا ارتکاب کر دیا ہے۔ مگر یہ سب کچھ صرف الفاظ کی دنیا میں ہوگا۔ عملاً ان لوگوں کا اپنا حال یہ ہوگا کہ ان کی زندگی ان اوصاف سے ضروری حد تک بھی خالی ہوگی جن کو وہ اپنے مفروضہ بزرگوں میں مبالغہ آمیز حد تک ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

یہ بظاہر غیر پرستی ہے۔ مگر حقیقۃً یہ خود پرستی کی بدترین قسم ہے۔ یہ کسی کی بڑائی کے نام پر اپنے آپ کو بڑا بنانے کی کوشش ہے۔ یہ دوسرے کی شہادت اور قربانی کا قصیدہ پڑھ کر اپنے آپ کو شہیدوں کی صف میں کھڑا کرنا ہے۔ یہ دوسروں کی بزرگی کا چرچا کر کے اپنے آپ کو بزرگوں کے زمرہ میں داخل کرنا ہے۔ یہ کچھ مسلّم شخصیتوں کو نمایاں کر کے ان کی فہرست کمال میں اپنا اندراج کرنا ہے۔ یہ اس نفسیات کو تسکین دینا ہے کہ ــــــ ہم خود بڑے نہیں، مگر ہم کو بڑوں سے نسبت تو حاصل ہے۔ حالانکہ اس قسم کی نسبت کی خدا کے یہاں کوئی حقیقت نہیں۔

جو لوگ ایسا کرتے ہیں انھیں شاید یہ معلوم نہیں کہ یہ دنیا حقائق کی دنیا ہے نہ کہ مفروضات کی دنیا۔ اس دنیا میں ہر آدمی حقیقت کے پیمانہ سے ناپا جا رہا ہے۔ ہر آدمی وہ ہے جو حقیقت واقعہ کی نسبت سے وہ قرار پائے نہ کہ وہ جو وہ خود ساختہ مفروضات کے خانہ میں ظاہر ہو۔ بڑوں کی مدح خوانی سے کوئی بڑا نہیں ہو جاتا۔ بڑا وہ ہے جو حقیقت واقعہ کی نظر میں بڑا ہو۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے: لیس للانسان الا ما سعیٰ۔

عظیم کوتاہی

۱۹۱۶ میں آل انڈیا کانگرس کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ اس اجلاس میں گاندھی جی پہلی بار کانگرس کے اسٹیج پر نمایاں ہوئے۔ گوپی ناتھ امن لکھنوی بھی اس تاریخی اجلاس میں ایک جوشیلے نوجوان کی حیثیت سے موجود تھے۔ ان کی روایت کے مطابق اس وقت کے یوپی کے انگریز گورنر سر جیمس مسٹن نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی تھی۔ وہ اسٹیج پر کھڑے ہوئے تو انھوں نے گوپی ناتھ امن کے الفاظ میں شستہ اردو میں تقریر کی جو اس وقت سامعین کے لئے بڑی دلپذیر ثابت ہوئی (صدق جدید ۱۹ اگست ۱۹۸۲)

برطانی راج کے زمانہ میں بہت سے انگریزوں نے اردو (یا ہندستانی زبان) سیکھی تھی۔ ان کے لئے اردو زبان سیکھنے کا محرک اگرچہ تمام تر سیاسی تھا۔ مگر اس نے ہمارے علماء کے لئے تبلیغ دین کا زبردست موقع پیدا کر دیا تھا۔ وہ علماء جو دین سے واقف تھے مگر انگریزی نہیں جانتے تھے، وہ کم از کم اردو داں انگریزوں سے مل کر ان کو خدا کے سچے دین سے واقف کرا سکتے تھے۔ اس طرح کچھ انگریزوں تک براہ راست طور پر اور بقیہ انگریزوں تک بالواسطہ طور خدا کا پیغام پہنچ جاتا اور وہ اپنی دعوتی ذمہ داری سے خدا کے یہاں سبک دوش ہو جاتے۔

مگر ایک پورا دور ختم ہو گیا۔ اور اس قیمتی امکان کو استعمال نہ کیا جا سکا۔ اس کی وجہ مواقع کی کمی نہیں بلکہ جذبہ کی کمی تھی۔ انگریز ہندستان میں آئے تو ہمارے علماء ان کو قومی دشمن کی نظر سے دیکھنے لگے۔ انگریز ان کے لئے نفرت اور حقارت کا موضوع بن گئے۔ انگریزوں کے بارہ میں ہمارے علماء کے اندر قومی نفسیات تو پیدا ہوئی مگر ان کے اندر انگریزوں کے بارہ میں دعوتی نفسیات پیدا نہ ہو سکی۔

دعوت کا کام دوسرے لفظوں میں مدعو کو جنت کا راستہ دکھانے کا کام ہے۔ اس قسم کا کام وہی شخص کر سکتا ہے جس کے اندر اپنے مخاطب کے لئے محبت اور خیر خواہی کا بے پناہ جذبہ پایا جاتا ہو۔ علماء جب انگریزوں سے نفرت کر رہے تھے تو وہ ان کو دعوت حق کا مخاطب نہیں بنا سکتے تھے۔ ہمارے علماء کی یہی عظیم الشان کوتاہی ہے جس کی سزا انھیں یہ ملی کہ وہ لوگ جنھوں نے آزادی کی جدوجہد میں آگے بڑھ کر قربانیاں دی تھیں۔ جب ملک آزاد ہوا تو وہ یہاں سب سے پیچھے کی صف میں دھکیل دئے گئے۔ غلام ہندستان کے "امام" آزاد ہندستان کے "مقتدی" بن کر رہ گئے۔

خدائی معاشرہ

اسلامی دعوت کا نشانہ فرد ہے نہ کہ اجتماع ـــــــ الرسالہ میں یہ مضمون دیکھ کر ایک صاحب لکھتے ہیں کہ "مجھے اس امر میں آپ سے اتفاق ہے کہ اصل کام فرد کو خدا سے جوڑنے ہی کا ہے۔ مگر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک صالح اجتماعیت کا وجود بھی ضروری ہے جو کہ فرد کو خدا سے جوڑنے میں اپنی اجتماعی صالحیت کے دباؤ سے کام لیتی ہے۔"

فرد کو خدا سے جوڑنے کا یہ نظریہ اصل مسئلہ کے کمتر اندازہ پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے ایک انسان کا رب العلمین سے جڑنا اس سے زیادہ بڑا مسئلہ ہے کہ کوئی مفروضہ اجتماعی دباؤ اس کو وقوع میں لاسکے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہی لوگ معیاری لوگ تھے جو انفرادی شعور کو بیدار کرنے سے پیدا ہوئے تھے۔ اس کے بعد جب " اجتماعی دباؤ " کا زمانہ آیا تو دوبارہ ویسے لوگ پیدا نہ ہوسکے۔

انسان انسان سے نہیں ڈرتا۔ انسان صرف خدا سے ڈرتا ہے۔ اور خدا سے ڈرنے کے لئے خود خدا کا دباؤ درکار ہے نہ کہ انسان کا دباؤ۔ خدا کا دباؤ کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ خدا کی یاد اور خدا کی کائنات میں غور کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرد کے اندر ربانی جذبہ پیدا کرنے کا ذریعہ انسانی معاشرہ نہیں بلکہ خدائی معاشرہ ہے۔ کائنات گویا ایک وسیع معاشرہ ہے جو خدا نے براہ راست اپنے انتظام کے تحت قائم کر رکھا ہے۔ کائنات دہشت ناک حد تک عظیم ہے۔ ایک بندہ جب پھیلی ہوئی کائنات میں غور کرتا ہے تو اس میں وہ خدائی کمالات کی جھلکیاں پاتا ہے۔ کائنات اس کو مالک کائنات سے متعارف کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اسلامی دعوت کا کام، ایک اعتبار سے، انسان کو اسی خدائی جلوہ گاہ سے جوڑنا ہے۔ اسلامی دعوت کا نشانہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کے اندر یہ صلاحیت ابھارے کہ وہ کائنات کی عظمتوں کو دیکھ کر خدا کی عظمتوں کو محسوس کرسکے۔

انسانی معاشرہ مخصوص حالات میں جزئی اور محدود دباؤ کا کام کرسکتا ہے۔ مگر اس کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ انسانی شعور کو جگائے، وہ کسی شخص کے اندر روحانی بیداری پیدا کرے، وہ انسان کے اندر وہ تڑپ پیدا کرے کہ وہ خود اپنا نگراں بن جائے۔ اس مقصد کے لئے بے حد طاقتور عامل کی ضرورت ہے۔ ایک فرد کے اندر ربانی احساس جگانے کے لئے لامحدود کائنات کی وسعت درکار ہے۔ محدود انسانی معاشرہ کبھی اس کام کو انجام نہیں دے سکتا۔

اسلام کی نفی

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آدم اور ان کی نسل کو زمین میں بھیجنے کا فیصلہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو (اور ان
کی متوقع نسلوں کو) مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگ جاکر زمین میں بسو۔ تہارا بعض تمہارے بعض کا دشمن
ہوگا۔ پس جب تمہارے پاس میری ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت پر چلے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور
نہ بد بختی میں مبتلا ہوگا (طٰہٰ ۲۳)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں انسانوں کا بگاڑ یہ ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ہوکر
لڑنے لگیں۔ انسانوں کا دو گروہ بن کر باہم لڑنا انسانی بگاڑ کی خاص علامت ہے۔ حضرت آدم کے زمین میں
آباد ہونے کے بعد آپ کے فرزند ہابیل اور قابیل سے اس باہمی جنگ کا آغاز ہوا۔ اس وقت سے لے کر
آج تک تاریخ کے بیشتر حصوں میں یہی صورت حال جاری رہی ہے۔

تاہم قدیم زمانہ اور جدید زمانہ میں ایک فرق ہے۔ قدیم زمانہ کی لڑائیاں ضد اور ظلم کے جذبہ
کے تحت ہوتی تھیں۔ موجودہ زمانہ میں یہ باہمی ٹکراؤ فلسفیانہ جواز کے تحت ہو رہا ہے۔ یہ فلسفیانہ جواز
موجودہ زمانہ میں دو قسم کے لوگوں نے فراہم کیا ہے۔ اولاً اشتراکی مفکرین نے، اور اس کے بعد اسلامی
مفکرین نے۔ اشتراکی مفکرین نے یہ کام "حکومتِ مزدور" کے نعرہ کے تحت کیا اور اسلامی مفکرین نے
"حکومتِ الٰہیہ" کے نعرہ کے تحت۔

اشتراکی فلسفہ نے موجودہ زمانہ میں کچھ لوگوں کو موقع دیا ہے کہ وہ لوگوں کی آزادیاں چھین لیں۔ ان
کو ان کی جائدادوں سے محروم کریں۔ ان کو بے دریغ قتل کریں۔ ان کو ناقابل بیان مصائب میں
مبتلا کر دیں۔ اس کے باوجود ان تمام مظالم کے جواز کے لئے ان کے پاس ایک خوبصورت فلسفہ موجود
ہو۔ ٹھیک اسی طرح جدید اسلامی مفکرین کے نظریات نے انھیں یہ موقع دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو دو
طبقوں (حکمراں طبقہ اور انقلاب پسند طبقہ) میں تقسیم کرکے انھیں ایک دوسرے سے لڑائیں اور اس
کو اسلامی جہاد کہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کی باہمی جنگ حرام ہے۔ وہ اقتدار پاکر انسان سے ہر قسم
کی آزادی چھین لیں اور اپنے مخالفین کو کچلنے کے تمام وحشیانہ طریقے استعمال کریں اور اس کے باوجود
ان کا اسلامی فلسفہ ان کو جائز ثابت کرنے کے لئے موجود ہو۔

اشتراکی مفکرین نے عدل کے نام پر عدل کی نفی کی تھی، اسلامی مفکرین اسلام کے نام پر اسلام
کی نفی کر رہے ہیں۔

قومی نہ کہ دینی

اخبار ٹیلی گراف (کلکتہ) کی ۱۰ جنوری ۱۹۸۵ میں صفحہ تین پر ایک تصویر ہے۔ اس تصویر میں ایک کالے بچہ کے ساتھ ایک سفید نسل کی بچی بیٹھی ہوئی ہے۔ دونوں ایک کھلی ہوئی کتاب کے سامنے جھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے کہ ایک چھوٹی اسرائیلی لڑکی ایک باتصویر کتاب کے ذریعہ ایتھوپیا کے ایک چھوٹے لڑکے کو عبرانی زبان سکھا رہی ہے۔ یہ تصویر ایلات کی ہے جو بحر احمر کے کنارے واقع ہے۔ یہ بچہ ان ہزاروں یہودیوں میں سے ایک ہے جو حال میں اسرائیل پہنچے ہیں:

A little Israeli girl using a picture book to teach Hebrew to an Ethiopian boy at Eilat on the Red Sea coast. The boy arrived with thousands of other Ethiopians recently.

۱۹۸۴ میں ایتھوپیا (افریقہ) میں غیر معمولی قحط پڑا۔ انسان اور جانور بھوک سے مرنے لگے۔ یہاں یہودی تقریباً ۲۵ ہزار کی تعداد میں آباد ہیں جن کو فلاشا کہا جاتا ہے۔ اسرائیل کی حکومت نے یہ منصوبہ بنایا کہ ان یہودیوں کو اسرائیل میں بسایا جائے۔ ان کو ایتھوپیا سے اسرائیل لانے کے لئے جو ہوائی سروس جاری کی گئی اس کا سرکاری نام عمل موسیٰ (Operation Moses) رکھا گیا۔ اسرائیل کے وزیر اعظم شیمون پیریز (Shimon Peres) نے اسرائیلی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس عظیم انسانی خدمت کے کام کو ہم جاری رکھیں گے۔ ہم اس وقت تک اس سے باز نہ آئیں گے جب تک ایتھوپیا کا آخری یہودی ہمارے پاس نہ آجائے:

We shall continue this noble and humane rescue act and shall not interrupt it until the last of Ethiopia's Jews has arrived with us.

حضرت موسیٰ کے زمانہ میں یہود مصر میں آباد تھے۔ آپ ان کو خدائی منصوبہ کے تحت مصر سے نکال کر سینا میں لے گئے۔ اسی ظاہری مشابہت کی بنا پر ایتھوپیا کے یہودیوں کو وہاں سے نکال کر اسرائیل لے جانے کو مذکورہ نام دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک قومی واقعہ کو دینی اصطلاح میں بیان کرنا ہے۔ یہی مسلمان بھی موجودہ زمانہ میں بڑے پیمانہ پر کر رہے ہیں۔ وہ اپنی قومی تحریک کو دعوت کا عنوان دیتے ہیں۔ وہ اپنی قومی بھگدڑ کو ہجرت کہتے ہیں۔ وہ اپنی قومی لڑائیوں کے لئے جہاد کا پرفخر لفظ پالیتے ہیں۔ مگر ایک چیز جو باعتبار حقیقت قومی ہو وہ خدا کے نزدیک قومی ہی رہے گی۔ دینی الفاظ بولنے سے وہ دینی نہیں ہو جائے گی۔

شیطانی فریب

۲۵ دسمبر ۱۹۸۴ کو میری ملاقات ایک مصری نوجوان سے ہوئی۔ وہ لندن کے ایک عربی رسالہ کے نامہ نگار ہیں۔ یہ عربی رسالہ ایرانی انقلاب کی حمایت میں نکالا گیا ہے۔ مصری نوجوان سے میری جو گفتگو ہوئی اس کا ایک حصہ یہ تھا:

"میں امام خمینی کا عاشق ہوں"

"کیوں"

"وہ جدید تاریخ کے پہلے مسلم قائد ہیں جنھوں نے اسلام دشمن طاقتوں کو ذلت آمیز شکست دی"

یہ گفتگو بتاتی ہے کہ بہت سے مسلمان جو امام خمینی کے پرجوش حمایتی ہیں اس کا اصل راز کیا ہے۔ اس کا راز تمام تر منفی ہے نہ کہ مثبت۔ جو لوگ قومی اور سیاسی اسباب کے تحت مغربی قوموں کی نفرت اپنے دلوں میں لئے ہوئے تھے انھوں نے خمینی انقلاب کے واقعہ میں یہ تسکین پالی کہ اس نے ــــ ہم کو ذلیل کرنے والوں کو ذلیل کردیا۔ امام خمینی کی یہ حمایت مفروضہ اسلام دشمنوں کو شکست دینے کی بنا پر ہے نہ کہ خود اسلام کو قائم کرنے کی بنا پر۔ اس خوشی کا راز قومی مراد کو پالینا ہے نہ کہ اسلامی مراد کو پالینا۔

لیکن زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو یہ منفی بنیاد بھی محض خیالی ہے۔ غور کیجئے کہ وہ کون ہے جس کو امام خمینی نے "ذلت آمیز" شکست دی ہے۔ وہ در اصل خود ایران کا مسلم بادشاہ ہے نہ کہ وہ اسلام دشمن طاقتیں جن کو روس اور امریکہ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ امام خمینی کی " فتح " کا تعلق امریکہ اور روس سے نہیں۔ بلکہ خود ایران کے مسلم بادشاہ سے ہے۔ پرجوش مجاہدین نے اولاً شاہ ایران کو " دشمنوں کا ایجنٹ" کا لقب دیا۔ اس کے بعد اس کو فتح کرکے اعلان کردیا کہ ہم نے اسلام دشمن طاقتوں کے اوپر فتح پائی ہے۔

اسی کو قرآن میں تزئین اعمال کہا گیا ہے۔ یعنی برے اعمال کو اچھا کرکے دکھانا۔ مسلمان آج اسی شیطانی فریب میں مبتلا ہیں۔ وہ ایک مسلمان کو قتل کرتے ہیں اور فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم نے ایک مرتد کو قتل کیا ہے۔ وہ اپنے بھائی کو ذلیل کرتے ہیں اور یہ کہہ کر خوش ہوتے ہیں کہ ہم اسلام دشمن عناصر کو ذلیل کررہے ہیں۔ وہ اپنے حکمراں کو تخت سے اتارتے ہیں اور پھر اس طرح یوم فتح مناتے ہیں جیسے انھوں نے کافروں اور مشرکوں کے اوپر غلبہ حاصل کرلیا ہو۔

اونٹ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اونٹ کو دیکھو کہ خدا نے کس طرح اسے بنایا ہے (الغاشیہ ۱۷)
حقیقت یہ ہے کہ اونٹ بڑا عجیب و غریب جانور ہے۔ اونٹ کی تخلیق پر غور کرنے سے خدا کی عجیب و غریب نشانیاں انسان کے سامنے آتی ہیں۔

وہ تمام فائدے جو دوسرے جانوروں میں ہیں وہ اونٹ میں بھی پوری طرح موجود ہیں۔ مثلاً اس سے دودھ، گوشت، اون، چمڑا اور دوسری چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ اونٹ کی انوکھی صفت یہ ہے کہ وہ صحرا کا جہاز (سفینۃ الصحراء) ہے۔ اونٹ کو اس کے بنانے والے نے اس طرح بنایا ہے کہ وہ صحراء کے ناقابل برداشت سفر میں انسان کا رفیق بن سکے۔

ریگستانوں میں بہت دور دور تک پانی نہیں ملتا جب کہ زندگی کے لئے پانی انتہائی ضروری ہے۔ چنانچہ اونٹ میں یہ عجیب و غریب صفت ہے کہ وہ متواتر ایک مہینہ تک یا اس سے بھی زیادہ پانی کے بغیر رہ سکتا ہے۔ وہ اپنے مسافر کو لئے ہوئے چار سو کلو میٹر تک جا سکتا ہے بغیر اس کے کہ اس کو پانی کا ایک قطرہ ملا ہو۔ اس کے بعد اگر کہیں پانی کا چشمہ مل جائے تو اس کے اندر مزید یہ عجیب و غریب صفت ہے کہ بیک وقت وہ اپنے پیٹ کو اس طرح بھر سکتا ہے جیسے وہ کوئی پانی کی ٹنکی ہو۔ وہ صرف دس منٹ کے اندر ایک سو لیٹر پانی اپنے اندر داخل کر سکتا ہے جو آئندہ کئی ہفتے تک اس کے کام آتا رہے۔

اونٹ کے اندر یہ عجیب بات ہے کہ وہ ایک وحشی جانور ہے پھر بھی وہ پالتو جانوروں میں شامل ہے۔ وہ سرکش ہے اور اسی کے ساتھ تابعدار بھی۔ وہ سخت غصہ ور ہے اور اس کے باوجود صابر بھی۔
پانی زندگی کے لئے لازمی طور پر ضروری ہے۔ پھر ریگستان کے سفر میں جب اونٹ کو کہیں پانی نہیں ملتا تو وہ اپنی پانی کی ضرورت کو کس طرح پوری کرتا ہے۔ محققین نے دریافت کیا ہے کہ اونٹ کا کوہان عملاً پانی کا کارخانہ ہے۔ کوہان حقیقتہً چربی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جب پانی کی شدید ضرورت ہوتی ہے تو اونٹ اپنے جسم کے اندر کسی پراسرار کیمسٹری کے ذریعہ چربی کو پانی میں تبدیل کرنا شروع کرتا ہے۔ اور اس طرح اپنی پانی کی ضرورت پوری کر لیتا ہے۔

(الوعی الاسلامی شوال ۱۴۰۴ھ)

آیت فتنہ

حضرتِ امام حسن بن علی نے ۴۱ھ میں ایک صلح نامہ کے ذریعہ خلافت سے دست برداری اختیار
۔ اس وقت سے خلافت بنو امیہ کے خاندان میں چلی گئی۔ تاہم امیر معاویہ کی وفات (۶۰ھ) کے
ر بار خلافت کے دعویدار اٹھتے رہے اور بنو امیہ میں اور ان مدعیان خلافت میں جنگ جاری

انھیں میں سے ایک عبد اللہ بن زبیر تھے۔ ان کا صدر مقام مکہ تھا۔ انھوں نے بنو امیہ
افت کو تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ بنو امیہ کے عامل حجاج بن یوسف سے ان کی جنگ ہوتی رہی۔
تک کہ ۷۳ھ میں وہ مکہ میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ فتنہ ابن زبیر کے زمانہ میں دو آدمی حضرت عبد اللہ بن عمر
س آئے۔ انھوں نے کہا کہ لوگ برباد ہو رہے ہیں اور آپ عمر فاروق کے صاحبزادے ہیں۔
سول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ہیں۔ پھر کیا چیز آپ کو روک رہی ہے کہ آپ ان
ن کے لئے نہیں نکلتے۔ عبد اللہ بن عمر نے کہا کہ مجھے یہ بات روک رہی ہے کہ اللہ نے میرے
کے خون کو میرے لئے حرام کر دیا ہے۔ آدمیوں نے کہا کیا اللہ نے حکم نہیں دیا ہے کہ ان سے
لڑو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ عبد اللہ بن عمر نے کہا: ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ
رہا۔ اور دین اللہ کے لئے ہو گیا۔ اور تم چاہتے ہو کہ جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ پیدا ہو اور
غیر اللہ کے لئے ہو جائے۔

دوسری روایت میں ہے کہ دو آدمی حضرت عبد اللہ بن عمر کے پاس آئے اور کہا کہ اے
الرحمٰن، کیا وجہ ہے کہ آپ ایک سال حج کرتے ہیں اور ایک سال مقیم رہتے ہیں اور اللہ کی
ں جہاد کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ آپ کو معلوم ہے کہ خدا نے کس قدر زیادہ اس کی
، دلائی ہے۔ عبد اللہ بن عمر نے کہا کہ اے میرے بھتیجے، اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔
ر اس کے رسول پر ایمان لانا، اور پانچ وقت کی نمازیں، رمضان کے مہینہ کا روزہ رکھنا،
وٰۃ دینا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔ آدمیوں نے کہا اے ابو عبد الرحمٰن کیا آپ نہیں سنتے جو اللہ نے اپنی
میں ذکر کیا ہے کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ عبد اللہ ابن عمر نے کہا کہ ہم نے
اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا کیا۔ اس وقت اسلام کم تھا، پس آدمی اپنے دین کے معاملہ میں

فتنہ میں ڈالا جاتا تھا، لوگ اس کو قتل کر دیتے یا عذاب دیتے۔ یہاں تک کہ اسلام کی کثرت ہو گئی۔ پھر فتنہ باقی نہ رہا (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۲۸ - ۲۲۷)

خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کچھ مسلمانوں کو سیاسی شکایت ہو گئی۔ وہ مدینہ میں گھس آئے اور آپ کے مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ حضرت عثمان اپنے مکان کی چھت پر چڑھے اور باغیوں سے کہا کہ تم جو میرا محاصرہ کئے ہوئے ہو اور میرے قتل کے درپے ہو، کیا اپنے اس فعل کے حق میں تمہارے پاس قرآن کی کوئی دلیل ہے۔ ایک باغی آگے بڑھا اور اس نے کہا ہاں۔ اس کے بعد اس نے قرآن سے جہاد اور قتال والی آیتیں پڑھ کر سنانا شروع کر دیا۔

باغیوں کے نزدیک اپنے عمل کے لئے ان آیتوں کا حوالہ درست تھا۔ کیوں کہ اپنے خیال میں وہ ایک بگڑی ہوئی حکومت کے خلاف جہاد کر رہے تھے اور جہاد کا حکم قرآن میں موجود ہے۔ مگر حضرت عثمان نے ان کے اس استدلال کو تسلیم نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ آیتیں تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے حق میں نازل نہیں ہوئیں۔ یہ میرے اور میرے ساتھیوں (صحابہ) کے حق میں اتری ہیں۔

حضرت عثمان کا جن لوگوں نے محاصرہ کر رکھا تھا وہ سب مسلمان تھے۔ ان کے پاس اپنے محاصرہ کو برحق ثابت کرنے کے لئے قرآن کی آیتیں بھی تھیں۔ مگر صحابہ نے اس معاملہ میں ان سے اتفاق نہیں کیا۔ حضرت علی نے فرمایا کہ انھوں نے قرآنی آیات کی تفسیر اور تشریح میں غلطی کی (اخطأوا فی التاویل) یعنی جن آیتوں کا تعلق کافروں اور مشرکوں سے ہے۔ ان کو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

"خوارج" سب کے سب مومن و مسلم تھے۔ وہ دیندار اور عبادت گزار بھی تھے۔ وہ ہر بات میں قرآن کی آیتیں پیش کرتے تھے۔ مگر خلیفہ چہارم حضرت علی کے خلاف ان کی جنگ کو امت نے کبھی صحیح نہیں قرار دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے خوارج کی لڑائیوں کے بارہ میں فرمایا کہ ان کی غلطی یہ ہے کہ قرآن کی وہ آیتیں جو کافروں اور مشرکوں سے جنگ کے بارہ میں اتری ہیں ان کو انھوں نے مسلمانوں کے اوپر منطبق کر دیا ہے۔ وہ قرآن کی تحریف کر رہے ہیں نہ کہ قرآن کی تفسیر۔

مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں دیکھا جائے تو موجودہ زمانہ کی انقلابی اسلامی جماعتیں جو اپنے ملکوں میں مسلم حکمرانوں سے اصلاح سیاست کے نام پر جنگ چھیڑے ہوئے ہیں وہ سراسر باطل ہے۔ اس قسم کی لڑائیوں کا جہاد سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تمام مفکرین اسلام درحقیقت مجرمین اسلام ہیں جو مسلمانوں کے درمیان اس قسم کی باہمی جنگوں کو جہاد فی سبیل اللہ ثابت کرنے کے لئے اپنی ذہانت صرف کر رہے ہیں۔ اس قسم کے اعمال کے لئے قرآن کی آیتیں پیش کرنا بے عملی پر سرکشی کا اضافہ کرنا ہے۔

عورت اسلام میں

مرد اور عورت کی باہمی حیثیت کو سمجھنے کے لئے قرآن کی اس آیت پر غور کیجئے: انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثی بعضکم من بعض (آل عمران ۱۹۵) اس آیت کا ترجمہ دو مترجمین کا کیا ہوا یہاں نقل کیا جاتا ہے:

میں کسی شخص کے کام کو جو کہ تم میں سے کام کرنے والا ہو اکارت نہیں کرتا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک دوسرے کا جزء ہو (مولانا اشرف علی تھانوی)

I waste not the work of any of you, be he male or female, you are members, one of another. (Abdulla Yusuf Ali)

اس آیت کی شان نزول کے بارہ میں ایک روایت آتی ہے جو کہ حسب ذیل ہے:

عن ام سلمة قالت یا رسول اللہ انی اسمع اللہ یذکر الرجال فی الھجرة (او فی القرآن) ولا یذکر النساء فنزلت ھذہ الآیة - اخرجه الترمذی والحاکم وصححه وابن ابی حاتم وعبد الرزاق وسعید ابن منصور (التفسیر المظھری)	حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے خدا کے رسول، میں سنتی ہوں کہ اللہ مردوں کا ذکر فرماتا ہے مگر عورتوں کا ذکر نہیں کرتا۔ اس پر یہ آیت اتری۔

سورہ آل عمران کی مذکورہ آیت (بعضکم من بعض) میں مرد اور عورت کی باہمی حیثیت کے بارہ میں نہایت جامع بیان موجود ہے۔ اس بات کو اگر موجودہ زمانہ کے الفاظ میں کہنا ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ "مرد اور عورت ایک دوسرے کے شریک حیات ہیں" دونوں ایک دوسرے کا حصہ ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے برابر کے ساتھی ہیں۔

حیاتیاتی اعتبار سے اگرچہ دونوں کی صنف ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ایک صنف مذکر ہے اور دوسری صنف مونث۔ مگر انسانی مرتبہ کے لحاظ سے دونوں بالکل یکساں ہیں۔ جو درجہ ایک کا ہے وہی درجہ دوسرے کا ہے۔ حقوق کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں۔

تقسیم کار کا اصول

تاہم سماجی زندگی میں اسلام نے دونوں کے عمل کے درمیان ایک حد تک تقسیم کار کا اصول اختیار

گیا ہے۔ مرد کی سرگرمیوں کا دائرہ بنیادی طور پر باہر ہے اور عورت کی سرگرمیوں کا دائرہ بنیادی طور پر اندر اس تقسیم کا کوئی بھی تعلق امتیاز سے نہیں ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ دونوں کی صنفی خصوصیات مجروح نہ ہوں۔ دونوں اپنی پیدائشی صلاحیتوں کو پوری طرح کام میں لا سکیں، بغیر اس کے کہ خاندان یا سماج کے اندر کوئی رخنہ واقع ہو۔ بالفاظ دیگر، یہ فرق انتظام کی بنیاد پر ہے، نہ کہ اعزاز کی بنیاد پر۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں مغفرت کے لئے جو چیزیں درکار ہیں وہ عورتوں کے لئے بھی وہی ہیں جو مردوں کے لئے ہیں۔ آخرت کی نجات کا مستحق بننے کے لئے عورتوں کو بھی وہی کرنا ہے جو مردوں کو کرنا ہے۔

دنیا میں زندگی کا انتظام چلانے کے لئے عورت اور مرد کے اندر حیاتیاتی فرق رکھا گیا ہے۔ اس اعتبار سے بعض امور میں دونوں کے حدود کار ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ تاہم خدا کی رضا اور آخرت کی نجات حاصل کرنے کے لئے جو بنیادی شرط درکار ہے وہ ایک صنف کے لئے بھی وہی ہے جو دوسری صنف کے لئے ہے۔

اسلام کا آغاز حقیقۃً خدا کی شعوری دریافت سے ہوتا ہے جس کو ایمان کہتے ہیں۔ یہ ایمان اگر حقیقی ہو تو اس کے بعد لازماً ایسا ہوتا ہے کہ مرد یا عورت خدا کے آگے جھک پڑتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ان کا اثاثہ خدا کے لئے وقف ہو جاتا ہے۔ خدا کی خاطر وہ صبر کرنے والے بن جاتے ہیں۔ وہ جھوٹ چھوڑ دیتے ہیں اور سچ بولنے والے بن جاتے ہیں۔

وہ خدا کے حکم کی تعمیل میں سال کے ایک مہینہ میں کھانا پینا تک چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ اپنی خواہشات پر کنٹرول کرتے ہیں۔ اپنی عبدیت کا شعور اور خدا کی معرفت ان کا یہ حال کر دیتی ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر موقع پر خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

آیات قرآن

یہی وہ چیزیں ہیں جو خدا کو ہر فرد کے اندر درکار ہیں۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ قرآن میں یہ بات مندرجہ ذیل الفاظ میں ملتی ہے:

ان المسلمین والمسلمات والمومنین والمومنات	بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان
والقانتین والقانتات والصادقین والصادقات	والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور فرماں بردار مرد
والصابرین والصابرات والخاشعین والخاشعات	اور فرماں بردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور
والمتصدقین والمتصدقات والصائمین والصائمات	صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور

والقانتين والقانتات والصادقين والصادقات والصابرين والصابرات والخاشعين والخاشعات والمتصدقين والمتصدقات والصائمين والصائمات والحافظين فروجهم والحافظات والذاكرين الله كثيرا والذاكرات اعد الله لهم مغفرة واجرا عظيما (الاحزاب ۳۵)

عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں، ان سب کے لئے اللہ نے بخشش اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں وہ تمام بنیادی صفات بتادی گئی ہیں جو اس مرد یا عورت میں ہونی چاہئیں جو اللہ کے یہاں اس کے مقبول بندوں میں شامل ہونا چاہے۔

اسلام —— پہلی چیز اسلام بتائی گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا نفس اللہ کی اطاعت پر راضی ہو جائے۔ وہ اللہ کے احکام کی پیروی میں اپنی زندگی گزارنے لگے۔

ایمان —— اس سے مراد وہ شعوری یافت ہے جب کہ آدمی خدا کو اپنے خالق اور معبود کی حیثیت سے پالے۔ جب آدمی کا فکر خدا کے فکر میں ڈھل جائے۔ جب آدمی اس یقین تک پہنچ جائے کہ سب سے بڑی حقیقت وہی ہے جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ انسان کے لئے ظاہر کی ہے۔

قنوت —— یعنی مخلصانہ فرماں برداری۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ذہن کی پوری یکسوئی اور دل کی پوری آمادگی کے ساتھ اس طریقہ کو اختیار کر لیا جائے جو خدا اور رسول نے بتایا ہے۔

صدق —— اس سے مراد قول اور عمل کی مطابقت ہے۔ یعنی وہی کہنا جو آدمی کرنے والا ہو اور وہی کرنا جو اس نے اپنی زبان سے کہا ہے۔ لوگوں کے درمیان وہ ایک صاحب کردار انسان کی حیثیت سے زندگی گزارے۔

صبر —— یعنی دین کے احکام پر چلنے کے لئے اگر تکلیفیں اٹھانی پڑیں تب بھی اس سے نہ ہٹنا۔ نفس اور شیطان کا مقابلہ کرتے ہوئے دینی تقاضوں پر قائم رہنا۔ غیر خدائی محرکات کی بنا پر خدائی رشتہ کو نہ چھوڑنا۔

خشوع —— اس کا مفہوم تواضع اور خاکساری ہے۔ یہ کیفیت وہ ہے جو خدا کی بڑائی اور اس کے کامل اختیار کے تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے اوپر سب سے زیادہ جو چیز چھائی ہوئی ہوتی ہے وہ خدا کا خوف ہے۔ یہ احساس ان کو خدا کے آگے بالکل جھکا دیتا ہے۔ اور دوسرے انسانوں کے سامنے بھی

۱. اسلامی مرکز کا مشن خدا کے فضل سے عالمی دلچسپی کا مرکز بن رہا ہے۔ اس سلسلہ میں دیگر اسباب کے علاوہ انگریزی ماہنامہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ۲۲ جنوری ۱۹۸۵ کو ایک امریکی عالم مسٹر ہیوسٹن اسمتھ مرکز میں آئے۔ اور صدر اسلامی مرکز سے ملے۔ وہ مینی سوٹا یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔ ان کا خصوصی موضوع مختلف مذاہب کا تقابلی اور تاریخی مطالعہ ہے۔ وہ مختلف کتابوں کے مصنف ہیں۔ مثلاً مذاہب انسانی (*The religions of Man*) اور فراموش سچائی (Forgotten Truth) وغیرہ پروفیسر موصوف سے تقریباً آدھ گھنٹہ تک باتیں ہوئیں۔ آخر میں ان کو اسلامی مرکز کا انگریزی تعارف نامہ اور انگریزی رسالہ دیا گیا۔ ان کا نام اور پتہ یہ ہے:

Prof. Huston Smith
130, Avenida Drive, Berkeley, California, U.S.A.

۲. "نیشنل اسٹوڈنٹس فورم" کے تحت نئی دہلی (ایوان غالب) میں ۱۸-۱۹ جنوری ۱۹۸۵ کو ایک دو روزہ اجتماع ہوا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔ موصوف نے ۱۹ جنوری کی آخری نشست میں شرکت کی اور تقریباً آدھ گھنٹہ کی تقریر میں مرکز کا تعمیری پروگرام حاضرین کے سامنے رکھا۔ ایوان غالب کا وسیع ہال مکمل طور پر سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اپنی اس تقریر میں خاص طور پر نوجوان طبقہ کو خطاب کیا اور تاریخی جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ ان کو چاہئے کہ اپنا وقت اور قوت ایسے کاموں میں لگائیں جو حقیقی معنوں میں نتیجہ خیز ہو سکیں۔ اس تقریر کا ٹیپ اسلامی مرکز میں موجود ہے۔ صدر اسلامی مرکز نے نیشنل اسٹوڈنٹس فورم کے سوونیر کے لئے ایک پیغام بھی دیا جو زیر نظر اشاعت میں "نوجوانوں کے نام" کے عنوان سے شامل ہے۔

۳. اسلامی مرکز کی لائبریری میں حال میں جن قیمتی کتابوں کا اضافہ ہوا ہے اس میں سے ایک انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا تازہ اڈیشن (۱۹۸۴) ہے۔ یہ اڈیشن ۳۰ جلدوں پر مشتمل ہے اور نئی ترتیب کے ساتھ خصوصی اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔

۴. کچھ دن پہلے یہ حال تھا کہ بہت سے لوگ ملاقات کے وقت یہ پوچھتے تھے کہ "کیا الرسالہ نکل رہا ہے"۔ مگر اب خدا کے فضل سے الرسالہ ابتدائی مرحلہ سے نکل کر دور استحکام میں داخل ہو گیا ہے۔ اس کے خریدار اور ایجنسی مسلسل ہر جگہ پھیلتے جا رہے ہیں۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو بیک وقت ایک سو شمارہ سے ایجنسی کا آغاز کر رہے ہیں۔ ۱۰ جنوری ۱۹۸۵ کو ایک صاحب مرکز میں آئے اور الرسالہ سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ الرسالہ محض ایک ماہنامہ نہیں وہ ایک مشن ہے۔ آپ کو اس مشن میں اپنے آپ کو شامل کرنا چاہئے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ آپ اس کی ایجنسی لیں۔ انھوں نے فوراً ایک سال کی پیشگی رقم جمع کر کے دس شماروں سے ایجنسی شروع کر دی۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو پانچ اور چھ سال کا سالانہ چندہ اکٹھا جمع کر کے الرسالہ اپنے نام جاری کراتے ہیں۔ اللہ کا فضل ہے کہ الرسالہ اپنی ساری سنجیدگی کے باوجود عمومی پرچہ بنتا جا رہا ہے۔

۵. تذکیر القرآن دوبارہ نئی ترتیب کے ساتھ زیر طبع ہے۔ یہ جلد سورہ فاتحہ سے سورہ بنی اسرائیل تک (پندرہ پاروں) پر مشتمل ہوگی۔ جو لوگ اس سے پہلے دس پاروں کی جلد لے چکے ہیں۔ ان کے لئے دو صورتیں ہیں۔ یا تو وہ مزید پانچ پاروں کے صفحات دفتر سے منگا کر اپنی جلد مکمل کر لیں۔ یا سابقہ جلد ہمیں واپس کر دیں اور جزئی اضافی قیمت ادا کر کے نئی جلد پندرہ پاروں کی حاصل کر لیں۔

۶. متعدد مقامات سے ہم کو خطوط اور رپورٹیں ملی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے تذکیر القرآن کو مساجد میں پڑھ کر سنانے کے لئے بہت موزوں پایا ہے۔ ایک مقام سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ انھوں نے شہر کی چار مسجدوں میں تذکیر القرآن پڑھ کر سنانے کا انتظام کیا ہے۔ بعض مساجد میں دن میں کئی بار تذکیر القرآن پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ ایک مقام سے رپورٹ ملی ہے کہ ایک صاحب پچھلے دو سال سے تذکیر القرآن لاؤڈ اسپیکر پر پڑھ کر سناتے ہیں۔ شروع شروع میں کچھ لوگوں نے مخالفت کی۔ مگر وہ صبر کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اب اس بستی میں الرسالہ کی باقاعدہ ایجنسی قائم ہو گئی۔ کئی درجن پرچے وہاں ہر ماہ جا رہے ہیں۔ متعدد افراد نے اسلامی مرکز کی کتابوں کا پورا پورا سٹ خریدنا اور پڑھنا شروع کر دیا ہے۔

۷. حیدر آباد میں ہر سال آل انڈیا صنعتی نمائش نہایت اہتمام سے منعقد ہوتی ہے۔ اس موقع پر "ادبی ٹرسٹ" حیدر آباد کی طرف سے کتابوں کا اسٹال بڑے پیمانہ پر لگایا جاتا ہے۔ پچھلے سال کی نمائش میں انھوں نے اپنے اسٹال پر اسلامی مرکز کی مطبوعات بھی رکھی تھیں۔ اس سال جنوری۔ فروری ۱۹۸۵ کی نمائش میں دوبارہ ادبی ٹرسٹ نے اسلامی مرکز کی تمام کتابیں منگوا کر اسٹال پر رکھیں۔ یہ کتابیں چند ہی روز میں فروخت ہوگئیں۔ اس کے بعد ان کا دوسرا آڈر ملا اور فوراً دوسرا زیادہ بڑا پارسل روانہ کیا گیا۔ ادبی ٹرسٹ کی رپورٹ کے مطابق "اسلامی مرکز کی کتابوں کی مانگ نمائش کے موقع پر بہت ہی اچھی رہی"۔

۸. اسلامی مرکز نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ الرسالہ کا ماہانہ عربی اڈیشن جاری کیا جائے۔ اس فیصلہ کے تحت خدا کے بھروسہ پر کام شروع کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ یکم اپریل ۱۹۸۵ تک عربی الرسالہ کا پہلا شمارہ چھپ جائے گا۔ اس کے بعد مرکز کا اگلا منصوبہ الرسالہ کے ہندی اڈیشن کا اجرا کرنا ہے۔ اس طرح ان شاء اللہ ہر ماہ الرسالہ چار اہم زبانوں (اردو، عربی، انگریزی، ہندی) میں نکلا کرے گا۔ جو لوگ الرسالہ کے عربی اڈیشن سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ خریداری یا ایجنسی کے لئے تحریر فرمائیں۔

۹. الرسالہ کے پھیلے ہوئے حلقوں کی طرف سے صدر اسلامی مرکز کو مسلسل دعوت نامے موصول ہوتے رہتے ہیں۔ لوگوں کی خواہش ہے کہ وہ موصوف کی تحریریں پڑھنے کے ساتھ موصوف کی آواز بھی سن سکیں مگر صدر اسلامی مرکز اپنی بڑھی ہوئی مصروفیات کی وجہ سے بیرونی مقامات کے دوروں کے لئے وقت نہیں نکال پاتے۔ اس کی تلافی کے طور پر یہ طے کیا گیا ہے کہ کیسٹ میگزین کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ یہ ان شاء اللہ ماہانہ کیسٹ کی صورت میں تیار کیا جائے گا اور اس کا نام "اسلامی آواز" ہوگا۔ کیسٹ میگزین کے اس پروگرام کے تحت ہر ماہ صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ٹیپ ریکارڈر پر ریکارڈ کی جائے گی۔ اور پھر اس کی نقلیں تیار کر کے خواہش مند حضرات کو ہر ماہ بہ قیمت روانہ کیا جائے گا۔ جو لوگ اس سلسلہ کے مستقل خریدار بننا چاہتے ہیں وہ ہم کو بذریعہ خط مطلع فرمائیں۔

۱۰. نئی دہلی کے میگزین انٹرنیشنل کوریئر (International Courier) کے نمائندہ نے صدر اسلامی مرکز کا مفصل انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ۹ فروری ۱۹۸۵ کو اسلامی مرکز میں ریکارڈ کیا گیا۔ اس کا خلاصہ ان شاء اللہ الرسالہ انگریزی میں شائع کر دیا جائے گا۔

اِسلام اور عصرِ حاضر

"اِسلام عصرِ حاضر میں" ویسا ہی ایک جُملہ ہے جیسا کہ "سُورج عصرِ حاضر میں"۔ اِسلام بالفاظِ دیگر خدا کی سچی ہدایت، اَبدی حقیقتوں کا اظہار ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کی مادّی تعمیر کے لئے جس طرح سُورج کی روشنی کی مستقل ضرورت ہے۔ اسی طرح اس کو اپنی زندگی کی روحانی اور اخلاقی تعمیر کے لئے خدا کی سچی ہدایت (اسلام) کی لازمی ضرورت ہے۔ جو لوگ اسلام کو نہ اپنائیں وہ گویا رُوحانی اور اخلاقی معنوں میں اُسی نادانی کا اظہار کر رہے ہیں جو وہ شخص کرے گا جو اپنی زندگی کی مادّی تعمیر اس طرح کرے کہ اُس نے سورج کو اپنی فہرست سے حذف کر دیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ سُورج کے بغیر آدمی کی دُنیا اندھیری ہے اور ہدایت کے بغیر آدمی کی آخرت اندھیری۔

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

فارم ۱۷

ماہنامہ الرسالہ۔ سی ۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی

۱۔ مقام اشاعت سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی

۲۔ وقفہ اشاعت ماہانہ

۳۔ نام پرنٹر (طابع) ڈاکٹر ثانی اثنین خاں
قومیت ہندستانی
پتہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

۴۔ نام پبلشر (ناشر) ڈاکٹر ثانی اثنین خاں
قومیت ہندستانی
پتہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

۵۔ نام ایڈیٹر (مدیر مسئول) ڈاکٹر ثانی اثنین خاں
قومیت ہندستانی
پتہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی

۶۔ نام اور پتہ مالک الرسالہ ڈاکٹر ثانی اثنین خاں
سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

میں ڈاکٹر ثانی اثنین خاں تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

ثانی اثنین خاں
یکم مارچ ۱۹۸۵ء

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بےآمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

برداشت بزدلی نہیں ——
برداشت زندگی کا ایک اصول ہے

شمارہ ۱۰۱

اپریل ۱۹۸۵

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

اپریل ۱۹۸۵ ☐ شمارہ ۱۰۱

قیمت فی پرچہ	۳ روپیہ
زرتعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دوسو روپے
بیرونی ممالک سے :	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لیے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی AL-RISALA MONTHLY لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ
سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شرک اور کبر

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذالک لمن یشاء ومن یشرک باللہ فقد افتریٰ اثما عظیما (النساء ۴۸)

بے شک اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے۔ اور اس کے سوا جس کے لئے چاہے گا بخش دے گا۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے اس نے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا۔

عن عبد اللہ بن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یدخل الجنۃ من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من کبر۔ قیل وما الکبر قال: الکبر بطر الحق و غمط الناس (مسلم)

حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جنت میں وہ شخص نہیں جائے گا جس کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی کبر ہو۔ پوچھا گیا کہ کبر کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: حق کو نظر انداز کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔ (مسلم)

اس دنیا میں سب سے زیادہ خلاف واقعہ بات یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو بڑائی کا درجہ دیا جائے۔ یہی خدا کے نزدیک سب سے بڑا جرم ہے۔ آدمی اگر اپنے آپ کو بڑا سمجھ لے تو یہ کبر ہے۔ اور اگر وہ کسی دوسرے کو بڑا قرار دے تو اسی کا نام شرک ہے۔

خدا کی معرفت خدا کے سوا دوسری تمام عظمتوں کو ڈھا دیتی ہے بشمول اپنی عظمت کے۔ خدا کے سوا دوسروں کی عظمت کا نام شرک ہے اور اپنی عظمت کا نام کبر۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لئے یہاں ہر قسم کے لوگوں کو بسنے کے مواقع ملے ہوئے ہیں مگر آخرت کی دنیا آئیڈیل دنیا ہوگی۔ وہاں صرف وہی لوگ عزت کا مقام پائیں گے جنھوں نے موجودہ آزمائشی دنیا میں یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ حقیقت واقعہ کی سطح پر جینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کبر اور شرک کی سطح پر جینا غیر حقیقی سطح پر جینا ہے۔ اس لئے جو لوگ کبر اور شرک کی سطح پر زندگی گزاریں گے وہ آخرت کی ابدی دنیا میں بسنے کے لئے سراسر نااہل ٹھہریں گے۔

جنت ان اعلیٰ انسانوں کے لئے ہے جو خدا کی بڑائی میں جیتے ہوں۔ جہنم ان پست لوگوں کا مقام ہے جو غیر خدا کی بڑائی میں جئیں، خواہ یہ جینا خود اپنی بڑائی میں ہو یا اپنے سوا کسی دوسرے کی بڑائی میں۔

کھونے والا پاتا ہے

اگر آپ بمبئی میں ہیں اور کلکتہ جانا چاہتے ہیں تو پہلے آپ کو بمبئی کو چھوڑنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی آپ کلکتہ میں موجود ہو سکتے ہیں۔ جو آدمی خدا کا طالب ہو وہ بھی گویا ایک قسم کا مسافر ہے۔ اگر وہ اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا ہے تو اس کی ایک ہی لازمی شرط ہے۔ یہ کہ وہ اپنی سابق جگہ کو چھوڑنے پر راضی ہو جائے۔ اس کے بعد ہی وہ اپنی مطلوب خدائی منزل پر پہنچنے کی خوشی حاصل کر سکتا ہے۔

دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں لینے کے لئے دینا پڑتا ہے۔ یہاں کھونے میں پانے کا راز چھپا ہوا ہے۔

آپ اگر ایک نفع بخش تجارت کے مالک بنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنا اثاثہ اس میں کھپانا پڑے گا۔ اگر آپ اپنے کھیت میں ہری بھری فصل دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنے بیج کے ذخیرے کو مٹی میں ملا دینا ہوگا۔ اگر آپ منصوبہ بند کے تحت دوررس عمل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے فوری جذبات کو کچل دینے پر اپنے آپ کو راضی کرنا پڑے گا۔ اگر آپ دولت مند بنا چاہتے ہیں تو ضروری ہوگا کہ آپ اپنے کو فضول خرچی سے باز رکھیں۔

جو ذرہ نہ پھٹے وہ کبھی ایٹمی طاقت نہیں بنتا۔ جو دانہ اپنے آپ کو فنا نہ کرے وہ درخت کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ جو فرد اپنے ذاتی مفاد کو قربان نہ کرے وہ اجتماعی مفاد کو حاصل کرنے کا کریڈٹ نہیں پاتا۔

یہی معاملہ خدا کا بھی ہے۔ کوئی شخص خدا والا اس وقت بنتا ہے جب کہ وہ خدا کی خاطر اپنے کو حذف کر دے۔ جو شخص اپنے وجود کو حذف کرنے کے لئے تیار نہ ہو وہ کبھی خدا والا بھی نہیں بنتا۔

خدا کو پانے کے لئے اپنے آپ کو کھونا پڑتا ہے —— یہی ایک لفظ میں خدا کو پانے کا راز ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو بھی پانا چاہے اور خدا کو بھی، وہ صرف اپنے آپ کو پائے گا۔ ایسا آدمی کبھی خدا کو پانے والا نہیں بن سکتا۔

دعا

"میرے لئے بائیسکل خرید دیجئے" ایک غریب خاندان کے لڑکے نے اپنے باپ سے کہا۔ باپ کے لئے بائیسکل خریدنا مشکل تھا۔ اس نے ٹال دیا۔ لڑکا بار بار کہتا رہا اور باپ بار بار منع کرتا رہا۔ آخر کار ایک روز باپ نے ڈانٹ کر کہا "میں نے کہہ دیا کہ میں بائیسکل نہیں خریدوں گا۔ آئندہ مجھ سے اس قسم کی بات مت کرنا"

یہ سن کر لڑکے کی آنکھ میں آنسو آگئے۔ وہ کچھ دیر تک چپ رہا۔ اس کے بعد روتے ہوئے بولا "آپ ہی تو ہمارے باپ ہیں۔ پھر آپ سے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں" اس جملہ نے باپ کو تڑپا دیا۔ اچانک اس کا انداز بدل گیا۔ اس نے کہا "اچھا بیٹے، اطمینان رکھو۔ میں تم کو ضرور بائیسکل دوں گا" یہ کہتے ہوئے باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ اگلے دن اس نے پیسہ کا انتظام کر کے بیٹے کے لئے نئی بائیسکل خرید دی۔

لڑکے نے بظاہر ایک لفظ کہا تھا۔ مگر یہ ایسا لفظ تھا جس کی قیمت اس کی اپنی زندگی تھی۔ جس میں اس کی پوری ہستی شامل ہو گئی تھی۔ اس لفظ کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے سرپرست کے آگے بالکل خالی کر دیا ہے۔ یہ لفظ بول کر اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے نقطہ پر کھڑا کر دیا جہاں اس کی درخواست اس کے سرپرست کے لئے بھی اتنا ہی بڑا مسئلہ بن گئی جتنا وہ خود اس کے اپنے لئے تھی۔

یہ انسانی واقعہ خدائی واقعہ کی تمثیل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون سی دعا ہے جو لوٹائی نہیں جاتی۔ یہ وہ دعا ہے جس میں بندہ اپنی پوری ہستی کو انڈیل دیتا ہے۔ جب بندے کی آنکھ سے عجز کا وہ قطرہ ٹپک پڑتا ہے جس کا تحمل زمین و آسمان بھی نہ کر سکیں۔ جب بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے ساتھ اتنا زیادہ شامل کر دیتا ہے کہ "بیٹا" اور "باپ" دونوں ایک ترازو پر آجاتے ہیں۔

یہ وہ لمحہ ہے جب کہ دعا محض زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک شخصیت کے پھٹنے کی آواز ہوتی ہے۔ اس وقت خدا کی رحمتیں اپنے بندے پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ بندگی اور خدائی دونوں ایک دوسرے سے راضی ہو جاتے ہیں۔ قادر مطلق عاجز مطلق کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

زلزلہ درکار ہے

خدا کی جنت جتنی نفیس ہے اتنی ہی بڑی قیمت اس کی ادا کرنی پڑتی ہے۔ جنت صرف ان حوصلہ مندوں کے لئے ہے جو بھونچال کی قیمت پر اس کو حاصل کرنے کے لئے راضی ہو جائیں۔ جنت کو پانے کے لئے آدمی کو ایسے کٹھن مرحلے سے گزرنا ہوتا ہے جس کو انسانی زبان میں صرف زلزلہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

جو آدمی آخرت کی ابدی جنت کا طالب ہو اس کو سب سے پہلے اپنی ذات کے اندر زلزلہ لانا ہے۔ جس طرح ایٹم کے مجموعہ میں بے پناہ طاقت چھپی ہوئی ہے۔ مگر یہ طاقت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب کہ ایٹم کو توڑا جائے۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ ہر آدمی کے اندر ایک عظیم ربانی انسان چھپا ہوا ہے۔ موجودہ امتحان کی دنیا میں آدمی کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک انفجار برپا کرے تاکہ اس کے اندر چھپا ہوا ربانی انسان باہر آسکے۔

ہر آدمی اصلاً فطرت خداوندی پر پیدا ہوتا ہے مگر ماحول، روایات، خواہشات اور اس طرح کے دوسرے اسباب اس کے اوپر تہہ بہ تہہ پردے ڈال دیتے ہیں۔ آدمی ایک مصنوعی غلاف میں بند ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس کے تحت وہ سوچتا ہے اور جس کے مطابق وہ جیتا ہے۔ اسی مصنوعی پردہ کو پھاڑنے میں انسان کی تمام ترقیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔ اپنے ذہنی سانچہ کو توڑنا بلاشبہ اس دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ مگر اسی مشکل ترین کام میں خدا نے تمام انسانی سعادتوں کا راز چھپا دیا ہے۔

قرآن کے الفاظ میں انسان جب اپنے شاکلہ کو توڑتا ہے تو اس کا شاکلہ خدا کے شاکلہ کے ہم سطح ہو جاتا ہے۔ اس کی ربانی فطرت جاگ اٹھتی ہے۔ وہ براہ راست خدائی فیضان کی زد میں آجاتا ہے۔ وہ محدودیت کی دنیا سے نکل کر ابدیت کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کی سوچ خدائی سوچ بن جاتی ہے۔ اس کا اخلاق خدائی اخلاق کے ہم رنگ ہو جاتا ہے۔ بیج کے اندر ایک شاداب درخت چھپا ہوا ہے۔ مگر یہ درخت اسی وقت ظہور میں آتا ہے جب کہ بیج ٹوٹے اور اپنے کو فنا کرنے کے لئے تیار ہو۔ اسی طرح ہر آدمی کے اندر ایک ربانی انسان چھپا ہوا ہے جو جنت کی حسین دنیا کا باسی بن سکے۔ مگر اس چھپے ہوئے انسان کا وقوع میں آنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ انسان اپنے اندر ایک زلزلہ پیدا کرنے کے لئے تیار ہو۔ وہ مصلحتیں اور محبوبات جن کو بچانے کے لئے آدمی اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے۔ نہیں مصلحتوں اور محبوبات کا ٹوٹنا جنت کے دروازہ کا کھلنا ہے۔ مگر اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے۔

نفیِ ذات

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو قرآن میں احسن القصص (بہترین قصہ) کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی زندگی اس بات کی ایک تاریخی مثال ہے کہ کس طرح خدائی مدد واقعات کے دھارے کو پھیر دیتی ہے۔ وہ ایک اسوء القصص کو احسن القصص بنا دیتی ہے۔

حضرت یوسف کے دشمنوں نے آپ کو کنویں میں ڈال دیا۔ مگر خدا نے آپ کو کنویں سے نکال کر مصر کے تخت پر پہنچا دیا۔ جہاں آپ کے مخالفین نے آپ کی کہانی ختم کرنی چاہی تھی وہیں سے آپ کی ایک نئی شاندار تر کہانی شروع ہو گئی۔

سورہ یوسف میں آنجناب کا قصہ بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے: یہاں تک کہ جب پیغمبر مایوس ہو گئے اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا تو ان کو ہماری مدد آپہنچی۔ پھر ہم نے جس کو چاہا بچا لیا اور ہمارا عذاب مجرموں سے ٹالا نہیں جاتا۔

(یوسف ۱۱۰)

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی مدد مایوسی کی حد پر پہنچ کر ملتی ہے۔ "مایوسی" سے مراد وہ مقام ہے جہاں بندہ اپنا سب کچھ دے کر خالی ہو چکا ہو۔ اس کے پاس مزید کچھ دینے کے لئے باقی نہ رہے۔ جب وہ محسوس کرنے لگے کہ بندگی کی حد ختم ہو گئی۔ اب وہ درجہ آ گیا ہے جہاں سے خدائی کی حد شروع ہوتی ہے۔ عین اس وقت خدا کی مدد آجاتی ہے۔ ناکامی کی انتہا کامیابی کا آغاز بن جاتا ہے۔

بیج کا ختم ہونا ایک درخت کو وجود دیتا ہے۔ یہی معاملہ خدا اور بندے کا بھی ہے۔ آدمی خدا کی مدد کا مستحق اس وقت بنتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے لئے مٹا دے۔ جہاں اعتمادِ خویش ختم ہو جائے وہاں سے اعتماد علی اللہ کا آغاز ہوتا ہے۔

خدا بلاشبہ سب سے بڑی طاقت ہے۔ مگر خدا کو پانا ہمیشہ اپنی نفی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ آدمی اپنی نفی نہیں کر پاتا اسی لئے وہ خدا کو پانے والا بھی نہیں بنتا۔ خدا ہر چیز کا بدل ہے۔ خدا کو پانا سب کچھ کو پا لینا ہے۔ مگر انسان کی یہ نادانی بھی عجیب ہے کہ وہ بے کچھ کے لئے سب کچھ کو کھو دیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں خدا سے محروم ہو جاتا ہے۔

امتحان

حضرت ابراہیم کو خواب میں دکھایا گیا کہ آپ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم ب کے مطابق بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر جیسے ہی آپ نے بیٹے کے گلے پر چھری ، آواز آئی کہ بس۔ تم نے خواب کو پورا کر دکھایا۔ اس کے بعد آپ کو خصوصی طور پر ایک مینڈھا م کیا گیا اور آپ نے بیٹے کے بدلے اسی مینڈھے کو ذبح کیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ـــــ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قربانی مانگی جاتی ہے مگر قربانی لی نہیں جاتی پر چھری رکھی جاتی ہے مگر قبل اس کے کہ چھری آدمی کا گلا کاٹے، چھری کو گلے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

اس دنیا میں آدمی کا اصل امتحان نفسیاتی امتحان ہے نہ کہ جسمانی امتحان۔ خدا انسان کی گی کو دیکھتا ہے نہ کہ کر ڈالنے کو۔ خدا کبھی کسی کو غیر ضروری مشقت میں نہیں ڈالتا۔ مگر مشقت سے نجات ملتی ہے جو اپنے آپ کو مشقت کے حوالے کرنے کا واقعی ثبوت دے دے۔

جو لوگ قربانی کے راستے سے بھاگتے ہیں وہ صرف اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ ئے رحمان ورحیم پر یقین نہیں رکھتے۔ خدا تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ وہ اپنے بندوں ں سے زیادہ شفیق ہے جتنا کوئی باپ اپنے عزیز بیٹے کے لئے شفیق ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ں کے راستہ سے بھاگنا خدا کے خلاف بے اعتمادی کا اظہار ہے۔ حالاں کہ خدا جتنا لیتا ہے ے بہت زیادہ دیتا ہے۔ حضرت ابراہیم نے خدا کو صرف ایک بیٹا پیش کیا تھا۔ اور خدا نے سارے عالم کی امامت دیدی۔

انسان کو چاہئے کہ وہ کسی تحفظ کے بغیر خدا کے راستہ پر چل پڑے۔ وہ قربانی کے مواقع پر ہرگز ف سے کوئی کمی نہ کرے۔ اسی کے ساتھ وہ یقین رکھے کہ شفیق باپ سے بھی زیادہ مہربان اور ت ور خدا ہر آن اس کو دیکھ رہا ہے۔ خدا آدمی کا امتحان ضرور لیتا ہے مگر قبل اس کے کہ آدمی ن میں پڑے وہ ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیتا ہے۔

کیسا عجیب ہے وہ بیٹا جو باپ کی پکار پر یقین نہ کرے۔ کیسا عجیب ہے وہ بندہ جو خدا کے میں اپنا اعتماد کھو دے۔

خدا کا عقیدہ

میں نئی دہلی میں گیٹ آف انڈیا کے سامنے کھڑا تھا۔ گیٹ آف انڈیا تعمیر اور سنگ تراشی کا بے حد حسین نمونہ ہے۔ وہ مشاہدہ کی زبان میں بتا رہا ہے کہ انسان کیسی انوکھی صلاحیتوں کا مالک ہے وہ "گیٹ آف انڈیا" جیسی ایک چیز کو پیشگی طور پر سوچتا ہے۔ وہ اس کا منصوبہ بناتا ہے اور پھر عملاً اس کو وقوع میں لاتا ہے۔

اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اگر تمام تاروں اور سیاروں اور تمام درختوں اور جانوروں سے کہا جائے کہ وہ ایک "گیٹ آف انڈیا" بنا دیں تو سب مل کر بھی اس کے جیسی ایک عمارت نہیں بنا سکتے۔

یہی دوسرے تمام انسانی واقعات کا حال ہے۔ انسان جو کام کرتا ہے وہ اس کی انتہائی نادر استثنائی خصوصیت ہے۔ معلوم کائنات میں کوئی بھی دوسری مخلوق اس قسم کے کام کو انجام نہیں دے سکتی جس کو انسان اپنی عقل اور اپنے ہاتھ پاؤں کو استعمال کر کے انجام دیتا ہے۔ خواہ وہ ایک گیٹ آف انڈیا کو بنانا ہو یا ایک پیچیدہ مشین کو چلانا۔

انسان سے خدا کو یہ مطلوب تھا کہ وہ خدا کی شعوری معرفت حاصل کرے۔ وہ اپنی عقل سے خدا کو پہچانے۔ اس لئے اس نے انسان کو ایسی ممتاز تخلیق کے ساتھ پیدا کیا۔ جس طرح انسان ساری کائنات سے ممتاز ایک ہستی ہے، اسی طرح خدا انسان کے مقابلہ میں ایک ممتاز تر ہستی ہے۔ انسان اگر اس فرق پر غور کرے جو اس کے اور بقیہ کائنات کے درمیان ہے تو اسی پر وہ اس فرق کو قیاس کر سکتا ہے جو اس کے اور خدا کے درمیان ہے۔ خدا اسی امتیازی فاصلہ کی آخری اور انتہائی شکل ہے۔ جس کا آدمی اپنے اور کائنات کے درمیان فاصلہ کے ذریعہ تجربہ کر رہا ہے۔ خدا کو سمجھنا اتنا ہی آسان ہے جتنا اپنے آپ کو سمجھنا۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننا ایک مانی ہوئی چیز کو ماننا ہے۔ خدا کو دیکھنا ایک دیکھی ہوئی چیز کو دیکھنا ہے۔ انسان جس واقعہ کا ہر آن تجربہ کر رہا ہے۔ اسی واقعہ کی توسیع کا دوسرا نام خدا کا عقیدہ ہے۔ انسان اس کائنات میں "فل اسٹاپ" نہیں۔ پھر اگر کائنات کے آگے انسان کا درجہ ممکن ہے تو انسان کے آگے خدا کا درجہ کیوں ممکن نہیں۔

خدا سے غافل

کسی شخص سے اس کے عزیز بیٹے کا ذکر کیجئے تو اس کے پاس اپنے بیٹے کے بارہ میں کہنے کے لئے اتنی زیادہ باتیں ہوں گی جو کبھی ختم نہ ہوں۔ مگر اسی شخص کے سامنے خدا کا تذکرہ کیجئے تو وہ اس طرح غیر متحرک بنا رہے گا جیسے کہ اس کے پاس خدا کے بارہ میں کہنے کے لئے کوئی بات ہی نہیں۔ جیسے کہ وہ خدا کے بارہ میں کچھ جانتا ہی نہیں۔

کسی شخص کو اس کے خاندانی بزرگ کی یاد دلایئے تو وہ اس قدر پرجوش طور پر بولنے لگے گا جیسے کہ اس کے تمام اندرونی احساسات جاگ اٹھے ہوں۔ مگر اسی شخص کے سامنے خدا کا ذکر کیجئے تو وہ جذبات سے اس طرح خالی نظر آئے گا جیسے کہ اس کو معلوم ہی نہیں کہ خدا کے بارہ میں کیا کہا جاتا ہے۔

کسی شخص کے سامنے اس کے جماعتی اکابر کا نام لے لیجئے۔ اچانک الفاظ کا دریا اس کی زبان سے بہہ پڑے گا۔ وہ اس وقت تک چپ نہ ہوگا جب تک آپ مداخلت کرکے موضوع کو بدل نہ دیں۔ مگر اسی شخص کے سامنے خدا کا نام لیجئے تو اس کے اندر کوئی جوش پیدا نہ ہوگا۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے اس کے پاس خدا کے بارہ میں بولنے کے لئے کوئی چیز ہی نہیں۔

ایک شخص کے سامنے اس کے قومی ہیرو کا چرچا کر دیجئے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ اچانک وہ بادشاہ سخن بن کر ظاہر ہوگیا ہے۔ مگر اسی کے سامنے خدا کا چرچا کیجئے تو وہ ایسا نظر آئے گا جیسے کہ اس کے اندر خدا کا نام سن کر کوئی ہلچل ہی پیدا نہیں ہوتی جو اس کو بولنے پر مجبور کر دے۔

آہ وہ لوگ جن کے پاس رجال کی تعریف کے لئے الفاظ ہوں مگر خدا کی تعریف کے لئے ان کے پاس الفاظ نہ ہوں۔ انسانوں کے بارہ میں وہ معلومات کا خزانہ بنے ہوئے ہوں مگر خدا کے بارہ میں ان کے پاس کوئی معلومات نہیں جو ان کے زبان یا قلم جاری ہو۔ کیا سینوں میں ایمان کے سوتے خشک ہوگئے۔

کیا لوگوں نے خدا کی عظمت کو محسوس نہیں کیا جس کو وہ لوگوں سے بیان کریں۔ کیا لوگوں کو خدا کے کمالات کا کوئی مشاہدہ نہیں ہوا۔ کیا انھیں صرف مخلوقات کی خبر ہے، خداوند ذوالجلال کی انھیں کوئی خبر نہیں۔

سب چلے گئے

فیبین سوشلزم (Fabian Socialism) ایک سو سال پہلے انگلینڈ میں وجود میں آئی۔ برنارڈ شا اور دوسرے بہت سے دانشور اس سے وابستہ تھے۔ فیبین کا لفظ ایک رومی جنرل (Fabius Maximus) کے نام سے لیا گیا تھا۔ یہ لوگ غریبی اور جہالت کے خاتمہ پر زور دیتے تھے اور جبر کے بغیر سوشلزم لانے کے علمبردار تھے۔ یہ گروہ فیبین سوسائٹی (Fabian Society) کے نام سے مشہور ہوا۔

اس نظریہ کو ماننے والوں میں ایک خاتون بیٹرس ویب (Beatrice Webb) بھی تھیں۔ وہ اپنی ڈائری لکھتی رہتی تھیں جو ان کے بعد شائع ہو کر کافی مقبول ہوئی۔ اس ڈائری کے آخری اندراجات میں سے ایک وہ ہے جو انھوں نے ۱۹۴۳ کی کسی تاریخ کو لکھا تھا۔ اس میں مذکورہ خاتون نے تحریر کیا تھا:

> Everything and everyone is disappearing — Churchill, Roosevelt, Stalin. What an amazing happening, and well worth recording in my diary. But that also will suddenly disappear (1943).

ہر چیز اور ہر شخص غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ چرچل، روزولٹ، اسٹالن، سب چلے گئے۔ کیسے عجیب ہیں یہ واقعات، اور کس قدر زیادہ میری ڈائری میں لکھے جانے کے قابل، مگر وہ بھی اچانک ایک روز غائب ہو جائے گی۔ (ہندستان ٹائمس ۵ دسمبر ۱۹۸۲)

کیسے کیسے انسان اس دنیا میں آتے ہیں۔ وہ کیسے کیسے کمالات دکھاتے ہیں۔ اور پھر اچانک ایک روز اس دنیا سے چلے جاتے ہیں، جیسے کہ ان کا یہاں آنا اور یہاں سے جانا ان کی اپنی مرضی سے نہ ہو۔ بلکہ کوئی اور ہو جو ان کو یہاں لاتا ہو اور پھر اپنے یک طرفہ فیصلہ کے تحت انھیں یہاں سے اٹھا لے جاتا ہو۔

اس واقعہ کی کوئی بھی بامعنی توجیہہ اس کے سوا نہیں ہے کہ پیغمبروں کی اطلاع کے مطابق آخرت کو مانا جائے۔ آخرت کو شامل کرنے کے بعد موجودہ دنیا کی ہر چیز بامعنی ہو جاتی ہے اور آخرت کو شامل کئے بغیر موجودہ دنیا کی ہر چیز بے معنی۔

امتحان

انسان کی آنکھ کیسی عجیب چیز ہے۔ اگر آپ اپنی آنکھ بند کرلیں تو آپ کو کچھ دکھائی نہیں دے گا۔ ساری دنیا آپ کے لئے ایک نامعلوم اندھیرا بن کر رہ جائے گی۔ دنیا ہوگی مگر آپ اس کو نہیں دیکھیں گے۔ چیزیں ہوں گی مگر آپ ان کو محسوس نہیں کریں گے۔

مگر جب آپ اپنی آنکھ کھولتے ہیں تو حیرت انگیز طور پر آپ تمام چیزوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔ اب کالی چیز آپ کو سفید چیز سے الگ دکھائی دینے لگتی ہے۔ اب متحرک چیز آپ کو متحرک دکھائی دیتی ہے اور جامد چیز جامد حالت میں نظر آتی ہے۔ آپ انسان کو انسان کے روپ میں دیکھتے ہیں اور جانور کو جانور کے روپ میں۔

یہی انسان کا خصوصی امتیاز ہے۔ وہ چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے پہچانتا ہے۔ وہ خیر اور شر کا فرق کرنا جانتا ہے۔ وہ روشنی کو تاریکی سے اور تاریکی کو روشنی سے جدا کرکے دیکھتا ہے۔ وہ یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ حق کو حق کے روپ میں دیکھے اور باطل کو باطل کے روپ میں پہچان لے۔ وہ اس فرق سے آشنا ہے کہ کون سی چیز دلیل سے ثابت ہوئی اور کون سی چیز دلیل سے ثابت نہیں ہوئی۔

انسان کی یہی خصوصیت اس کے لئے اس کے امتحان کا پرچہ ہے۔ یہی وہ خاص مقام ہے جہاں اس کا خدا اس کا امتحان لے رہا ہے۔ انسان کو اس دنیا میں یہ ثبوت دینا ہے کہ اس نے خیر کو شر سے الگ کرکے دیکھا۔ اس نے ظلم اور انصاف کے فرق کو پہچانا۔ اس کے سامنے جب کوئی بات آئی تو اس نے اس کو دلیل کی سطح پر جانچا۔ اگر وہ بے دلیل تھی تو اس نے اسے رد کردیا اور اگر وہ دلیل سے ثابت ہو رہی تھی تو اس نے کھلے طور پر اس کا اعتراف کرلیا۔

یہ امتحان بظاہر بہت آسان ہے مگر اس کی ایک قیمت دینی پڑتی ہے۔ یہ قیمت اپنی نفی ہے۔ حق کسی آدمی کو اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر ملتا ہے۔ آدمی یہ قیمت نہیں دے پاتا، اس لئے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ امتحان میں ناکام ہو جاتا ہے۔

آدمی کے سامنے حق ظاہر ہوتا ہے مگر وہ اس کو دیکھ نہیں پاتا۔ اس کے پاس حق کی آواز گونجتی ہے مگر وہ اس کو سن نہیں پاتا۔ حق خود چل کر اس کے پاس آتا ہے مگر اس سے اس کی ملاقات نہیں ہوتی۔ آہ، وہ انسان جو عین اس مقام پر سب سے زیادہ ناکام ہو جاتا ہے جہاں اس کو سب سے زیادہ کامیاب ہونا چاہئے۔

کامیاب زندگی

اسٹوارٹ کیلی (Stuart Kelly) اونٹاریو کا ایک ٹرک ڈرائیور تھا۔ اس نے لاٹری کا ایک ٹکٹ خریدا۔ ۱ جنوری ۱۹۸۴ میں اس کے نتیجہ کا اعلان ہوا تو اس کو پہلا انعام ملا جو ۹ء ۱۳ ملین ڈالر تھا۔ یہ کناڈا میں ملنے والے اب تک کے تمام لاٹری انعامات میں سب سے زیادہ تھا۔

اسٹوارٹ کیلی کے یہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کو اتنا بڑا انعام ملا تو اس نے کہا کہ یہ میری تمام ممکن ضرورتوں سے بھی زیادہ ہے۔ مگر اس کی خوشیوں کا ابھی آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے غم میں مبتلا ہوگیا۔ انعام ملنے کے صرف تین ماہ بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کو کینسر ہو چکا ہے۔ لاٹری انعام ملنے کے چھ ماہ بعد وہ مرگیا۔ اس کی عمر ۷۵ سال تھی۔ وہ ۲۵ سال تک ٹرک ڈرائیور رہا اور انعام ملنے کے صرف چھ ماہ بعد وہ اس دنیا سے چلا گیا۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی دولت چاہتا ہے تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے لئے ایک کامیاب زندگی کی تعمیر کرے۔ مگر موجودہ دنیا میں انسان کا اصل مسئلہ دولت نہیں بلکہ اس کا اصل مسئلہ محدودیت ہے کوئی انسان خواہ کتنی ہی زیادہ دولت اپنے لئے حاصل کرلے وہ محدودیت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے کوئی شخص اس دنیا میں اپنی دل پسند زندگی بھی نہیں بنا سکتا۔

دولت کی کوئی مقدار آدمی کو اس سے نہیں بچا سکتی کہ وہ بیمار نہ ہو۔ اس کو حادثہ نہ پیش آئے۔ ایک مختصر مدت کے بعد وہ مر نہ جائے۔ اور جب بیماری اور حادثہ اور موت پر انسان کو قدرت نہیں تو اپنے لئے پسندیدہ زندگی بنانے پر وہ کیسے قادر ہو سکتا ہے۔

دولت زندگی نہیں ہے۔ دولت زندگی کا ایک وسیلہ ہے۔ وسیلہ کی اہمیت ہمیشہ دوسرے درجہ کی ہوتی ہے۔ زندگی ہے تو وسیلہ کی بھی اہمیت ہے۔ اور اگر زندگی نہیں تو وسیلہ کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ مگر اکثر انسان اس فرق کو بھول جاتے ہیں۔ وہ دنیا کی دولت حاصل کرنے میں اتنا مشغول ہوتے ہیں جیسے کہ دنیا کی دولت بذات خود مقصود ہو، جیسے کہ دنیا کی دولت ہی کا دوسرا نام زندگی ہو۔

انسان کے لئے کامیاب زندگی کا کوئی نقشہ آخرت کو شامل کئے بغیر نہیں بن سکتا۔ انسان کو دو میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہے۔ موجودہ دنیا کو سب کچھ سمجھ کرنا کامی کی موت مرنا یا موجودہ زندگی کو آخرت تک وسیع کر کے اپنے لئے کامیاب زندگی کا راز دریافت کرنا۔

کتنا سنگین

اخبار ایک اعتبار سے موت کا خبر نامہ ہے۔ ہر روز اخبار میں لوگوں کی موت کی خبریں ہوتی ہیں۔ مثلاً میرے سامنے ۲۴ فروری ۱۹۸۵ کا اخبار ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ چکردھرپور ناگپور کی دو بوگیوں میں آگ لگ گئی۔ یہ آدمی رات کا وقت تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ آگ تیزی سے پھیلی۔ مگر بریک کام نہ کرنے کی وجہ سے مسافر ٹرین کو فوراً ٹھہرا نہ سکے۔ اگلے اسٹیشن پر ٹرین رکی تو بھرے ہوئے ڈبہ کے تقریباً ایک سو آدمی جل کر مر چکے تھے۔

دوسری خبروں میں صرف دہلی کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ ہندی ادیب چندرگپت ودیالنکر ۸۷ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اجیت سنگھ (۳۴ سال) جیپ میں سفر کرتے ہوئے ایکسیڈنٹ کا شکار ہوا اور مر گیا۔ ۲۵ سال کے ایک آدمی کی لاش بورے میں بند پائی گئی۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح کے واقعات ہر روز اور ہر جگہ پیش آتے ہیں۔ وہ سادہ معنوں میں صرف موت کے واقعات نہیں ہیں۔ یہ مخلوق کی اپنے خالق و مالک کے سامنے حاضری ہے۔ یہ ایک انسان کا خدا کی عدالت میں پہنچایا جانا ہے۔ یہ امتحان کے مرحلہ کو پورا کر کے ابدی انجام کے مرحلہ میں داخل ہونا ہے۔

موت کا یہ پہلو کتنا ہولناک ہے۔ یہ موت کے واقعہ کو انتہائی سنگین بنا دیتا ہے۔ اتنا سنگین کہ اس سے زیادہ سنگین کوئی دوسرا واقعہ نہیں۔

موت کے اس پہلو کا تقاضا ہے کہ آدمی سب سے زیادہ موت کے بارہ میں سوچے۔ لکھنے اور بولنے والے سب سے زیادہ اس کے بارہ میں لکھیں اور بولیں۔ انفرادی مجلسوں اور عوامی اجتماعات میں سب سے زیادہ اس کا چرچا ہو۔ مگر عملاً صورت حال اس کے برعکس ہے۔ موت ہر آدمی کو صرف یہ بتاتی ہے کہ "فلاں شخص اس دنیا سے چلا گیا" وہ کسی کو یہ نہیں بتاتی کہ "میں بھی اس دنیا سے جانے والا ہوں" ہر آدمی موت کے سفر کو دوسروں کا سفر سمجھتا ہے۔ کسی کو موت کے واقعہ میں اپنا سفر دکھائی نہیں دیتا۔

آہ وہ انسان، جو اس وقت تک ہوش میں آنے کے لئے تیار نہیں جب تک اس کو ہوش میں آنے کے لئے مجبور نہ کر دیا گیا ہو۔

جاننے کے بعد

پروفیسر مجیب (۱۹۸۵-۱۹۰۲) ہندستان کے چوٹی کے دانشوروں میں سے تھے۔ ان کی تعلیم خالص مغربی طرز کے اداروں میں ہوئی۔ انھیں شکسپیر کے ڈراموں کے بڑے بڑے حصے زبانی یاد تھے۔ ہندستان میں تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ بیرونی ملکوں میں مزید تعلیم کے لئے گئے۔ وہ ایک خوش فکر آدمی تھے۔ وہ اپنے کسی ساتھی کو رنجیدہ دیکھتے تو کبھی مسکراتے اور دور تک دیکھتے۔ وہ اردو انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی زبانیں یکساں طور پر جانتے تھے۔

دسمبر ۱۹۷۲ میں پروفیسر مجیب بیمار ہوئے۔ ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق ان کے دماغ کا آپریشن ہوا۔ آپریشن کامیاب ہوا مگر اس کے بعد ان کا حافظہ جاتا رہا۔ پروفیسر مجیب پانچ زبانوں کے ماہر تھے مگر آپریشن کے بعد وہ تمام زبانیں بھول گئے۔ حتی کہ اردو سمیت تمام زبانوں کے حروف تہجی تک انھیں یاد نہ رہے (جامعہ دسمبر ۱۹۸۴)

دس سال سے زیادہ عرصہ تک وہ اسی حال میں اپنے اوکھلا (دہلی) کے مکان میں پڑے رہے۔ یہاں تک کہ ۲۰ جنوری ۱۹۸۵ کو ان کا انتقال ہوگیا جب کہ ان کی عمر ۸۲ سال ہو چکی تھی۔ وہ ۱۹۴۸ سے ۱۹۷۳ تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر رہے۔

قرآن میں انسان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اللہ نے تم کو پیدا کیا۔ پھر وہ تم کو موت دیتا ہے۔ اور تم میں سے بعض وہ ہیں جو ناکارہ عمر تک پہنچ جاتے ہیں کہ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانیں۔ بے شک اللہ علیم وقدیر ہے (النحل ۷۰)

جوانی کے بعد بڑھاپا آنے کا واقعہ آدمی کے لئے ایک یاددہانی ہے۔ وہ اس لئے ہوتا ہے کہ آدمی اپنی اصل حقیقت کو جانے۔ وہ جانے کہ اس کا علم ذاتی نہیں ہے۔ بلکہ وہ دوسروں کا دیا ہوا ہے۔ وہ جب چاہے دے اور جب چاہے چھین لے۔ آدمی کی قوت اگر اس کی ذاتی ہو تو وہ کبھی اس سے نہ چھنے مگر قوت کا ملنا اور پھر اس کا چھن جانا اس بات کی علامت ہے کہ انسان دئے سے پاتا ہے۔ دینے والا اگر نہ دے تو وہ خود سے نہیں پا سکتا۔

یہ واقعہ ہر روز پیش آتا ہے۔ مگر نہ "بوڑھے" اس سے نصیحت لیتے جن پر یہ واقعہ گزرتا ہے اور نہ "جوان" اس سے سبق حاصل کرتے جو اس کو اپنے سامنے ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔

آخرت کے بغیر

ارنسٹ ہیمنگ وے (Ernest Hemingway) ایک امریکی فوجی تھا۔ وہ ۱۹۶۱ میں انتقال کرگیا۔ وہ ۱۹۱۸ میں اٹلی کی جنگ میں شریک تھا۔ اس نے اپنی فوجی زندگی کے درمیان جو خطوط لکھے تھے وہ کتابی صورت میں شائع کر دئے گئے ہیں۔

اٹلی کی جنگ میں جب وہ زخمی ہوگیا تو اس نے اسپتال سے اپنے گھر والوں کے نام کچھ خطوط لکھے۔ ان میں سے ایک خط میں حسب ذیل الفاظ درج تھے:

> There are no heroes in this war. All the heroes are dead. And the real heroes are the parents. They suffer a thousand times more. And how much better to die in all the happy period of undisillusioned youth to go out in a blaze of light, than to have your body worn out and illusions shattered.

اس جنگ میں کوئی ہیرو نہیں۔ تمام ہیرو مرچکے ہیں۔ اور اصل ہیرو ان کے والدین ہیں (فوجی جوان) ایک ہزار گنا زیادہ مصیبت اٹھاتے ہیں۔ اور یہ کتنا اچھا ہے کہ جوانی کے پرکیف زمانہ میں آدمی کی موت آجائے۔ روشن شعلہ میں داخل ہونا اس سے بہتر ہے کہ تمہارا جسم بوڑھا اور فرسودہ ہوجائے اور سارے فریب منتشر ہوچکے ہوں (لائف جون ۱۹۸۱)

ان الفاظ کے پیچھے زندگی کا کتنا مایوس تصور چھپا ہوا ہے۔ ایک شخص دیکھتا ہے کہ جو آدمی اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے اس کا آخری انجام یہ ہے کہ سو سال یا اس سے کم مدت میں وہ بوڑھا اور ناکارہ ہوکر مرجاتے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر زندگی بالآخر اسی کا نام ہے تو اس سے بہتر ہے کہ جوانی کے امید بھرے دور میں آدمی ہیروانہ اقدام کرکے اپنا خاتمہ کرلے۔

زندگی کو آخرت کے ساتھ ملاکر دیکھا جائے تو بوڑھا ہوکر مرنا بھی بامعنی ہوجاتا ہے اور روشن شعلہ میں داخل ہونا بھی۔ مگر جب ایک شخص زندگی کو آخرت سے الگ کرکے دیکھتا ہے تو اس کو اپنے چاروں طرف مایوسی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر آخرت کے تصور کو شامل نہ کیا جائے تو موجودہ زندگی اپنی تمام معنویت کھو دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ اتنی ناقابل فہم ہوجاتی ہے کہ اس دنیا میں زندہ رہنا بھی آدمی کو بے معنی نظر آنے لگے۔

غلط استعمال

جون ۱۹۸۴ میں امرت سر کے سورن مندر کے خلاف فوجی کارروائی کی گئی۔ ہندستانی فوج کی اس کارروائی کا خفیہ نام آپریشن بلیو اسٹار (Operation Blue Star) تھا۔ سورن مندر سکھوں کا انتہائی متبرک مقام ہے۔ اس واقعہ کے بعد کچھ پرجوش سکھوں میں "شہید" ہونے کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ چنانچہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کو خود انھیں سکھ جوانوں نے گولی مار کر اندرا گاندھی کو قتل کر دیا جو حفاظت کی خاطر وزیر اعظم کی سرکاری رہائش گاہ میں متعین کئے گئے تھے۔

اس کے بعد مقدمہ چلا۔ ۱۱ فروری ۱۹۸۵ کو چیف میٹرو پولٹین مجسٹریٹ مسٹر ایس ایل کھنا کی عدالت میں ملزمین کے خلاف ۲۰ صفحات کی چارج شیٹ پیش کی گئی۔ اس سلسلہ میں اخبارات میں جو رپورٹ آئی ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے:

> Satwant Singh has further been charged under section 27 of the Arms Act for using a weapon lawfully supplied to him to commit murder.

قاتل ستونت سنگھ پر اسلحہ ایکٹ کی دفعہ ۲۷ کے تحت مزید یہ الزام ہے کہ ایک ہتھیار جو اس کو جائز طور پر دیا گیا تھا اس کو اس نے قتل کرنے کے لئے استعمال کیا (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ فروری ۱۹۸۵)

ستونت سنگھ کو جو قیمتی آٹومیٹک ہتھیار دیا گیا تھا وہ وزیر اعظم کی حفاظت کے لئے تھا نہ کہ وزیر اعظم کو قتل کرنے کے لئے۔ یہ اگرچہ اس کے لئے جائز قانونی ہتھیار تھا مگر جب اس نے اس کا غلط استعمال کیا تو وہ قانون کی نظر میں مجرم قرار پایا۔ وہی ہتھیار جس کا صحیح استعمال اس کو انعام کا مستحق بناتا اس کے غلط استعمال نے اس کو سزا کا مستحق بنا دیا۔

اسی طرح خدا کی طرف سے جو چیزیں انسان کو دی گئی ہیں وہ اس کا جائز حق ہیں۔ مگر وہ صرف صحیح استعمال کے لئے ہیں۔ آدمی اگر ان چیزوں کو غلط راہ میں استعمال کرے تو وہ خدا کی نظر میں مجرم قرار پائے گا اور آخرت کی عدالت میں وہ ایسی سخت سزا کا مستحق ہوگا جس سے وہ کبھی نجات نہ پا سکے۔

اعتراف

اردو زبان کے ایک استاد کلاس میں غزل پڑھا رہے تھے۔ اس درمیان میں ایک مصرعہ آیا جو کتاب میں اس طرح چھپا ہوا تھا:

پنجۂ سل سے کھلیں گے عقدۂ گیسوئے دوست

استاد نے اس مصرعہ کی تشریح ان الفاظ میں کی ——— پنجۂ سل کا مطلب ہے سل کا پنجہ۔ کھلیں گے، یعنی وا ہو جائیں گے۔ عقدہ یعنی گرہ۔ گیسوئے دوست، یعنی محبوب کے گیسو۔ مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کے گیسو پنجۂ سل سے کھل جائیں گے۔

طلبہ حیرانی میں تھے۔ کیوں کہ استاد کی مذکورہ تشریح کے باوجود مصرعہ کا مطلب واضح نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے نظم کے الفاظ کو نثر میں دہرا دیا تھا۔ اتنے میں کلاس کا ایک ذہین طالب علم اٹھا۔ اس نے کہا:

"سر، میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں"

"کہو"

"سر، یہ شاید طباعت کی غلطی ہے۔ میرے خیال سے یہ پنجہ سل نہیں بلکہ پنجہ شل ہے۔ اور شل کے معنی ہیں بے جان۔ کنگھا انسانی پنجہ کے مشابہ ہوتا ہے۔ بے جان ہونے کی وجہ سے شاعر نے اس کو پنجۂ شل کہا۔ شاعر افسوس کر رہا ہے کہ ہماری جاندار انگلیاں تو محبوب کی زلف کو سنوار نہ سکیں۔ اور کنگھا جس کی انگلیاں بے جان ہیں اور وہ گویا پنجہ شل ہے، اس کی خوش بختی دیکھو کہ اس نے زلف محبوب کے بل کھول کر اس کو سنوار دیا"

طالب علم کی اس وضاحت کے بعد کلاس کے تمام طلبہ خوش ہوگئے۔ ان کو محسوس ہوا کہ استاد کی تشریح کے باوجود جو مصرعہ بدستور ناقابل فہم بنا ہوا تھا اس کو طالب علم کی تشریح نے قابل فہم بنا دیا ہے مگر استاد محترم اپنی ہار ماننے والے نہیں تھے۔ انھوں نے فوراً کہا:

درست، درست۔ پنجہ سل اور پنجہ شل ایک ہی بات ہے۔

حقیقت کھل جانے کے بعد آدمی اگر اس کا اعتراف نہ کرے تو گویا وہ چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو بڑا اور حقیقت کو چھوٹا ثابت کرے۔ مگر چوں کہ امر واقعہ اس کے خلاف ہے۔ اس لئے عملاً صرف یہ ہوتا ہے کہ آدمی خود چھوٹا ہو کر رہ جاتا ہے۔

مومن کا ذہن

ایک روز کا واقعہ ہے۔ میں انگریزی اخبار پڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھ پر ایک عجیب تجربہ گزرا۔ مجھ کو محسوس ہوا کہ کاغذ پر چھپے ہوئے انگریزی زبان کے الفاظ کو میں اردو زبان میں سمجھ رہا ہوں۔ میری آنکھ اگرچہ ان کو انگریزی زبان میں پڑھ رہی ہے مگر میرا ذہن ان کو اردو زبان میں لے رہا ہے۔

یہی ہر شخص کا معاملہ ہے، خواہ وہ اردو کا آدمی ہو یا کسی دوسری زبان کا۔ آدمی کسی بات کو ہمیشہ اپنی مادری زبان میں سمجھتا ہے۔ کان یا آنکھ کے راستہ سے بظاہر آدمی کے اندر ٹیبل کا لفظ داخل ہوتا ہے۔ مگر اردو کا ایک آدمی ٹیبل کو صرف اس وقت سمجھ پاتا ہے جب کہ اس کا ذہن اس کو میز میں تبدیل کرلے۔ اسی طرح انگریزی کا ایک آدمی جب میز کا لفظ سنتا ہے تو وہ اس کو صرف اس وقت سمجھتا ہے جب کہ اس کا ذہن اس کو ٹیبل کی صورت میں ڈھال لے۔ انسانی ذہن کے اندر ایک اجنبی زبان کا لفظ داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک حیرت ناک واقعہ ہوتا ہے۔ ذہن اس کو ایک انتہائی پیچیدہ نظام سے گزار کر پراسرار طور پر اس کو اپنی مادری زبان میں تبدیل کرلیتا ہے۔

یہ واقعہ تمثیل کے انداز میں بتاتا ہے کہ مومن کا معاملہ اس دنیا میں کیا ہے۔ مومن اس دنیا میں اس طرح رہتا ہے کہ ہر چیز جو اس کے اندر داخل ہوتی ہے وہ فی الفور خدائی حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ باہر جو چیز ایک مادی واقعہ ہے وہ مومن کے ذہنی سانچہ میں آکر روحانی واقعہ بن جاتی ہے۔ ایک معاملہ جو باہر بظاہر انسانی معاملہ تھا وہ مومن کے ذہن میں داخل ہوتے ہی خدائی معاملہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک دنیوی چیز مومن کے ذہن میں پہنچ کر اخروی چیز کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ مومن کا ذہن ایک انتہائی پیچیدہ کارخانہ ہے جو ہر واقعہ کو ربانی واقعہ میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اس خدائی کارخانہ میں ہر وقت ایک عظیم عمل جاری رہتا ہے۔ اس کے اندر "خام مال" داخل ہوتا ہے اور وہ "تیار مال" بن کر باہر آتا ہے۔ ایک بظاہر بے معنی چیز اس سے گزر کر ایک انتہائی بامعنی چیز کی صورت میں ڈھل جاتی ہے۔ وہی شخص مومن ہے جس کا وجود اس قسم کا ایک ربانی کارخانہ بن جائے۔

معیاری دنیا

آدمی پیدائشی طور پر معیار پسند (Idealist) ہے۔ ہر آدمی ایک معیاری دنیا (Ideal world) کی تلاش میں ہے۔ مگر اس دنیا میں معیاری دنیا کا بننا ممکن نہیں۔ اس دنیا میں آدمی کو صرف معیاری نظریہ دیا جا سکتا ہے نہ کہ معیاری دنیا۔

معیاری دنیا بننے کی جگہ صرف آخرت ہے۔ موجودہ دنیا امتحان کی حکمت کے تحت بنائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بہت سی محدودیتیں (Limitations) ہیں۔ یہ محدودیتیں خود خالق کی طرف سے ہیں اور ان کی موجودگی میں یہاں معیاری دنیا بننا ممکن نہیں۔ اس کے ساتھ امتحان کی مصلحت کے تحت یہاں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے۔ یہاں اگر نیک لوگوں کو عمل کی آزادی ہے تو یہاں برے لوگوں کو بھی چھوٹ ملی ہوئی ہے کہ وہ جو چاہیں کریں۔ چنانچہ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ نیک لوگ ایک نقشہ بناتے ہیں اور برے لوگ شرارتیں کر کے اس نقشہ کو توڑ ڈالتے ہیں۔

امتحان کا تصور موجودہ دنیا کو سمجھنے کی کنجی ہے۔ فلاسفہ اور مفکرین اس کنجی کو نہ پا سکے۔ اس لئے دنیا کو سمجھنے میں بھی وہ ناکام رہے۔ انھوں نے موجودہ دنیا میں اپنی پسند کی دنیا بنانی چاہی۔ مگر "ناقص دنیا" میں "کامل دنیا" نہیں بن سکتی تھی، چنانچہ ان کے حصہ میں ذہنی انتشار کے سوا اور کچھ نہ آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں معیاری دنیا نہیں بن سکتی۔ معیاری دنیا بننے کی جگہ آخرت ہے۔ یہاں صرف یہ ممکن ہے کہ لوگوں کو خدا کی اسکیم سے آگاہ کیا جائے اور ان کو آخرت پسندی کی زندگی گزارنے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اس دعوت کے نتیجہ میں اگر انسانوں کی بہت بڑی تعداد دین حق پر آجائے تو ان کے اجتماع سے یقیناً ایک ایسا معاشرہ بن جائے گا جو نسبتاً بہتر معاشرہ ہوگا۔ نیز اگر حالات نے مساعدت کی تو یہ گروہ غیر دینی نظام کے اوپر غلبہ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ اور وہ چیز بھی قائم ہو سکتی ہے جس کو دینی حکومت کہا جاتا ہے۔

تاہم اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ یہ معاشرہ یقینی طور پر "معیاری" معاشرہ ہوگا۔ اور نہ اس کی کوئی ضمانت ہے کہ وہ مستقل طور پر باقی رہے گا۔ یہ ساری چیزیں خدا نے آخرت کی دنیا میں رکھ دی ہیں اور جو چیزیں مالک کائنات نے اگلی دنیا میں رکھ دی ہوں ان کو ہم موجودہ دنیا میں کبھی نہیں پا سکتے۔

مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۶۶ء کی سردیوں کا ایک دن تھا۔ میں نادرن ایسٹرن ریلوے کے ایک اسٹیشن پر اترا۔ کچھ دور آگے چلا تھا کہ سامنے نظر آیا کہ ایک پیدل قافلہ سڑک کو پار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ قدیم وضع کا لباس، حلیہ سے دینداری اور سادگی نمایاں، بستر اور ضروری سامان کا بنڈل اپنے اوپر لادے ہوئے چلا جا رہا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہے جو اچانک زمین پر اتر آئی ہے۔ شاید مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ کون لوگ تھے۔ کیونکہ یہ اب عام طور پر لوگوں کے لیے ایک مانوس منظر بن چکا ہے۔ ملک میں کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جنہیں کبھی نہ کبھی اس منظر سے سابقہ نہ پڑا ہو۔ اب اس طرح کی شکلیں دیکھ کر ہر شخص خود سمجھ جاتا ہے کہ یہ کن لوگوں کا قافلہ ہے اور کس مقصد کے لیے ادھر سے اُدھر سفر کر رہا ہے۔

اس طرح کے بے شمار قافلے آج ساری دنیا میں اپنے قدموں کو دین کی راہ میں گرد آلود کر رہے ہیں۔ شاید ۲۴ گھنٹے میں کوئی وقت ایسا نہیں ہوگا جب کہ دین کی یہ نقل و حرکت کہیں نہ کہیں جاری نہ ہو۔ یہ عظیم حرکت جو تبلیغ کے نام سے چل رہی ہے اور جس نے آج لاکھوں انسانوں میں ایک نیا جوش اور نئی ہلچل پیدا کر دی ہے، اس کا آغاز کرنے والا ایک ایسا شخص تھا جو اپنے لاغر جسم، پستہ قد، اور غیر نمایاں شخصیت کے ساتھ لکنت کا بھی شکار تھا۔ اور مشکل سے اپنی ی بات کو صاف طور پر ادا کر سکتا تھا۔ یہی وہ حیرت انگیز وجود ہے جس کو لوگ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانتے ہیں۔ اور اس نے جو دینی نقل و حرکت پیدا کی، اس کو عوام کی زبان میں "تبلیغی جماعت" کہا جاتا ہے۔ مولانا اگرچہ جسمانی اعتبار سے کمزور اور دبلے آدمی تھے۔ مگر اس کمزور جسم کے اندر ایک انتہائی طاقت ور چیز چھپی ہوئی تھی، اور وہ ہے لوگوں کو دین کی راہ پر ڈالنے کا بے پناہ جذبہ۔ یہی چیز تھی جس نے ایک کمزور شخص سے وہ کام کرا دیا جو طاقتوروں سے نہیں ہو سکتا۔

ابتدائی حالات

انیسویں صدی کے آخر میں اگر کوئی شخص دہلی کی کسی اونچی عمارت پر چڑھے تو اس کو شہر کے باہر جنوبی سمت میں

دور تک پھیلے ہوئے جنگلوں کے درمیان چند بے ترتیب عمارتیں نظر آئیں گی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں نظام الدین اولیاء کا مزار ہے اور اسی نسبت سے یہ جگہ بستی نظام الدین کے نام سے مشہور ہے۔ یہیں اس وقت ایک بزرگ رہا کرتے تھے جن کا نام مولانا محمد اسماعیل (م ۱۸۹۸ء) تھا۔ ان کا معمول تھا کہ جو مزدور اس ویرانہ میں آنکلتے ان کا بوجھ اتار کر رکھتے اور اپنے ہاتھ سے ڈول کھینچ کر اُن کو پانی پلاتے، پھر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرتے کہ اللہ نے اپنے بندوں کی اس خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔

مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی انہیں بزرگ کے صاحبزادے تھے۔ جن کی ولادت ۱۳۰۳ھ او وفات ۱۳۶۳ھ (۱۹۴۴ء) میں ہوئی۔

مولانا محمد الیاس صاحب خاندان ولی اللٰہی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ وہی خاندان ہے جس کے متعلق اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ ہندستان میں آلِ تیمور کی غلط سیاست نے دین اسلام کو جو نقصان پہونچایا اس کے تدارک اور اصلاح کا کام اللہ تعالیٰ نے اسی خاندان کے ذریعے لیا۔ مولانا الیاس صاحب نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں زندگی میں ہماہمی پیدا کرنے کے لیے لوگوں کو فرضی واقعات کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ کئی کئی پشت سے ان کے خاندان اور رشتہ داروں میں علماء اور مجاہدین کی شاندار روایات چلی آرہی تھیں ان کے گھر کے باہر اور اندر کی مجلسیں سید صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان کے قصوں سے گر تھیں۔ ان بزرگوں کے واقعات مردوں اور عورتوں کی زبانوں پر رہتے۔ اور گھر کی بیبیاں بچوں کو طوطا مینا اور پر کی کہانیاں سنانے کے بجائے ان کے روح پرور واقعات سناتی تھیں۔ گھر میں ہر طرف نماز، روزہ، تلاو اور ذکر کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ گھر کی کوئی بڑی بی خوش ہوتیں تو یہ نہ کہتیں کہ "میرا بچہ آئی۔سی۔ایس میں ج گا۔" بلکہ ان کی زبان سے نکلتا ــــ "بیٹے مجھے تجھ سے صحابہ کی خوشبو آتی ہے" یہ تھے وہ ابتدائی خاندانی حالات جن میں مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی پرورش ہوئی۔

آپ کے گھر پر ایک تجارتی کتاب خانہ تھا جس کا انتظام آپ کے بڑے بھائی مولانا یحییٰ صاح کرتے تھے۔ مولانا الیاس صاحب یوں بھی بچپن سے کمزور ہونے کی وجہ سے جسمانی مشقت کا کام نہ کر تھے۔ اور وہ اس میں کچھ حصہ نہیں لیتے تھے۔ ان کا وقت زیادہ تر مطالعہ اور دینی مشاغل میں گز اس کے برعکس بڑے بھائی کافی محنت سے کتاب خانہ کے امور انجام دیتے تھے۔ ایک روز کتاب خ منتظم نے کہا "مولوی الیاس کتاب خانہ کے کاموں میں کچھ ہاتھ نہیں بٹاتے۔ کوئی خدمت ان کے ذمہ کر دینی چاہیئے" بڑے بھائی نے تکدّر کے ساتھ جواب دیا۔ "حدیث میں آیا ہے کہ هَلْ تُرْزَقُونَ اِلَّا بِضُ (تم کو جو رزق ملتا ہے وہ تمہارے کمزور افراد ہی کی برکت تو ہوتی ہے) میرا اعتقاد ہے کہ مجھے اسی ب

برکت سے رزق مل رہا ہے۔ اس لیے آئندہ اس قسم کی بات مجھ سے نہ کہی جائے۔"

اخلاص اور دینداری کے اس ماحول کا نتیجہ یہ تھا کہ مولانا کی پرورش اس طرح ہوئی گویا وہ دین کے گہوارے میں پل رہے ہیں۔ ایسی حالت میں جذبات کا دین کی راہ پر مڑ جانا بالکل فطری تھا۔ مولانا کے ایک ہم درس بیان کرتے ہیں کہ بچپن میں جب وہ ان کے ساتھ مکتب میں پڑھتے تھے، ایک دن آپ لکڑی لے آئے اور کہا۔۔۔"آؤ میاں ریاض الاسلام! چلو بے نمازیوں پر جہاد کریں۔"

مکتب کی تعلیم سے فارغ ہو کر مولانا نے قدیم طرز پر عربی و دینی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم (سہارن پور) میں استاد مقرر ہوئے۔ مگر قدرت کو منظور تھا کہ اب آپ کو اگلے مرحلہ کی تربیت گاہ میں پہونچایا جائے۔ پہلے ذکر آچکا ہے کہ آپ کے والد صاحب دہلی کے پاس بستی نظام الدین میں رہتے تھے۔ وہاں انہوں نے ایک چھوٹا سا مدرسہ جاری کیا تھا۔ جس میں کچھ غریبوں کے بچے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد آپ کے بھائی مولانا محمد صاحب نے اس مدرسہ کو سنبھالا۔ ۱۳۲۶ھ میں ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس وقت جب آپ اس سلسلہ میں نظام الدین گئے تو وہاں لوگوں نے اصرار کیا کہ اب یہیں قیام کریں اور والد اور بھائی کی جگہ، جو ان کی وفات سے خالی ہوئی ہے، اس کو پُر کریں۔ آپ نے اس درخواست کو منظور کر لیا۔

یہاں سے آپ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جب کہ میواتیوں سے تعلق کی وجہ سے آپ کو تبلیغی تحریک چلانے کی طرف توجہ ہوئی۔ تبلیغ کا ابتدائی محرک میواتی مسلمان بنے۔ اس کے بعد یہ کام دوسرے تمام مقامات پر پھیل گیا۔

میواتیوں میں کام

دہلی کے جنوب کا وہ علاقہ جس میں قدیم زمانے سے میو قوم آباد ہے، میوات کہلاتا ہے۔ یہ تقریباً اسی قسم کی ایک قبائلی آبادی تھی جیسا کہ عرب کے قدیم بدوؤں کے سلسلے میں ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں۔ ایک جاہل اور اجڈ قوم جو غالباً حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء و متبعین کی کوششوں سے مسلمان ہوگئی تھی۔ مگر عملاً وہ اسلام سے دور تھے۔ بجز اس خیال کے کہ "ہم مسلمان ہیں" اور کوئی اسلامی چیز ان کے اندر باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ناہر سنگھ اور بھوپ سنگھ جیسے نام رکھتے، ان کے سروں پر چوٹیاں ہوتیں، ان کے یہاں مورتیاں پوجی جاتیں، وہ ہندوؤں کے تیوہار اور تقریبات مناتے، دیوی دیوتاؤں کے نام پر قربانی چڑھاتے، شب برات میں ان کے یہاں سید سالار مسعود غازی کا جھنڈا اٹھتا تھا۔ مگر وہ بھی ایک بُت تھا جو پوجا جاتا تھا۔ انہیں کلمہ تک یاد نہ تھا۔ حتیٰ کہ نماز کی صورت سے وہ اس

مذہبنا آشنا تھے کہ کبھی کوئی مسلمان اتفاق سے ان کے علاقے میں پہونچ گیا اور اس نے نماز پڑھی تو گاؤں کے عورت، مرد، بچے سب اس کے گرد یہ دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے کہ یہ شخص آخر کیا کر رہا ہے۔ اس کے پیٹ میں درد ہے یا اس کو جنون ہو گیا ہے کہ بار بار اٹھتا بیٹھتا اور جھکتا ہے۔ ان کی تہذیب کا یہ عالم تھا کہ عورت مرد اکثر نیم برہنہ گھومتے تھے۔ چوری ڈکیتی اور رہزنی ان کا پیشہ تھا۔ آپس کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کے درمیان لمبی لمبی خوں ریز لڑائیاں ہوتی رہتی تھی۔ وہ فطرتاً جفاکش اور بہادر تھے۔ مگر علم اور تربیت کی کمی نے انہیں جنگلی قبائل کی سطح سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ میجر پاؤلٹ۔ جو انیسویں صدی کے آخر میں ریاست الور کا افسر بندوبست تھا، کے الفاظ ہیں:

"میو اپنے عادات میں آدھے ہندو ہیں"

دہلی کی مسلمان سلطنت کے ابتدائی دور میں میواتی بہت تکلیف دہ عنصر بن گئے تھے۔ انہوں نے دہلی کے اوپر تاخت و تاراج شروع کر دی تھی۔ ان کے خوف سے راجدھانی کے دروازے سرِ شام بند ہو جاتے شام کو شہر پناہ سے باہر نکلنے کی کوئی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ غیاث الدین بلبن نے ان کے خلاف ایک زبردست مہم بھیجی جس میں میواتیوں کی بڑی تعداد قتل ہوئی۔ بعد کے حالات بھی بتاتے ہیں کہ انگریزی حکومت کے افسران اور الور اور بھرت پور کی ہمسایہ ریاستیں وہاں امن و امان قائم کرنے میں ناکام رہی تھیں۔

۱۹۲۱ء کے زمانے میں مزید ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ آریہ مبلغین سیکڑوں کی تعداد میں اٹھ کھڑے ہوئے جن کا مقصد یہ تھا کہ ہندستان کے وہ باشندے جنہوں نے پہلے اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا انہیں دوبارہ اپنے مذہب کی طرف واپس لایا جائے۔ ہر طرف ارتداد کی ہوا پھیلنے لگی اور جاہل نو مسلم دیہاتی علاقوں میں آریوں کی کامیابی کی خبریں آنے لگیں۔

بستی نظام الدین عین میوات کے دہانے پر واقع تھی۔ اور یہاں کے مدرسہ میں ان کے کچھ بچے پڑھتے تھے۔ اسی کے ساتھ مولانا الیاس صاحب کے والد بزرگوار اور آپ کے بھائی صاحب مرحوم کے تعلق سے کچھ میواتی عقیدت مند بھی ہو گئے تھے۔ وہ آتے جاتے رہتے تھے۔ مولانا الیاس صاحب نے میواتیوں کی افسوسناک حالت دیکھی تو ان کے اندر اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا۔ آپ کے دونوں پیشرو (والد صاحب اور بھائی صاحب) دینی تعلیم کے ذریعہ پہلے سے بھی ان کی اصلاح کی کوشش کر رہے تھے۔ فطری طور پر آپ کا پہلا ذہن اسی طرف گیا کہ اس سلسلے کو جاری رکھنا ان کی اصلاح کا حقیقی

ذریعہ ہے۔ آپ نے اس میں اتنا اور اضافہ کیا کہ خود میوات کے اپنے علاقہ میں بھی دینی مکاتب و مدارس قائم کرنے کی تحریک چلائی۔

یہ دوسرا جزء میواتیوں کے لیے سخت مشکل تھا۔ کیونکہ وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ بچہ کو کھیتی باڑی اور جانوروں کی دیکھ بھال سے ہٹا کر مدرسہ میں بٹھا دیں۔ تاہم آپ نے کوشش جاری رکھی۔ تبلیغ سے لے کر خوشامد تک ہر طریقہ اختیار کیا۔ میواتیوں سے کہا کہ "تم بچے دے دو، معلمین کی تنخواہ میں لاؤں گا" بالآخر میوات میں سیکڑوں ایسے مکتب قائم ہو گئے جن میں قرآن اور ابتدائی دینی تعلیم ہوتی تھی۔

اس کے بعد ایک واقعہ ہوا جس نے آپ کی کوششوں کے رُخ کو بالکل موڑ دیا۔ ایک بار آپ میوات کے سفر میں تھے۔ ایک مقام پر مولانا کے سامنے بڑی تعریف کے ساتھ ایک نوجوان پیش کیا گیا کہ یہ میوات کے فلاں مکتب سے فارغ ہو کر نکلے ہیں۔ دیکھا تو ڈاڑھی منڈی ہوئی ہے اور چہرہ اور وضع قطع میں کہیں اسلامیت کا کوئی نشان نہیں، یہ واقعہ مکاتب کی عملی ناکامی کی تصویر تھا۔ مکاتب کے نتائج کے بارے میں جو بے اطمینانی آپ کو رہا کرتی تھی۔ وہ اب پوری شدت کے ساتھ اُبھر آئی۔ مکاتب کے قیام سے بلاشبہ یہ فائدہ تھا کہ آہستہ آہستہ لوگوں کے اندر مولانا کی عقیدت بڑھ رہی تھی، اور ایک دوسرا کام جو مولانا وہاں کرنا چاہتے تھے وہ بھی کسی قدر ہو رہا تھا۔ یعنی میواتیوں کے آپس کے لڑائی جھگڑوں کو چکانا اور باہم صلح کرانا۔ اس میں ان کی کامیابی کا یہ عالم تھا کہ میوات کے لوگ کہنے لگے تھے — "یہ شخص دیکھنے میں تو ایک مشتِ استخواں ہے۔ مگر جس معاملے میں پڑ جاتا ہے، چٹکیوں میں اس کو سلجھا دیتا ہے۔ اور معلوم نہیں کیا بات ہے کہ بڑے بڑے ضدی اس کے کہنے سے فوراً مان جاتے ہیں۔"

مگر اصل مسئلہ میواتیوں کی دینی بیداری کا تھا۔ اور اس معاملے میں مکاتب کی ناکامی اپنی جگہ بدستور باقی تھی۔ غور و فکر کے بعد آپ پر کھلا کہ اصل رکاوٹ یہ ہے کہ موجودہ طریق کار کے تحت ہم یہ کرتے ہیں کہ میواتیوں کو ان کے مشاغل اور ماحول میں رکھ کر انہیں دین کا سبق پڑھانا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم تو انہیں محنت اور عرق ریزی سے دین کی باتیں بتاتے ہیں۔ مگر اس کے چند ہی لمحے بعد جب وہ اپنے گھر اور اپنے ماحول میں پہونچتے ہیں تو وہاں دوسری قسم کی باتیں انہیں گھیر لیتی ہیں اور پھر خود بخود سفیدی پر سیاہی پھر جاتی ہے۔ اس کا واحد حل جو مولانا کو نظر آیا وہ یہ کہ میواتیوں کی جماعت بنا کر انہیں ان کے ماحول سے نکالا جائے۔ اور پھر مسجدوں میں، دینی مدارس میں، بزرگوں کی صحبتوں میں، اور وعظ و تلقین کے ماحول میں رکھ کر انہیں تعلیم دی جائے اور انہیں ایک عرصہ تک ذکر اور نماز اور دعا میں مشغول رکھ کر متاثر کرنے کی

کوشش کی جائے۔ اب انہوں نے اس دوسرے طریقے کے مطابق کام شروع کر دیا۔

اس کام میں ابتداً پہلے سے بھی زیادہ مشکلیں پیش آئیں۔ جس میواتی کا یہ حال تھا کہ اس کو اپنا بچہ مقامی مدرسے میں دینا گوارا نہیں ہوتا تھا، وہ خود اپنا وطن چھوڑ کر اور اپنا وقت نکال کر باہر جانے کے لیے کس طرح راضی ہوتا، مگر مولانا کا اخلاص، مسلسل کوشش، دعائیں اور گریہ وزاری نے بالآخر اس کو ایسا رواج دیا کہ سارے میوات میں ایک نئی حرکت پیدا ہو گئی۔

اس سرکش قوم کو مولانا نے کس طرح رام کیا۔ اس کا اندازہ دو واقعات سے ہوگا۔ ایک مرتبہ دورانِ تبلیغ آپ نے ازراہِ محبت ایک شخص کے اوپر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ آگ بگولہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ اگر اب کی تم نے ہاتھ لگایا تو میں لٹھ مار دوں گا۔ آپ نے فوراً اس کے پاؤں پکڑ لیے اور فرمایا کہ ــ "پاؤں کو تو نہیں کہا تھا" اس کے بعد اس کا غصہ کافور ہو گیا اور فوراً نرم پڑ گیا۔ اسی طرح آپ ایک بار ایک میواتی پر تبلیغ کر رہے تھے کہ وہ بگڑ گیا اور آپ کو ایک گھونسہ مار دیا۔ مولانا الیاس صاحب دُبلے کمزور آدمی تھے۔ گھونسہ کی تاب نہ لا کر زمین پر گر پڑے۔ کچھ دیر بعد جب ان کے حواس بجا ہوئے تو وہ گرد جھاڑ کر اٹھے اور میواتی کا دامن پکڑ لیا اور کہا:

"اچھا تم تو اپنا کام کر چکے، اب میری سنو"

یہ دیکھ کر میواتی آپ کے قدموں پر گر پڑا اور بولا "مولوی مجھے معاف کر و ورنہ میری بخشش نہیں ہوگی۔"

اسی اخلاص اور اخلاق کا نتیجہ تھا کہ بالآخر لوگوں کے دل کھنچے۔ میواتیوں کی کثیر تعداد آپ کے ساتھ ہو گئی۔ ان کے قافلے جوق در جوق اپنے علاقوں سے نکل کر نظام الدین، سہارن پور، اور دوسرے مقامات کو جانے لگے اور ہفتوں اور مہینوں تک ان کی زندگیاں دینی تعلیم و تربیت کے سائے میں گزرنے لگیں۔ نتیجہ نے بتایا کہ مولانا کا سوچنا صحیح تھا۔ اس کورس سے نکل کر جو لوگ میوات لوٹتے وہ بڑی حد تک بدل چکے ہوتے۔ ماحول سے متاثر ہونے کے بجائے ماحول کو بدلنے کا جذبہ ان کے اندر بیدار ہو چکا ہوتا تھا۔

اب میوات کی فضا بدلنے لگی۔ پورے علاقے میں دین کی رغبت پیدا ہو گئی۔ جہاں میلوں تک کوئی مسجد نظر نہیں آتی تھی وہاں گاؤں گاؤں مسجدیں بن گئیں۔ مکاتب و مدارس نہ صرف تعداد میں بڑھے بلکہ اب انہیں واقعی میوؤں کے درمیان دینی تعلیم و تربیت کے ادارے کا مقام حاصل ہو گیا۔ ہندوانہ وضع و لباس کی جگہ اسلامی وضع و لباس ہر طرف نظر آنے لگا۔ ہاتھوں کے کڑے اور کانوں کی مُرکیاں

اترنے لگیں۔ بے کہے لوگوں نے ڈاڑھیاں رکھنی شروع کر دیں۔ تقریبات سے مشرکانہ رسوم کا خاتمہ ہو گیا۔ سود خواری کم ہو گئی۔ شراب نوشی کا وجود مٹ گیا۔ قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کی واردات میں کمی آ گئی۔ گاؤں کے گاؤں ایسے ہو گئے جہاں ایک بچہ بھی بے نمازی نہیں تھا۔ ان کی معاشرت، ان کے برتاؤ، ان کے لین دین، غرض ہر چیز میں فرق آ گیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ قوم جو پہلے دینی شعور سے بالکل بیگانہ تھی۔ اس کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو گیا کہ وہ دوسروں کو خدا کے دین سے آگاہ کرے۔ ان کی سیدھی سادی زبانوں سے دین کی باتیں سن کر ایسا محسوس ہونے لگا کہ تاریخ اپنے اوراق الٹ رہی ہے۔ اور آغاز اسلام میں عرب کے نو مسلم بدو دوبارہ پیدا ہو کر زمین کے اوپر چلنے پھرنے لگے ہیں۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک بزرگ ستمبر ۱۹۲۹ء میں میوات کے حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے انہوں نے ایک جاہل میواتی کو روک کر پوچھا —— "یہ تبلیغی دورے تم کس لیے کر رہے ہو" اس نے جواب دیا:

"ہم جہالت میں پڑے ہوئے تھے۔ نہ ہم کو خدا کی خبر تھی نہ رسول کی۔ اس مولوی کا خدا بھلا کرے کہ اس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دوسرے بھائیوں تک بھی یہ نعمت پہونچائیں جو ہمیں ملی ہے"

میواتی کے یہ سیدھے سادے الفاظ سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

مولانا کی شخصیت

کسی کام کی کامیابی کے لیے طریق کار کی صحت کے ساتھ کارکنوں کا اخلاص اور تعلق بھی ضروری ہے۔ یہ مولانا الیاس صاحب کی بے تاب طبیعت نے فراہم کر دیا۔ مولانا کو جن لوگوں نے دیکھا ہے ان کی متفقہ شہادت ہے کہ وہ اس قدر بے چین اور مضطرب آدمی تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ گوشت پوست کا مجسمہ نہیں بلکہ درد اور تڑپ کا مجسمہ ہیں۔ مولانا کے ایک قدیم رفیق ایک بار نظام الدین گئے۔ اس وقت مولانا الیاس صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ انہوں نے گھر میں مولانا الیاس صاحب کی زوجۂ محترمہ کے یہاں کہلایا کہ مولانا کی کوئی خاص بات جو آپ کو یاد ہو بتائیے۔ محترمہ نے اندر سے کہلایا:

"جب میری شادی ہوئی اور میں رخصت ہو کر مولانا کے گھر گئی تو میں نے دیکھا کہ مولانا راتوں کو بہت کم سوتے ہیں۔ ان کی راتیں بستر پر کروٹ بدلنے اور آہ بھرنے میں گزرتی تھیں۔ میں نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ آپ کو راتوں کو نیند نہیں آتی۔ مولانا نے ایک آہ بھری اور فرمایا —— کیا بتاؤں اگر تم کو وہ بات معلوم ہو جائے تو جاگنے والا ایک نہ رہے، دو ہو جائیں"

لاناکی ساری زندگی گواہی دیتی ہے کہ وہ سراپا دردِ دین تھے ۔ وہ اگرچہ لکنت کی وجہ سے ، نیز اکثر قدیم طرز زبان اور اصطلاعات میں بولنے کی وجہ سے عام لوگوں کو اپنی بات بخوبی سمجھا نہیں پاتے تھے ۔ مگر جب بولتے تو شدت احساس کی وجہ سے ان کا وجود مجسم بیان اور اظہار بن جاتا ۔ اکثر ماہیِ بے آب کی طرح چیتے ، آہیں بھرتے اور فرماتے ۔۔ " میرے اللہ میں کیا کروں ، کچھ ہوتا ہی نہیں " اس قدر کمزور اور لاغر تھے دیکھنے والوں کو ترس آتا ۔ مگر اس کے باوجود تندرست اور طاقتور لوگوں سے زیادہ کام کرتے ۔ فرمایا تے تھے ۔۔ " دین کے فروغ کے لیے جان دینے کے شوق کو زندہ کرنا اور جان کو بے قیمت کر دینا ہماری ریک کا خلاصہ ہے ۔"

اپنے مقصد کے پیچھے آرام اور کھانا پینا تک بھول جاتے ۔ میوات کے ناہموار علاقوں میں ۲۰-۲۰ میل ۲۵-۲۵ میل تک پیدل چلے جاتے ۔ کھانا موجود ہونے کے باوجود بعض اوقات اس ہنگامی زندگی کی سے کھانے کی نوبت نہ آتی ۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جمعہ کے دن نظام الدین سے کھانا کھا کر روانہ ہوئے اور اتوار نظام الدین واپس آکر کھانا کھایا ۔ راتوں کو جاگنا ، پہاڑیاں عبور کرنا ، میوات کے میدانوں میں کبھی گرم لُو بٹیں اور کبھی زمستانی ہوا کے سرد جھونکوں کا مقابلہ کرنا ، یہ ان کی زندگی تھی ۔ اس طرح کے پُرمشقت سفروں بھی دیکھتے کہ ساتھی گھبرا گئے ہیں تو فرماتے :

" جبل جُہد کے پرلی طرف خدا ہے جس کا جی چاہے مل لے ۔"

ماری کے عالم میں کوئی خیریت پوچھتا تو فرماتے :

" بھئی تندرستی بیماری تو انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے اس میں کیا خیریت اور کیا بے خیریت ۔ خیریت تو جب ہے کہ جس کام کے لیے پیدا گئے ہیں وہ کام ہو ۔"

ایک مرتبہ مولانا کے وطن کاندھلہ سے کچھ اعزہ عیادت کے لیے آئے ۔ مولانا نے پوچھا کس لیے آئے لگے آپ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے ۔ فرمایا ۔۔ " جو مٹنے کے لیے بنا ہے اس کی خیریت پوچھنے کے اندھلہ سے یہاں تک آؤ ۔ اور رسول کریم کا دین جو مٹنے والا نہیں ، وہ مٹایا جا رہا ہے ، اور تم اس رنہیں لیتے ۔" بیماری میں ڈاکٹر بولنے سے منع کرتے تو فرماتے ۔۔ " تبلیغ کے لیے بول کر مرجانا رتا ہوں ۔ بہ نسبت اس کے کہ اس سے خاموش رہ کر صحت حاصل کروں ۔" ایک صاحب کو طلب ت کے سلسلے میں جواب دیتے ہوئے خط میں لکھا :

" طبیعت میں سوائے تبلیغی درد کے اور خیریت ہے ۔"

مولانا کو تبلیغ کے کام سے اس قدر تعلق تھا کہ جب دیکھتے کہ ان کی ساری کوشش کے بعد جو

لوگ ان کے گرد جمع ہوتے ہیں وہ زیادہ تر جاہل یا معمولی پڑھے لکھے لوگ ہیں تو سخت غمگین ہوتے۔ آخری بیماری میں ایک مرتبہ گہرے تاثر کے ساتھ فرمایا:

"کاش علماء اس کام کو سنبھال لیتے اور پھر ہم چلے جاتے۔"

لوگوں کے ساتھ رعایت کا یہ عالم تھا کہ ریل کے سفر میں ایک بار مغرب کے نوافل پڑھتے وقت ایک رفیق نے مسافروں کو سامنے سے گزرنے سے روکنے کا انتظام کیا۔ آپ نے منع فرمایا اور کہا کہ یہ حقوق عامہ ہیں، تم دوسرے کو گزرنے سے نہ روکو بلکہ سترہ کا انتظام کرو۔ کاندھلہ کے سفر میں ایک مرتبہ بھیڑ کی وجہ سے آپ سکنڈ کلاس میں بیٹھ گئے۔ ٹکٹ تھرڈ کلاس کا تھا۔ خیال ہوا کہ ٹکٹ چک کرنے والا آئے گا تو ٹکٹ بنوا لیا جائے گا۔ وہ آیا تو اس نے ایسی بے ڈھنگی گفتگو کی کہ مولانا کو غصہ آگیا۔ اور اس کو ڈانٹ دیا۔ ٹکٹ بنانے کے بعد وہ چلا گیا۔ تو مولانا انعام الحسن صاحب نے جو اس وقت ساتھ تھے کہا کہ حضرت، اس کو تو کہنے کا حق تھا۔ ان لصاحب الحق مقالاً (جس کا حق آتا ہو وہ کہنے سننے کا مجاز ہے) مولانا نے فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور اگلے اسٹیشن پر اتر کر اس ٹی ٹی ای سے معذرت کی اور معافی مانگی۔

اسی کے ساتھ خدا سے تعلق اور آخرت کے استحضار کا یہ عالم تھا کہ نماز میں انہیں لذت ملتی۔ پہاڑی پر چڑھتے اور اوپر پہونچ کر جب تمام ساتھی تھک کر بیٹھ جاتے، مولانا فوراً نماز کی نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے۔ انتقال کے بعد جب غسل دیا گیا اور خوشبو لگائی جانے لگی تو ایک رفیق خاص کی زبان سے بے اختیار نکلا — "پیشانی پر اچھی طرح خوشبو لگاؤ، یہ گھنٹوں سجدہ میں ٹکی رہتی تھیں۔"

آپ کی یہی عبادتیں، قربانیاں، اور خلق اللہ سے آپ کی محبت تھی جس نے آپ کی محنت اور آپ کے کام میں وہ تاثیر پیدا کر دی کہ آج جو لوگ تبلیغ کے کام کے پھیلاؤ اور اس کے حیرت انگیز نتائج کو دیکھتے ہیں، ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مادی اصطلاحوں میں ان واقعات کی کس طرح تشریح کریں۔

ایک مکتوب میں مولانا نے لکھا:

"عادات خداوندی عموماً دین میں اپنی جدوجہد کی مقدار کے ساتھ وابستہ ہیں۔ آدمی کسی مقصد کے لیے جتنا اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے اور تکالیف کو جھیلنے کے ذریعہ اپنے حالات، جوارح، قلب اور قوتوں کی شکستگی اور تعب و انکسار کو پہونچاتا ہے، اتنا ہی حق تعالیٰ کی رحمت کے نزول کا سبب ہوتا ہے۔ انا عند المنکسرۃ قلوبھم۔ کسی راہ کی ذلت کو اٹھائے بغیر اس کی عزت کو پہونچنا عادۃً ہوتا نہیں۔"

یہ الفاظ درحقیقت خود کہنے والے کی تصویر ہیں۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ آپ نے خود کو دین کی راہ میں

گھلا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی زندگی اور آپ کے کلام میں عجیب کشش پیدا ہوگئی۔ مولانا نے جو بات اوپر کے اقتباس میں کہی ہے اس کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ آدمی جب کسی کام میں اپنے کو فنا کئے ہوئے ہو، اس وقت اس کی شخصیت بے پناہ ہو جاتی ہے۔ اس کی زبان سے تیر و نشتر کی باتیں نکلنے لگتی ہیں جو دلوں میں گھستی ہیں اور روحوں کو بے چین کر دیتی ہے۔ دلوں کو چھید دینے والے کلمات اسی کی زبان سے نکل سکتے ہیں جس کا دل مقصد کے غم میں چھلنی ہو گیا ہو۔

مولانا کے چند کلمات سے اس کی مزید وضاحت ہو سکے گی۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"سچے مولوی جی، یہ کام قرن اول کا ہیرا ہے۔ اس کے لیے اپنی جانیں قربان کر دو اور اپنا سب کچھ مٹا دو۔ اس کے لیے جتنا زیادہ قربان کر دگے اتنا زیادہ پاؤ گے"

کچھ لوگ مولانا سے ملنے گئے اور مہمان کی طرح رہ کر واپس چلے گئے۔ ان کو کہلایا "تم لوگ آئے اور چند روز مسند نشینی کر کے چل دیے۔ یاد رکھو اس راہ میں بھوک اور پیاس کی تکلیفات برداشت کرنے کی ضرورت ہے۔ اس راہ میں اپنا پسینہ بہاؤ اور خون بہانے کے لیے تیار رہو"

ایک خط میں اس پر افسوس کرتے ہوئے کہ فی گھر ایک آدمی بھی لوگ تبلیغ کے لیے نہیں دے رہے ہیں لکھتے ہیں:

"عیسیٰ! تم غور تو کرو۔ دنیا فانی میں کام کے لیے تو گھر کے سارے افراد ہوں اور اس کے لیے صرف ایک آدمی کو کہا جائے اور اس پر بھی نباہ نہ ہو، تو آخرت کو دنیا سے گھٹایا یا نہیں گھٹایا۔"

ایک مرتبہ لکھنؤ میں تبلیغی جلسہ ہوا۔ جلسہ کے بعد تحریک ہوئی کہ کچھ لوگ جماعت بنا کر کانپور کے لیے جائیں۔ مگر اعلان کے باوجود کوئی نام نہیں دے رہا تھا۔ مولانا بے قرار ہو کر کھڑے ہو گئے اور لوگوں کو آمادہ کرنا شروع کر دیا۔ حاجی ولی محمد صاحب کئی روز سے صاحب فراش تھے۔ بواسیر کی شکایت نے نقاہت پیدا کر دی تھی۔ آپ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا، تم کیوں نہیں جاتے۔ انہوں نے جواب دیا۔ "میں تو مر رہا ہوں" فرمایا "مرنا ہی ہے تو کانپور جا کر مرو"

یہ چند جملے محض سمجھنے کے لیے نقل کر دیئے گئے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے الفاظ کبھی بھی اپنی اصل حیثیت کے ترجمان نہیں ہوتے۔ کیونکہ جب اس طرح کا جملہ کہا جاتا ہے تو وہ کاغذ پر لکھ کر کسی کو نہیں دیا جاتا۔ بلکہ کہنے والا سامنے موجود ہوتا ہے اور سننے والا براہ راست اس کے کلمات کو سن رہا ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں بات بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ اس وقت یہ الفاظ محض الفاظ نہیں ہوتے بلکہ اس میں دو اور چیزیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اور وہ ہیں ــــ جذبات اور شخصیت۔ اس وقت وہ ایک ایسی حقیقت ہوتی ہے جس میں درد، خیر خواہی اور اخلاص کے ساتھ ایک زندہ شخصیت کا پورا وزن بھی شامل رہتا ہے، ایسے کلمات جب وجود میں آتے ہیں تو فضا میں رعشہ پیدا کر دیتے ہیں وہ سوتوں کو بیدار کر دیتے ہیں۔ کٹر سے کٹر طبیعتیں رام ہو جاتی ہیں۔ غفلت میں پڑے ہوئے چونک اٹھتے ہیں، فطرت میں چھپی ہوئی عبودیت اس طرح جاگ اٹھتی ہے کہ ساری زندگی کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ ایسے ہی کلمات کے لیے کہا گیا ہے ــــ از دل خیزد بر دل ریزد۔

ایک صاحب ایک مرتبہ تبلیغی جلسہ سے واپس آئے تو مولانا نے فرمایا۔ کہو کچھ اپنی حالت پر افسوس بھی ہوا۔ انہوں نے کہا۔ "جو کچھ دیکھا اس کے بعد تو اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے بھی شرم آنے لگی ہے" اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کی زندگی ہی میں کام اس ترقی کو پہونچ گیا کہ نومبر ۱۹۴۱ء میں جب میوات میں پہلا بڑا تبلیغی جلسہ ہوا تو ۲۵ ہزار آدمی اس میں شریک ہوئے۔ ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو ۵۰ ــ ۵۰ میل سے پیدل چل کر وہاں پہونچے تھے۔ ایک میواتی سے جب پہلی بار آپ نے کہا کہ جاؤ تبلیغ کرو۔ تو وہ بولا۔ "تبلید کیا ہو ہے" مگر یہی لوگ جو تبلیغ کا صحیح تلفظ بھی نہیں جانتے تھے وہ ایسے مبلّغ بنے کہ انہوں نے مبلّغوں کی ایک نئی قوم ملک میں پیدا کر دی۔ اگر کوئی اس وقت مبلّغوں کے ان قافلوں کو دیکھے جو بستی بستی اس طرح گھوم رہے ہیں کہ کاندھوں پر کمبل پڑے ہوئے ہیں۔ بغل میں سیپارے دبے ہوئے ہیں۔ چادر کے پلّو میں چنے یا چند روٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ زبانیں تسبیح اور ذکر میں مشغول ہیں۔ آنکھوں میں شب بیداری کے آثار، پیشانی پر سجدے کے نشانات، ہاتھ پاؤں سے جفاکشی اور مشقت نمایاں، تو دیکھنے والوں کو وہ منظر یاد آجاتا جب عرب کے مفلس اور غیر تعلیم یافتہ باشندے اسلام کی دولت کو پاکر سرشار تھے اور قرآن اور احکام دین کی تعلیم کے لیے چاروں طرف چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔

تبلیغ کی اندرونی طاقت

مولانا نے اپنی تبلیغ کے ذریعہ لوگوں کو وہ کیا چیز دی تھی جس نے اتنی بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ تھا آخرت کا خیال اور نصرت الٰہی کا یقین۔ مولانا نے اس حقیقت کو شدت سے لوگوں کے ذہن نشین کیا کہ اس کائنات کا ایک مالک ہے۔ اور اسی کے پاس لوٹ کر ہمیں جانا ہے۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس کی مرضی کے بغیر ہل نہیں سکتا جو کچھ ہوگا اسی کے کیے سے ہوگا۔ اس کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے ایک واقعہ پر غور کیجیے۔ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک میواتی

صحبت یافتہ سے ایک شخص نے پوچھا "اپنی تبلیغی زندگی کا کوئی واقعہ بتائیے"

میواتی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنا شروع کیا "مولانا نے ایک مرتبہ تین آدمیوں کی ایک جماعت مراد آباد بھیجی۔ جس میں سے ایک میں تھا۔ مولانا نے چلتے وقت یہ مختصر سی ہدایت دی کہ اللہ کے نام پر روانہ ہو جاؤ۔ اور جب کوئی مشکل پڑے تو ایسا کرنا کہ بستی کے باہر جاکر تنہائیوں میں نماز پڑھنا اور دعا کرنا کہ خدایا ہماری مشکل حل کر دے۔ ہم لوگ بستی میں پہونچ کر ایک مسجد میں داخل ہوئے۔ مغرب کی نماز کے بعد اعلان کیا گیا "لوگ ٹھہر جائیں۔ کچھ دین کی باتیں ہوں گی"۔ مگر جب ہم سنتوں سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ ایک ایک شخص جاچکا ہے۔ اور مسجد میں ہم تین کے سوا کوئی موجود نہیں۔ اب ہم ٹھیر کر اگلی شام کا انتظار کرنے لگے۔ دوسرے دن پھر مغرب کی نماز کے بعد یہی اعلان کیا۔ مگر دوسرے دن بھی یہی قصہ پیش آیا کہ نماز کے بعد سارے لوگ مسجد سے اٹھ اٹھ کر چلے گئے۔ اب ہمیں مولانا کی نصیحت یاد آئی۔ رات گزار کر صبح کو ہم لوگ حسب ہدایت بستی کے باہر چلے گئے اور سارا دن دعا کرتے رہے۔ شام کو آکر پھر اسی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی اور جس طرح دو دن اعلان کر چکے تھے، اسی طرح آج بھی اعلان کیا ــــــ "نماز سے فارغ ہو کر آپ لوگ ٹھہر جائیں کچھ دین کی باتیں ہوں گی"۔

اتنا کہہ کر میواتی رک گیا۔ وہ پوچھنے والے کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ کسی نہایت اہم واقعہ کا انکشاف کرنے جا رہا ہو۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے اپنی خاص زبان میں کہا :

"جیسے دھرتی نے سب کو پکڑ لیا، ایک بھی نہ اٹھا، حضرت! یہ کام تو بس یوں ہی چلے گا"

جن لوگوں کو یہ تجربہ ہوا، اس تجربے نے انہیں کتنی قیمتی چیز عطا کی۔ اس نے انہیں اس لازوال حقیقت کا رازداں بنایا کہ یہاں ایک ایسا خزانہ بھی پوشیدہ ہے جس کا مالک بننے کے لیے ٹوٹے ہوئے دل اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسی طاقت ہے جو زمین کو ہلا دے اور پہاڑوں کو کھسکا دے۔ یہ نہتوں کو عظیم ترین ہتھیاروں سے مسلح کرتا ہے، یہ بے علم افراد کو بڑے بڑے مدعیانِ علم سے مقابلہ کرنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔ یہ وہ فیض ہے جس کو پاکر گونگے بولنے لگتے ہیں، اندھے دیکھنے لگتے ہیں اور لنگڑے چلنے لگتے ہیں۔ یہ ہر تالے کی کنجی ہے اور ہر دروازے کو کھولنے والا ہے۔ اس کے ملنے سے وہ سروسامان ملتا ہے کہ انتہائی انتہائی بے سروسامانی کے باوجود آدمی زندگی کے تمام مراحل کو پار کرتا چلا جائے۔

اس طرح کے بے شمار تجربے ہیں جن سے تبلیغ کی تاریخ بھری ہوئی ہے اور اس نے تبلیغ کے افراد کو ایک ایسی ذہنی اور نفسیاتی طاقت دی ہے کہ وہ انتہائی مشکل حالات کے باوجود اقدام کرنے سے نہیں ہچکچاتے سخت ترین ماحول میں گھس کر کام کرنے سے ہراساں نہیں ہوتے۔ وہ دعا کو اپنے لیے عصائے موسیٰ سمجھتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ عصا انہیں کسی بھی مقام پر دھوکا نہیں دے سکتا۔

ہر شخص اور ہر قوم کو کسی ایسے سہارے کی ضرورت ہے جس کے اوپر وہ اپنے اقدام اور استحکام کے لیے بھروسہ کر سکے اور جس کے اوپر اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔ تمام لوگ ایسا سہارا فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس کے جس سرچشمے سے عام طور پر لوگ واقف ہیں وہ صرف مادی ساز و سامان ہے۔ لوگ صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ جدید ترین ٹکنالوجی کو استعمال کر کے بڑے بڑے کارخانے کھڑے کرو۔ بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کے ذریعہ سارے ملک کی دولت اکٹھا کر لو۔ بموں اور ہوائی جہازوں سے اپنی فوجی چھاؤنیوں کو بھر دو۔ جبری فوجی ٹریننگ کے ذریعہ سارے ملک کو عظیم فوج میں تبدیل کر دو۔ خلائی سائنس کے محیر العقول کارنامے دکھا کر دنیا کے اوپر اپنا سکہ جما دو۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، پریس، اور ان تمام چیزوں کے مالک بن جاؤ جن کو آج طاقت و قوت سمجھا جاتا ہے۔

گویا جن لوگوں کے پاس اس قسم کے ساز و سامان فراہم کرنے کے حالات نہ ہوں، ان کے لیے اس دنیا میں کچھ نہیں ہے۔ مگر تبلیغی نظریہ آدمی کو طاقت کے ایسے خزانے سے آشنا کرتا ہے جس کے لیے ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف ایک ایسی چیز کی ضرورت ہے جو ہر آدمی کے پاس موجود رہتی ہے، خواہ وہ کسی حال میں ہو۔ اور وہ ہے آدمی کا دل۔ اگر آدمی اپنے دل کو خدا کے آگے ڈال دے تو ساری کائنات اس کے قدموں کے نیچے آجائے گی۔

یہ طاقت کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس کو اقتصادی امداد روک کر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ناکہ بندی کر کے اسے مسدود کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ ٹینکوں کا مارچ اور ہوائی جہازوں کی بمباری بھی اسے فنا نہیں کر سکتی۔ اور نہ اس قسم کی کوئی خبر اس کے لیے اندیشہ ناک ثابت ہو سکتی ہے کہ حریف نے زیادہ طاقتور قسم کا ہتھیار ایجاد کر لیا ہے۔

جو نظریہ آدمی کو اتنی بڑی طاقت دیتا ہو، جو ہنتوں کو سب سے زیادہ طاقت ور فوج میں تبدیل کر دینے والا ہو، اس کی کشور کشائی اور جہانگیری کا کیا ٹھکانا۔ اور تبلیغی کارکنوں کے وہ حیرت انگیز واقعات جو مغرب سے لے کر مشرق تک پیش آرہے ہیں، ثابت کرتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اس سرچشمہ میں سے ایک حصہ عطا فرمایا ہے۔ مگر خدا کی یہ نعمت اپنی پوری شکل میں اس وقت ظاہر ہو گی جب پوری قوم اس راہ پر آجائے۔ مولانا الیاس صاحبؒ کو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ اگر پوری قوم اس راہ پر آجائے تو خدا کی نصرت ان کے اوپر اس آخری اور انتہائی شکل میں ظاہر ہو سکتی ہے جب ایک بے حیثیت قوم اٹھ کر پوری دنیا کو زیر و زبر کر دے۔ جب کسی تار کے بغیر ان کے امیر کی آواز مدینہ سے نہاوند کی پہاڑیوں تک سنائی

ہے۔ جب سمندروں اور جنگلوں پر ان کا حکم چلنے لگے۔ جب قومیں ان کی باج گزار ہوں اور زمین میں ہر طرف ان کا جھنڈا لہرانے لگے۔ یہ سب ممکن ہے اور اس امکان کا سرا صرف اس واقعہ میں ہے کہ ہم "اللہ کو اپنالیں"۔

نصرت قرآن میں

یہاں "نصرت" کے بارے میں قرآن کا نظریہ بیان کرنا مناسب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت جو بندوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک وہ جس کو قرآن میں "حیات طیبہ" کہا گیا ہے اور دوسری وہ جس کے لیے استخلاف اور تمکین فی الارض کے الفاظ آئے ہیں۔ دونوں آیتیں حسب ذیل ہیں:

من عمل صالحا من ذکر او انثیٰ وھو مومن فلنحیینه حیاۃ طیبة ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون (نحل - ۹۷)	جو نیک عمل کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو ہم اس کو حیات طیبہ کی زندگی دیں گے، اور ان کے عمل کا ان کو بہترین بدلہ دیں گے۔

دوسری آیت یہ ہے:

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً۔ نور - ۵۵	جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح کیا، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں اقتدار بخشے گا جس طرح پچھلوں کو اقتدار دیا تھا۔ اور ان کے لیے ان کے دین کو جما دے گا اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔

"حیاۃ طیبہ" سے مراد یہ ہے کہ شخصی طور پر ایک آدمی کو اچھی اور ستھری زندگی حاصل ہو۔ ایک مفسر کے الفاظ میں اس اچھی اور ستھری زندگی کے اجزاء مثال کے طور پر یہ ہیں ـــــ "دنیا میں حلال روزی قناعت، غنائے قلبی، سکون و طمانیت، ذکر اللہ کی لذت، حُب الٰہی کا مزہ، ادائے فرض عبودیت کی خوشی، کامیاب مستقبل کا تصور، تعلق مع اللہ کی حلاوت، وغیرہ"۔ یہ چیزیں جس کو ملتی ہیں اس کی زندگی تنگی اور فراخی ہر حال میں بہترین کیفیات سے مالا مال رہتی ہے۔

دوسری چیز استخلاف اور تمکین ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ نصرت ہے جو اجتماع اور معاشرہ کے اوپر نازل ہوتی ہے۔ ایک مفسر کے الفاظ میں:

"یہ خطاب فرمایا حضرت نے وقت کے لوگوں کو۔ یعنی جو ان میں اعلیٰ درجے کے نیک اور رسول کے کامل متبع ہیں، رسول کے بعد ان کو زمین کی حکومت دے گا اور جو دین اسلام

خدا کو پسند ہے ان کے ہاتھوں سے دنیا میں اس کو قائم کرے گا۔ گویا جیسا کہ لفظ استخلاف میں اشارہ ہے، وہ لوگ محض دنیوی بادشاہوں کی طرح نہ ہوں گے۔ بلکہ پیغمبر کے جانشین ہو کر آسمانی بادشاہت کا اعلان کریں گے۔ اور دین حق کی بنیادیں جما دیں گے۔ اس وقت مسلمانوں کو کفار کا خوف مرعوب نہ کرے گا۔ وہ کامل امن و اطمینان کے ساتھ اپنے پروردگار کی عبادت میں مشغول رہیں گے۔ اور دنیا میں امن و امان کا دور دورہ ہوگا۔ ان مقبول و معزز بندوں کی ممتاز شان یہ ہوگی کہ وہ خالص خدائے واحد کی بندگی کریں گے جس میں ذرہ برابر شرک کی آمیزش نہ ہوگی۔ صرف ایک خدا کے غلام ہوں گے، اسی سے ڈریں گے، اسی سے امید رکھیں گے، اسی پر بھروسہ کریں گے۔ اسی کی رضا میں ان کا جینا اور مرنا ہوگا۔ کسی دوسری ہستی کا خوف و ہراس ان کے پاس نہ پھٹکے گا۔ نہ کسی دوسرے کی خوشی ناخوشی کی پروا رکھیں گے۔"

ان دونوں آیتوں میں جس شخصی اور اجتماعی نعمت کا ذکر ہے، ان کے دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے اور دونوں میں ان کے استحقاق کی ایک ہی مشترک بنیاد بتائی گئی ہے، اور وہ ہے — ایمان اور عمل صالح۔ گویا حیات طیبہ اور تمکین فی الارض کے حصول کا راز اللہ تعالیٰ کے حصول میں پوشیدہ ہے اگر ہم حقیقی معنوں میں مومن بن جائیں اور عمل صالح کی زندگی اختیار کریں تو وہ خدا جو مالک الملک ہے، جو حالات کو کنٹرول کرتا ہے اور واقعات عالم کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے، وہ ہمارے لیے ایسے اسباب و حالات پیدا کرے گا کہ ایک طرف ہم ذاتی طور پر دین کی حقیقت کو پالیں، اور دوسری طرف اگر ہمارا ایمان اور عمل صالح اجتماعی سطح پر پہونچ جائے تو خدا کی نصرت پورے اجتماعی دائرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور ہماری کوششیں ایسے موافق رخ اختیار کریں گی جن کے اجتماعی نتائج نکلنے لگیں۔

مولانا الیاس صاحبؒ کے نزدیک یہ نصرت کا تصور تبلیغ کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس سے مبلغ کو وہ قوت اور وہ سہارا حاصل ہوتا ہے کہ وہ ہر ماحول اور ہر قسم کے حالات میں دینی کام کا آغاز کر سکے اور ایک ناقابل شکست اعتماد کے ساتھ اپنے کام کو آخر تک جاری رکھے۔ یہ ایک طرف مبلغ کی قوت ہے، دوسری طرف وہ اس یقینی امید کا سرچشمہ بھی ہے کہ جس کے اوپر تبلیغ کی جارہی ہے اس کا دل بھی خدا ہی کی مٹھی میں ہے اور وہ اس کو زیر کرکے رہے گا۔

دل سے خطاب

اکتوبر ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال اپنے لاہور کے مکان میں آرام کرسی پر نیم دراز ہیں۔ حقہ

اسی اثنے میں ایک شخص داخل ہوتا ہے۔ علیک سلیک اور رسمی مزاج پرسی کے بعد گفتگو شروع ہوتی ہے۔
"آپ ایک کتاب لکھیے" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔
"کیسی کتاب" نو وارد نے پوچھا۔
تحقیقات کرنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے قصبات اور دیہات میں ہزارہا غیر مسلم
ذ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان از خود مسلمان ہونے والوں سے ملے اور ان سے قبول
سلام کے اسباب دریافت کرکے ایک کتاب میں جمع کر دے تو اس سے تبلیغ اسلام کے مقصد کو بے حد
یت حاصل ہوگی۔
"کیا صداقت اسلام کے متعلق پہلے دلائل ناکافی ہیں؟"
"بہت کافی ہیں۔ مگر ایسا کرنے سے کئی ایسے عجیب اور جدید دلائل آپ کو ملیں گے کہ دنیا حیرت زدہ
جائے گی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ دل اور دماغ کے کام کرنے کے طریقوں میں بہت فرق ہے۔ دماغ اکثر
ات ہزارہا مضبوط دلائل کو مسترد کر دیتا ہے اور ان کی کچھ بھی پروا نہیں کرتا۔ لیکن دل اس کے برعکس بعض
ات کمزور سے کمزور چیزوں سے اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ صرف ایک ہی جھٹکے میں زندگی کا سارا نقشہ
جاتا ہے۔ قبولِ اسلام کا تعلق جس قدر دل سے ہے، دماغ سے نہیں۔ اصل بات جو مبلغ کو معلوم
ا چاہیے، یہ ہے کہ وہ کون کون سے نشتر ہیں جن سے دل متاثر ہوا کرتے ہیں۔ کفار اور مشرکین کے انقلاب
ت کی ہزارہا مثالیں تاریخ اسلام میں موجود ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنے حالات کے تحت
خیال یا ایک مذہب پر چٹان کی طرح قائم ہوتا ہے۔ ناگہاں غیب سے اس کے دل پر ایک نشتر چلتا ہے
چشم زدن میں اس کی زندگی کی تمام گزشتہ تاریخ بدل جاتی ہے۔ صداقت اسلام کے عقلی دلائل تو آپ
پاس بہت ہیں۔ مگر قلبی دلائل کم ہیں۔ اگر آپ نومسلموں کے پاس جائیں تو وہ بتائیں گے کہ اسلام
ہ کون سی بے ساختہ ادا تھی جو ان کے دل کو بھا گئی۔ اگر ان کے بیانات ایک کتاب میں جمع کر دیئے
ں تو مجھے یقین ہے کہ انقلاب حیات کی ایک بالکل نئی دنیا مبلغین کے سامنے آجائے گی اور انہیں
عت اسلام کے لیے ایسے نئے دلائل یا جدید ہتھیار مل جائیں گے جن سے اسلام کا موجودہ کتب خانہ
ا ہے۔"
اس کے بعد مثال کے طور پر چند واقعات بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر اقبال نے مزید کہا:
"قبول اسلام میں اصل چیز دل ہے۔ جب دل ایک تبدیلی پر رضامند ہو جاتا ہے اور کسی بات پر
پکڑ لیتا ہے تو پھر باقی تمام جسم اس کے سوا کچھ نہیں کرتا کہ وہ اس تبدیلی کی تائید کے لیے وقف ہو جائے۔

ہمیں اسلام کے قدیم وجدید مبلغوں میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے۔ قدیم مبلغوں کا وار غیر مسلموں کے دلوں پر ہوتا تھا۔ وہ اپنی للّٰہیت، بے نفسی، خوش خلقی اور احسان و مروت کی جادو اثر اداؤں سے دلوں کو گرویدہ کرتے تھے۔ اور اس طرح ہزارہا لوگ از خود بغیر کسی بحث و تکرار کے ان کے رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ مگر جدید مبلغوں کا سارا زور دماغ کی تبدیلی پر صرف ہوتا ہے۔ وہ صداقت اسلام پر ایک دلیل دیتے ہیں۔ مقابلہ میں دوسری حجت غیر مسلم پیش کر دیتے ہیں۔ اس پر بحث و تکرار شروع ہو جاتی ہے۔ مسلمان اپنی بات پر اڑ جاتا ہے۔ غیر مسلم اپنے قول پر تن جاتا ہے۔ اس سے ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہدایت ختم ہو جاتی ہے۔"

"مبلغین اسلام کو دلوں کے متاثر کرنے کے لیے نکلنا چاہیئے یا دماغوں کے" ڈاکٹر اقبال نے مزید تفصیل کرتے ہوئے کہا۔" اس کے فیصلے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم فطرت کی روش کی پیروی کریں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ فطرت اپنی فتوحات حاصل کرنے کے لیے اپنا تعلق ہمیشہ دلوں سے جوڑتی ہے۔ فطرت کھانے میں لذت پیدا کرتی ہے اور آپ اسے بے اختیار کھا جاتے ہیں۔ اس وقت ایک بھی شخص دماغ سے یہ نہیں پوچھتا۔ کیا یہ کھانا طبی لحاظ سے مفید ہوگا۔ آپ کہیں جا رہے ہوتے ہیں کہ ناگہاں پھولوں کی ایک خوشنما زمین اور لب جو کا ایک حسین نظارہ سامنے آجاتا ہے، آپ وہاں بے اختیار بیٹھ جاتے ہیں، وہیں ٹھنڈی ہوا کا ایک دلنواز جھونکا آتا ہے اور آپ کو میٹھی نیند سلا دیتا ہے۔ اس وقت کوئی بھی شخص دماغ سے یہ نہیں پوچھتا کہ مجھے سونا چاہیئے یا نہیں۔ مختصر یہ کہ فطرت ہر کام میں اسی طرح دلوں کو گرویدہ کر کے مطلب نکالتی ہے۔ وہ دماغوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتی۔ اسلام چونکہ سر بسر نور فطرت ہے۔ اس واسطے مبلغین اسلام کو چاہیئے کہ اخلاق و محبت کی گیرائیوں سے دلوں کو اس طرح شکار کریں کہ ان میں سرکشی اور انکار کی سکت ہی باقی نہ رہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مبلغ اسلام، اسلامی کیرکٹر کی عظمت کے مالک ہوں۔ تاکہ سرکش سے سرکش آدمی بھی ان کے سامنے اپنی گردن جھکا دیں۔ باقی رہے دماغی مباحث اور عقلی تکرار، تو اس سے نہ تو دل مطمئن ہو سکتے ہیں نہ منقلب ہو سکتے ہیں۔ اور نہ فطرت رام ہو سکتی ہے۔"

شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مولانا الیاس صاحبؒ کی ذات اور ان کی پھیلائی ہوئی تبلیغ، کم از کم مسلمانوں کے اندر کام کی حد تک۔ ڈاکٹر اقبال کے اسی خواب کی تعبیر ہے۔ مولانا کی پوری زندگی اور تبلیغی تحریک کی پوری تاریخ اس طریق تبلیغ کی مثالوں سے بھری پڑی ہے اور اس کے حیرت انگیز نتائج بر آمد ہوئے ہیں۔ یہاں واقعات کو جمع کرنا مقصود نہیں ہے۔ میں اصل مدعا کو واضح کرنے کے لیے صرف ایک مثال نقل کروں گا۔

ایک عربی مدرسہ کے کچھ طلبہ مولانا الیاس صاحب کے یہاں حاضری کے لیے نظام الدین گئے۔ اس

میں ایک نہایت شریر طالب علم بھی تھا جس کو اس کے ساتھیوں نے کہہ سن کر وہاں جانے کے لیے راضی کیا تھا۔ جلسے کو تو وہ طالب علم چلا گیا۔ مگر جب رات ہوئی اور لوگ سو گئے تو وہ کچھ ساتھیوں کو لے کر سینما دیکھنے کے لیے دہلی روانہ ہو گیا۔ ان لوگوں کو نظام الدین سے دہلی جانے کے لیے تو بس مل گئی مگر دوسرا شو دیکھ کر جب وہ فارغ ہوئے تو واپسی کے لیے کوئی بس نہیں تھی۔ مجبوراً رات کو یہ لوگ دہلی ہی میں رہ گئے۔

یہاں نظام الدین میں صبح کی نماز کے بعد حسب معمول جب مولانا الیاس صاحب وعظ کے لیے ممبر پر بیٹھے تو انہوں نے کہا —— مدرسہ کے لوگ جو کل شام کو آئے ہیں وہ سب قریب آجائیں "۔ اس وقت وہاں صرف دو طالب علم تھے۔ مولانا نے کہا خیر انتظار کیجیے۔ وہ لوگ شاید ضروریات کے لیے کہیں گئے ہوں واپس آجائیں گے تو گفتگو شروع ہوگی۔ مگر وہ لوگ کافی دیر بعد نظام الدین پہونچے۔ اب ان کا معاملہ مشتبہ ہو گیا نیز بعض ذریعوں سے بھی معلوم ہو گیا کہ وہ لوگ سینما دیکھنے کے لیے دہلی گئے ہوئے تھے۔

اس وقت مذکورہ مدرسہ کے ناظم صاحب بھی نظام الدین میں موجود تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ طلبہ نے یہاں آکر اس قسم کی "بے ہودگی" کی ہے تو وہ سخت برہم ہوئے۔ مذکورہ طالب علم کے بارے میں پہلے ہی سے ان کی رائے خراب تھی۔ کیونکہ وہ مدرسہ میں بری عادتوں کی وجہ سے کافی بدنام تھا۔ وہ اس قدر ڈھیٹ ہو چکا تھا کہ ایک بار مدرسہ کی انجمن کے لیے چندہ وصول کرنے گیا اور اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ۲۰ ہزار روپے چندہ وصول کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر روپیہ ملا تو اس نے پورے روپیہ کی ناولیں خرید ڈالیں اور ان کے پارسل انجمن کے کتب خانہ کے نام روانہ کر دیئے۔ یہاں جب ذمہ داران مدرسہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے بندھے ہوئے بنڈل بازار میں بھجوا دیئے اور انہیں ردی میں فروخت کرا دیا۔

رات کے واقعہ کے بعد یہ سارے واقعات ناظم صاحب کے ذہن میں آگئے۔ اس سے پہلے اس کو سمجھانے بجھانے کی ساری کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ انہوں نے سوچا کہ اب یہ لڑکا ناقابل اصلاح ہو چکا ہے اور مدرسہ کو مزید بدنامی سے بچانے کے لیے اس کا فوراً اخراج ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے مدرسہ کے صدر مدرس کو خط لکھا کہ فلاں طالب علم نے یہاں آکر ہمارے مدرسہ کو سخت بدنام کیا ہے۔ ان کے نام فوراً مدرسہ سے خارج کر دیئے جائیں۔

ادھر جو صاحب اس طالب علم کو کہہ سن کر نظام الدین لوا گئے تھے وہ پریشان ہوئے۔ ان کی سمجھ میں آیا کہ مولانا الیاس صاحب سے یہ تمام بات کہہ دی جائے۔ چنانچہ تنہائی میں حاضر ہو کر انہوں نے مولانا کو پورا واقعہ بتا دیا۔ مولانا نے کہا ٹھیک ہے۔ فکر نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ سب درست فرما دے گا۔ اس کے بعد عصر کی نماز پڑھ کر جب شام کی مجلس ہوئی تو مولانا نے قلم کاغذ اور لفافہ منگوایا۔ اور

مدرسہ کے ناظم صاحب کو قریب بلا کر کہا کہ آپ کے مدرسہ کے صدر مدرس صاحب کے نام ایک خط میں لکھوانا ہوں اس کو لکھیے۔ اس کے بعد انہیں کے ہاتھ سے اس مضمون کا خط لکھوایا کہ "آپ کے مدرسہ کے کچھ لڑکے یہاں آئے۔ میں ان سے بہت خوش ہوں۔ وہ یہاں سے بہت کچھ لے کر جا رہے ہیں۔ میری خصوصی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ اور آپ سے گزارش ہے کہ آپ ان سے اعزاز و اکرام کا معاملہ فرمائیں۔ اس کے بعد ناظم صاحب سے کہا کہ آپ بھی اس پر اپنی تصدیق لکھئے۔ ناظم صاحب نے خاموشی سے تصدیق لکھ دی۔ اور اس کے بعد مولانا نے اپنے ہاتھ سے وہ خط لفافہ میں بند کر کے اپنے خاص آدمی کو دیا کہ جاؤ ڈاک میں ڈال آؤ۔

اس واقعہ کا اتنا زبردست اثر ہوا کہ مدرسہ کا سب سے زیادہ شریر طالب علم وہاں کا سب سے زیادہ شریف اور سنجیدہ طالب علم بن گیا۔ اور تبلیغ کا باقاعدہ کارکن ہو گیا۔ لوگ اس سے پوچھتے کہ تمہاری زندگی میں اتنا زبردست تغیر کیسے ہو گیا تو وہ صرف ایک جملہ کہتا ــــ "مولانا الیاس نے مجھے چھین لیا" جس شخصیت کو مدرسہ کا علم اور ناظم کے اختیارات قابو میں نہیں لا سکے تھے۔ اس کو اخلاق کی طاقت نے مسخر کر لیا۔

اس طرح کے واقعات سے مولانا الیاس صاحب کی زندگی اور تبلیغی تحریک کی تاریخ بھری ہوئی ہے دعا اور محبت، اخلاق اور خیر خواہی نے ہزاروں قلوب کو جیتنے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ تبلیغ کی زبان میں ایک عجیب تسخیری شان پیدا ہو گئی ہے۔ آپ تبلیغ کے کسی بھی جلسے میں شریک ہو کر اس کے مقررین کی تقریریں سنیئے۔ آپ محسوس کریں گے کہ یہاں ایک ایسی زبان استعمال ہو رہی ہے جو ساری تحریکوں سے جدا ہے۔ اس زبان کے اجزا ہیں ــــ سادگی، گھلاوٹ حقیقت رسی، فطرت سے قریب تر استدلال، روح کو مانوس کرنے والا انداز، دل کو چھیدنے والے کلمات، اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تبلیغ کے کارکن، ڈاکٹر اقبال کے الفاظ میں، دل کی راہ سے چلتے ہیں۔ اس لیے خواہ ان کے یہاں عقلی ساز و سامان کم ہو مگر دل والی باتوں کی بہتات ہے اور یہ اس کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

پروگرام

مولانا الیاس صاحب نے اپنے کام کا جو ابتدائی خاکہ بنایا تھا، اس کو وہ چھ نکات کی شکل میں بیان کرتے تھے:

۱۔ کلمۂ اسلام کو دلوں میں بٹھانا۔

۲۔ نماز کو اس کی حقیقی شکل میں قائم کرنا۔
۳۔ دین کا علم سیکھنا۔
۴۔ اکرامِ مسلم۔
۵۔ تفریغ وقت۔ یعنی دنیوی مشاغل سے اپنے وقت کو فارغ کر کے جماعت کی شکل میں باہر نکلنا
۶۔ تصحیح نیت اور اخلاص و احتساب۔

ان چھ نکات کو اگر مزید گھٹایا جائے تو اس کو تین پر تقسیم کیا جا سکتا ہے — کلمۂ توحید، نماز اور تفریغ وقت بقیہ تینوں اجزاء دراصل انہیں چیزوں کے تقاضے ہیں جو ان کو صحیح طور پر اختیار کرنے کے بعد لازماً پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو الگ سے بیان کرنا محض وضاحت کے لیے ہے نہ کہ تعین کے لیے۔

مولانا الیاس صاحب کے اس دعوتی پروگرام کی تشریح مختلف الفاظ میں بیان کی جا سکتی ہے۔ خود مولانا اس کو "حضورؐ کے طریقہ کو زندہ کرنے کی کوشش" کا نام دینا پسند کرتے تھے اور اسی قسم کے الفاظ اور اصطلاحات میں اس کی وضاحت فرماتے تھے۔ بلاشبہ یہ الفاظ آپ کی دعوت کو اس کی اصل حیثیت میں ظاہر کرنے کے لیے موزوں ترین بلکہ محبوب ترین ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو جدید انداز میں سوچتے ہیں اور جنہیں کسی بات کی صداقت کا اسی وقت پورا اطمینان ہوتا ہے جب وہ اس کی تعبیر نفسیاتی، عمرانی یا فلسفیانہ الفاظ میں سن لیں، ان کے ذوق کی رعایت سے بھی اس پروگرام کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

مولانا الیاس صاحب کی دعوت میں کلمۂ توحید کو اولین اور بنیادی حیثیت حاصل ہے — کلمۂ توحید کیا ہے۔ اس بات کا یقین کہ خدا ہی اس کائنات کا مرجع و مولیٰ ہے اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ شخص ہیں جن کے ذریعہ مکمل صداقت کا ظہور ہوا ہے۔ ایک شخص جب لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہتا ہے تو گویا وہ اپنی اس اندرونی کیفیت کا اظہار کرتا ہے کہ اس نے اس یقین کو اپنے دل میں جگہ دی ہے۔ اور زندگی کے اس طریقہ پر آنے کا اعلان کر رہا ہے جو ایک طرف اس یقین کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے کہ خدا ہی حقیقۃً وہ وجود ہے جو انسان کے جذبات اور امنگوں کا مرکز ہے اور وہی وہ ہستی ہے جس پر اس کو سارے معاملات میں بھروسہ اور اعتماد کرنا چاہیے اور دوسری طرف یہ اعلان گویا اس بات کا اظہار ہے کہ آدمی اس احساس سے سرشار ہے کہ وہ زندگی کا راستہ پا چکا ہے اور اسے معلوم ہو چکا ہے کہ سچائی کا سرچشمہ کیا ہے جس کی رہنمائی میں اسے اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے۔

یہ یقین و اعتماد اور یہ شرح صدر ہی دراصل وہ چیز ہے جو سارے انقلابات کی بنیاد ہے۔ دنیا

کے کسی بھی انقلاب کی تاریخ پڑھ لیجئے۔ آپ کو ملے گا کہ اسی قسم کا احساس ـــــ خواہ وہ باعتبار حقیقت صحیح ہو یا غلط ـــــ کچھ لوگوں میں پیدا ہو گیا تھا اور وہی بالآخر تحریک اور انقلاب کا سبب بنا۔ فرانس کا انقلاب، کمیونزم کی کامیابیاں اور مختلف ملکوں میں قومی آزادی کی جدوجہد دراصل اسی قسم کے احساس کی بنیاد پر شروع ہوئی اور اسی کی بنیاد پر جیتی گئی۔ ابتداءً ان میں سے کسی تحریک کے پاس نہ تو ہتھیار تھے نہ مال و دولت کی کثرت، حتیٰ کہ آئندہ بننے والے نظام کا کوئی تفصیلی نقشہ بھی نہیں تھا۔ ان کا اول و آخر سرمایہ بس ایک تخیل تھا جو ان کے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا۔ اور وہ یہ کہ ان پر سیاسی، معاشی یا قومی سچائی کا انکشاف ہوا ہے۔ اس احساس نے ان کے دل و دماغ میں آگ لگا دی، ان کی قوتوں کو مجتمع کیا۔ انہیں مستقبل سے بے پروا کر کے وقت کے خلاف کھڑا کر دیا۔ اور انہیں ایک ایسی مجنونانہ جدوجہد میں لگا دیا جس کا آخری انجام صرف کامیابی ہو سکتا تھا۔

یہ اس یقین کا انجام تھا جو صرف جزئی نوعیت کا تھا اور جس کو ہم صحیح بھی نہیں سمجھتے۔ پھر وہ یقین جو کلی صداقت کی بنیاد پر پیدا ہو اور جو فی الواقع صداقت ہو نہ کہ محض غلط فہمی سے صداقت سمجھ لیا گیا ہو، ایسی صداقت اگر دلوں میں اتر جائے اور ایسے دین کے لیے اگر جنون پیدا ہو جائے تو اس کا کیا انجام ہوگا۔ دوسری تحریکوں نے اگر کسی جغرافی خطہ یا زندگی کے کسی گوشہ کے لیے ذہن کو متحرک کیا ہے تو یہ عقیدہ سارے کرۂ ارض کے لیے انسان کو بے تاب کر دینے والا ہے۔ دوسری تحریکوں کے افراد اگر ملک و قوم کے نام پر توپوں کے دہانے کے آگے کھڑے ہو گئے تو وہ تحریک جس کے افراد مالک کائنات کے اعتماد پر اٹھے ہوں ان کے سیل رواں کو کون روک سکتا ہے۔ دوسری تحریک کے افراد اگر اپنے خودساختہ تخیلات کی برتری سے لوگوں کو مرعوب کر سکتے تھے تو عالم کل اور خالق فطرت کے دیئے ہوئے تصورات میں جہاں گیری کی کیا کچھ طاقت ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا الیاس صاحبؒ امت کو جو کلمہ دینا چاہتے تھے وہی دین کی اصل بنیاد ہے۔ وہ اس زمین کی عظیم ترین طاقت ہے۔ اس بنا پر اس تحریک کو کلمہ کی تحریک کہا جا سکتا ہے۔ مگر ایسا کہنے والوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہر تحریک جو کبھی دنیا میں اٹھی ہے وہ ابتداءً کلمہ ہی کی تحریک تھی خواہ وہ انقلابی تحریک ہو یا غیر انقلابی تحریک۔ اور خواہ اس کا کلمہ سیاسی کلمہ ہو یا معاشی کلمہ یا قومی کلمہ۔ پھر دینی کلمہ کی بنیاد پر اگر کوئی تحریک اٹھے تو اس کو محدود یا ناقص کس بنا پر کہا جا سکتا ہے، جب کہ دینی کلمہ سارے کلمات کا جامع ہے۔

مولانا کی دعوت کا دوسرا جزء نماز ہے۔ عام طور پر لوگ نماز کی حقیقت اور اہمیت کو نہیں

جانتے اس لیے وہ اس کی واقعی عظمت کو نہیں سمجھ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کلمہ کو ذہنی طور پر بنیادی حیثیت حاصل ہے، اسی طرح نماز کا انسان کی عملی زندگی میں بنیادی مقام ہے۔ نماز اپنی اصلی اور اندرونی حقیقت کے اعتبار سے خدا کی طرف متوجہ ہونے اور اس سے حیاتی ربط قائم کرنے کا نام ہے۔ نماز بندے کو اپنے رب سے اس طرح جوڑتی ہے کہ وہ گویا کہ اسے دیکھنے لگتا ہے اور اس سے اس کی سرگوشیاں جاری ہو جاتی ہیں۔ نماز وہ مقام ہے جہاں خدا اپنے بندوں سے ملاقات کرتا ہے۔ جب آدمی نماز کو اس کے سارے ارکان کے ساتھ ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے اور دل و دماغ کی پوری یکسوئی کے ساتھ اس میں مشغول ہوتا ہے تو وہ ایک اور ہی دنیا میں پہونچ جاتا ہے۔ اس کی روح ایک ایسے تجربے سے دوچار ہوتی ہے جہاں عبدیت اور معبودیت کی حدیں ملنے لگتی ہیں۔ بندگی، خدائی کے جلووں میں نہا اٹھتی ہے۔

یہ تجربہ انسان کی شخصیت کو ایک نئی جلا دیتا ہے اور اس کو ایسی عجیب و غریب نعمتیں عطا کرتا ہے جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن میں نماز کی حقیقت کی مکمل تفصیل ہے۔ یہاں میں مختصراً چند کا ذکر کرتا ہوں۔

ان میں سے ایک چیز وہ ہے جس کو قرآن میں "خشوع" کہا گیا ہے۔ خشوع کے معنی ہیں فروتنی عاجزی اور جھکاؤ۔ نماز کی شکل میں آدمی جب خدا کے سامنے حاضر ہوتا ہے اور اس کو یاد کرتا ہے تو خدا کی خدائی اور اپنی بندگی کا احساس اس پر اس طرح طاری ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک قسم کی عاجزی اور فروتنی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسا وجود سمجھنے لگتا ہے جو خدا کے سامنے ہمیشہ جھکا رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر سے کبر نکل جاتا ہے جو اکثر برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ کمزور کے اوپر طاقت ور کا ظلم، ماتحت کے اوپر افسر کا برا سلوک، قانونی طور پر بہتر پوزیشن والے کا قانونی طور پر کمتر پوزیشن والے کو دبانا، صاحب اثر شخص کا بے اثر اشخاص کو خاطر میں نہ لانا، صاحب مال کا بے مال لوگوں سے بے اعتنائی برتنا، اکثریت کے افراد کا اقلیت کے افراد کو لوٹنا، غرض جب بھی کوئی زور آور آدمی بے زور افراد کو تختۂ مشق بناتا ہے تو ایسی تمام صورتوں میں ہمیشہ کبر ہی اس کی خاص وجہ ہوتی ہے۔ اگر کسی معاشرے کے افراد میں کبر کا خاتمہ ہو جائے تو بے شمار برائیوں کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔

نماز کا دوسرا فائدہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ـــــ "وہ برائیوں اور بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے"۔ نماز میں آدمی اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے، وہ اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ خدا کا تابعدار بن کر زندگی گزارے گا، وہ اس آنے والے دن کو یاد کرتا ہے جب اس کی زندگی

احساب ہوگا اور عذاب وثواب کی ترازو قائم کی جائے گی۔ یہ سب باتیں اگر سچے دل سے ہوں تو زندگی کو دل دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔

نماز کا ایک اور اہم ترین پہلو وہ ہے جس کو "ذکر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے خدا کی یاد سے دل کا معمور رہنا اس طرح نماز گویا اس بات کے لیے آدمی کو تیار کرتی ہے کہ اس کے دل ودماغ ان صحیح ترین خیالات سے بھرے رہیں جو حقیقتہً کسی کے ذہن وقلب میں ہونے چاہئیں۔ یہ فکر اور جذبات کی اعلاترین تربیت ہے۔

یہ نماز کے وہ نتائج ہیں جو نفسیاتی اور سماجی پہلو رکھتے ہیں اور جن کے اثرات معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ نماز کی اصلی حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ خدا کے آگے اپنا سر رکھ دے اور اس کا دل کہہ رہا ہو ——— "خدایا میں تیرا ہوگیا۔ تو بھی میرا ہو جا۔"

مولانا کی دعوت کا تیسرا جز "تفریغ وقت" ہے۔ اس کام کے لیے "چلّہ" کا لفظ سن کر بعض لوگوں کو توحش ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ صرف ایک اعتباری مدت ہے جو تربیت اور دعوت کی اس دوگونہ مہم کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ تفریغ وقت دراصل اس حقیقت کا مظہر ہے کہ آدمی اپنے عقیدے میں اتنا بے تاب ہو چکا ہے کہ اس کے لیے اپنی مصروفیتوں کو چھوڑ کر گھر سے باہر نکل پڑا ہے۔ ایمان کے ساتھ تبلیغ کا سودا بھی اس کے سر میں سما گیا ہے، وہ اپنے درد کو سارے عالم کا درد بنا دینا چاہتا ہے۔ یہ کیفیت جب عملی شکل اختیار کرتی ہے تو تبلیغ کی اصطلاح میں اسی کا دوسرا نام وقت فارغ کرنا یا اس کی ایک مقرر مدت کا نام چلّہ ہے۔

مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے گشت اور تبلیغی سفر کے طریقے پر جو اس قدر زور دیا اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے اندر تبلیغی فائدوں کے علاوہ بہت سے تعلیمی تربیتی اور اصلاحی فائدے بھی چھپے ہوئے ہیں۔ آدمی جب تبلیغ کی راہ میں دور دور کے سفر پر نکلتا ہے تو وہ دین سیکھتا ہے اپنی اخلاقی اصلاح کرتا ہے، لوگوں کی حالت دیکھ کر اپنے اندر دینی کام کی اہمیت کا احساس پیدا کرتا ہے قربانیاں اور مشقتیں اس کے اندر وہ سوز اور تڑپ پیدا کرتی ہیں جس کے بعد ایک طرف وہ دین داری کی حقیقی لذت سے آشنا ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کی زبان سے نکلے ہوئے تبلیغی کلمات میں جان پڑ جاتی ہے۔

لوگوں کو باہر نکالنا مولانا الیاس صاحبؒ کے دینی طریق کار کی جان ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے یہ موقع ملتا ہے کہ لوگوں کو ان کے ماحول سے نکال کر ایک دینی ماحول میں پہونچایا جائے اور اس کے

ان کے اوپر تبلیغ کی جائے تاکہ وہ خالی الذہن ہو کر دین کی باتیں سنیں اور مختلف ماحول میں جاکر اس کا
ائل کرنے کے بجائے مسلسل اس سے اثر لیتے رہیں۔ یہ طریقہ عملی طور پر کافی مفید ثابت ہوا ہے اور
ہے ایسے نتائج نکلے ہیں کہ وہ لوگ جنہوں نے قریب سے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی وہ اس
تصور بھی نہیں کر سکتے۔

تبلیغ کے لیے نکلنا، حدیث کے الفاظ میں، اپنے قدموں کو دین کی راہ میں گرد آلود کرنا ہے۔ اور
یث میں آیا ہے کہ جو قدم دین کی راہ میں گرد آلود ہوں، ان کو دوزخ کی آگ کبھی نہ چھوئے گی۔ سرکس
بعض آدمی یہ کرتب دکھاتے ہیں کہ وہ آگ کے الاؤ میں جسم کو دپڑتے ہیں اور ان پر آگ کا کچھ اثر نہیں
ا۔ یہ لوگ اپنے جسم پر خاص طرح کی مالش کر لیتے ہیں۔ اس مالش کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ آگ انہیں
و نہیں سکتی۔ اسی طرح دین کی راہ کی گرد وہ چیز ہے جو دوزخ کی آگ کو بے اثر کر دینے والی ہے۔ جس
کے اوپر یہ گرد پڑ گئی وہ گویا دوزخ کی آگ سے محفوظ ہو گیا۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مولانا الیاس صاحب یا ان کے پیرووں کے نزدیک تبلیغ کا گشت بذات خود وہ
ز ہے جس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس سے مراد کسی خاص گروہ کا گشت نہیں بلکہ
ین کا گشت ہے۔ کسی کا گشت اسی وقت اس حدیث کا مصداق بنے گا جب کہ وہ حقیقۃً دین کا گشت
، اور جتنا زیادہ وہ دین کے لیے ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کا مصداق ہوگا اور دین سے اس کا تعلق
متنا کم ہوگا اتنا ہی اس کا مصداق ہونا مشتبہ ہوتا چلا جائے گا۔ کسی خاص گروہ سے نسبت اس کو حدیث
کا مصداق نہیں بنا سکتی۔

مولانا الیاس صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا:

"ہمارے طریق کار میں دین کے واسطے جماعتوں کی شکل میں گھروں سے دور نکلنے کو بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس کا خاص فائدہ یہ ہے کہ آدمی اس کے ذریعہ اپنے دائمی اور جامد ماحول سے نکل کر ایک نئے صالح اور متحرک ماحول میں آجاتا ہے۔ جس میں اس کے دینی جذبات کے نشو و نما کا بہت کچھ سامان ہوتا ہے۔ نیز اس سفر و ہجرت کی وجہ سے جو طرح طرح کی تکلیفیں مشقتیں پیش آتی ہیں اور دربدر پھرنے میں جو ذلتیں اللہ کے لئے برداشت کرنی ہوتی ہیں ان کی وجہ سے اللہ کی رحمت خاص طور سے متوجہ ہو جاتی ہے۔"

وسیع تصور

مولانا الیاس صاحب نے اپنے زمانہ میں تبلیغ کا کام جس ڈھنگ سے چلایا تھا، اس کے متعلق

مولانا فرماتے تھے کہ ــــ "یہ تبلیغ کی الف ب ہے" اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ الف ب کوئی الگ چیز ہوتی ہے اور و۔ ہ۔ ی کوئی دوسری چیز۔ حقیقت یہ ہے کہ جو الف۔ ب ہے وہی و۔ ہ۔ ی بھی ہے۔ مگر جن لوگوں کی نگاہیں ظواہر پر ہوتی ہیں اور جو لوگ حقائق کا ان کی گہرائیوں کے ساتھ مشاہدہ نہیں کرسکتے۔ ان کو بتانا پڑتا ہے کہ قطرہ کس طرح پھیل کر بحر بیکراں بنتا ہے۔ قطرہ ہی کا دوسرا نام بحر بیکراں بھی ہے۔ مگر عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قطرہ کوئی دوسری چیز ہے اور بحر بے کراں کوئی اور چیز۔

مولانا الیاس صاحب کے اس قول کو اس مثال کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے جیسے کوئی ڈرائیور اسٹیم تیار کر رہا ہو۔ اور وہ کہے کہ یہ تو میرے کام کی الف بے ہے۔ اسٹیم تیار کرنا ایک لحاظ سے کام کی الف ہے اور ایک لحاظ سے وہی سارا کام ہے۔ کیونکہ اسٹیم کے بغیر نہ انجن چل سکتا ہے اور نہ گاڑی حرکت میں آسکتی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اسٹیم کے بغیر کوئی انجن اپنی منزل پر نہیں پہونچ سکتا بلکہ اس کے بغیر دو قدم چلنا بھی اس کے لیے ناممکن ہے۔

کام کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے ہی دن از اوّل تا آخر کام کا پورا خاکہ بنا لیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس اصل بنیاد کو پکڑ لیا جائے جو دوسرے تمام اجزا کے لیے اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔ پہلا طریقہ پارلیمنٹ کی قانون سازی کا ہے اور دوسرا تحریک کا۔ پارلیمنٹ کا اصول اگر تحریک کے لیے اختیار کیا جائے تو اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کے ساتھ اسی اصول کے تحت معاملہ کیا کہ آغاز نبوت میں دین کی صرف بنیادی باتوں کی تعلیم دی گئی اور لمبی مدت تک اسی پر سارا زور دیا جاتا رہا۔ اس کے بعد جیسے جیسے حالات آگے بڑھتے گئے، بقیہ چیزیں نازل کی جاتی رہیں۔

اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اصل اساس مضبوط ہوجاتی ہے۔ اور اساس کی مضبوطی کے بغیر کوئی بھی عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلامی عقیدہ کی رو سے ہر کام کی توفیق خدا ہی سے ملتی ہے۔ ذاتی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی، ان پر عمل کرنے میں آدمی اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب اس کے ساتھ خدا کی توفیق بھی شامل حال ہوجائے۔

مولانا الیاس صاحب نے ایک مرتبہ اس سوال پر کلام کرتے ہوئے کہ "مسلمانوں کو حکومت واقتدار کیوں نہیں بخشا جاتا:" فرمایا:

اللہ کے احکام اور اوامر ونواہی کی حفاظت ورعایت (جو) تم اپنی ذات اور اپنی منزلی زندگی میں نہیں کررہے ہو (جس پر تمہیں اختیار حاصل ہے اور کوئی مجبوری نہیں ہے)

تو دنیا کا نظم و نسق کیسے تمہارے حوالے کردیا جائے۔ ایمان والوں کو حکومت ارضی دینے سے تو منشاء الٰہی یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی مرضیات اور اس کے احکام کو دنیا میں نافذ کریں تو تم جب اپنے حدود اختیار میں آج یہ نہیں کر رہے ہو تو دنیا کی حکومت تمہارے سپرد کرکے کل کے لیے تم سے اس کی کیا امید کی جاسکتی ہے"

تبلیغ میں قلم

ایک نیاز مند سے (جن کو مولانا کے تبلیغی کام سے بھی تعلق تھا اور اس کے علاوہ تحریر و تصنیف ان کا خاص مشغلہ تھا) ایک دن مولانا نے فرمایا — "میں اب تک اس کو پسند نہیں کرتا تھا کہ اس تبلیغی کام کے سلسلے میں کچھ زیادہ لکھا پڑھا جائے اور تحریر کے ذریعہ اس کی دعوت دی جائے۔ بلکہ میں اس کو منع کرتا رہا۔ لیکن اب میں کہتا ہوں کہ لکھا جائے اور تم بھی خوب لکھو۔ مگر یہاں کے فلاں فلاں کام کرنے والوں کو میری یہ بات پہونچا کر ان کی رائے بھی لے لو" چنانچہ ان نامزد حضرات کو مولانا کی بات پہونچا کر مشورہ طلب کیا گیا۔ ان صاحبان نے اپنی رائے یہ ظاہر کی کہ اس بارے میں اب تک جو طرز عمل رہا ہے، وہی اب بھی رہے، ہمارے نزدیک یہی بہتر ہے۔

اس کے بعد مولانا کو یہ بات پہونچائی گئی۔ مولانا نے دوبارہ فرمایا — "ہم پہلے بالکل کس مپرسی کی حالت میں تھے۔ کوئی ہماری بات سنتا نہیں تھا۔ اور کسی کی سمجھ میں ہماری بات آتی نہیں تھی۔ اس وقت یہی ضروری تھا کہ ہم خود ہی چل پھر لوگوں میں پہلے طلب پیدا کریں۔ اور عمل سے اپنی بات سمجھائیں اس وقت اگر تحریر کے ذریعے عام دعوت دی جاتی تو لوگ کچھ کا کچھ سمجھتے۔ اور اپنے سمجھنے کے مطابق ہی رائے قائم کرتے اور اگر بات کچھ دل کو لگتی تو اپنی سمجھ کے مطابق کچھ سیدھی کچھ الٹی اس کی عملی تشکیل کرتے اور پھر جب نتائج غلط نکلتے تو ہماری اسکیم کو ناقص کہتے۔ اس لیے ہم یہ بہتر نہیں سمجھتے تھے کہ لوگوں کے پاس تحریر کے ذریعہ ہماری دعوت پہونچے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی مدد سے اب حالات بدل چکے ہیں۔ ہماری بہت سی جماعتیں ملک کے اطراف میں نکل کر کام کا طریقہ دکھلا چکی ہیں۔ اور اب لوگ ہمارے کام کے طالب بن کر خود ہمارے پاس آتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو اتنے آدمی دے دیئے ہیں کہ اگر مختلف اطراف میں طلب پیدا ہو اور کام سکھانے کے لیے جماعتوں کی ضرورت ہو تو جماعتیں بھیجی جاسکتی ہیں۔ تو اب ان حالات میں بھی کس مپرسی والے ابتدائی زمانہ ہی کے طریقہ کار کے ہر ہر جزء پر جمے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ تحریر کے ذریعے بھی دعوت دینی چاہیئے"

بعض مواقع پر مولانا نے اس کا بھی اظہار فرمایا کہ اس وقت جس قسم کے کارکن ہمارے گرد جمع ہیں

اس کے مطابق کام ہو رہا ہے، اور دوسری دوسری صلاحیتوں والے لوگ آئیں تو کام میں مزید اضافہ ہو۔

قلم کے ذریعہ کے بارے میں مولانا کے جو خیالات تھے، ان کو غالباً حسب ذیل طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ کوئی تحریک جب نئی نئی شروع ہوتی ہے تو ایک اہم مسئلہ اس کے صحیح تعارف کا ہوتا ہے اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ داعی کی زبان بذات خود زیادہ سے زیادہ تعارف کا ذریعہ بنے۔ مگر ایک وقت آتا ہے جب دعوت ساری فضا میں گونج اٹھتی ہے اور اس کی صدا سے سارا ماحول آشنا ہو جاتا ہے۔ اس وقت غلط تعارف کا اندیشہ بہت کم ہو جاتا ہے۔ کچھ الفاظ اصطلاح عام بن کر لوگوں کے ذہنوں میں جگہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس وقت مقرر یا محرر کے الفاظ ہی دعوت کے تعارف کا کام نہیں کرتے بلکہ ان کے ساتھ سننے والے کا اپنا وہ ذہن بھی شامل ہو جاتا ہے جو پہلے سے اس دعوت کے بارے میں ایک تعارف سے آشنا ہو چکا ہے۔ جب کوئی تحریک اس دوسرے مرحلہ پر پہونچ جائے تو ان ابتدائی تحفظات کی ضرورت نہیں رہتی جو دعوت کے آغاز میں ضروری سمجھے گئے تھے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر تحریک کے لیے کام کرنے کے سیکڑوں پہلو ہوتے ہیں۔ مگر عملی طور پر تحریک انھیں کاموں میں حصہ لیتی ہے جس کے لیے اس کے پاس کارکن موجود ہوں۔ ایسا کام جس کے لیے کارکن ہی حاصل نہ ہوں اس کو چھیڑنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ مولانا الیاس صاحب کا کام ابتداءً جس نقشہ کے مطابق چلا، ایک لحاظ سے اگرچہ اس کی اہمیت یہ تھی کہ وہ بنیادی اور اصلی کام تھا، مگر اس کے ظاہری ڈھانچہ میں اس واقعہ کا بھی دخل تھا کہ اس وقت جس نوعیت کے کارکن فراہم ہوئے وہ اسی ڈھنگ سے کام کو چلا سکتے تھے۔ اب اگر تحریک کو پھیلاؤ حاصل ہو جائے تو کام میں بھی اسی نسبت سے پھیلاؤ ہو جائے گا جیسا کہ کارکنوں کی اقسام میں پھیلاؤ ہوا ہے۔

۳۔ مولانا نے ایک مرتبہ بہت قیمتی بات فرمائی — آپ نے فرمایا کہ ایک طریقہ دین کی عمومی تعلیم و تربیت کا ہے۔ اور دوسرا طریقہ وہ ہے جو "ضرورت حادثہ" کے تحت پیدا ہوتا ہے۔ پہلا جو طریقہ ہے وہ دورِ نبوت میں ملتا ہے اور عمومی تعلیم و تربیت اسی طریقہ پر ہونی چاہیے۔ دوسرا طریقہ حالات و ماحول کی رعایت سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں پہلے طریقہ میں دوامی قدر ہے اور دوسرے طریقہ میں زمانی قدر۔

مولانا کے اسی ملفوظ کی روشنی میں ہم تصنیف و اشاعت کے کام کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر

کو سمجھ سکتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں تصنیف و تالیف کی بے حد اہمیت ہوگئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج علمی سطح پر جو مسائل چھڑے ہوئے ہیں ان کو صحیح طور پر کتابی شکل ہی میں ایک دوسرے کے سامنے لایا جا سکتا ہے۔ دور عباسیہ میں یونانی علوم کی اشاعت سے اسلام کے لیے بہت سے ذہنی مسائل پیدا ہوئے جن کے جواب کے لیے علم کلام ایجاد ہوا اور علماء نے قلم کے ذریعہ ان کا جواب دیا۔ اسی طرح دور جدید میں افکار و خیالات کا ایک نیا سیلاب امنڈ آیا ہے جو مختلف پہلوؤں سے اسلام کو چیلنج کر رہا ہے۔ ہمیں اسلام کی طرف سے اس کا جواب فراہم کرنا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فکر اس کام کی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کرتا ہے۔ البتہ ان کے الفاظ میں اس کام کو ضرورتِ حادثہ کے تحت پیدا شدہ کام سمجھنا چاہیے نہ کہ اس کو اصلی اور عمومی کام سمجھ لیا جائے۔

اسی طرح ضرورت حادثہ کی اور بہت سی اقسام ہو سکتی ہیں مگر سب کا استقصار یہاں مقصود نہیں۔ (۱۳۸۶ھ)

اعلان

اوپر کا مضمون ان چند مضامین میں سے ایک ہے جو ۱۵۔ ۲۰ سال پہلے لکھے گئے تھے۔ ان مضامین کا مجموعہ ایک کتاب کی صورت میں زیر طبع ہے جو انشاء اللہ جلد ہی "تبلیغی تحریک" کے نام سے شائع کیا جائے گا۔

ادارۃ الرسالہ

خبر نامہ اسلامی مرکز۔ ۷

کیسٹ میگزین کی بابت اس سے پہلے اعلان کیا جا چکا ہے۔ اس سلسلہ کا نام "الرسالہ کیسٹ" ہوگا۔ انشاء اللہ یکم مئی ۱۹۸۵ سے اس کی روانگی شروع ہوگی۔ اس کے بعد ہر انگریزی مہینہ کی پہلی تاریخ کو اس کی روانگی ہوتی رہے گی۔ یہ ماہانہ کیسٹ صدر اسلامی مرکز کی تقریروں پر مشتمل ہوگا۔ ہر کیسٹ میں موصوف کی دو تقریریں ۳۰۔۳۰ منٹ کی ہوں گی۔

۲. ۲۶ جنوری ۱۹۸۵ کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔ حسب معمول مرکز میں ماہانہ اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۸۲ پر درس دیتے ہوئے بتایا کہ یہ آیت اس بات کا زبردست ثبوت ہے کہ قرآن خدا کی طرف سے آئی ہوئی کتاب ہے۔ اس سلسلہ میں موصوف نے بہت سی علمی اور سائنسی دلیلیں پیش کیں۔ اس درس کا ٹیپ مرکز میں محفوظ ہے۔

۳. یکم فروری ۱۹۸۵ کو میرواعظ مولانا محمد فاروق کشمیری اسلامی مرکز میں آئے۔ صدر اسلامی مرکز سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ماہنامہ الرسالہ میں پابندی سے پڑھتا ہوں۔ انھوں نے مرکز کی تمام مطبوعات کا ایک سٹ فرمائش کر کے حاصل کیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی تحریروں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تخلیقی ہوتی ہیں۔ جب کہ عام طور پر اسلام پر لکھنے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ نقل اور روایتی تکرار سے زیادہ کوئی چیز نہیں پیش کر پاتے۔ مرکز کے مختلف شعبوں کا معائنہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہاں ہر کام جدید معیار کے مطابق کیا جا رہا ہے۔

۴. ۸ فروری ۱۹۸۵ کو پروفیسر آگوانی (ریکٹر جواہر لال نہرو یونی ورسٹی نئی دہلی) مرکز میں آئے اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک صدر اسلامی مرکز سے تبادلہ خیال کیا۔ انھوں نے الرسالہ باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ ان کی فرمائش پر اسلامی مرکز کی مطبوعات انھیں پیش کی گئیں۔

۵. جو نئی کتابیں اس وقت زیر طبع ہیں ان میں سے ایک "سوشلزم اور اسلام" ہے۔ یہ کتاب ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے چار حصے ہیں۔ اس میں سوشلزم کا فکری و عملی جائزہ اور اسلام اور سوشلزم کا تقابل ہے۔ نیز معاشی مسئلہ کا فطری اور اسلامی حل بیان کیا گیا ہے۔ دوسری زیر طبع کتاب "اسلامی زندگی" ہے۔ یہ سیرت اور احادیث اور آثار پر مشتمل ہے اور عمومی سطح پر اشاعت دین کے لئے تیار کی گئی ہے۔

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

April 1985
Number 101

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاء اسلام	15/-
پیغمبر انقلاب	25/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	3/-
اسلام دین فطرت	3/-
تعمیر ملت	[illegible]
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	[illegible]
عقلیات اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-
اتحاد ملت	3/-

سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبر اسلام	3/-
آخری سفر	3/-
حقیقت حج	2/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-

تعارفی سٹ

[illegible]یا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیات طیبہ	3/-
باغ جنت	3/-
نار جہنم	3/-

English Publications

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

روزہ کا مطلب اللہ کیلئے اپنی خواہشوں پر روک لگانا ہے
خواہ روک لگانے کی یہ فہرست
کھانے پینے جیسی ضروری چیزوں تک پہنچ جائے

مئی ۱۹۸۵
شمارہ ۱۰۲

اردو ، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

مئی ۱۹۸۵ □ شمارہ ۱۰۲

قیمت فی پرچہ	۳ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دو سو روپے
بیرونی ممالک سے :	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لیے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے
بنک ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی
لکھیں AL RISALA MONTHLY

ماہنامہ الرسالہ
سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک گزارش

اسلامی مرکز کی ابتدا ۱۹۷۰ میں ہوئی۔ پچھلے پندرہ سال کے عرصے وہ نہایت خاموشی کے ساتھ دعوت الی اللہ اور تعمیر ملت کے کام میں مصروف ہے۔ اردو اور انگریزی میں ماہنامہ الرسالہ جاری ہے اور ہندی اور دوسری زبانوں میں اس کے اجراء کی کوششیں جاری ہیں۔ مکتبہ الرسالہ کے تحت کئی درجن کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے ذرائع دعوت کو بھی حسب حالات استعمال کیا جا رہا ہے۔

کام میں اضافہ کے ساتھ بہت سی نئی ضرورتیں بھی سامنے آگئی ہیں۔ مثلاً پرنٹنگ پریس کا قیام دارالترجمہ، تعلیمی و تربیتی درس گاہ، دوسری ملکی زبانوں میں الرسالہ کا اجراء اور کتابوں کی اشاعت، مختلف مقامات پر فارغ کارکن مقرر کرنا وغیرہ

موجودہ کام کو چلانے اور دوسرے منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لئے کثیر وسائل کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں ہم آپ سے مالی تعاون کی اپیل کرتے ہیں۔

رقم بھیجتے وقت یہ ضرور صراحت فرما دیں کہ وہ کس مد کی رقم ہے۔

وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۳

خدا سے ڈرو

قرآن، جیساکہ معلوم ہے، ۲۳ سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے اترا۔ اس کا آغاز اقرأ (پڑھ) سے ہوا۔ پیغمبر کے واسطے سے خدا انسان کو پڑھاتا رہا۔ وہ انسان کو اس کی زندگی کی تعمیر کے بارہ میں وہ تمام باتیں بتاتا رہا جس کو وہ خود سے نہیں جان سکتا تھا۔

اس طرح خدا کتاب ہدایت کے اجزا بھیجتا رہا۔ یہاں تک کہ خدائی منصوبہ کے مطابق جب کتاب پوری ہوگئی تو اس کی آخری آیت اتری۔ یہ ایک لمبی آیت ہے جو موجودہ قرآن میں سورہ مائدہ کی تیسری آیت کے طور پر شامل ہے۔ اس آیت کا ایک حصہ یہ ہے:

اليوم يئس الذين كفروا من دينكم فلا تخشوهم واخشون اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا (المائدہ ۳)	آج منکرین تمہارے دین سے ناامید ہوگئے، پس ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنے انعام کو پورا کر دیا۔

اس آیت سے مسلمانوں نے اپنے لئے فخر کی غذا تو بہت لی ہے مگر اس سے انھوں نے سبق کی غذا نہیں لی۔ ہر مسلمان آپ کو یہ فخر کرتا ہوا ملے گا کہ ہمارا دین کامل ہے۔ مگر ایسے لوگ آپ کو نہیں ملیں گے جو اس سے اس سبق کو لینے کی کوشش کریں جو اس آیت میں ہمارے لئے رکھ دیا گیا ہے۔

"تم اب لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ صرف خدا سے ڈرو" اس سے یہ متعین ہو رہا ہے کہ مسائل میں مسلمانوں کے سوچنے کا انداز کیا ہونا چاہئے۔ وہ یہ ہونا چاہئے کہ مسلمان اپنے مسائل و مشکلات میں انسان کی طرف نہ دیکھیں بلکہ خدا کی طرف دیکھیں۔

انسانوں کی طرف سے معاملہ پیش آئے تب بھی وہ خدا کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ وہ خدا کے ساتھ اپنے معاملہ کو درست کر کے سمجھیں کہ انسانوں کے ساتھ بھی ان کا معاملہ درست ہو جائے گا۔

پیغمبر اسلام کا لایا ہوا دین چونکہ آخری دین ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو اس حد تک محفوظ اور مستحکم کر دیا ہے کہ کوئی اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔ مسلمان اگر اپنے دین پر قائم ہوں تو یہی ان کے استحکام کی یقینی ضمانت بن جائے۔

محرومی

فرانس میں سحر ونجوم تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۹۸۴ میں فرانس کے جن شہریوں نے ساحروں اور جوتشیوں سے رجوع کیا ان کی تعداد تقریباً آٹھ ملین ہے۔ یعنی فرانس کے ہر چار آدمیوں میں سے ایک آدمی۔

فرانس میں جوتش اور غیب دانی باقاعدہ تجارتی پیشہ بن گئے ہیں۔ چنانچہ ٹیکس کے محکمہ کے مطابق پچاس ہزار افراد باقاعدہ محکمۂ ٹیکس میں اس اعتبار سے رجسٹرڈ ہیں۔ یہ تعداد فرانس میں پادریوں یا ڈاکٹروں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ ان لوگوں کی آمدنی ۵۰۰ ملین سے لے کر ۶۰۰ ملین ڈالر سالانہ تک ہوتی ہے۔

اے ایف پی نے پیرس سے رپورٹ دیتے ہوئے کہا ہے کہ:

With the deepening economic recession, more and more people are turning to the occult for relief for their physical and psychological ailments.

گہرے اقتصادی بحران کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ لوگ اپنی جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں کے لئے غیب دانوں سے رجوع کر رہے ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۵ مارچ ۱۹۸۵)

انسان کو بار بار یہ تجربہ ہوتا ہے کہ ظاہری مادی اسباب اس کا سہارا بننے کے لئے ناکافی ہیں۔ وہ معلوم اسباب سے مایوس ہو کر نامعلوم اسباب کی طرف دوڑتا ہے۔ مگر نامعلوم اسباب کی تلاش میں کسی انسان کا سہارا پکڑنا سراسر بے حقیقت ہے۔ یہ ایسی چیز کا سہارا پکڑنا ہے جس کے اندر سہارا بننے کی طاقت نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا سہارا صرف ایک ہے۔ اور وہ خدا ہے۔ مادی اسباب کی بے مائگی اس لئے تھی کہ آدمی خدا کی طرف رجوع کرے۔ مگر مادی اسباب کے عجز کا تجربہ اس کو ایک اور عاجز کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ حقیقت کا سراغ پانے کے بعد آدمی دوبارہ حقیقت کو کھو دیتا ہے۔

غیر حقیقی اضافہ

ایک مغربی ملک کے ایک ادارہ نے ایک اشتہار شائع کیا۔ اس کو ایک خاتون کارکن کی ضرورت تھی۔ ادارہ کو خاتون کے اندر جو مختلف صفات درکار تھیں ان میں سے ایک صفت اس کا خاص اور متعین قد بھی تھا۔

اشتہار کی اشاعت کے بعد ادارہ کے پاس بہت سی درخواستیں آئیں۔ جانچ ہوئی تو ایک خاتون تمام مطلوبہ اوصاف میں غیر معمولی طور پر پوری ہوتی چلی گئی۔ تاہم قد کے معاملہ میں وہ نامنظور کر دی گئی اس کا قد مطلوبہ لمبائی سے آدھ انچ کم تھا جس کو اس نے اپنے جوتے کی ہیل میں آدھ انچ اونچائی کا اضافہ کر کے پورا کیا تھا۔ ججوں نے لکھا:

> غیر نارمل ہونا ہر حال میں ناقابل قبول ہے۔ خواہ وہ قد کے آدھ انچ کم ہونے میں ہو یا ہیل کے آدھ انچ زیادہ ہونے میں۔

یہ چھوٹا سا واقعہ زندگی کے ایک قانون کو بتاتا ہے۔ یہ قانون کہ غیر حقیقی چیز میں اضافہ حقیقی چیز میں کمی کا بدل نہیں ہے۔ اگر آپ کا اپنا "جسم" چھوٹا ہے تو "اسٹیج" کو اونچا کر کے آپ کبھی بلندی کا مقام حاصل نہیں کر سکتے۔

جب بھی آدمی زندگی کی دوڑ میں پیچھے ہو جائے تو اس کی وجہ ہمیشہ اپنی کوئی کمی ہوگی۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اس کمی کو جانے۔ وہ اپنی ساری توجہ اپنی کمی کو دور کرنے میں لگا دے۔ اپنی کمی کو دور کر کے دوبارہ آدمی اپنے کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کر سکتا ہے۔ مگر دوسری باتوں پر ہنگامہ کھڑا کر کے وہ صرف وقت کو ضائع کرتا رہے گا۔

اگر آپ کارکردگی میں کم ہوں تو مطالبات میں اضافہ سے آپ اس کی تلافی نہیں کر سکتے۔ اگر آپ منصوبہ بندی میں کم ہوں تو شور وغل میں زیادتی سے آپ اس کی تلافی نہیں کر سکتے۔ اگر آپ معنویت میں کم ہوں تو آپ الفاظ میں اضافہ سے اس کی تلافی نہیں کر سکتے۔ اگر آپ مقابلہ کی دوڑ میں پیچھے ہو گئے ہوں تو احتجاج اور شکایت میں اضافہ سے آپ زندگی کی اگلی صفوں میں جگہ نہیں پا سکتے۔

ایک حقیقی کمی صرف حقیقی چیز سے پوری ہو سکتی ہے نہ کہ کسی غیر حقیقی اور غیر متعلق چیز سے۔

بائبل کی زبان سے

رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ درخت کاٹ ڈالو اور یروشلم کے مقابل دمدمہ باندھو
یہ شہر سزا کا سزاوار ہے۔ اس میں ظلم ہی ظلم ہے۔ جس طرح پانی چشمہ سے پھوٹ نکلتا ہے اسی طرح
شرارت اس سے جاری ہے۔ ظلم اور ستم کی صدا اس میں سنی جاتی ہے۔ اے یروشلم تربیت پذیر ہو، تا نہ
ہو کہ میرا دل تجھ سے ہٹ جائے۔ نہ ہو کہ میں تجھے ویران اور غیر آباد زمین بنا دوں۔

رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ دیکھ، ان کے کان نامختون ہیں۔ اور وہ سن نہیں سکتے۔ دیکھو
خداوند کا کلام ان کے لئے حقارت کا باعث ہے۔ وہ اس سے خوش نہیں ہوتے۔ اس لئے میں خداوند
کے قہر سے لبریز ہوں۔ ان کے گھر کھیتوں اور بیویوں سمیت اوروں کے ہو جائیں گے کیونکہ خداوند
فرماتا ہے میں اپنا ہاتھ اس ملک کے باشندوں پر بڑھاؤں گا۔ اس لئے کہ چھوٹوں سے بڑوں تک سب
کے سب لالچی ہیں۔ اور نبی سے کاہن تک ہر ایک دغا باز ہے۔ کیوں کہ وہ میرے لوگوں کے زخم کو
یوں ہی سلامتی سلامتی کہہ کر اچھا کرتے ہیں حالاں کہ سلامتی نہیں ہے۔

خداوند یوں فرماتا ہے کہ راستوں پر کھڑے ہو اور دیکھو اور پرانے راستوں کی بابت
پوچھو کہ اچھی راہ کہاں ہے۔ اسی پر چلو اور تمہاری جان راحت پائے گی۔ پر انہوں نے کہا کہ ہم اس پر
نہ چلیں گے۔

اس سے کیا فائدہ کہ سبا سے لوبان اور دور کے ملک سے اگر میرے حضور لاتے ہیں۔ تمہاری
سوختنی قربانیاں مجھے پسند نہیں۔ اور تمہارے ذبیحوں سے مجھے خوشی نہیں۔ اس لئے خداوند یوں
فرماتا ہے کہ دیکھ میں ٹھوکر کھلانے والی چیزیں ان لوگوں کی راہ میں رکھ دوں گا۔ اور باپ اور بیٹے باہم
ان سے ٹھوکر کھائیں گے۔ ہمسایہ اور ان کے دوست ہلاک ہوں گے۔ میدان میں نہ نکلنا اور سڑک پر نہ
جانا، کیوں کہ ہر طرف دشمن کی تلوار کا خوف ہے۔

وہ سب کے سب نہایت سرکش ہیں۔ وہ غیبت کرتے ہیں۔ وہ تو تانبہ اور لوہا ہیں۔ وہ سب
کے سب معاملہ کے کھوٹے ہیں۔ دھونکنی جل گئی۔ سیسہ آگ سے بھسم ہو گیا۔
وہ مردود چاندی کہلائیں گے۔ کیوں کہ خداوند نے ان کو رد کر دیا ہے۔

(یرمیاہ ، باب ۶)

بتائے بغیر

ایک انگریزی کتاب میں ایک دلچسپ واقعہ پڑھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے :

When Sir Charles Napier conquered Sind in 1843, his victory message to the Governor-General, Lord Dalhousie, read "Peccavi" which in Latin means, "I have sinned."

انگریز جنرل سر چارلس نیپیر نے جب ۱۸۴۳ء میں سندھ کو فتح کیا تو اس نے اس وقت کے ہندستانی گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کو فتح کا پیغام ان لفظوں میں بھیجا "پیکاوی" یہ لاتینی لفظ ہے جس کے معنی ہوتے ہیں "میں نے گناہ کیا"

بظاہر یہ بڑا عجیب پیغام تھا۔ فوجی افسر اور گورنر جنرل میں پہلے سے ایسی کوئی قرارداد نہیں ہوئی تھی جس کے مطابق وہ اس کا مطلب جان لیتا۔ اس کے باوجود گورنر جنرل اس کو سمجھ گیا۔ اس نے پیکاوی کا انگریزی ترجمہ کاغذ پر لکھا تو وہ اس طرح تھا I have sinned اس کو دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گیا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ میں نے سندھ کو سر کر لیا۔

نازک اور بڑے معاملات میں عہدہ برآ ہونے کے لئے ہمیشہ ایسے ہی ذہین اور دوررس افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی ایسے لوگ جو اشاروں کے ذریعے تفصیل کو سمجھ لیں۔ جو نہ کہی ہوئی بات کو کہی ہوئی بات کی طرح جان لیں۔ جو اس بات کو پڑھ لیں جو سطروں میں لکھی ہوئی موجود نہیں ہے۔ اور نہ کبھی موجود ہو سکتی۔

زندگی کی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ ہر بات پیشگی بتائی نہیں جا سکتی۔ بہت سی باتوں کو بتائے بغیر جاننا پڑتا ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت ہو وہی کوئی قابل ذکر کام کرتے ہیں۔ اور جو لوگ اس صلاحیت سے محروم ہوں وہ صرف نادانیاں کریں گے اور اس کے بعد شکایتوں کا دفتر لے کر بیٹھ جائیں گے۔

دنیا میں سب سے زیادہ خوش قسمت انسان وہ ہے جس کو ایسے ساتھی مل جائیں جو چپ کی زبان جانتے ہوں۔ جو بولے بغیر سنیں اور لکھے بغیر پڑھیں۔ جو سطروں سے گزر کر بین السطور میں چھپی ہوئی باتوں کو جان لیں۔

زیادہ قیمت

ابوجہل کے لڑکے عکرمہ ابتداءً اپنے باپ کے ساتھ تھے۔ مگر فتح مکہ کے بعد انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ مدینہ آئے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ان کا مختصر سوال وجواب ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے کلمۂ شہادت کا اقرار کرلیا۔ قبول اسلام کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عکرمہ سے کہا کہ آج تم جو کچھ بھی مجھ سے مانگوگے وہ میں تمھیں دوں گا۔ عکرمہ نے کہا کہ میں آپ سے صرف یہ مانگتا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھ جو بھی دشمنی کی ہو۔ یا جو قدم بھی آپ کے خلاف اٹھایا ہو۔ یا جو بھی جنگ آپ سے کی ہو۔ یا جو مخالفانہ بات بھی آپ کے سامنے یا آپ کے پیچھے کہی ہو ان سب کو آپ معاف فرمادیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر فوراً خدا کی طرف متوجہ ہوگئے۔ آپ نے فرمایا اے اللہ، تو عکرمہ کو ہر اس دشمنی کے لئے بخش دے جو انھوں نے میرے خلاف کی ہو۔ ان کے ہر اس اقدام کے لئے ان سے درگزر فرما جو انھوں نے تیرے نور کو بجھانے کے لئے کیا ہو۔ اور انھوں نے میرے سامنے یا میرے پیچھے جو کچھ مجھے برا کہا ہو اس کو معاف فرما۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کے بعد عکرمہ نے کہا:

اما و اللہ یا رسول اللہ لا ادع نفقۃ کنت انفقتہا فی الصد عن سبیل اللہ الا انفقت ضعفہا فی سبیل اللہ ولا قاتلت قتالاً فی الصد عن سبیل اللہ الا ابلیت ضعفہ فی سبیل اللہ (کنز العمال)

خدا کی قسم اے اللہ کے رسول، میں خدا کے راستہ سے روکنے کے لئے جتنا خرچ کرتا تھا اس کا دگنا اب خدا کے راستہ میں خرچ کئے بغیر نہ رہوں گا۔ میں خدا کے راستہ سے روکنے کے لئے جتنا لڑتا تھا اس کا دگنا اب میں خدا کے راستہ میں لڑوں گا۔

حضرت عکرمہ اپنے اس قول پر پوری طرح قائم رہے۔ انھوں نے اپنے وقت اور اپنے مال اور اپنی جان کو پہلے سے بھی زیادہ مقدار میں اللہ کے راستہ میں لگا دیا۔ وہ اسلام کے لئے جہاد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ طبری کی روایت کے مطابق یرموک کی جنگ میں شہید ہوکر اس دنیا سے چلے گئے۔

اسلامی دعوت کا ایک دور "فتح" سے پہلے ہوتا ہے اور دوسرا فتح کے بعد۔ پہلا عدم استحکام کا دور ہے اور دوسرا استحکام کا دور۔ جو لوگ دوسرے دور میں اسلامی دعوت کا ساتھ دیں ان کے لئے دور اول کے لوگوں کا درجہ حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ یہ کہ وہ اسلام کے لئے اس سے بھی زیادہ قربانیاں دیں جتنی قربانیاں وہ اس سے پہلے غیر اسلام کے لئے دے رہے تھے۔

دو قسم کے لیڈر

ہندستان کے مشہور قانون داں مسٹر نانی پالکی والا نے لکھا ہے کہ ہندستان کی مصیبت یہ ہے کہ یہاں سیاسی لیڈروں کی بھرمار ہے۔ اور سیاسی مدبرین کی کمی :

The bane of India is the plethora of politicians
and the paucity of statesmen.
Nani Palkhivala in *WE THE PEOPLE*

سیاسی لیڈر (پالی ٹیشین) اور سیاسی مدبر (اسٹیٹس مین) میں کیا فرق ہے، اس کا جواب ہندستان کے نائب صدر جمہوریہ مسٹر وینکٹا رمن نے حسب ذیل الفاظ میں دیا ہے :

A politician thinks of the next election while
a statesman thinks of the next generation.

یعنی ایک سیاسی لیڈر اگلے الکشن کے بارہ میں سوچتا ہے جب کہ ایک سیاسی مدبر اگلی نسل کے بارہ میں سوچتا ہے (ٹائمس آف انڈیا، ۱۷ ستمبر ۱۹۸۴) اس بات کو دوسرے لفظوں میں کہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ رہنما دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک سچا رہنما دوسرا جھوٹا رہنما۔ سچا رہنما قوم کے مفاد میں سوچتا ہے اور جھوٹا رہنما اپنی قیادت کے مفاد میں۔ سچے رہنما کو قوم کے مستقبل کی فکر ہوتی ہے۔ اور جھوٹے رہنما کو اپنے ذاتی مستقبل کی۔

جھوٹا رہنما ایک روایت کو توڑ کر کامیابی حاصل کر سکتا ہو تو وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر روایت کو توڑ ڈالے گا اور پھر ذاتی کامیابی حاصل کر کے خوشی کا جشن منائے گا، مگر سچا رہنما ایسے موقع پر رک جائے گا، وہ سوچے گا کہ ایک روایت کو توڑنا بہت آسان ہے مگر دوبارہ ایک مفید روایت قائم کرنا انتہائی مشکل ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ روایت کو باقی رکھا جائے خواہ اس کی وجہ سے ذاتی نقصان اٹھانا پڑے۔

جھوٹا رہنما اگر دیکھے گا کہ ایک جذباتی نعرہ لگا کر وہ کامیاب ہو سکتا ہے تو وہ فوراً اپنی کامیابی کے لئے جذباتی نعرہ لگا دے گا۔ مگر سچا رہنما ایسے موقع پر رک جائے گا، وہ سوچے گا کہ جذباتی نعرہ لگانا دوسرے لفظوں میں قوم کو جذباتی راہوں پر دوڑانا ہے۔ اس لئے قوم کو جذباتی خندق میں گرانے سے بہتر ہے کہ اپنے لئے سیاسی موت کو برداشت کر لیا جائے۔ لیڈر کی موت میں قوم کی زندگی ہے۔ خوش قسمت ہے وہ قوم جس کو ایسے باحوصلہ لیڈر مل جائیں۔

غلط فہمی

مفسر ابن کثیر نے سورہ بنی اسرائیل کی آخری آیتوں کے ذیل میں ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے:

ان رجلاً من المشرکین سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو یقول فی سجودہ: یا رحمٰن یا رحیم فقال انہ یزعم انہ یدعو واحداً وھو یدعوا اثنین

مشرکین میں سے ایک شخص نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سنا۔ آپ سجدہ میں کہہ رہے تھے کہ اے رحمٰن اے رحیم۔ مشرک نے یہ سن کر کہا کہ یہ شخص سمجھتا ہے کہ وہ ایک خدا کی دعوت دینے والا ہے حالانکہ وہ دو خداؤں کو پکار رہا ہے۔

یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح بہت سی شکایتیں اور اعتراضات محض آدمی کی اپنی کم فہمی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک خدا کو اس کی کئی صفتوں کے ساتھ پکار رہے تھے کیونکہ خدا اگرچہ ایک ہے مگر اس کی صفتیں بے شمار ہیں۔ مگر مذکورہ اعرابی نے صفات میں تعدد کو وجود میں تعدد کے ہم معنی سمجھ لیا اور اس طرح ایک موحد انسان کے بارہ میں غلط طور پر یہ رائے قائم کر لی کہ وہ بھی اسی کی طرح مشرک ہے۔

انسان ایک بے حد پیچیدہ مخلوق ہے۔ اس کی زندگی کے لاتعداد پہلو ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے بارہ میں رائے قائم کرنا بے حد دشوار کام ہوتا ہے۔ اس میں ۵۰ فی صد سے زیادہ غلط فہمی کا امکان ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ دوسرے شخص کے بارہ میں رائے قائم کرنے میں وہ نہایت محتاط ہو۔ خوش گمانی قائم کرنے میں آدمی اگر غیر محتاط ہو تو کوئی حرج نہیں۔ مگر بدگمانی قائم کرنا ہو تو آدمی کے لئے لازم ہے کہ وہ بے حد سنجیدہ ہو، وہ آخری حد تک احتیاط سے کام لے۔

ہر آدمی کو جاننا چاہئے کہ وہ جو کچھ رائے قائم کرتا ہے اپنی معلومات کے دائرہ میں کرتا ہے۔ اب چونکہ حقائق کا دائرہ کسی شخص کی ذاتی معلومات سے بہت زیادہ وسیع ہے، اس لئے ہر وقت یہ امکان ہے کہ اپنی معلومات کے دائرہ میں وہ ایک رائے کو صحیح سمجھ لے۔ حالانکہ وسیع تر حقائق کے اعتبار سے اس کی رائے صحیح نہ ہو۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ جب دوسرے کے بارہ میں رائے قائم کرنا ہو تو خوش گمانی کے معاملہ میں وہ حد درجہ فیاض بن جائے اور بدگمانی کے معاملہ میں حد درجہ بخیل یہی عقل کا تقاضا بھی ہے اور یہی خدا کے خوف کا تقاضا بھی۔

قدردانی

يحكى في كتب السير والتاريخ ان ابا موسى الاشعري عاقب جنديا في جيش العراق فحلق شعر راسه فجمع الجندي الشعر وسافر به من العراق الى المدينة بالحجاز ودخل على امير المومنين عمر بن الخطاب رضي الله عنه فقذف بالشعر امامه وقال في غضب هكذا ايعامل رجالك فتهلل وجه عمر وقال: لان يكون الناس كلهم في مثل شجاعة هذا احب الى من كل ما فتحنا من بلاد (ابن خلدون)

سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں آیا ہے کہ ابوموسیٰ اشعری نے عراق کی فوج میں ایک مسلمان سپاہی کو تنبیہ کی اور اس کے سر کا بال منڈا دیا۔ سپاہی نے بال جمع کئے اور اس کو لے کر عراق سے مدینہ آیا۔ وہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچا۔ اس نے اپنے بال ان کے آگے ڈال دئے اور غصہ سے کہا کہ تمہارے آدمی ہمارے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرتے ہیں۔ حضرت عمر کا چہرہ چمک اٹھا۔ انھوں نے کہا کہ اگر تمام لوگ بہادری میں اس آدمی کی طرح ہو جائیں تو یہ مجھ کو ان تمام ملکوں سے زیادہ محبوب ہے جو ہم نے فتح کئے ہیں۔

مذکورہ فوجی آدمی کے عمل کا ایک رخ یہ تھا کہ اس نے خلیفۂ وقت پر تنقید کی۔ وہ تنقید میں بدتمیزی کی حد تک پہنچ گیا۔ اس کا دوسرا رخ یہ تھا کہ اس نے حد درجہ بہادری اور جرأت کا ثبوت دیا۔ حضرت عمر نے پہلے رخ کو نظر انداز کر دیا۔ اور دوسرے رخ کی بنا پر اس کی تعریف کی۔

مذکورہ فوجی کی بات سن کر اگر حضرت عمر کو غصہ آجاتا تو وہ اس کو سزا دیتے۔ اس کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیتے۔ یا کم از کم اس کو معتوب کر کے دور بھگا دیتے۔ ایسی صورت میں وہ اپنے دل کی تسکین تو ضرور حاصل کرتے مگر یہ شخصی تسکین اس قیمت پر ہوتی کہ وہ ایک ایسے بہادر شخص کو کھو دیتے جو اسلام کے محاذ پر زبردست کام انجام دینے والا تھا۔

ایک جاندار آدمی تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ مگر جاندار آدمی ہمیشہ جری ہوتا ہے۔ وہ خوشامدانہ باتیں کرنا نہیں جانتا۔ جاندار آدمی کو اپنا ساتھی وہی شخص بنا سکتا ہے جو اس کی تنقیدوں اور اس کی جرأت مندانہ باتوں کے باوجود اس کی قدر کر سکے۔ جو اس کو اس کے اندر کے لحاظ سے دیکھے نہ کہ اس کے باہر کے لحاظ سے۔

تین قسم

مستدرک حاکم (کتاب الجہاد) میں حضرت ابوہریرہ سے ایک روایت حسب ذیل الفاظ میں آئی ہے:

کل شیٔ من لھو الدنیا باطل الا ثلاثۃ انتضالک بقوسک وتادیبک لفرسک وملاعبتک لاھلک فانھن من الحق۔

دنیا کا ہر کھیل باطل ہے سوا تین چیزوں کے۔ تمہارا تیر کمان سے کھیلنا۔ اور تمہارا اپنے گھوڑے کو سدھانا اور تمہارا اپنی بیوی کے ساتھ تفریح کرنا۔ یہ تین کھیل ہیں جو درست ہیں۔

یہ اور اس طرح کی دوسری حدیثوں کو جو لوگ مطلق معنوں میں لے لیتے ہیں وہ ان کو سمجھ نہیں پاتے اور مختلف قسم کی غلطیاں کرتے ہیں۔ مثلاً ایک گروہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ مذکورہ تین چیزوں کے سوا ہر کھیل شریعت میں ممنوع ہے۔ حتیٰ کہ ہاکی اور فٹ بال کھیلنا بھی شیطانی فعل ہے۔

دوسرا گروہ جس کو یہ ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے کہ خدا مذکورہ تین چیزوں کے سوا ہر کھیل کو قابل ترک قرار دے وہ جھنجھلا کر خود حدیث ہی کو ترک کر دیتے ہیں۔ وہ کہہ دیتے ہیں حدیث میں پیغمبر کے اقوال صحیح طور پر نقل نہیں ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم قرآن کو مانیں گے اور حدیث کو چھوڑ دیں گے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی حدیثیں مطلق معنوں میں نہیں ہوتیں۔ وہ کسی مخصوص صورت حال میں دین کی روح کو بتانے کے لئے ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مذکورہ حدیث میں تین کھیل سے مراد تین قسم کے کھیل ہیں۔ وہ حقیقۃً کھیل کی نوعیت کو بتاتے ہیں نہ کہ کھیل کی صورت کو۔ مفہوم کے اعتبار سے اگر اس حدیث کی تشریح کی جائے تو وہ یہ ہوگی کہ ـــــ دنیا کا ہر کھیل باطل ہے الا یہ کہ وہ بامقصد کھیل ہو۔ مثلاً مقابلہ کی تیاری والا کھیل جیسے کہ قدیم زمانہ میں تیر کمان تھا۔ گھوڑا دوڑانا جس میں جسمانی ورزش بھی ہے اور گھوڑے کو سواری کے لئے تیار کرنا بھی۔ اسی طرح بیوی سے تفریح جو در اصل ناجائز تفریح سے اپنے کو بچانے کا ذریعہ ہے۔

مذکورہ حدیث کو "تین کھیل" کے مفہوم میں لیا جائے تو وہ عجیب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس کو "تین قسم کے کھیل" کے مفہوم میں لیں تو وہ نہایت بامعنی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک چیز ظاہر میں کچھ نظر آتی ہے لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو وہ کچھ اور بن جاتی ہے۔

فطری سادگی

صحیح روایات کے مطابق نبوت کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک حج ادا کیا۔ یہ وہی حج ہے جس کو عام طور پر حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ یہ حج آپ نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے ۱۰ھ میں ادا فرمایا۔

حجۃ الوداع کے بارے میں بہت تفصیلی روایات آئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ طواف کے بعد آپ نے صفا اور مروہ نامی پہاڑیوں کے درمیان سعی کی۔ اس سعی کا آغاز آپ نے صفا سے کیا۔ اس وقت آپ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا: ان الصفا و المروۃ من شعائر اللہ۔ ابدأ بما بدء اللہ بہ (بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ میں اس سے شروع کرتا ہوں جس سے اللہ نے شروع فرمایا)

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی آیت میں جہاں صفا اور مروہ کا لفظ ہے وہاں جملہ میں صفا کا لفظ پہلے ہے اور مروہ کا لفظ اس کے بعد۔ اسی ترتیب کو آپ نے سعی میں بھی اختیار کیا۔ یعنی قرآن کی آیت چوں کہ صفا سے شروع ہوتی تھی اس لئے آپ نے بھی اپنی سعی صفا سے شروع فرمائی۔ صفا سے چل کر آپ مروہ کی طرف گئے۔

یہ بظاہر ایک چھوٹا سا واقعہ ہے مگر اس میں بہت بڑا سبق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سادگی کو پسند کرتا ہے۔ اگر آپ مروہ سے اپنی سعی کا آغاز کرتے تو آدمی کو غیر ضروری طور پر صفا اور مروہ کے بارہ میں دو ترتیب یاد رکھنی پڑتی۔ ایک قرآن کی آیت میں ان الفاظ کی ترتیب، دوسری حج کی سعی میں ان کی ترتیب۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دونوں جگہ ایک ہی ترتیب جاری کرکے لوگوں کو غیر ضروری تکلف سے بچا لیا۔

یہ اسلام کی ایک روح ہے جس کو ہمیں ہر معاملہ میں پیش نظر رکھنا چاہئے۔

اسلام ایک سادہ مذہب ہے۔ وہ ہر قسم کی پیچیدگیوں اور غیر ضروری تکلفات سے پاک ہے۔ اسلام میں روح پر زور دیا گیا ہے اور ظواہر کو ثانوی درجہ میں رکھا گیا ہے۔ اسلام میں اساسی باتوں اور ضمنی باتوں میں فرق کیا گیا ہے، اساسی باتوں کو اساسی اہمیت دی گئی ہے اور ضمنی باتوں کو ضمنی اہمیت۔ اسلام کو سادہ حقیقتوں پر قائم کیا گیا ہے نہ کہ عقلی بحثوں اور منطقی موشگافیوں پر۔ اسلام کو اختیار کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا ہوا اور پانی کو اختیار کرنا۔

ظاہر اور باطن

قال الشعبی کنت جالساً عند شریح القاضی۔ اذ دخلت امرأة تبکی وتشتکی زوجہا وھو غائب وتاثرت لبکائھا وقلت للقاضی اصلحك الله ما اراھا الا مظلومة ماخوذا حقھا۔ فقال وما علمك۔ قلت لشدة بکائھا وکثرة دموعھا۔ قال لا تحکم الا بعد ان تتبین الامر۔ فان اخوة یوسف جاؤا اباھم عشاء یبکون وھم له ظالمون۔

امام شعبی کہتے ہیں کہ میں قاضی شریح کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت آئی جو کہ رو رہی تھی اور اپنے شوہر کی شکایت کر رہی تھی اور شوہر وہاں موجود نہ تھا۔ میں اس کے رونے سے متاثر ہوگیا اور قاضی شریح سے کہا کہ اللہ آپ کی مدد کرے، میرا خیال ہے کہ یہ ضرور مظلوم ہے اور اس کا حق چھینا گیا ہے۔ قاضی شریح نے کہا کہ آپ نے کیسے جانا۔ میں نے کہا کہ اس کے رونے کی شدت اور اس کے آنسوؤں کی کثرت کی وجہ سے۔ قاضی شریح نے کہا کہ کوئی حکم نہ لگاؤ جب تک معاملہ واضح نہ ہوجائے کیوں کہ قرآن میں ہے کہ حضرت یوسف کے بھائی اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے حالانکہ وہ خود ظالم تھے۔

بے شمار تجربات بتاتے ہیں کہ ظاہر پر باطن کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ظاہر میں خوش اخلاق دکھائی دیتا ہے مگر جب کوئی حقیقی معاملہ پڑتا ہے تو وہ اخلاق سے خالی ثابت ہوتا ہے۔ ایک شخص ظاہری طور پر درست معلوم ہوتا ہے لیکن گہرائی میں جاکر تحقیق کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ درست آدمی نہ تھا۔

ظاہر و باطن کا یہ فرق یہاں تک جاسکتا ہے کہ آدمی کی آنکھیں روئیں حالاں کہ اس کا دل نہ رو رہا ہو۔ وہ زبان سے ہمدردی کے کلمات کہے حالاں کہ اس کے سینہ میں ہمدردی کا کوئی شائبہ موجود نہ ہو۔ وہ بظاہر ایک اچھا آدمی دکھائی دے حالاں کہ اندر سے وہ ایک برا آدمی ہو۔ وہ لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو مظلوم بتائے حالانکہ خدا کی نظر میں وہ خود سب سے بڑا ظالم ہو۔ عقلمند وہ ہے جو آدمی کو اس کے اندر سے دیکھ سکے نہ کہ صرف اس کے ظاہر سے۔

اپنی پہچان

ہر انسان خدا کی ایک منصوبہ بندی ہے۔ ہر انسان کی پیدائش انسان اور اس کے خدا کے درمیان ایک خاموش عہد ہے۔ اسی عہد میں انسان کی ساری قیمت چھپی ہوئی ہے۔

ہر انسان کو خدا نے کچھ خاص صلاحیتیں دی ہیں اور ہر آدمی نے خاموش زبان میں یہ اقرار کیا ہے کہ وہ دنیا میں اس خاص کام کو انجام دے گا جس کے لئے اس کے خدا نے اس کو پیدا کیا تھا۔ اور جس کے مطابق اسے خصوصی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ جو انسان ایسا کرے اس نے گویا خدا کے نقشہ تخلیق میں اپنی جگہ حاصل کی۔ جو شخص ایسا نہ کرے وہ خدا کے نقشہ تخلیق میں اپنی جگہ حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

اس بات کو یہاں اصحاب رسول کی مثال سے واضح کیا جاتا ہے:

صحابہ کرام میں ایک حضرت ابو ہریرہ تھے اور دوسرے خالد بن الولید۔ حضرت ابو ہریرہ کی روایات کی تعداد ۵۳۷۴ تک شمار کی گئی ہے۔ جب کہ حضرت خالد کی روایات کی تعداد ایک سو سے بھی کم ہے۔ یہ فرق بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس فرق کی وجہ خدمت اسلام کے میدان کا فرق تھا نہ کہ خود اسلام کا۔

حضرت ابو ہریرہ بھی ایک مخلص مسلمان تھے اور حضرت خالد بھی ایک مخلص مسلمان۔ مگر فطری صلاحیت کے اعتبار سے دونوں کے درمیان فرق تھا۔ انھوں نے کامل شعور کے ساتھ اس فرق کو پہچانا اور اس پر عمل کیا۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ نے اپنی صلاحیت کے لحاظ سے اپنے لئے خدمت اسلام کا ایک میدان منتخب کر لیا اور حضرت خالد نے اپنی صلاحیت کے لحاظ سے دوسرا میدان۔

حضرت خالد کہتے ہیں کہ میں جب بھی رسول اللہ صلے اللہ کے خلاف کسی مہم میں نکلتا تو ہمیشہ یہ احساس لے کر واپس آتا کہ میں اپنے آپ کو وہاں لگائے ہوئے ہوں جہاں مجھ کو نہیں لگانا چاہئے (انی موضع فی غیر شئ) یہ احساس انھیں ستاتا رہا یہاں تک کہ وہ فتح مکہ سے کچھ پہلے مدینہ آئے اور اسلام قبول کر لیا۔

حضرت خالد فطری طور پر انتہائی بہادر آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی اس خصوصیت کو جانا اور اس کے موقع استعمال کا ادراک کیا۔ انھوں نے شعوری طور پر اس کو دریافت کیا کہ اسلامی خدمت

کے وسیع میدان میں وہ کیا خاص حصہ ادا کر سکتے ہیں۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی خداداد بہادرانہ صلاحیت کو شرک کے استیصال اور توحید کے قیام کے محاذ پر لگا دیں۔ چنانچہ وہ اسلامی فوج میں شامل ہو گئے۔

وہ ساری عمر اسی راہ میں سرگرم عمل رہے۔ وہ خدا سے اپنے لئے قوت اور استقامت کی دعا کرتے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ خواست کرتے کہ وہ آپ کے لئے اس کی دعا فرمائیں۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی اسلامی جہاد میں صرف کر دی۔ حتی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا کہ خالد اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں جس کو خدا نے مشرکین کے خلاف نکالا ہے (سیف من سیوف اللہ سلہ اللہ علی المشرکین)

دوسری مثال حضرت ابوہریرہ کی ہے۔ حضرت ابوہریرہ کے اندر حضرت خالد والی صلاحیتیں نہیں تھیں۔ البتہ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے اندر حافظہ کی قوت عام لوگوں سے زیادہ ہے۔ انھوں نے اپنی اس صلاحیت کو دین کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میرے لئے دعا فرمایئے کہ خدا مجھے وہ علم دے جس کو میں فراموش نہ کر سکوں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس پر آمین کہا اور حضرت ابوہریرہ کے حق میں یادداشت کی دعا فرمائی۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ کی غیر معمولی قوت حافظہ اسی پیغمبرانہ دعا کا نتیجہ ہے۔ مگر نفسیاتی اعتبار سے دیکھئے تو یہ دراصل خود حضرت ابوہریرہ کی اپنی تڑپ کا اظہار تھا۔ یہ دوطرفہ واقعہ تھا نہ کہ محض یک طرفہ۔

حضرت ابوہریرہ نے اپنی خداداد امتیازی صلاحیت کو پہچانا۔ اس کی حفاظت اور ترقی کی دعائیں کیں۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کے لئے دعا کرائی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دعا کرانا دراصل خود اپنی دعا کا ایک تسلسل تھا۔ اس طرح دعاؤں کے سائے میں وہ اپنی استعداد کے مطابق اپنے ممکن میدان میں ہمہ تن لگ گئے۔ وہ برابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے۔ آپ کی باتوں کو پوری توجہ کے ساتھ سنتے۔ اس کو ذہن میں محفوظ رکھتے نیز حسب ضرورت اسے لکھ لیتے۔ اسی معرفت خویش کا یہ نتیجہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ اسلامی تاریخ میں وہ شخص قرار پائے جن کے ذریعہ اگلی نسلوں کو پیغمبر اسلام کی حدیثیں سب سے زیادہ تعداد میں پہنچی ہیں۔

ہر آدمی کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے۔ اپنے آپ کو جان کر وہ اپنے لئے بھی زیادہ مفید بن سکتا ہے اور دین کے لئے بھی۔

خواب میں

مسٹر رام رتن کپلا ریفریجریٹر اور ائرکنڈیشنر کا بزنس کرتے ہیں۔ ان کی فرم کا نام کیپسنس ہے نئی دہلی میں آصف علی روڈ پر اس کا صدر دفتر ہے۔

مسٹر رام رتن کپلا کو اپنے فرم کے لئے ایک سلوگن کی ضرورت تھی۔ انھوں نے اخبار میں اعلان کیا کہ جو شخص کم لفظوں میں ایک اچھا سلوگن بنا کر دے گا اس کو معقول انعام دیا جائے گا۔ بار بار کے اعلان کے باوجود کوئی ایسا شخص نہ ملا جو انھیں اچھا سلوگن دے سکے۔ بعض لوگوں نے کچھ فقرے لکھ کر بھیجے مگر مسٹر کپلا کو وہ پسند نہ آئے۔ "سلوگن کو Penetrating ہونا چاہئے۔ مگر یہ سلوگن Penetrating نہ تھے" انھوں نے ۴ دسمبر ۱۹۸۳ کی ایک ملاقات میں کہا۔

مسٹر کپلا اسی ادھیڑ بن میں رات دن لگے رہے۔ وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچتے رہے۔ ان کا دماغ برابر سلوگن کی تلاش میں لگا ہوا تھا مگر کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

اسی فکر میں تقریباً پانچ سال گزر گئے۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ مسٹر کپلا نے ایک روز رات کو ایک خواب دیکھا۔ خواب میں انھوں نے دیکھا کہ وہ ایک باغ میں ہیں۔ نہایت سہانا موسم ہے۔ طرح طرح کی چڑیاں درختوں پر چہچہا رہی ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر وہ بے حد خوش ہو گئے۔ ان کی زبان سے نکلا:

ویدر (Weather) ہو تو ایسا

یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھ کھل گئی۔ اچانک انھیں معلوم ہوا کہ انھوں نے وہ سلوگن دریافت کر لیا ہے جس کی تلاش میں وہ برسوں سے سرگرداں تھے۔ فوراً ان کے ذہن میں یہ انگریزی جملہ مرتب ہو گیا:

KAPSONS: the weather masters

خواب انسانی دماغ کی وہ سرگرمی ہے جس کو وہ نیند کی حالت میں جاری رکھتا ہے۔ اگر آپ اپنے ذہن کو سارے دن کسی چیز میں مشغول رکھیں تو رات کے وقت وہی چیز خواب میں آپ کے سامنے آئے گی۔ تاریخ کی بہت سی ایجادات خواب کے ذریعہ ظہور میں آئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ موجد اپنی ایجاد میں اتنا مشغول ہوا کہ وہ سوتے میں بھی اسی کا خواب دیکھنے لگا۔ خواب دراصل کسی چیز میں کامل ذہنی وابستگی کا نتیجہ ہے۔ ایسے آدمی کے عمل کی مدت ۱۲ گھنٹے کے بجائے ۲۴ گھنٹے ہو جاتی ہے۔ یہی کسی مقصد میں کامیاب ہونے کا راز ہے۔ اس قسم کی گہری وابستگی کے بغیر کوئی بڑا کام نہیں کیا جا سکتا۔ نہ دنیا کا اور نہ آخرت کا۔

کامیاب تدبیر

ایک مغربی کمپنی نے موٹرکار کا ایک ٹائر بنایا۔ اس نے اشتہار دیا کہ جو شخص ہمارے ٹائر میں کوئی واقعی خرابی بتلائے گا اس کو پچاس ہزار ڈالر انعام دیا جائے گا۔ جب اس کمپنی کا ٹائر بازار میں آیا تو لوگ اس کو خریدنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ لوگوں نے سوچا کہ اگر کوئی خرابی نکال پائے تو پچاس ہزار ڈالر مل جائیں گے۔ ورنہ ٹائر تو ہے ہی۔

کمپنی کو بے شمار شکایت نامے موصول ہوئے۔ چھان بین کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں سے ۲۰ فیصد خطوط قابل لحاظ ہیں۔ چنانچہ کمپنی نے ہر علاقہ کے منتخب مکتوب نگاروں کو دعوت نامے روانہ کئے۔ ان کو آمدورفت کا کرایہ دیا اور ان کو عمدہ ہوٹلوں میں ٹھہرایا۔ کمپنی کے تحت ایک سمینار میں یہ لوگ شریک ہوئے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی تنقیدی رائیں پیش کیں۔ بحث مباحثہ کے بعد ایک متفقہ تجویز منظور ہوئی اور انعام بھی تقسیم کیا گیا۔

اس کے بعد کمپنی نے نیا ٹائر بنایا۔ اس نے نئے ٹائر کی قیمت پہلے کے مقابلہ میں دگنا کر دی جب اشتہار دیا گیا تو دوسرا ٹائر پہلے ٹائر سے بھی زیادہ فروخت ہوا۔ پہلا ٹائر کمپنی نے اپنی رائے سے بنایا تھا۔ دوسرے ٹائر میں عوام کی رائے شامل ہو گئی۔ لوگوں نے سمجھا کہ یہ ٹائر استعمال کرنے والوں کی تجاویز اور مشوروں کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اس لئے وہ اس ٹائر سے زیادہ اچھا ہوگا جس کو کمپنی خود اپنی رائے سے بنائے۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی دوسرے آدمی سے بندھا ہوا ہے۔ ہر آدمی دوسروں کو شریک کرنے کے بعد کامیاب ہوتا ہے۔ اس لئے موجودہ دنیا میں کامیاب عمل کے لئے دوسروں کی رعایت ضروری ہے۔ آپ اپنی ذات کے لئے کوئی کامیابی اس وقت حاصل کر سکتے ہیں جب کہ دوسروں کو کامیاب بنانے میں بھی آپ نے کوئی حقیقی حصہ ادا کیا ہو۔

اس دنیا میں کامیاب ہونے کے لئے آدمی کو نفع بخش بننا پڑتا ہے۔ جن لوگوں سے وہ لے رہا ہے ان کو یہ یقین دلانا پڑتا ہے کہ وہ ان کو کچھ دے بھی رہا ہے۔ یہ دنیا دو طرفہ لین دین کا بازار ہے۔ جو دوسروں کو دے گا وہی دوسروں سے پائے گا۔ جس کے پاس دوسروں کو دینے کے لئے کچھ نہ ہو۔ اس کو شکایت نہ ہونی چاہئے اگر دوسرے اسے کچھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

جاپانی خاتون

جاپان کی عورتوں کے بارہ میں ایک رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ جاپان میں اگرچہ ۱۵ ملین کارکن خواتین موجود ہیں۔ مگر یہ زیادہ تر معمولی کاموں میں مصروف ہیں۔ وہ اپنے مرد افسروں (Male superiors) کی مددگار کے طور پر کام کرتی ہیں۔

۳۶ سال کے بعد دو خواتین جاپانی کابینہ میں لی گئی ہیں۔ وہ بھی زیادہ تر متحدہ اقوام کے موسم خواتین کی رعایت سے جو ۱۹۸۵ میں ختم ہو رہا ہے۔ جاپان میں اس وقت ۶۰۸ ڈپلومیٹ ہیں۔ ان میں خواتین کی تعداد صرف ۱۲ ہے۔ جاپان آج بھی بنیادی طور پر مردوں کا سماج (Male-dominated society) ہے۔

رپورٹ میں جاپان کی موجودہ خاتون وزیر سے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں:

A bill, yet to be passed by the parliament, on ending discrimination against women, is considered by many of its male critics as reverse discriminatory.

عورتوں کے خلاف امتیاز کو ختم کرنے والا ایک بل جاپانی پارلیمنٹ میں ہے مگر وہ اب تک پاس نہ ہو سکا۔ اکثر مرد ناقدین اس بل کو برعکس امتیاز پیدا کرنے والا اقدام سمجھتے ہیں (انڈین اکسپریس ۲۴ نومبر ۱۹۸۴)

جو لوگ کہتے ہیں کہ عورتوں کی مساوی شرکت کے بغیر قومی ترقی نہیں ہو سکتی انھیں اس واقعہ سے نصیحت لینا چاہئے۔ جاپان دور جدید کا انتہائی ترقی یافتہ ملک ہے۔ مگر یہ ترقی اس کو اس کے بغیر حاصل ہوئی ہے کہ اس نے اپنی خارجی سرگرمیوں کے تمام میدانوں میں عورتوں کو برابر کے شریک کی حیثیت سے داخل کر دیا ہو۔

قدیم زمانہ میں عورت اور مرد کے کام کا دائرہ الگ الگ سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں اس حدبندی کو ختم کر دیا گیا۔ دلیل یہ دی گئی کہ اس سے ترقی کی رفتار تیز ہوگی۔ مگر تجربہ نے بتایا کہ تقسیم عمل کے قدیم نظام کو توڑنے کا کوئی فائدہ تمدنی ترقی کے اعتبار سے نہیں ہوا۔ جن ملکوں میں عورت اور مرد دونوں کو زندگی کے ہر میدان میں برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے وہاں بھی عملاً زندگی کے تمام ترقیاتی کام مردوں ہی کے ہاتھ میں ہیں نہ کہ عورتوں کے ہاتھ میں۔

جاپان کی مذکورہ مثال بھی اس کی تردید کرتی ہے۔ جاپان پورے معنوں میں دور جدید کا ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ مگر وہاں کا سماج ابھی تک قدیم انداز کے مطابق مردوں کے غلبہ کا سماج ہے۔ جاپان کی مثال ثابت کرتی ہے کہ ترقی کے لئے عورتوں کی مفروضہ مساوی شرکت ضروری نہیں۔

صبر کی ضرورت

مغل حکمراں اورنگ زیب کو اپنے والد شاہ جہاں سے سیاسی اختلاف ہوا۔ ۱۶۵۸ء میں اس نے شاہ جہاں کو تخت سے بے دخل کرکے آگرہ کے قلعہ میں قید کر دیا۔ اسی حال میں شاہ جہاں ۱۶۶۶ء میں ۷۴ سال کی عمر میں مر گیا۔ اسیری کے زمانہ میں اس کی بہن جہاں آرا بھی قلعہ میں اس کے ساتھ تھی۔ شاہ جہاں آگرہ کے قلعہ سے تاج محل کو دیکھا کرتا تھا اور اشعار پڑھتا رہتا تھا۔

ڈاکٹر آر۔ سی۔ مجمدار، ڈاکٹر ایچ۔ سی۔ رائے چودھری اور ڈاکٹر کالی کنکر دتہ نے اپنی مشترک کتاب تاریخ ہند (An Advanced History of India) میں شاہ جہاں کے آخری حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے مذہب میں اپنی تسکین کا سامان پا لیا۔ اور صبر کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے آخری ایام اپنی پارسا لڑکی جہاں آرا کے ساتھ عبادت اور مراقبہ میں گزار دئے یہاں تک کہ مر گیا:

He found solace in religion, and, in a spirit of resignation, passed his last days in prayer and meditation in the company of his pious daughter, Jahanara, till his death (p. 477).

کہا جاتا ہے کہ ایک عرصہ کے بعد شاہ جہاں قید کی زندگی سے گھبرا اٹھا۔ اس نے اورنگ زیب کو ایک مصرعہ لکھ کر بھیجا جس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو ہم کو مار ڈالو یا دام دو یا پھر ہم کو آزاد چھوڑ دو:

یا بکش یا دام دہ یا از قفس آزاد کن

اورنگ زیب نے بھی اس کے جواب میں ایک اور مصرعہ لکھ کر شاہ جہاں کے پاس بھیج دیا۔ جو یہ تھا کہ ہوشیار چڑیا جب جال میں پھنس جائے تو اس کو برداشت سے کام لینا چاہئے:

مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ نہ ہو، صرف ایک لطیفہ ہو۔ تاہم یہ بذات خود ایک حکمت کی بات ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی غلطی یا کسی حادثہ کی بنا پر ایک ایسی صورت حال میں پھنس جاتا ہے جو اس کے لئے عام حالات میں بالکل ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ مگر اب جہاں وہ پھنس گیا ہے وہاں سے فوری طور پر نکلنا عملاً ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں گھبرا کر کوئی اقدام کرنا سراسر نادانی ہے۔ جال میں پھنسنے کے بعد چڑیا اگر پر پھڑپھڑائے تو وہ اور زیادہ پھنستی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح کسی نازک صورت حال میں پھنس جانے کے بعد آدمی اگر بے صبری کے ساتھ کارروائی کرے تو وہ اور زیادہ اس میں الجھ جائے گا۔

حکمت کا یہ اصول افراد کے لئے بھی ہے اور قوموں کے لئے بھی۔

بہت سے لوگ

- بہت سے لوگ جو اعلان کرتے ہیں کہ سونے اور چاندی کے سکوں میں ان کی قیمت نہیں لگ سکتی وہ اس وقت بازار میں بکنے والا مال بن جاتے ہیں جب کہ عزت اور شہرت کے سکوں میں ان کی قیمت ادا کر دی جائے۔
- بہت سے لوگ جو بتوں کو توڑنے کی مہم کے امام بنے ہوئے ہیں وہ اس وقت سب سے بڑے بت پرست ثابت ہوتے ہیں جب کہ ان کو خود اپنا بت ٹوٹتا ہوا نظر آئے۔
- بہت سے لوگ جو اسلام کو اپنی عظمت کا پرفخر نشان بنائے ہوئے ہیں وہ اس وقت اسلام کو نظر انداز کر دیتے ہیں جب کہ اسلام ان سے اپنے آپ کو بے عظمت کرنے کا مطالبہ کرے۔
- بہت سے لوگ جو خدا کی بڑائی کے نام پر دوسروں کو چھوٹا کرنے کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں وہ اس وقت اپنی تردید آپ بن جاتے ہیں جب کہ انھیں خدا کی بڑائی کے لئے خود اپنے آپ کو چھوٹا کرنا پڑے۔
- بہت سے لوگ جو مکمل اسلامی حکومت سے کم کسی چیز پر راضی ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں وہ اس وقت اپنے دعوے کے برعکس ثابت ہوتے ہیں جب کہ اسلامی حکومت کی حدود کو ان کی اپنی ذات تک وسیع کیا جائے۔
- بہت سے لوگ جو دوسروں کے بچوں کو میدان جہاد میں بھیجنے کے لئے بہادر بنے ہوئے ہیں وہ اس وقت غیر بہادر ثابت ہوتے ہیں جب کہ انھیں خود اپنے بچوں کو میدان جہاد میں ذبح ہونے کے لئے بھیجنا پڑے۔
- بہت سے لوگ جو احتساب عالم سے کم کوئی لفظ بولنے کو اسلام کی تصغیر سمجھتے ہیں وہ اس وقت بالکل دوسرے انسان ثابت ہوتے ہیں جب کہ اس احتساب عالم کی فہرست میں خود ان کی ذات کے احتساب کو بھی شامل کر لیا جائے۔
- بہت سے لوگ جو ملت کے احیاء کے لئے مردان کار کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ اس وقت ان کے سب سے بڑے دشمن بن جاتے ہیں جب کہ خدا مطلوبہ مردان کار پیدا کر کے انھیں ان کے سامنے کھڑا کر دے۔

تعلیمی پیغام

تعلیم صرف روزگار کا سرٹیفکٹ نہیں۔ اس کا اصل مقصد قوم کے افراد کو باشعور بنانا ہے۔ افراد کو باشعور بنانا ملت کی تعمیر کی راہ کا پہلا قدم ہے۔ ملت کا سفر جب بھی شروع ہوگا یہیں سے شروع ہوگا۔ اس کے سوا کسی اور مقام سے ملت کا سفر شروع نہیں ہو سکتا۔

باشعور بنانا کیا ہے۔ باشعور بنانا یہ ہے کہ ملت کے افراد ماضی اور حال کو ایک دوسرے سے جوڑ سکیں۔ وہ زندگی کے مسائل کو کائنات کے ابدی نقشہ میں رکھ کر دیکھ سکیں۔ وہ جانیں کہ وہ کیا ہیں۔ اور کیا نہیں ہیں۔ وہ اس راز سے واقف ہوں کہ وہ اپنے ارادہ کو خدا کے ارادہ سے ہم آہنگ کر کے ہی خدا کی اس دنیا میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ باشعور انسان ہی حقیقی معنوں میں انسان ہے۔ جو باشعور نہیں وہ انسان بھی نہیں۔

باشعور آدمی اپنے اور دوسرے کے بارہ میں صحیح رائے قائم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ وہ یہ جان لیتا ہے کہ اس کی کون سی رائے جانب دارانہ رائے ہے اور کون سی غیر جانب دارانہ۔ جب بھی کوئی موقع آتا ہے تو وہ پہچان لیتا ہے کہ یہاں کون سی کارروائی ردعمل کی کارروائی ہے اور کون سی مثبت کارروائی۔ وہ شر کو خیر سے جدا کرتا ہے اور باطل کو الگ کر کے حق کو پہچانتا ہے۔ ایک آنکھ وہ ہے جو ہر آدمی کی پیشانی پر ہوتی ہے۔ تعلیم آدمی کو ذہنی آنکھ عطا کرتی ہے۔ عام آنکھ آدمی کو ظاہری چیزیں دکھاتی ہے، تعلیم کی آنکھ آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ معنوی چیزوں کو دیکھ سکے۔

جس طرح ایک کسان بیج کو درخت بناتا ہے، اسی طرح تعلیم گاہ کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کو فکری حیثیت سے اس قابل بنائے کہ وہ ارتقائے حیات کے سفر کو مکمل کر سکے۔ تعلیم آدمی کو ملازمت بھی دیتی ہے۔ مگر یہ تعلیم کا ثانوی فائدہ ہے۔ تعلیم کا اصل پہلو یہ ہے کہ وہ آدمی کو زندگی کی سائنس بتائے۔ وہ آدمی کو حقیقی معنوں میں آدمی بنا دے۔

ہمارے مدارس

صحابہ ہمیشہ اساسات دین پر متوجہ رہتے تھے۔ مگر بعد کو عباسی خلافت کے زمانہ میں دوسری قوموں کے اثر سے مسلمانوں کا یہ حال ہوا کہ وہ اساسات دین کے بجائے جزئیات دین کو طے کرنے میں الجھ گئے۔ ان کے درمیان عجمی قوموں کے اختلاط سے نئے نئے مسائل پر بحثیں ہونے لگیں۔ یہ بحثیں حقیقۃً ان امور پر نہ تھیں جو قرآن و حدیث میں واضح الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں۔ بلکہ زیادہ تر ان پہلوؤں پر تھیں جو لوگوں نے اپنے غیر ضروری قسم کے غوص و تعمق سے خود پیدا کیا تھا۔ فقہ میں جزئیاتی امور پر بحثیں پیدا ہوگئیں اور اعتقادیات میں کلامی موشگافیوں سے پیدا شدہ مسائل لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت جو اسلامی نظام تعلیم بنا اس میں انھیں فقہی اور اعتقادی بحثوں نے سب سے زیادہ جگہ حاصل کر لی۔ حتیٰ کہ خود قرآن و حدیث بھی اب انھیں اختلافی بحثوں کی روشنی میں پڑھائے جانے لگے۔ یہ انداز تعلیم جو ابتداءً عباسی دور میں رائج ہوا بعد کو مقدس بن کر اسلامی نظام تعلیم کا لازمی جزء بن گیا اور آج بھی وہ کسی نہ کسی طرح اس کا لازمی جزء بنا ہوا ہے۔ جو چیز صرف اسلام کی تاریخ تھی اس کو اسلام کی حقیقت سمجھ لیا گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی درس گاہوں سے اس سے بالکل مختلف انسان بن کر نکلنے لگے جو قرآن کو مطلوب تھے۔ قرآن کو اسلامی تعلیم سے ایسے انسان مطلوب تھے جو اللہ سے ڈریں (انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء) اور جو دنیا کے لوگوں کو آنے والے سخت دن سے ہوشیار کریں (ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم) مگر اب اسلام کے تعلیمی نظام سے ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جو جزئیاتی بحثوں کے ماہر ہوں اور اختلافی مسائل میں کمال فن کی داد دے سکیں۔

اس فرق کا مزید شدید تر نقصان یہ ہوا کہ ہمارے مدارس قساوت اور بے حسی کی تربیت گاہ بن گئے۔ اگر آپ خدا کی عظمت کا تذکرہ کریں، اگر آپ جنت اور جہنم کو یاد کریں تو آپ کے اندر خشوع اور تقویٰ کے جذبات ابھریں گے۔ اس کے برعکس اگر آپ ظاہری جزئیات اور لفظی موشگافیوں میں بحث و مباحثہ کریں تو اس سے صرف قساوت کو غذا ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے مدارس خشوع کے بجائے غفلت اور قساوت کی پیداوار کا مرکز بن کر رہ گئے ہیں۔

بے قیمت الفاظ

ہمارے قائدین اپنی تقریروں اور تحریروں میں ہر روز مسلمانوں کو بتاتے رہتے ہیں کہ مسلمان کیا کریں۔ وہ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ:

مسلمان متحد ہو جائیں

مسلمان اس ملک کی اخلاقی قیادت کریں

مسلمان خیر امت کا کردار ادا کریں

یہ مشورے یقیناً بہت اچھے مشورے ہیں مگر وہ سادہ معنوں محض مشورے نہیں ہیں۔ وہ عظیم ترین قربانی کے مطالبے ہیں۔ آدمی قربانی کی قیمت پر ہی ان مشوروں پر قائم ہو سکتا ہے ــــــ متحد ہونے کی قیمت ہے اختلاف کے باوجود متحد ہونا۔ اخلاقی قیادت کی قیمت ہے تلخیوں کے باوجود اخلاق پر قائم رہنا۔ خیر امت کا کردار ادا کرنے کی قیمت ہے شکایتوں کے باوجود لوگوں کا خیر خواہ ہونا۔

یہ سب اعلیٰ ظرفی کی باتیں ہیں اور اعلیٰ ظرفی کا یہ معیار وہ ہے جس پر خود مشورہ دینے والے قائدین بھی پورے نہیں اترتے۔ پھر وہ عوام اعلیٰ ظرفی کے اس معیار پر کیسے پورے اتریں گے۔ جن کو تقریر و تحریر کی صورت میں یہ قیمتی مشورے دئے جا رہے ہیں۔ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ اسی طرح مشورے کی بھی ایک قیمت ہے۔ اور وہ ہے آدمی کا اول المسلمین ہونا یعنی مشورہ دینے والا خود اس اصول پر قائم ہو جس کا مشورہ وہ دوسروں کو دینے جا رہا ہے۔ ایک ایسا مشورہ جس کی قیمت ادا نہ کی گئی ہو سراسر لاحاصل ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہ مشورہ دینے والے کے حصہ میں آتا ہے اور نہ اس کے حصہ میں جس کو مشورہ دیا گیا ہے۔

جو لوگ اختلاف کے وقت بے برداشت ہو جاتے ہیں۔ جو شکایت پیدا ہوتے ہی آدمی کے دشمن بن جاتے ہیں۔ جن کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے مداحوں کے لئے با اخلاق ہیں اور اپنے ناقدین کے لئے بے اخلاق۔ وہی لوگ دوسروں کو اتحاد اور اعلیٰ کردار کا مشورہ دے رہے ہیں۔

اس قسم کا مشورہ دینے والے قائدین پر حضرت مسیح کے وہ الفاظ صادق آتے ہیں جو آنجناب نے یہودی پیشواؤں کے بارہ میں فرمائے تھے:

"اے شرع کے عالمو، تم پر افسوس کہ تم ایسے بوجھ جن کو اٹھانا مشکل ہے۔ آدمیوں پر لادتے ہو اور آپ ایک انگلی بھی ان بوجھوں کو نہیں لگاتے (لوقا ۱۱: ۴۶)

اور وہ غالب ہو گئے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے ایمان لانے والو، تم لوگ اللہ کے مددگار بنو جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے حوارین سے کہا کہ کون اللہ کے لئے میرا مددگار بنتا ہے۔ حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ پس بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ منکر ہو گیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد کی اور وہ غالب ہو گئے (الصف ۱۴)

مگر واقعات بتاتے ہیں کہ مومنین مسیح بہت تھوڑے اور کمزور تھے اور مخالفین بہت زیادہ اور طاقت ور تھے۔ چنانچہ اس وقت عملاً جو ہوا وہ یہ کہ حضرت مسیح کی دعوتی جدوجہد کی تکمیل کے بعد یہود کے منکر طبقہ نے آپ کے ساتھیوں کو دبا لیا اور بزعم خود پیغمبر کو سولی پر چڑھا دیا۔ پھر سوال یہ ہے کہ فاصبحوا ظاہرین کا واقعہ کب اور کیوں کر پیش آیا۔

قصہ یہ ہے کہ وقتی طور پر تو منکرین مسیح کا گروہ غالب آگیا۔ انھوں نے حضرت مسیح کو سولی پر چڑھانے کی کوشش کی مگر آپ کو خدا نے عزت کے ساتھ آسمان پر اٹھا لیا۔ مگر خدا کا قانون یہ ہے کہ اتمام حجت کے بعد انکار کو وہ معاف نہیں کرتا۔ چنانچہ جو کام مسیح کے ابتدائی مومنین نہ کر سکے تھے اس کو دوسروں کے ذریعہ لیا گیا۔ ۷۰ء میں رومی شہنشاہ تیتس نے یروشلم پر حملہ کیا اور مخالفین مسیح (یہود) میں کچھ کو ہلاک کیا اور کچھ کو ذلیل کر کے ان کے مرکز سے نکال دیا جس کے بعد وہ تتر بتر ہو گئے۔ دوسری طرف مسیح کے ماننے والوں (نصاریٰ) کو یہ موقع ملا کہ وہ مسیحیت کے مبلغ بن کر اطراف کے ملکوں میں پھیلے۔ وہ رومی شہنشاہیت میں داخل ہوتے۔ انھوں نے اپنی تبلیغ سے بہت سے لوگوں کو عیسائی بنایا۔ توسیع مسیحیت کا یہ عمل جاری رہا۔ یہاں تک کہ رومی شہنشاہ قسطنطین (۲۷۲ - ۳۳۷ء) نے مسیحیت قبول کرلی۔ یہ الناس علیٰ دین ملوکہم کا زمانہ تھا۔ رومی شہنشاہ کے قبول مسیحیت کے بعد اس کی پوری مملکت میں مشرق سے مغرب تک مسیحیت پھیلنے لگی۔ حضرت مسیح کے رفع کے تین سو سال بعد یہ حال ہوا کہ رومی شہنشاہیت کے اکثر باشندے مسیحی بن گئے۔ یہاں تک کہ مسیحیت دنیا کا سب سے بڑا مذہب بن گیا۔ یہودی مسیحی قوموں کے محکوم ہو گئے، حتیٰ کہ موجودہ اسرائیل بھی۔

A RETURN TO RELIGION

There's no doubt about it", says Harvey R. Cox, Professor of Divinity at the larvard Divinity School, "There's a tremendous resurgence of religious iterest here." It is not uncommon to see students wearing crosses or armulkes on campuses across the United States, and few hide the fact that hey go to church or synagogue. Not just students, but the academic commuity in general, long a haven for skeptics, is now giving religion a second look. 'ox's bestselling 1965 book, The Secular City, suggested that people had lost iterest in the sacred. His new book, Religion In The Secular City, describes ie current revival in religious concern. A century that has seen the Gulag, the Iolocaust, Hiroshima and the spread of nuclear arms has caused some who sed to champion rationalism and science to humble themselves. Since their cular gods have failed, they are beginning to view more traditional gods with new curiosity. "There is a reaction against extreme individualism and self, a reoccupation with and a search for roots with a capital R, which takes people ack to religion," says Robert N. Bellah, Ford Professor of Sociology and 'omparative Studies at the University of California at Berkeley. "Tradition is ack on the agenda with a positive force." It would have been hard to imagine similar revival 20 years ago. On April 8, 1966, Time magazine asked on its over: "Is God Dead?" Among intellectuals today, God is not pronounced ead easily. Science and religion are not viewed as necessarily incompatible, id logical attempts to disprove God's existence are viewed as somewhat cane. All of this would have surprised our intellectual predecessors. "At the id of the 18th and to the middle of the 19th century, almost every enlighmed thinker expected religion to disappear in the 20th century," Daniel Bell id in a seminal lecture, "The Return of the Sacred," at the London School f Economics in 1977. "The belief was based on the power of reason." The ieory was that man could use his mind to overcome his problems, and relion would wither away. But that has hardly been the case. "We've gained iormous power over nature via technology," Bell said in an interview. "And t, the 20th century is probably the most dreadful period in human history." or intellectuals, according to Bell, there have always been secular alternaves to religious faith: rationalism and the belief in science; aestheticism and e belief in art; existentialism as expressed in the works of Kierkegaard and e early Sartre, and politics — the cults of Stalin, Lenin and Mao. Yet, one one, those alternatives, according to Bell, have exhausted their power to ove individuals. "It's ironic that my generation should be the one coming ick to religion," says Alan Dershowitz, 45, professor of law at Harvard Law hool. "We were the generation that had all the freedom and all the choice." nd yet, it is the rootlessness of much of that freedom that has brought so any intellectuals back to religion. "I can't say to you I believe in God." says oles, who might be described as a spiritual wanderer rather than as a beiver in any particular faith. "There are moments when I do stop and pray to od. But if you ask me who that God is or what kind of image He has, my ind boggles. I'm confused, perplexed, confounded. But I refuse to let that nfusion be the dominant force in my life."

مذہب کی طرف واپسی

امریکہ کے ٹائم میگزین (۸ اپریل ۱۹۶۶) کی کور اسٹوری (خصوصی مضمون) کا عنوان تھا "کیا خدا مرچکا ہے" یہ ۲۰ سال پہلے کی بات تھی۔ اب خود مغربی دنیا میں ایسی کتابیں اور مضامین مسلسل شائع ہو رہے ہیں جن کا عنوان اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ماہنامہ اسپان (دسمبر ۱۹۸۴) میں ایک مفصل رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس کی سرخی کے الفاظ یہ ہیں "مذہب کی طرف واپسی"

یہ رپورٹ الرسالہ کے انگریزی اڈیشن میں نقل کی جا رہی ہے۔ اس کا خلاصہ یہاں مقابل کے صفحہ پر درج ہے۔ اس کے مطابق امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں مختصر وقفہ کے بعد مذہب از سرنو زندہ ہو رہا ہے۔ کالجوں میں دینیات کی کلاس جو پہلے خالی رہتی تھی اب بھری رہتی ہے۔ چرچ اور سینیگاگ (یہودی عبادت خانہ) میں جانے والوں کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ مذہبی لٹریچر پڑھنے والوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ مذہب کے نام پر کانفرنسیں کثرت سے منعقد کی جا رہی ہیں۔ ایک پروفیسر کے الفاظ میں، یہاں مذہب میں دلچسپی کا حیرت ناک احیاء ہوا ہے۔

ایک مغربی دانشور جس نے ۱۹۶۵ میں "سیکولر شہر" نامی کتاب میں بتایا تھا کہ لوگوں نے مقدس چیزوں میں اپنی دلچسپی کھو دی ہے، اب وہ اپنی دوسری کتاب "سیکولر دنیا میں مذہب" میں دکھا رہا ہے کہ مذہب میں لوگوں کی دلچسپی از سرنو بحال ہو گئی ہے۔ دانشور طبقہ جو عرصہ سے شک کی بنا پر مذہب کو نظر انداز کئے ہوئے تھا وہ مذہب کی طرف دوبارہ دیکھنے لگا ہے۔

ڈینیل بل نے لکھا ہے کہ ۱۸ ویں صدی کے آخر سے لے کر ۱۹ ویں صدی کے نصف تک تقریباً ہر ترقی پسند مفکر یہ خیال کرتا تھا کہ مذہب ۲۰ ویں صدی میں ختم ہو جائے گا۔ یہ عقیدہ عقل کی طاقت کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ نظریہ یہ تھا کہ انسان اپنے دماغ سے اپنے مسائل کو حل کرلے گا اور اس کے بعد مذہب اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ہم نے ٹکنالوجی کے ذریعہ غیر معمولی طاقت فطرت کے اوپر حاصل کرلی۔ اس کے باوجود ۲۰ ویں صدی غالباً انسانی تاریخ کی سب سے بھیانک صدی ہے۔

چونکہ انسان کے سیکولر خدا ناکام ہو گئے ہیں، وہ روایتی خدا کی طرف زیادہ سے زیادہ دیکھنے

لگا ہے۔ ایک پروفیسر کے الفاظ میں روایت دوبارہ مثبت قوت کے ساتھ ابھر آئی ہے۔

مذہب کی طرف یہ واپسی حقیقۃً فطرت کی طرف واپسی ہے۔ یعنی اس خدا کی طرف واپسی جس کا احساس اس کی فطرت میں پیوست ہے نہ کہ اس خدا کی طرف جس کی نمائندگی وہ اپنے موروثی مذہب میں پا رہا ہے۔

ہارورڈ لا اسکول کے پروفیسر آلن ڈرشووٹز (۴۵) نے کہا کہ یہ بڑی عجیب چیز ہے کہ میری نسل مذہب کی طرف واپس آئے۔ ہم وہ نسل ہیں جس کو ہر قسم کی آزادی اور ہر طرح کی چھوٹ حاصل تھی۔ مگر ہمیں یہ تجربہ ہوا کہ اس آزادی کی کوئی جڑ نہیں۔ یہی بے جڑ ہونے کا احساس ہے جو اکثر دانشوروں کو دوبارہ مذہب کی طرف لایا ہے۔ ایک دوسرے پروفیسر مسٹر کولس نے کہا کہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں خدا میں عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں روحانیت کی تلاش میں ہوں نہ کہ کسی خاص مذہب کو ماننے والا۔

میری زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جبکہ میں ٹھہر جاتا ہوں اور خدا کو پکارنے لگتا ہوں۔ لیکن اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ وہ خدا کون ہے اور اس کی صورت کیا ہے تو میں تردد میں پڑ جاؤں گا۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں انتشار ذہنی کا شکار ہوں۔ اگرچہ میں نہیں چاہتا کہ ذہنی انتشار میری زندگی پر پوری طرح چھا جائے۔

تبصرہ

یہ صورت حال جو غیر مسلم اقوام میں پیدا ہوئی ہے یہی خود مسلمانوں میں بھی پیدا ہوئی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر بھی دین کی طرف از سر نو رجوع پیدا ہوا ہے۔ مگر اس رجوع کا تعلق کسی عہد ساز مفکر یا کسی خدا رسیدہ بزرگ سے نہیں ہے۔ یہ تمام تر ایک زمانی مظہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر قوم میں یکساں طور پر پیدا ہوا ہے۔ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی، بدھسٹ وغیرہ سب کے یہاں اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک مذہب اور دوسرے مذہب کا کوئی فرق نہیں۔

اس نئی صورت حال کی وجہ مغربی انسان کی وہ مایوسی ہے جو اس کو موجودہ صدی میں پیش آرہی ہے۔ بیسویں صدی عقلیت اور سائنس کی صدی تھی۔ جدید انسان کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنی عقل اور اپنی سائنس سے وہ سب کچھ حاصل کر لے گا جس کی امید پہلے صرف مذہب سے کی جاتی تھی۔ مگر اس کی امیدیں پوری نہیں ہوئیں۔ انسان کی عقلیت نے اس کو صرف بے یقینی تک پہنچایا اور اس کی سائنس ایٹمی جنگ کا سیاہ بادل بن کر اس کے سر پر منڈلانے لگی۔ چوں کہ لوگوں کے سیکولر خدا ناکام ہو گئے۔ اس

لوگوں نے روایتی خدا کی طرف زیادہ توجہ کے ساتھ دیکھنا شروع کر دیا۔

اس طرح موجودہ صورت حال نے ہمارے لئے ایک نیا امکان کھولا ہے۔ اس نے خدا کے محفوظ دین (اسلام) کی تبلیغ و اشاعت کا ایک نیا موافق میدان پیدا کر دیا ہے۔ آج کا انسان خدا اور مذہب کی تلاش میں نکلا ہے۔ مگر یہ تمام تر فطرت کے زور پر ہے۔ موجودہ مذاہب تحریف ہو جانے کی بنا پر اس کی تلاش کا حقیقی جواب نہیں ہیں۔ یہاں ضرورت ہے کہ اس کو بتایا جائے کہ جس مذہب کی تمہیں تلاش ہے وہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں موجود ہے۔ اسلام اسی مذہب کا غیر محرف اڈیشن ہے جس کو تم محرف مذاہب میں ناکام طور پر تلاش کر رہے ہو۔

دنیا کے موجودہ حالات دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے لوگوں کو لاکر اپنی رحمت کے دروازہ پر کھڑا کر دیا ہے۔ وہ لوگوں کو مجبور کر کے انھیں دین حق میں داخل کرنا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آسمان سے لوگوں کی ہدایت اتر چکی ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم حق کو طالبان حق تک پہنچا دیں۔

حضرت جی

۱۴ اپریل ۱۹۶۵ء کی شب کو تین بجے ایک ہوائی جہاز دہلی کے ہوائی اڈے پر اترا۔ اس میں ایک مسافر تھا جو لاہور سے دہلی لایا گیا تھا۔ مسافر کی آمد ٹھیک اپنے پروگرام کے مطابق ہوئی۔ مگر اس طرح کہ اس کا جسم تو دہلی آیا اور روح اپنے رب کے پاس ابدی آرام کے لیے پہونچ چکی تھی۔

یہ مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جنہیں تبلیغ کے لوگ عام طور پر "حضرت جی" کہتے ہیں۔ وہ فروری ۱۹۶۵ء کے دوسرے ہفتہ میں براستہ لاہور ڈھاکہ کے اجتماع میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ اس سلسلے میں سابق مشرقی پاکستان کے مختلف مقامات کا دورہ کرتے ہوئے دوبارہ مغربی پاکستان واپس آئے اور یہاں بھی مختلف شہروں میں ان کا بہت مصروف پروگرام رہا۔ اس سفر کی آخری منزل لاہور تھی۔ وہاں کے اجتماعات کی کارروائیوں میں بھی مکمل شرکت کی۔ اس کے بعد ۲ اپریل کو جمعہ کے دن بذریعہ ٹرین سہارن پور کے لیے روانہ ہونے والے تھے کہ اسی دن اچانک قلب کا حملہ ہوا اور ۲ بجے دن میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے بعد جنازہ رات کو لاہور سے دہلی لایا گیا۔

مولانا محمد یوسف صاحب ۲ مارچ ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد مرحوم مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ۱۲ جولائی ۱۹۴۴ء کو تبلیغ کا کام سنبھالا اور اکیس سال تک برابر اسی کام میں لگے رہے۔ اس مختصر مدت میں اتنی زبردست کامیابی حاصل کی کہ وہ تحریک جو "میوات کے اَن پڑھ مسلمانوں کو کلمہ و نماز سکھانے کی تحریک کے نام سے مشہور تھی اس کو پہلے ملکی اور پھر ایک بین اقوامی تحریک بنا دیا اور ہر طبقہ اور ہر ذہنی سطح کے لوگوں کو اس کثرت سے متاثر کیا کہ ایک بزرگ کے الفاظ میں "اس کی نظیر قریب کی پچھلی صدیوں میں مشکل سے ملے گی۔

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب راوی ہیں کہ مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی

وفات کے چند مہینے بعد مراد آباد میں ایک تبلیغی اجتماع ہو رہا تھا۔ تبلیغ کے لیے اوقات دینے کا رواج اس وقت تک میوات سے باہر بہت ہی کم ہوا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد مولانا محمد یوسف صاحب نے تقریر کی اور اس کے بعد اوقات کا مطالبہ شروع ہوا۔ مگر بہت کم لوگوں نے اپنے نام لکھوائے۔ بجنور، چاند پور اور رام پور جیسے قریبی مقامات کے لیے دس دس آدمیوں کی جماعتیں بھی نہیں بن سکی تھیں۔ کئی آدمی ترغیب دلانے میں مصروف تھے اور اپنا پورا زور لگا رہے تھے مگر ناموں میں بالکل اضافہ نہیں ہو رہا تھا۔ مولانا یوسف صاحب جو تقریر کرنے کے بعد مسجد کے اندرونی حصے میں چلے گئے تھے۔ لوگوں کی سرد مہری دیکھ کر یکایک اٹھے اور مائکروفون ہاتھ میں لے کر فرمانا شروع کیا کہ "آج تم بجنور، چاند پور، رام پور جیسے قریبی مقامات کے لیے اور صرف تین تین دن کا وقت دینے کے لیے تیار نہیں ہو رہے ہو، ایک وقت آئے گا جب تم شام جاؤ گے، مصر جاؤ گے، عراق جاؤ گے۔ مگر اس وقت اجر گھٹ جائے گا۔ کیونکہ اس وقت اس کا عام رواج ہو چکا ہوگا۔" مولانا محمد یوسف کی یہ بات جو ۱۹۴۵ء میں ایک خیالی بات معلوم ہوتی تھی، آج واقعہ بن چکی ہے۔ تبلیغی جماعتوں کی نقل و حرکت آج نہ صرف شام و عرب بلکہ یورپ، جاپان، امریکہ، افریقہ اور اقصائے مشرق سے اقصائے مغرب تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ رات دن کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا جب تبلیغی جماعت کے وفود دنیا کے مختلف حصوں میں گشت نہ کر رہے ہوں۔

دعوت میں انہماک

مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جن لوگوں نے بھی قریب سے دیکھا ہے (اور ایسے لوگ بلاشبہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہیں) وہ جانتے ہیں کہ مولانا کو اپنی دعوت میں کس قدر انہماک تھا۔ ایک صاحب جو لاہور میں نماز فجر کے بعد مولانا کی ایک تقریر میں شریک تھے، فرماتے ہیں کہ نماز کے بعد مولانا نے تقریر شروع کی اور پورے تین گھنٹے تک انتہائی جوش و خروش کے ساتھ مجمع کو خطاب کرتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی لاوا پھوٹ پڑا ہے اور ماحول کو گرمائے نہیں بلکہ پگھلائے جا رہا ہے۔ ۸½ بجے خطاب ختم ہوا اور ناشتہ کا دسترخوان بچھایا گیا۔ مولانا نے دسترخوان پر بیٹھتے ہی پھر گفتگو شروع فرما دی اور اس انداز سے الفاظ زبان سے نکلنے لگے کہ گفتگو کے زور، استدلال کی ندرت اور مطالب کی آمد کو دیکھ کر کوئی شخص یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو ابھی تین گھنٹے کے زور دار خطاب سے فارغ ہوا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ایک بالکل تازہ دم

خطیب ہے جو بول رہا ہے۔

یہ ناشتہ کی مجلس تھی۔ مگر مولانا اپنی دعوت کی وضاحت میں اس قدر مستغرق تھے کہ انہوں نے ناشتہ کی جانب کوئی توجہ نہیں کی۔ ایک رفیق نے چائے کی پیالی پیش کی تو آپ نے پکڑ لی۔ دس پندرہ منٹ تک وہ یونہی پیالی ہاتھ میں پکڑے رہے اور پھر ایک شریک مجلس کے توجہ دلانے پر آپ نے وہ چائے جواب پانی کی طرح ٹھنڈی ہو چکی تھی، حلق میں انڈیل لی۔ دوسری پیالی یہ کہہ کر پیش کی گئی کہ حضرت یہ گرم ہے، پی لیجیے اور یہ بسکٹ بھی تناول فرمایئے۔ مگر اللہ کے اس بندے نے اس پیالی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ گفتگو میں مستغرق رہے اور ۱۰۔ ۱۵ منٹ بعد اسے بھی پانی کی طرح پی لیا۔

اس کے بعد اٹھے اور ایک دوسرے اجتماع میں تقریر کے لیے تشریف لے گئے۔ اور یہ پہلے سے معلوم تھا کہ دوپہر سے قبل ایک تیسرا خطاب بھی کرنا ہے ـــ یہ کوئی استثنائی واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ یہی آپ کی روزانہ کی زندگی تھی۔

مولانا کے ایک رفیق خاص راوی ہیں:

"میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ وہ تقریر شروع فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ اور مراقب ہوتے تھے اور اس کے بعد تقریر شروع فرماتے تھے اور پھر ان کو خود اپنی بھی خبر نہیں رہتی تھی۔ اب سے ۸۔ ۱۰ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ بھوپال میں اجتماع تھا۔ ان دنوں حضرت مولانا مرحوم کی ران میں ایک بہت بڑا زخم تھا جس کا حال یہ تھا کہ حرکت کرنے سے اور زور سے تقریر کرنے سے اس میں خون جاری ہو جاتا تھا۔ مولانا اسی حال میں بھوپال تشریف لائے اور اپنی عادت کے مطابق اجتماع میں تقریریں بھی فرمائیں۔ زخم کی تکلیف کافی بڑھ گئی۔ بھوپال سے فارغ ہونے کے بعد وہاں سے ۴۰۔ ۵۰ میل کے فاصلہ پر ایک اور اجتماع طے تھا۔ حضرت مولانا وہاں بھی تشریف لے گئے۔ لیکن طے یہ ہوا کہ یہاں مولانا تقریر نہیں فرمائیں گے۔ بلکہ فلاں ساتھی کی تقریر ہوگی۔ مگر ساتھی کی تقریر کے بعد مولانا کو احساس ہوا کہ دعوت، قوت کے ساتھ نہیں دی جا سکی تو اپنے اندرونی جذبے سے مغلوب ہو کر خود تقریر کے لیے اصرار فرمایا۔ حالت یہ تھی کہ بیٹھنے کے لائق بھی نہیں۔ چنانچہ لیٹ کر بولنا شروع کیا۔ ادھر زخم کی یہ حالت ہوئی کہ اس میں سے خون جاری ہو گیا۔ ایک کپڑا لگا دیا جاتا۔ جب وہ بالکل تربتر ہو جاتا تو دوسرا کپڑا لگا دیا جاتا۔ اس طرح کئی کپڑے خون سے بھر گئے۔ اور مولانا نے عادت کے مطابق پوری تقریر فرمائی۔ اندازہ ہے کہ

اس تقریر کے دوران میں آدھا سیر خون مولانا کے جسم سے نکل گیا ہوگا۔ مگر اللہ کے اس بندہ کو کچھ پتہ نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔"

گھر کے لوگ، خاص طور پر بیوی کو جتنی خبر کسی شخص کی ہوتی ہے، اتنی دوسروں کو نہیں ہو سکتی۔ مولانا کی اہلیہ جو اب مرحومہ ہو چکی ہیں دق کی مریض تھیں۔ اور آخر میں حالت کافی خراب ہو گئی۔ مگر مولانا کے اوقات میں ان کا حصہ بہت کم ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر ایک صاحب نے اپنی بیوی کو مولانا کی اہلیہ کے پاس بھیجا اور یہ بھی ہدایت کر دی کہ اس بارے میں تم ان سے اس طرح کی جذباتی باتیں کرنا کہ ان کے دل کی بات زبان پر آجائے اور اگر مولانا سے انہیں کوئی شکایت ہو تو ظاہر ہو جائے۔ چنانچہ راوی موصوف کی اہلیہ نے مرحومہ سے بات کی۔ ان کا بیان ہے کہ انہوں نے مولانا کی طرف سے خود مدافعت کی اور کہا کہ "وہ دن رات دین کی فکر اور دین کے کام میں لگے رہتے ہیں، انہیں اپنا بھی ہوش نہیں ہے۔ میں نے خود ہی ان سے کہہ دیا ہے آپ میری فکر بالکل نہ کریں دوا علاج ہو ہی رہا ہے۔ اگر اللہ نے جنت میں جمع فرما دیا تو وہاں اطمینان سے رہنے کا موقع ملے گا۔" چند مہینوں کے بعد اسی مرض میں خاص نماز کی حالت میں مرحومہ کا انتقال ہو گیا۔

آپ کی دعوت

یہ تڑپ اور لگن کس کام کے لیے تھی۔ صرف اس لیے کہ لوگوں کے اندر دین کا صحیح تصور آجائے اور زندگیاں اس کے مطابق چل پڑیں۔ مولانا کے نزدیک ایمان کا مطلب ایک لفظ میں یہ تھا کہ ــــــ "اللہ سے سب کچھ ہوتا ہے، چیزوں سے کچھ نہیں ہوتا۔" ایک مرتبہ فرمایا:

کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کا اس ذات پر یقین قائم ہو جائے جس کے کرنے سے کام ہوگا۔ یعنی اللہ جل جلالہ کی ذات پر، اور اس کی حیثیت کام کرنے والے پر ایسی منکشف ہو کہ اپنی ذات اور کوئی دوسری ذات دکھائی نہ دے۔ دوسرا یقین یہ ہو کہ جب میں ظاہر و باطن سے حضور کے طریقوں پر آجاؤں گا تو رب العزت دنیا و آخرت میں اچھے حالات لائے گا۔

ایک تقریر میں فرمایا:

"محنت کے دو میدان ہیں۔ ایک زمین اور زمین سے پیدا ہونے والی چیزیں۔ دوسرے ایمان اور ایمان والے اعمال۔ پہلی محنت کا معاوضہ دنیا میں ملتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ملتا کہ محنت کرنے والے اس پر خوش اور مطمئن ہوں۔ دوسری محنت کا معاوضہ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ

بھر پور دے گا۔" مولانا کے نزدیک دنیوی غلبہ اسلامی زندگی کا ایک نتیجہ تھا۔ فرمایا :

"تم حضورؐ کے نمونے پر بننا شروع کر دو۔ جتنا بننا ہو گا بن جائے گا اور جو بننے والا نہیں ہو گا اور بننے والوں کے لیے رکاوٹ بنے گا، خدا اسے اس طرح توڑ دے گا جیسے انڈے کے چھلکے کو توڑ دیتا ہے۔ تم جن کو بڑی طاقتیں کہتے ہو، خدا کے نزدیک ان کی حیثیت مکڑی کے جالے کے برابر بھی نہیں ہے۔ اس دنیا میں پاکیزہ انسانوں کے نہ ہونے کی وجہ سے مکڑیوں کے بڑے بڑے جالے لگ گئے تھے، جب حضورؐ کی سعی سے پاکیزہ انسان بن گئے تو خدا نے عذاب کی ایک جھاڑو سے روم و فارس کے جالے صاف کر دیئے تھے۔ بالکل یہی صورت روس اور امریکہ کی ہو گی۔"

ایک طویل مکتوب کے چند فقرے یہ ہیں :

"اللہ نے انسانوں کی تمام کامیابیوں کا دار و مدار انسان کے اندرونی مایہ پر رکھا ہے۔ کامیابی اور ناکامی انسان کے اندر کے حال کا نام ہے ..... اللہ جل شانہ ملک و مال کے ساتھ انسان کو ذلیل کر کے دکھا دیں اور فقر کے نقشہ میں عزت دے کر دکھا دیں۔ انسان کے اندر کا یقین اور اندر سے نکلنے والے عمل اگر ٹھیک ہوں گے تو اللہ جل شانہ کامیابی کی حالت پیدا فرما دیں گے خواہ چیزوں کا نقشہ کتنا ہی پست کیوں نہ ہو ...... جو کچھ قدرت سے بنتا ہے وہ قدرت کے ماتحت ہے .... ہر شکل پر خواہ ملک کی ہو یا مال کی، برق کی ہو یا بھاپ کی، ان کا ہی قبضہ ہے اور وہ ہی تصرف فرماتے ہیں۔ جہاں سے انسان کو تعمیر نظر آتی ہے وہاں سے تخریب لاکر دکھا دیں اور جہاں سے تخریب نظر آتی ہے وہاں سے تعمیر لاکر کے دکھا دیں۔ .... اللہ جل شانہ کی ذاتِ عالی سے تعلق پیدا ہو جائے اور ان کی قدرت سے براہِ راست استفادہ ہو، اس کے لیے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے طریقے لے کر آئے ہیں۔ جب ان کے طریقے زندگیوں میں آئیں گے تو اللہ جل شانہ ہر نقشے میں کامیابی دے کر دکھائیں گے ..... آج امت میں کسی حد تک انفرادی اعمال کا رواج ہے گو ان کی حقیقت نکلی ہوئی ہے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے طفیل پوری امت کو دعوت والی محنت ملی تھی اس کے بندوں کا تعلق اللہ جل شانہ سے قائم ہو جائے۔ اس کے لیے انبیاء علیہم السلام والے طرز پر اپنی جان و مال کو جھونک دینا اور جن میں محنت کر رہے ہیں ان سے کسی چیز کا طالب نہ بننا، اس کے لیے، ہجرت بھی کرنا اور نصرت بھی کرنا..... اس راستے میں محنت کرنے والوں

کی دعائیں بنی اسرائیل کے انبیار علیہم السلام کی دعاؤں کی طرح قبول ہوتی ہیں یعنی جس طرح ان کی دعاؤں پر اللہ جل شانہ نے ظواہر کے خلاف اپنی قدرت کو استعمال فرما کر ان کو کامیاب فرمایا اور باطل طاقتوں کو توڑ دیا اسی طرح اس محنت کرنے والوں کی دعاؤں پر اللہ جل شانہ ظواہر کے خلاف اپنی قدرت کے مظاہرے فرمائیں گے۔ اور اگر عالمی بنیاد پر محنت کی گئی تو تمام اہل عالم کے قلوب میں ان کی محنت کے اثر سے تبدیلیاں لائیں گے۔"

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "چیزوں میں سے چیزیں نکل رہی ہیں اور چیزوں میں سے اثرات وخواص ظاہر ہو رہے ہیں"۔ مگر مولانا کے نزدیک انبیار کے ذریعہ جو حقیقت انسانوں پر کھولی گئی ہے وہ یہ ہے کہ "جو کچھ چیزوں سے بنتا ہوا اور ظاہر ہوتا ہوا نظر آتا ہے، یہ چیزوں سے نہیں بنتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور امر سے بنتا ہے"۔ اگر یہ حقیقت ذہنوں میں پوری طرح بیٹھ جائے تو مولانا کے الفاظ میں "بازار کے نقشوں سے اساس زندگی ہٹ کر دعاؤں پر آجاتی ہے اور بڑے سے بڑا اور مشکل سے مشکل مرحلہ خداوند قدوس کی قدرت کاملہ سے آسان سے آسان بن جاتا ہے"۔ مولانا کی تقریریں جن لوگوں نے سنی ہیں وہ جانتے ہیں کہ مولانا کا سب سے زیادہ زور اس حقیقت کو ذہن نشین کرانے پر ہوتا تھا کہ محنت اور کوشش کا اصل میدان کیا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زراعت، تجارت، ملازمت وغیرہ محنت کے میدان ہیں۔ اسی طرح اجتماعی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے لوگ جن چیزوں پر انحصار کرتے ہیں وہ الکشن اور حکومت پر اثر ڈالنے اور اس پر قبضہ کرنے کی دوسری کوششیں ہیں۔ مگر مولانا کا کہنا تھا کہ یہ چیزیں مثل بجلی کے بلب اور پنکھے کے ہیں۔ بلب اور پنکھے پر عمل کر کے ہم نہ انہیں روشن کر سکتے ہیں اور نہ انہیں چلا سکتے ہیں، بلکہ اس کے لیے بجلی کے بٹن تک ہاتھ پہونچانے کی ضرورت ہے، اسی طرح اگر خدا سے تعلق پیدا ہو جائے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اور اگر تعلق پیدا نہ ہو تو ساری کوششیں کے باوجود کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

طریق کار

اس مقصد کے لیے مولانا کا طریق کار نہایت سادہ تھا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسجدوں کو ان کے اعمال کے ساتھ زندہ کرنے کی کوشش۔ گشت اور سفر جس پر مولانا بہت زور دیتے تھے، اس کا مقصد بھی حقیقۃً آدمی کو "مسجد والا" بنانا تھا۔ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ لوگوں کو ان کی روزمرہ کی دنیوی مصروفیتوں سے نکال کر کچھ دنوں کے لیے ایک خاص طرح کی دینی

فضا میں رکھا جائے۔ جب کہ آدمی عبادات و اذکار میں وقت گزارے دوسروں کو دینی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرے، اور اس طرح تربیت یافتہ ہو کر جب اپنے وطن واپس آئے تو آئندہ مسجد والی زندگی میں مصروف ہو جائے۔ مسجد والی زندگی ہی مولانا کے نزدیک دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضامن تھی۔

ایک جماعت کے نام خط میں اس طرح طریق کار کی وضاحت فرماتے ہیں۔

"دین سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے ہر شخص سے خواہ کسی شعبہ سے متعلق ہو، چار ماہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اپنے مشاغل، ساز و سامان اور گھر بار سے نکل کر ان چیزوں کی دعوت دیتے ہوئے اور خود مشق کرتے ہوئے ملک بہ ملک، اقلیم بہ اقلیم، قوم بہ قوم، قریہ بہ قریہ پھریں گے۔ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے ہر امتی کو مسجد والا بنایا تھا۔ مسجد کے کچھ مخصوص اعمال دیے گئے۔ مسجد میں اللہ کی بڑائی کی، ایمان کی اور آخرت کی باتیں ہوتی تھیں، اعمال سے زندگی بننے کی باتیں ہوتی تھیں، عملوں کے ٹھیک کرنے کی تعلیمیں ہوتی تھیں۔ ایمان و عمل صالح کی دعوت کے لیے ملکوں اور علاقوں میں جانے کی تشکیلیں بھی مسجد ہی سے ہوتی تھیں۔ اللہ کے ذکر کی مجلسیں مسجدوں میں ہوتی تھیں۔ یہاں تعاون، ایثار، ہمدردیوں کے اعمال ہوتے تھے، ہر شخص حاکم، محکوم، مالدار، غریب، تاجر، زارع، مزدور، مسجد میں آکر زندگی سیکھتا تھا۔ اور باہر جاکر اپنے اپنے شعبہ میں مسجد والے تاثر سے چلتا تھا۔ آج ہم دھوکے میں پڑ گئے کہ ہمارے پیسے سے مسجد چلتی ہے۔ مسجدیں اعمال سے خالی ہوگئیں اور چیزوں سے بھر گئیں۔ حضور صلعم نے مسجد کو بازار والوں کے تابع نہیں کیا حضور صلعم کی مسجد میں نہ بجلی تھی، نہ پانی تھا، نہ غسل خانے تھے، خرچ کی کوئی شکل نہ تھی۔ مسجد میں آکر داعی بنتا تھا، معلم اور متعلم بنتا تھا، ذاکر بنتا تھا۔ نمازی بنتا تھا، مطیع بنتا تھا، متقی زاہد بنتا تھا، خلیق بنتا تھا، باہر جاکر ٹھیک زندگی گزارتا تھا۔ مسجد بازار والوں کو چلاتی تھی۔ ان چار ماہ میں ہر جگہ جاکر مسجدوں میں ہر امتی کو لانے کی مشق کریں مسجد والے اعمال کو سیکھتے ہوئے دوسروں کو یہ محنت سیکھنے کے لیے تین چلوں کے واسطے آمادہ کردیں۔ واپس اپنے مقام پر آکر اپنی بستی کی مسجد میں ان اعمال کو زندہ کرنا ہے، ہفتہ میں دو مرتبہ گشت کے ذریعہ بستی والوں کو جمع کرکے انہیں چیزوں کی طرف متوجہ کرنا اور مشق کے لیے فی گھر ایک نفر تین چلوں کے لیے باہر نکلنا ہے۔ ایک گشت اپنی مسجد کے ماحول میں اور دوسرا گشت دوسری مسجد کے ماحول میں کریں۔ ہر مسجد میں مقامی جماعت بھی بنائیں ہر مسجد کے احباب روزانہ

فضائل کی تعلیم کریں۔ اپنے شہر یا بستی کے قریب دیہات میں کام کی فضا بنے، اس کے لیے ہر مسجد سے تین یوم کے لیے جماعتیں پانچ کوس کے علاقے میں جائیں۔ ہر دوست مہینے میں تین یوم پابندی سے لگائے۔ الحسنۃ بعشر امثالھا کے مصداق تین دن پر حکماً تیس دن کا ثواب ملے گا۔ پورے سال ہر مہینے تین دن لگائے تو سارا سال اللہ کی راہ میں شمار ہوگا۔"

اشاعت سے پرہیز

مولانا اشاعت کے عام طریقوں کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اس کام کی تعمیم کے لیے رواجی طریقوں۔ اخبار، اشتہار، پریس وغیرہ اور رواجی الفاظ سے بھی پورے پرہیز کی ضرورت ہے۔ یہ کام سارا کا سارا غیر رواجی ہے۔ رواجی طریقوں سے رواج کو تقویت پہونچے گی اس کام کو نہیں۔ اصل کام کی شکلیں، دعوت، گشت، تعلیم تشکیل وغیرہ ہیں۔"

مولانا کے ذہن میں لٹریچر کا جو تصور تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتا ہے:

"فضائل قرآن مجید پڑھ کر تھوڑی دیر کلام پاک کی ان سورتوں کی تجوید کی مشق کی جائے جو عموماً نمازوں پر پڑھی جاتی ہے۔ اللہ پاک توفیق دیں تو ہر کتاب میں سے تین چار صفحے پڑھے جائیں۔ تعلیم میں اپنی طرف سے تقریر نہ ہو، حدیث شریف پڑھنے کے بعد دو تین جملے ایسے کہہ دیئے جائیں کہ اس سے عمل کا جذبہ ابھر آئے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی تالیف فرمودہ فضائل قرآن مجید، فضائل نماز، فضائل تبلیغ، فضائل ذکر فضائل صدقات حصہ اول دوم، فضائل رمضان، فضائل حج، (ایام حج و رمضان میں) اور مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی دام مجدہ کی (مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج) صرف یہ کتابیں ہیں جن کو اجتماعی تعلیم میں پڑھنا اور سننا ہے اور تنہائیوں میں بیٹھ کر بھی ان کو پڑھنا ہے۔"

اشاعت سے پرہیز کا یہ عالم تھا کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے مکاتیب کی تلاش میں ایک صاحب نے دہلی کا سفر کیا۔ مگر وہاں ایک مکتوب کی نقل بھی محفوظ نہیں مل سکی۔ حالانکہ آپ کثرت سے خطوط لکھتے تھے۔

غیر مسلموں میں تبلیغ

غیر مسلموں میں تبلیغ کے بارے میں مولانا کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جب تک مسلمانوں میں دینی

زندگی پیدا نہ ہو، اغیار میں دین کے لیے کشش پیدا نہیں ہوسکتی۔ ایک دفعہ فرمایا:

"جب تک یقین اور علم نبوت کے مطابق عبادات درست نہ ہوجائیں، اخلاق نہیں آتے اور جب تک ہم میں اخلاق نہیں آئیں گے دوسروں میں دین نہیں پھیلے گا۔ اغراض کے لیے کسی سے سلوک کرنا اخلاق نہیں ہے بلکہ کوئی کام بھی جب تک اس میں اخلاص نہ ہو اس کی قطعاً کوئی قیمت نہیں ہے عمل اخلاص کے بغیر مردہ ہے اور دیکھو، گھروں، بازاروں، دفتروں، یہاں تک کہ مدارس و مساجد میں بھی ایسے مرداروں کے ڈھیر لگ رہے ہیں"

اسی لیے آپ کم از کم پہلے مرحلہ میں اصلاح و تبلیغ کی زیادہ تر کوشش مسلمانوں پر صرف کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

اجتماعیت

مولانا اجتماعیت کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اپنے رفقاء کو آپ کی ہدایت ہوتی تھی کہ "ہر کام کو اجتماعی کریں۔ حتیٰ کہ سفر میں بھی یکجا رہنے کی بھرپور کوشش کریں" مگر اجتماعیت کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر عام تصور سے کچھ مختلف تھا۔ اس کو ہم شاید اس طرح بیان کرسکتے ہیں کہ آپ کے نزدیک اجتماعیت کی اہمیت تھی مگر جماعت بندی کی نہیں۔ فرماتے ہیں:

"ہم نے اس کام کے لیے کوئی انجمن نہیں بنائی۔ نہ اس کا کوئی دفتر ہے نہ رجسٹر ہے نہ فنڈ ہے یہ سارے ہی مسلمانوں کا کام ہے ہم نے مروجہ طریقہ پر کوئی علٰحدہ جماعت بھی نہیں بنائی ہے۔ جس طرح مسجد میں نماز کے عمل پر مختلف طبقوں اور مشغلوں والے مسلمان آکر جُڑ جاتے ہیں اور نماز سے فارغ ہوکر اپنے اپنے گھروں اور مشغلوں میں چلے جاتے ہیں اسی طرح ہم آپ سب سے کہتے ہیں کہ کچھ وقت کے لیے اپنے گھروں اور مشغلوں سے نکل کر یہ محنت اور مشق کریجیے۔ اور پھر اپنے گھروں اور مشغلوں میں آکر ان اصولوں کے مطابق لگ جایئے ——— آپ نے اگر یہ چیز محنت کرکے حاصل کرلی تو دنیا بھر کے سائنس والے آپ سے یہ طریقہ سیکھنے آئیں گے اور خدا نے چاہا تو آپ دنیا کے امام ہوں گے"

حکمتِ تبلیغ

ایک تقریر میں تبلیغی کارکنوں کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا:

خصوصی گشت میں اگر دیکھا جائے کہ وہ صاحب جن سے آپ ملنے گئے ہیں اس وقت توجہ سے بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو مناسب طریقہ سے جلدی سے بات ختم کرکے ان کے پاس سے اٹھ آنا چاہیئے۔ اور ان کے لیے دعا کرنی چاہیئے اور اگر دیکھا جائے کہ وہ صاحب متوجہ ہیں تو پھر پوری بات ان

کے سامنے رکھنی چاہیئے ...... خصوصی گشت میں جب دینی اکابر کی خدمت میں حاضری ہو تو ان سے صرف دعا کی درخواست کی جائے اور ان کی توجہ دیکھی جائے تو کام کا کچھ ذکر کر دیا جائے"

دعا

مولانا کی تقریروں کا خاتمہ ہمیشہ دعا پر ہوتا تھا۔ لفظ "دعا" اپنے عام استعمالی مفہوم کے لحاظ سے شاید اس کی کیفیت کو ادا کرنے سے قاصر ہے جو مولانا کی دعامیں ہوتی تھی۔ مولانا کی دعوت کا اصل اور مغز اللہ سے استعانت اور دعا کا تعلق پیدا کرنا تھا۔ اور یہ چیز ان کی دعامیں اس طرح ابھر آتی تھی کہ اس وقت وہ اپنی دعوت کا مجسم نمونہ بن جاتے تھے۔ ایک واقف حال کے الفاظ میں "جب دعا کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ نہ اس سے پہلے دعا کی ہے نہ اس کے بعد کریں گے۔ سب کچھ اسی دعامیں مانگ لینا ہے اور سب کچھ اسی دعامیں کہہ دینا ہے"۔ مولانا کی دعا کی کیفیت، اس کے مضامین، اس کی آمد اور جوش وخروش اس کی رقت انگیزی اور اس کی تاثیر مولانا کے ان خصائص میں سے تھی جن کی مثال دور دور دیکھنے میں نہیں آتی۔ جب دعا کرتے، حاضرین کا عجیب حال ہوتا، خاص طور پر جب اردو میں دعا کے الفاظ ادا فرماتے تو آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑتا۔ دور دور سے رونے والوں کی ہچکیاں سننے میں آتیں۔"

ایک صاحب جو ایک اجتماع میں شریک تھے، لکھتے ہیں:

"مولانا محمد یوسف صاحب نے دعا کی۔ اپنے گناہوں کی توبہ۔ مغفرت، آخرت کی سرخروئی، دین کی عظمت، تمام انسانوں کے لیے ہدایت طلبی، یہ سب باتیں اللہ سے طلب کی گئیں۔ دعا یوں مانگی گئی جس طرح مانگنے کا حق ہوتا ہے۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو روئی نہ ہو کوئی زبان نہ تھی جو ہلی نہ ہو، کوئی دل نہ تھا جو پھٹ پڑنے پر نہ آیا ہو۔ بس ایک ہی احساس تھا کہ اتنی زندگی جو گزری ناکامی میں گزری۔ میں ہی سراپا معصیت ہوں۔ سب برائیاں مجھ ہی میں ہیں۔ اے اللہ ان سب کوتاہیوں کو معاف فرما اور میری زندگی کو اپنے راستے پر لگا دے۔"

ایک دعا جو اتفاق سے ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ محفوظ ہو گئی ہے، اس کے چند الفاظ یہ ہیں:

اے اللہ ہمارے گناہوں کو معاف فرما...... اے خدا ہماری محنت کے بگڑ جانے کے اس جرم عظیم کو معاف فرما جس جرم عظیم سے ہزاروں خرابیاں ہم میں پیدا ہو گئی ہیں۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم جس محنت پر ڈال کر گئے اس محنت کو چھوڑ کر ہم ان محنتوں میں الجھ گئے جن محنتوں سے وہ نکال کر گئے تھے ...... اے اللہ ہمیں عصیاں کے دریاؤں سے نکال دے اور ہمیں طاعت کی سڑکوں پر ڈال دے ...

اے خداوند قدوس جس قسم کے زمانے میں تونے اس تبلیغ کے ذریعہ اس کلمہ و نماز پر محنت کی دعوت پیدا فرمادی اور اپنی راہ میں نکلنے کی توفیق دی ..... اے رب کریم اپنے کرم سے سب کو قبول فرمالے اور ان سب کی ایسی تربیت فرما کہ یہ نقل و حرکت تجھے پسند آجائے ..... اے اللہ درندوں کی اور اژدہوں کی قسم سے جتنے انسان اور درندے ہیں اور جن کو تجھے انسانیت سے نوازنا ہی نہیں، اے خدا ایسے ایسوں کو چن چن کر ہلاک فرما۔ ایسوں کی زمینوں کو، ان کے لیے پہاڑ دے، ایسوں کے مکانوں کو ان پر توڑ دے۔ ایسوں سے نعمتوں کو اپنی چھین لے ..... اے خدا لوٹ کھسوٹ کے ماحول کو ختم کر، ظلم وستم کے ماحول کو ختم کر، عدل و انصاف کے ماحول کو قائم کر، علم و ذکر کے ماحول کو قائم کر، خدمت خلق کے ماحول پیدا کر تعاون و ہمدردی و محبت کے ماحول کو قائم کر ..... اے اللہ ہماری دعاؤں کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرما۔

مقبولیت

مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی زندگی ہی میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بجنور کے ایک اجتماع کے مشاہد فرماتے ہیں ـــــ "اس میں حضرت مولانا اپنے تمام رفقاء کے ہمراہ تشریف لائے تھے، عقیدت مندوں کے ہجوم نے بڑی دشواری پیدا کر دی۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح مولانا سے مصافحہ کر لوں۔ انتظاماً قیام گاہ پر بعض میواتیوں کا پہرہ لگانا پڑا۔ پھر بھی قیام گاہ کے دروازہ کی چوکھٹ، داخلے کی بے محابا کوشش کرنے والے کی وجہ سے اکھڑ گئی۔ جب مولانا قیام گاہ سے جلسہ گاہ میں تشریف لاتے مجمع آپ کے گرد سمندر کی طرح موجیں مارتا ہوا نظر آتا۔"

مولانا شیخ طریقت بھی تھے۔ بیعت چاروں سلسلوں میں اپنے والد ماجد صاحب کے واسطے سے کرتے تھے۔ ایک صاحب رائے ونڈ کا حال بیان کرتے ہیں۔ "ایک کثیر مجمع نے بیعت کی۔ بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں میں پگڑیاں اور چادریں وغیرہ تھیں اور اتنا کثیر مجمع تھا کہ کئی حضرات مکبّر کی طرح پکار پکار کر الفاظ بیعت کو بیعت کرنے والوں تک پہونچا رہے تھے۔ عجیب دل کش منظر تھا۔ میرے ایک عزیز کہنے لگے کہ آج تو حضرت جی نے امام شہید (سید احمد صاحب رائے بریلوی) کی یاد تازہ کر دی۔"

تقریر

مولانا کو تقریر کا عجیب و غریب ملکہ تھا جو کچھ وہبی تھا اور کچھ ان کے دعوتی جذبہ نے ان کے اندر پیدا کر دیا تھا۔ ایک عالم کے الفاظ میں آپ کی تقریروں کو سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "آپ کو اللہ

کی طرف سے ایک علم عطا ہوا ہے (جو مدرسہ اور کتب خانہ کا علم نہیں ہے) اور اسی کا نام حکمت ہے اور قوت بیان مزید براں ہے" بعض قریبی لوگوں کا اندازہ ہے کہ آخر میں مجموعی طور پر آٹھ آٹھ گھنٹے تک بولنے کی نوبت آتی تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ سننے والے خواہ وہ جاہل ہوں یا عالم آپ کی تقریریں سننے سے گھبراتے نہیں تھے بلکہ پوری تقریر کے دوران ہمہ تن گوش بنے رہتے تھے۔ اور ایک کثیر تعداد کا یہ عالم ہوتا تھا کہ شدت پسندیدگی میں وہ کاغذ قلم لے کر اس کو دوران تقریر ہی میں نوٹ کرنا شروع کر دیتے تھے۔ آپ تقریر پر تقریر کرتے رہتے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہر بعد کی تقریر میں نئے سننے والوں کو یہ اندازہ ہوتا کہ بولنے والا اسی وقت بولنے کھڑا ہوا ہے اور اس سے پہلے اس کو اپنے خیالات وجذبات کے اظہار کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس موقع پر اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتا ہے"

ایک صاحب مولانا کے ایک سفر کی روداد بیان کرتے ہیں۔ ہر جگہ جہاں آپ کا جانا ہوا "صبح وشام گھنٹوں خطاب فرماتے رہے۔ بولتے بولتے گلے میں سوجن پڑ گئی۔ ڈاکٹروں نے اصرار سے مشورہ دیا کہ کچھ دنوں کے لیے بولنا چھوڑ دیا جائے۔ مگر حضرت مولانا اس پر آمادہ نہیں ہوئے۔ حسب عادت تقریروں اور گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رہا اور مرض ترقی کرتا گیا۔

تقریر کا انداز بھی عجیب تھا۔ بات کرتے کرتے آستین چڑھاتے پھر اتارتے۔ بیٹھ کر تقریر شروع کرتے اور پھر درمیان میں کھڑے ہو جاتے۔ کبھی درمیان کلام میں ایک آہ بھرتے جو درد واثر میں ڈوبی ہوئی عجیب کیفیت پیدا کر دیتی۔ ایک صاحب فرماتے ہیں:

"حضرت جی گھنٹوں مسلسل بیان کرتے رہتے تھے بندہ نے خود ایک دن میں حضرت کے پانچ بیان سنے ہیں۔ جن میں سے ایک ساڑھے پانچ گھنٹے کا تھا۔ یہاں علوم اندر سے پھوٹ کر نکلتے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ آپ نہیں کہہ رہے ہیں کہلوایا جا رہا ہے۔ علوم الٰہیہ کا فیضان موسلا دھار بارش کی طرح حضرت کے قلب پر ہوتا تھا"

ذوق علم

آپ کے علمی ذوق کے بارے میں آپ کے ایک قریبی واقف کار روایت کرتے ہیں کہ ایک بار مولانا نے فرمایا ــــ " میں نے سوا ایک دفعہ کے بازار سے ایک آنہ کی بھی مٹھائی خرید کر نہیں کھائی یہ وجہ نہ تھی کہ میرے پاس پیسے نہ ہوتے تھے۔ بلکہ بات یہ تھی کہ میں نے پیسے جمع کرنے کا ایک ڈبہ بنایا تھا اس میں جو پیسے مجھ کو ملتے ڈال دیا کرتا تھا کہ ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی کتابیں خریدوں گا تعلیم کے زمانے میں مولانا انعام الحسن صاحب آپ کے ساتھی اور ہم سبق تھے۔ وہ روایت کرتے ہیں

"ہم دونوں نے آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ رات کے ابتدائی آدھے حصے میں ہم میں سے ایک مطالعہ کرے گا اور دوسرا سوئے گا۔ اور آدھی رات ہو جانے پر مطالعہ کرنے والا چائے بنائے گا اور دوسرے ساتھی کو اٹھا کر اور اس کے ساتھ چائے پی پلا کر سو جائے گا اور اسی دوسرے کے ذمہ ہوگا کہ فجر کی جماعت کے لیے سونے والے ساتھی کو اٹھائے۔ ایک دن مولانا مرحوم شروع رات میں مطالعہ کرتے تھے اور میں سوتا تھا اور دوسرے دن برعکس ترتیب رہتی تھی۔"

بستی نظام الدین کی زندگی میں آپ کا معمول تھا کہ روزانہ ایک خاص وقت میں آپ اپنے مطالعہ کے کمرے میں چلے جاتے اور وہاں مقررہ وقت تک مطالعہ اور تحریر کا سلسلہ جاری رہتا۔

زبان

کسی تحریک کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ایک زبان پیدا کرتی ہے۔ مولانا یوسف صاحب نے بھی تبلیغی تحریک کو ایک مخصوص زبان اور طرز ادا دیا جو اس طرح رائج ہوا کہ ہزاروں افراد کی زبان سے بے تکلف ادا ہونے لگا۔ مثلاً مسجد میں تبلیغی جماعت کا اجتماع ہو رہا ہے اس میں شرکت کی دعوت دینی ہے تو اس طرح کہیں گے۔" بھائی مسجد میں کچھ فکر کی بات ہو رہی ہے، آؤ وہاں چلیں، مولانا یوسف صاحب ایک مکتوب میں لکھتے ہیں ——" جب محلوں کی مساجد میں ہفتوں کی دو گشتوں کے ذریعہ فی گھر ایک آدمی تین چلے کے لیے نکلنے کی آواز لگ رہی ہوگی۔ تعلیموں اور تسبیحات پر احباب جڑ رہے ہوں گے۔ ہر مسجد سے تین دن کے لیے جماعتیں نکالنے کی کوششیں ہو رہی ہوں گی تو شب جمعہ کا اجتماع صحیح نہج پر ہوگا اور کام کے بڑھنے کی صورتیں بنیں گی.... مشورے سے ایسے احباب سے عموماً دعوت دلوائی جائے جو محنت کے میدان میں ہوں اور جن کی طبیعت پر کام کے تقاضے غالب ہوں بہت ہی فکر و اہتمام سے تشکیلیں کی جائیں۔ اگر اوقات وصول نہ ہوں تو رات کو بھی محنت کی جائے، رو رو کر مانگا جائے..... تمام انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے زمانے میں کسی نہ کسی نقشہ کے مقابلہ پر آئے اور بتایا کہ کامیابی کا اس نقشہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں" جزیرۂ عرب کو دین حیات کے لیے جان کھپانے کا مرکز قرار دے کر اس میں طریقۂ جُہد کے سیکھنے سکھانے کا رواج ڈال کر ہر طرف دین حیات کے لیے ٹھوکریں کھانے کے لیے مقامی احباب کے ساتھ مل کر روانہ کرنے کا رُخ ڈالا جائے..... تین تین چلہ کی جم کر دعوت دیں.... عربلاد کس میرس طبقات میں کام کا ضرور پھیر ڈالیں۔"

اپنے شہر یا بستی کے قریب دیہات میں کام کی فضا بنے اس کے لیے ہر مسجد سے تین یوم کے لیے جماعتیں

پانچ پانچ کوس کے علاقے میں جائیں "۔ ماہ رمضان کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں : "کیا ہی اچھا ہو کہ اس مبارک زمانہ میں تین تین چلوں کے لیے تشکیل کرکے جماعتیں روانہ کی جائیں تاکہ ارکانِ اسلام کی حیات والی محنت کا حساب اس ماہ میں قائم ہو۔ اور اس ماہ میں چلے کے لیے نکلنے کی برکت سے زیادہ وقت کے لیے اللہ رب العزت کے راستہ میں رواج پڑ جائے "

یہ نمونہ کے چند ٹکڑے ہیں ۔ اسی طرح مولانا نے ایک مستقل تبلیغی زبان پیدا کی جس کے اندر سادگی کے ساتھ گہرائی اور تحریکی شدت کے ساتھ مٹھاس کی عجیب وغریب آمیزش تھی ۔

آخر میں ایک واقعہ پر اس گفتگو کو ختم کروں گا ۔ ندوہ کے ایک عالم نے مجھ سے بیان کیا ایک جلسہ میں مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر ہو رہی تھی ۔ پورے مجمع پر سکون خاموشی چھائی ہوئی تھی ۔ مقرر حکمت و معرفت کی بارش برسا رہا تھا ۔ جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی اس جلسہ میں موجود تھے ۔ راوی کا بیان ہے کہ ایک موقع پر جب کہ تقریر اپنے عروج پر تھی ۔ مولانا کی زبان سے بے اختیار نکلا ـــــ "اگر میں قسم کھاؤں تو میں حانث نہیں ہوں گا کہ اس وقت پورے عالم اسلام میں اس درجہ یقین و ایمان کے ساتھ بولنے والا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں ہے " (۱۳۸۶ھ)

اعلان

اوپر جو مضمون نقل کیا گیا ہے وہ تقریباً ۲۰ سال پہلے لکھا گیا تھا ۔ اس طرح کے اور بھی کچھ قدیم مضامین ہیں ۔ ان تمام مضامین کا مجموعہ ایک کتاب کی صورت میں شائع ہو گیا ہے جس کا نام " تبلیغی تحریک " ہے ۔ انشاءاللہ جلد ہی اس کا انگریزی اڈیشن بھی شائع کیا جائے گا ۔

ادارۂ الرسالہ

بمبئی میں

اجتماع

مولانا وحید الدین خاں صاحب ، صدر اسلامی مرکز

انشاء اللہ ۱۵ رمئی ۱۹۸۵ کی صبح کو بروز بدھ

بمبئی پہونچیں گے

بمبئی میں ۱۸ رمئی تک مولانا موصوف کا قیام رہے گا۔ اس دوران میں (۱۵ تا ۱۶ مئی) مولانا موصوف بمبئی کے مختلف مقامات پر خطاب کریں گے۔ بمبئی میں موصوف کا قیام جامعہ اصلاح البنات (ڈونگری) میں ہوگا۔ اس تفصیلی پروگرام اور معلومات پتہ ذیل سے حاصل کریں۔

ہارون ٹریڈنگ کمپنی — ۱۱ بھاجی پالا لین — بمبئی ۳

فون نمبر ، آفس 335423

رہائش گاہ 8515413

۱. ۱۶ مارچ ۱۹۸۵ کو دہلی ٹیلی وژن پر اردو خطاطی کا ایک پروگرام دکھایا گیا۔ اس موقع پر اردو ٹائٹل کے چند منتخب نمونے دکھائے گئے۔ ان میں سے ایک "پیغمبر انقلاب" کا ٹائٹل بھی تھا۔ مشہور خطاط اور آرٹسٹ جناب خلیق ٹونکی صاحب نے اس کے فنی پہلوؤں کی وضاحت کی۔

۲. ۲۴ فروری کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔ حسب معمول بعد نماز مغرب ماہانہ درس قرآن کا اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے صبر کی چند آیات کی روشنی میں دین میں صبر کی اہمیت بتائی۔ صدر اسلامی مرکز نے بتایا کہ دنیا اور آخرت کی تمام کامیابیوں کا راز صبر ہے۔ یہ بات قرآن میں نہایت واضح ہے۔ مگر صبر ہمیشہ اپنے آپ کو تھامنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ لوگ چونکہ یہ قیمت دینا نہیں چاہتے اس لئے وہ صبر کا طریقہ بھی اختیار نہیں کرتے۔ درس کی اہمیت کی بنا پر کچھ لوگوں نے یہ تجویز کیا کہ ہر ماہ اخبار میں درس کا اعلان کیا جائے تاکہ زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔

۳. درس قرآن میں شرکا کا دائرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اب باہر کے لوگ بھی اپنے سفر کی ترتیب اس طرح بنانے لگے ہیں کہ وہ دہلی آئیں تو ماہانہ درس قرآن میں بھی شریک ہو سکیں۔ ۲۴ فروری کے اجتماع میں راجستھان کے ایک صاحب شریک ہوئے۔ وہ اپنے ساتھ ٹیپ ریکارڈر لائے تھے۔ مذکورہ درس قرآن کو ٹیپ کر کے لے گئے۔ اسی طرح ۲۶ جنوری کے اجتماع میں جناب سلیمان سیٹھ (ایم پی) نے مع اپنے ساتھیوں کے شرکت فرمائی۔

۴. بعض شہروں میں حلقہ الرسالہ کے افراد یہ کر رہے ہیں کہ نقشہ بنا کر وہ ایک ایک شخص سے ملتے ہیں اور الرسالہ کا تعارف کراتے ہیں۔ اس طرح کافی لوگ الرسالہ کے خریدار بن رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ انفرادی اپروچ کا یہ طریقہ ہر جگہ اختیار کیا جائے۔

۵. مدینہ ٹیکنیکل کالج (حیدر آباد) ایک قدیم تعمیری ادارہ ہے۔ اس نے اپنی سالانہ تقریب کے موقع پر ایک سوونیر شائع کیا تھا۔ اس پر انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے پیغام بھیجنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس سلسلہ میں ان کو جو تحریری پیغام بھیجا گیا تھا وہ عمومی افادہ کے پیش نظر زیر نظر اشاعت میں "پیغام" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔

۶ بہت سے لوگ اپنے دل میں یہ تڑپ لئے ہوئے تھے کہ کوئی ایسا میگزین ہو جس میں اسلا

کی دعوت خالص مثبت انداز میں اور موثر اسلوب میں پیش کی گئی ہو تاکہ وہ اسے اطمینان کے ساتھ غیر مسلموں کے ہاتھ میں دے سکیں۔ ایسے لوگوں کے لئے انگریزی الرسالہ ایک نعمت ثابت ہوا ہے۔ وہ اس کو مسرت کے ساتھ غیر مسلموں تک پہنچا رہے ہیں۔ سعودی عرب سے ہم کو ایک خط موصول ہوا ہے۔ مکتوب نگار لکھتے ہیں کہ وہ ایک اسپتال میں کام کرتے ہیں۔ اس اسپتال میں فلپائن کی ایک خاتون نے اسلام قبول کر لیا۔ مکتوب نگار نے طے کیا کہ وہ مذکورہ خاتون کو ایک اسلامی تحفہ پیش کریں۔ اس کے لئے انھوں نے الرسالہ کا انتخاب کیا۔ انھوں نے مذکورہ نو مسلمہ کا پتہ اور سالانہ زر تعاون بھیجتے ہوئے لکھا ہے کہ میری طرف سے ان کو انگریزی الرسالہ ایک سال کے لئے جاری کر دیا جائے۔

۷ الرسالہ کس طرح لوگوں کے ذہن کو بیدار کر رہا ہے۔ اس کا اندازہ ایک خط سے ہوگا۔ ایک صاحب مالیگاؤں سے لکھتے ہیں: میں باقاعدگی سے ہر ماہ الرسالہ خرید کر پڑھتا ہوں۔ اس کے تمام مضامین ہمیشہ کچھ نہ کچھ سبق اور نصیحت دیتے ہیں۔ الرسالہ کے کسی مضمون کو پڑھنے کے بعد اگر آدمی میں ذرا سی بھی عقل ہو تو اس کو اپنی زندگی کا مقصد مل جائے گا۔ وہ خود بخود سیکھ جائے گا کہ اسے دنیا میں کس طرح رہنا ہے۔ الرسالہ کے ذریعہ دین اسلام کی جو اشاعت کی جا رہی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ ابھی مجھ کو فروری ۱۹۸۵ کا شمارہ ملا۔ اس میں "یہ علامات کیوں" پڑھ کر میں سوچنے لگا کہ نہ جانے کتنی بار ٹرین سے سفر کر چکا ہوں۔ ہر بار اس کی روانگی سے پہلے سیٹی کی آواز سنی ہے۔ مگر کبھی میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ اس سیٹی کو فطرت کے الارم سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں۔ یہ بات صرف آپ جیسے اعلیٰ ذہن رکھنے والی شخصیت ہی سوچ سکتی ہے۔

۸ انگریزی الرسالہ کے سلسلے میں ہم کو تقریباً روزانہ خطوط مل رہے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کے اندر اور ملک سے باہر خدا کے فضل سے اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ حال میں ہم کو مرکز الملک فیصل للبحوث والدراسات الاسلامیہ (ریاض) کا خط مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۸۴ موصول ہوا ہے۔ یہ ادارہ عالم اسلام کے انتہائی بڑے اداروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے ڈائرکٹر جنرل نے الرسالہ (انگریزی) سے دل چسپی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ان کے ادارہ کو مستقل طور پر روانہ کیا جائے۔ نیز پچھلے تمام شمارے بھی ان کو فراہم کئے جائیں تاکہ ان کو ادارہ کی لائبریری میں محفوظ کیا جا سکے۔ اس خط کا عکس بالمقابل صفحہ پر دیا جا رہا ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

لملك فيصل للبحوث والدراسات الإسلامية

KING FAISAL CENTER FOR RESEARCH AND ISLAMIC ST

December 24, 1

The Editor
Maktaba Al-Risala
C 29 Nizamuddin West
New Delhi 110 013

Subject: AL-RISALA

Dear Sir,

I have great pleasure in informing you that the King Faisal Centre for Resarch and Islamic Studies has recently been established. The Centre's library facilities are very extensive and its bibliographic holdings will cover not only all subjects relevant to Islamic civilization in all its aspects, but will extend to the pricipal fields of knowledge of other civilizations. Our acquisition policy will aim to fulfil these main objectives.

Briefly stated, I am very much impressed by your informative publication entitled "Al-Risala". Kindly send all back volumes to 1984. I hope that it would be useful to our readers. I shall be grateful if you would send the above mentioned publication to our library. Please also include the name of our Centre in your mailing list, so that we may receive your publications/periodical regularly.

Yours faithfully

Dr Zaid al-Husain
Director General

الرمز البريدي ١١٤١١ – المملكة العربية السعودية – ص.ب: ٣٥٢ – برقياً: حضارة – هاتف: ٤٦٥٢٢٥٥ – تلكس: ٢٠٥٤٧٠ حضارة

RIYADH 11411 — SAUDI ARABIA — P O BOX 352 — CABLE HADARA — TEL 4652255 — TELEX 205470 HADA

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارنبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط وکتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ
کیسٹ

الرسالہ کیسٹ کی روانگی انشاءاللہ یکم جون سے شروع ہوگی
انفرادی خریدار اطلاع بھیج کر جلد اپنی خریداری درج کرادیں۔
جو حضرات اس کی ایجنسی لینا چاہیں
وہ بھی اپنی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں۔
الرسالہ کیسٹ کی ایجنسی کم از کم پانچ کیسٹوں پر دی جائے گی۔

کمیشن :

۲۵ کیسٹ تک — ۲۰ فی صد
۲۵ کیسٹ سے زیادہ — ۲۵ فی صد

(ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ)

الرسالہ کیسٹ
سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

May 1985
Number 102

AL-RISALA MONTHLY
C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

الرسالہ
کیسٹ

(ماہانہ کیسٹ میگزین)



عصری اسلوب میں
اسلامی تعلیمات

مولانا وحیدالدین خاں کی آواز میں

ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ	ششماہی (۶ کیسٹ) ۱۴۰ روپیہ	سالانہ (۱۲ کیسٹ) ۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک ۵ ڈالر امریکی	۲۵ ڈالر امریکی	۵۰ ڈالر امریکی

مزید معلومات کے لیے لکھیں

الرسالہ کیسٹ

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

AL-RISALA CASSETTE C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

روزہ اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی مشق ہے
کھانے پینے میں بھی اور دوسرے معاملات میں بھی

شمارہ ۱۰۳
جون ۱۹۸۵

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	30/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاء اسلام	20/-
پیغمبر انقلاب	25/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	3/-
اسلام دین فطرت	3/-
تعمیر ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیات اسلام	2/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	3/-
راہیں بند نہیں	3/-

ایمانی طاقت	3/-
اتحاد ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبر اسلام	2/-
حقیقت حج	2/-
آخری سفر	3/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-
حل یہاں ہے	3/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیات طیبہ	3/-
باغ جنت	3/-
نار جہنم	3/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عقل کا فیصلہ	
کاروان اسلام	
راز حیات	

The Way to Find God	4/-
The Teachings of islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	3/-

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

جون ۱۹۸۵ □ شمارہ ۱۰۳

قیمت فی پرچہ	۳ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دو سو روپے
بیرونی ممالک سے :	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لیے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے بنک ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی AL-RISALA MONTHLY لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ
سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کامیابی کی فہرست

سید محمد کیرلا میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم لندن میں ہوئی۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر ان کے ۸۰ سالہ انگریز استاد پروفیسر سٹیونس (Dr. Cleveland Stevans) نے ۱۹۵۷ میں کہا تھا کہ اے نوجوان شخص، ایک دن تم یہاں اپنے ملک کے نمائندہ بن کر آؤ گے۔ مگر میں اس وقت تم کو دیکھنے کے لئے موجود نہ ہوں گا:

Young man, one of these days you will come here to represent your country. But I would not be there to see you.

یہ پیشین گوئی ۲۲ سال بعد پوری ہوئی۔ اور مسٹر سید محمد ہندستان کے ہائی کمشنر بن کر لندن گئے۔

سید محمد نے بیرسٹری سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد انھیں بہت سے اعلیٰ عہدے ملے۔ وہ اقوام متحدہ میں ہندستان کے مندوب تھے۔ کیرلا کابینہ میں وزیر ہوئے۔ مائنارٹیز کمیشن کے چیرمین مقرر ہوئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ سید محمد کے خاص دوستوں میں ایک مسٹر خوشونت سنگھ بھی تھے۔ انھوں نے سید محمد کے بارہ میں ایک مضمون لکھتے ہوئے اس کو اس پیراگراف پر ختم کیا ہے:

Seyid's passions were politics and law. He had applied for the Congress-I ticket to fight the last Parliamentary elections. Going by his records he would have undoubtedly won it. Kerala State Congress bosses denied him the ticket. It broke Seyid's heart and a month later the setback took his life.

سید محمد کا شوق سیاست اور قانون تھا۔ انھوں نے کانگرس آئی کے ٹکٹ کے لئے درخواست دی تھی تاکہ حالیہ پارلمنٹری الکشن میں لڑ سکیں۔ اپنے حالات کے لحاظ سے وہ ضرور کامیاب ہوتے۔ کیرلا ریاستی کانگرس کے ذمہ داروں نے انھیں ٹکٹ دینے سے انکار کیا۔ اس واقعہ نے سید محمد کا دل توڑ دیا اور ایک ماہ بعد اس حادثہ نے ان کی زندگی لے لی (ہندستان ٹائمس ۲۳ مارچ ۱۹۸۵)

آج انسان کامیابیوں کی فہرست میں صرف ایک کمی کو برداشت نہیں کر پاتا۔ حالانکہ انسان پر وہ دن آنے والا ہے جب کامیابیوں کی پوری فہرست اس سے چھن جائے گی۔ کیسا عجیب ہوگا وہ دن اور کیسا عجیب ہوگا اس دن انسان کا حال۔

پابند زندگی کی مشق

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصیام جنۃ فاذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث یومئذ ولا یصخب فان شاتمہ احد او قاتلہ فلیقل انی صائم انی صائم (اخرجہ البخاری ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روزہ ڈھال ہے پس جب تم میں سے کسی کا روزہ کا دن ہو تو وہ نہ فحش کلامی کرے اور نہ شور کرے۔ اور اگر کوئی شخص اس کو برا کہے یا اس سے لڑائی کرے تو اس کو چاہئے کہ وہ کہدے کہ میں روزہ دار ہوں، میں روزہ دار ہوں۔

عن ابی عبیدۃ بن الجراح قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: الصوم جنۃ ما لم یخرقھا (اخرجہ النسائی)

حضرت ابوعبیدہ نے فرمایا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ روزہ ڈھال ہے جب تک آدمی اس کو نہ توڑے۔

روزہ خواہشات پر روک لگانے کی مشق ہے۔ رمضان کے مہینہ میں اس کی مشق اس آخری حد پر کی جاتی ہے کہ کھانا پینا جیسی ضروری چیزوں کے استعمال سے بھی روک دیا جاتا ہے۔ کھانا پینا انسان کے لئے عین جائز ہے۔ مگر روزہ کے دنوں میں اس پر بھی پابندی لگادی جاتی ہے تاکہ دنیا میں پابند زندگی گزارنے کی اہمیت کا شدید احساس پیدا ہو۔

روزہ کا یہ مقصد اگر آدمی کے ذہن میں تازہ ہو تو وہ اشتعال کے مواقع پر مشتعل ہونے سے بچے گا۔ کیونکہ روزہ اپنے آپ پر کنٹرول کرنے ہی کا تو سبق ہے۔ پھر روزہ رکھتے ہوئے وہ اپنے آپ کو کنٹرول سے باہر کیسے لے جاسکتا ہے۔

اس طرح کا شدید سبق ہر سال کے ایک مہینہ میں عملی طور پر دلایا جاتا ہے۔ اگر آدمی صحیح شعور اور جذبہ کے ساتھ روزہ رکھے تو ایک مہینہ کی اس تربیت کا اثر اس کی بارہ مہینہ کی زندگی تک باقی رہے گا۔ تربیت کے دوران جب اس نے اپنے آپ کو تھاما تھا۔ جب وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہیں ہوا تھا۔ تو تربیت کے بعد یقیناً اس کے اوپر اس کے اثرات باقی رہیں گے۔ لوگ اس کو بقیہ مہینوں میں بھی "روزہ دار" پائیں گے۔ جس طرح انھوں نے اس کو رمضان کے مہینہ میں روزہ دار پایا تھا۔

خدا کا ثبوت

اگر ایک انسان کا وجود ہے تو ایک خدا کا وجود کیوں نہیں۔ اگر ہوا اور پانی، درخت اور پتھر، چاند اور ستارے موجود ہیں تو ان کو وجود دینے والے کا وجود مشتبہ کیوں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیق کی موجودگی عمل تخلیق کا ثبوت ہے۔ اور انسان کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں ایک ایسا خالق موجود ہے جو دیکھے اور سنے۔ جو سوچے اور واقعات کو ظہور میں لائے۔

اس میں شک نہیں کہ خدا ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اس دنیا کی کوئی بھی چیز ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی۔ پھر کسی چیز کو ماننے کے لئے دیکھنے کی شرط کیوں ضروری ہو۔

آسمان پر ستارے جگمگاتے ہیں۔ عام آدمی سمجھتا ہے کہ وہ ستاروں کو دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ خالص علمی اعتبار سے یہ صحیح نہیں۔ جب ہم ستاروں کو دیکھتے ہیں تو ہم ستاروں کو براہ راست نہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کے ان اثرات کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جو ستاروں سے چل کر کروروں سال کے بعد ہماری آنکھوں تک پہنچے ہیں۔

یہی تمام چیزوں کا حال ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز جس کو انسان "دیکھ" رہا ہے۔ وہ صرف بالواسطہ طور پر اسے دیکھ رہا ہے۔ براہ راست طور پر انسان کسی چیز کو نہیں دیکھتا۔ اور نہ اپنی موجودہ محدودیت کے ساتھ کبھی دیکھ سکتا۔

پھر جب دوسری تمام چیزوں کے وجود کو بالواسطہ دلیل کی بنیاد پر مانا جاتا ہے تو خدا کے وجود کو بالواسطہ دلیل کی بنیاد پر کیوں نہ مانا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا اتنا ہی ثابت شدہ ہے جتنا کہ اس دنیا کی کوئی دوسری چیز۔ اس کی ہر چیز بالواسطہ دلیل سے ثابت ہوتی ہے۔ اس دنیا میں ہر چیز اپنے اثرات کے ذریعہ سے پہچانی جاتی ہے۔ ٹھیک یہی نوعیت خدا کے وجود کی بھی ہے۔

خدا یقیناً براہ راست ہماری آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ مگر خدا اپنی نشانیوں کے ذریعہ دکھائی دیتا ہے۔ اور بلاشبہہ خدا کے علمی ثبوت کے لئے یہی کافی ہے۔

چھت گر پڑی

۱۹۶۸ کا واقعہ ہے۔ میں اعظم گڈھ کی ایک دکان میں داخل ہوا۔ وہاں میرے ایک جانے پہچانے بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو سلام کیا۔ مگر انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے دوبارہ سلام کیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اب بھی وہ خاموش ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ رہے تھے مگر کچھ بول نہیں رہے تھے۔ "کیا یہ کوئی دوسرے صاحب ہیں" میں نے سوچا۔ مگر میری آنکھیں اس شبہ کی تردید کر رہی تھیں۔ جو شخص میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا وہ یقینی طور پر وہی شخص تھا جس کو میں پندرہ سال سے جانتا ہوں۔ بظاہر یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ مجھ کو بھول گئے ہوں۔

دکان کے مالک کو جلد ہی میری حیرانگی کا احساس ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ ایک سخت حادثہ پیش آگیا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔ وہ اپنا نیا مکان بنا رہے تھے۔ دیواریں کھڑی ہو گئیں تو حسب قاعدہ ان کے اوپر سانچہ بنا کر چھت ڈلوائی مگر ایک ماہ بعد جب سانچہ کھولا گیا تو ساری چھت دھڑام سے گر پڑی۔ اس حادثہ کا ان کے دماغ پر اتنا اثر ہوا کہ وہ نیم پاگل ہو گئے۔ اب وہ نہ کوئی کام کرتے ہیں، نہ کھانا کھاتے ہیں اور نہ بولتے ہیں۔ بس بت کی طرح اِدھر اُدھر پڑے رہتے ہیں جیسا کہ اس وقت آپ ان کو دیکھ رہے ہیں۔ مزید تحقیق کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہاں کچھ لوگوں نے یہ کاروبار کیا ہے کہ سمنٹ کے رنگ کی مٹی (پنڈول) کو باریک پیس کر بوریوں میں بھر دیتے ہیں۔ یہ مٹی دیکھنے میں بالکل سمنٹ جیسی ہوتی ہے۔ اس لئے لوگ اس کو سمنٹ سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ مذکورہ بزرگ کو بھی اتفاق سے اسی قسم کی سمنٹ مل گئی۔ اور اسی سمنٹ سے انھوں نے اپنی چھت بنوادی۔ ظاہر ہے کہ ایسی سمنٹ سے بنی ہوئی چھت کا وہی انجام ہونا تھا جو ہوا۔

اسی طرح کوئی دولت کو اپنی چھت بنائے ہوئے ہے۔ کسی کو اپنے الفاظ پر بھروسہ ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھیوں کی مدد اس کے لئے کافی ہے۔ کوئی بڑوں کا سہارا پکڑے ہوئے ہے۔ مگر یہ سب جھوٹے سہارے ہیں۔ قیامت جب ظاہری سانچہ کو ہٹائے گی تو اچانک لوگوں کی چھت ان کے اوپر اس طرح گر پڑے گی کہ وہاں کوئی تنکا بھی نہ ہوگا جو آدمی کا سہارا بن سکے۔

خدا کا فیضان

ہمارے گھر میں پہلے ایک میٹر بینڈ کا معمولی ٹرانسسٹر تھا۔ وہ صرف دہلی ریڈیو اسٹیشن پکڑتا تھا۔ ہم اس سے دہلی کی خبریں سن لیتے تھے۔ مگر دوسرے ملکوں کی نشریات سننا اس کے ذریعہ ممکن نہ تھا۔ کئی سال تک یہی چھوٹا ٹرانسسٹر ہمارے لئے ریڈیائی نشریات سننے کا ذریعہ بنا رہا۔

اس کے بعد ہم نے چار میٹر بینڈ کا بڑا ریڈیو سٹ خریدا۔ یہ ریڈیو سٹ دنیا بھر کے تمام ملکوں کے ریڈیو اسٹیشن کو پکڑتا تھا۔ اس کے ذریعہ جب ہم نے بی بی سی اور دوسرے بیرونی اسٹیشنوں کو سنا تو معلوم ہوا کہ ہم کتنی بڑی دولت سے محروم تھے۔ ہر روز مختلف ممالک نہایت قیمتی پروگرام نشر کرتے ہیں۔ ان کو سننے سے زبردست فکری اور معلوماتی فائدے ہوتے ہیں۔ مگر اس علمی خزانہ سے مستفید ہونا ہمارے لئے اس وقت تک ممکن نہ ہو سکا جب کہ ہم نے بڑا ریڈیو سٹ اپنے لئے حاصل نہ کیا۔

خدا اور بندے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ خدا کا فیضان گویا ایک لامحدود نشرگاہ ہے۔ اس سے ہر لمحہ رزق رب کا مینھ برستا رہتا ہے۔ مگر آپ اس سے کتنا پائیں، اس کا انحصار آپ کے اپنے "ریڈیو سٹ" پر ہے۔ اگر آپ کا ریڈیو سٹ چھوٹا ہے تو آپ بہت کم چیزیں اخذ کر سکیں گے۔ اور اگر آپ کا ریڈیو سٹ بڑا ہے تو آپ کے اوپر اتنا زیادہ خدا کا فیضان برسے گا گویا کہ آپ خدائی فیضان کے اتھاہ سمندر میں نہا اٹھے ہیں۔

آجکل ہر آدمی محدودیت کا شکار ہے۔ کوئی شخص ہے جو کسی گروہی خول میں بند ہے۔ کوئی اپنے آپ کو حقیر مفادات میں اس طرح گم کئے ہوئے ہے کہ اس کو آگے پیچھے کی کوئی خبر نہیں۔ کسی کی سطحیت اس کو گہری حقیقتوں کا ادراک کرنے میں مانع بنی ہوئی ہے۔ کسی کی تنگ نظری نے اس کو اس قابل نہیں رکھا ہے کہ وہ وسیع تر دائرہ کی معرفت حاصل کر سکے۔

بند کوٹھری میں سورج کی روشنی نہیں پہنچتی۔ اسی طرح بند ذہن خدا کا فیضان پانے سے محروم رہتا ہے۔ خدا کا فیضان اسی کو ملتا ہے جو اپنے ذہن کے دروازے کھولنے پر راضی ہو جائے۔

خدا کی نشانی

ان فی السماوات والارض لأیات للمومنین وفی خلقکم وما یبث من دابة أیات لقوم یوقنون۔ واختلاف اللیل والنہار وما انزل اللہ من السماء من رزق فاحیابہ الارض بعد موتہا وتصریف الریاح أیات لقوم یعقلون (الجاثیہ ۳-۵)

بے شک آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ اور تمہارے اور حیوانات کو پیدا کرنے میں جن کو زمین میں پھیلا دیا ہے نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لئے۔ اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور اس رزق میں جس کو اللہ نے اتارا ہے پھر اس سے زمین کو زندہ کیا اس کے خشک ہونے کے بعد اور ہواؤں کے چلنے میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے۔

قرآن میں کثرت سے اس طرح کی آیتیں ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ کائنات میں سوچنے والے لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان سے جن معنوی حقیقتوں پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے ان کی مادی تمثیلات اس نے کائنات میں ہر طرف قائم کر دی ہیں۔ تاکہ آدمی کے لئے ان حقیقتوں کو سمجھنا آسان ہو جائے۔ تاکہ وہ دکھائی دینے والی چیزوں کے آئینہ میں نہ دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھ سکے۔

سورج اور چاند خدا کی روشن ہستی کا تعارف ہیں۔ چڑیاں اور جانور خدا کی خدائی کے معصوم نمائندے ہیں۔ آسمان خدا کی عظمت و قدرت کا اعلان ہے۔ پانی اور ہوا خدا کی رحمت و شفقت کا ایک نمونہ ہیں۔ درخت اور پہاڑ خدا کے لامحدود حسن کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

انسان اگر دنیا میں اس طرح رہے کہ اس کے دماغ کی کھڑکیاں کھلی ہوئی ہوں۔ وہ دیکھنے والی چیزوں کو دیکھ رہا ہو تو ساری دنیا اس کو خدا کی یاد دلانے والی بن جائے گی۔ وہ ہر چیز میں خدا کا نور پائے گا۔ ہر چیز میں وہ خدا کی حکمت کو دریافت کرے گا۔ کائنات اس کے لئے ایک خدائی سمندر بن جائے گی جس میں وہ نہائے۔ زمین و آسمان اس کے لئے خدائی جلوہ گاہ بن جائیں گے جہاں وہ اپنے رب سے ملاقات کرے۔

ارتقاء کا فریب

نظریہ ارتقاء کا دعویٰ ہے کہ انسان اور حیوان دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ انسان دوسرے حیوانات ہی کی ترقی یافتہ نوع ہے نہ کہ کوئی علیحدہ نوع۔ اس دعویٰ کے سلسلے میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ایک اہم سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ ہے تو بیچ کی وہ انواع کہاں ہیں جو مفروضہ ارتقائی عمل کے مطابق ابھی موجودہ انسان کے مقام تک نہیں پہنچی تھیں۔ وہ ابھی حیوان اور انسان کے درمیان تدریجی ارتقاء کے مراحل طے کر رہی تھیں۔

اس نظریہ کے حامیوں کے پاس اس کے جواب میں قیاس و گمان کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ چارلس ڈاروِن نے اپنی کتاب میں بار بار ہم بخوبی قیاس کر سکتے ہیں (We may well suppose) کا جملہ استعمال کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یقیناً ایسا ہوا ہے، اگرچہ ابھی ہمیں اس کے تمام نمونے حاصل نہیں ہو سکے ہیں۔ اس فرضی یقین کی بنیاد پر ایک پورا شجرۂ نسب تیار کر لیا گیا ہے جو انسان کی نسل کو بندر کی نسل تک جا ملاتا ہے۔ بندر اور انسان کے درمیان کی یہ کڑیاں تمام کی تمام مفروضہ کڑیاں ہیں مگر بالکل غلط طور پر ان کو گم شدہ کڑیاں (Missing links) کہا جاتا ہے۔

ان خیالی قسم کی گم شدہ کڑیوں کی تلاش پچھلے ایک سو سال سے جاری ہے۔ بار بار دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ فلاں گم شدہ کڑی ہاتھ آگئی ہے۔ انھیں میں سے ایک کڑی وہ ہے جس کو پلٹ ڈاؤن مین (Piltdown Man) کہا جاتا ہے۔

پلٹ ڈاؤن مین کو تقریباً آدھی صدی تک "عظیم دریافت" کہا جاتا رہا۔ یہ سمجھا جاتا رہا کہ یہ ماقبل تاریخ کا وہ انسان ہے جو ایک طرف انسانی اوصاف کا حامل تھا اور دوسری طرف وہ بندر (چمپینزی) کی بھی کچھ خصوصیات اپنے اندر رکھتا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں باقاعدہ اس کے حوالے شامل ہو گئے۔ وہ کالجوں کے نصاب میں پڑھایا جانے لگا۔ مثال کے طور پر آر ایس لل (R.S. Lull) کی مشہور کتاب عضویاتی ارتقاء (Organic Evolution) سات سو صفحات پر مشتمل ہے اور ٹکسٹ بک کی حیثیت سے رائج ہے۔ اس میں انسان اور حیوان کے درمیان جن معلوم کڑیوں" کا ذکر کیا گیا ہے وہ حسب ذیل چار ہیں:

1. Ape-man of Jawa
2. Piltdown man

3. Neanderthal Man
4. Cro-magnon Man

مگر بعد کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ پلٹ ڈاؤن مین ایک مکمل فریب تھا۔ اس سلسلہ میں سائنس دانوں کے تحقیقی نتائج مختلف کتابوں اور مقالات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کو جاننے کے لئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا مقالہ یا "پلٹ ڈاؤن فورجری" نامی کتاب کا مطالعہ کافی ہے۔ جس کو آکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

1. *Bulletin of the British Museum* (Natural History) Vol. 2, No. 3 and 6
2. J.S. Weiner, *The Piltdown Forgery* (1955)
3. Ronald Millar, *The Piltdown Men* (1972)
4. *Readers Digest*, November 1956
5. *Popular Science* (Monthly) 1956

چارلس ڈاسن (Charles Dawson) نامی ایک انگریز متحجر ہڈیوں (Fossil Bones) کے جمع کرنے کا بہت شائق تھا۔ ۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے کہ وہ کچھ ہڈیوں کو لے کر برٹش میوزیم پہنچا اور یہ خبر دی کہ یہ ٹکڑے اسے جنوبی انگلینڈ کے ایک مقام پلٹ ڈاؤن (Piltdown) میں ایک کھوہ کے اندر کنکریوں کے درمیان پڑے ہوتے ملے ہیں۔ برٹش میوزیم کے ایک نامور عالم ڈاکٹر آرتھر اسمتھ وڈورڈ (A.S. Woodward) نے اس میں خصوصی دلچسپی لی اور بتائے ہوتے مقام پر پہنچ کر کھدائی کے ذریعہ مزید ٹکڑے حاصل کئے۔ اس طرح بیس سے کچھ زیادہ ہڈیوں اور دانت کے ٹکڑے جمع کرکے ان کا مطالعہ شروع کیا گیا۔

ان حاصل شدہ ٹکڑوں میں سب سے زیادہ نمایاں ایک جبڑے کا ٹوٹا ہوا حصہ تھا جو واضح طور پر ایک بندر کا جبڑا معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس میں ایک خاص چیز بندر سے مختلف تھی۔ یہ اس میں لگے ہوئے داڑھ کے دو دانت تھے جن کی اوپر کی سطح ہموار (Flat) تھی۔ جو کہ صرف کسی انسانی دانت ہی میں ہوسکتی ہے۔ چنانچہ قیاس کر لیا گیا کہ یہ جبڑا کسی قدیم انسان کا ہے۔ اور اس کے بعد نہایت آسانی سے اس کو ارتقار کی ایک گم شدہ کڑی قرار دے دیا گیا۔ تلاش کرنے والوں نے جلد ہی پلٹ ڈاؤن کے آس پاس وہ کھوپڑی بھی حاصل کرلی جو دورسابق کے اس انسان کے سر پر قدرت نے پیدا کی تھی!

مذکورہ بالا کھوہ میں ماقبل تاریخ کے زمانے کے کچھ جانوروں کے آثار ملے جن سے یہ متعین ہو گیا کہ "پلٹ ڈاؤن مین" قدیم برفانی دور کا انسان ہے جو پانچ لاکھ سال پہلے زمین کے اوپر گزر چکا ہے۔

اس تحقیق نے دوسری معلوم کی ہوئی گم شدہ کڑیوں کے مقابلہ میں اس کو قدیم ترین معلوم انسان کی حیثیت دے دی۔ چارلس ڈاسن عظیم اعزازات کا مستحق قرار دیا گیا کیوں کہ اس نے سائنس کی ایک پیچیدہ گتھی کو حل کرنے میں مدد دی تھی۔

پتھر میں تبدیل شدہ یہ انسانی ہڈیاں جو حاصل ہوئی تھیں وہ پورے انسانی ڈھانچہ کے صرف بعض اجزاء تھے۔ مگر ماہرین نے ان کی روشنی میں قوت تخئیل سے کام لے کر پانچ لاکھ سال پہلے کے انسان کا ایک پورا ڈھانچہ تیار کر لیا جو اپنی بے ڈھنگی پیشانی اور بندر نما جبڑوں کے ساتھ چالیس سال تک سائنس دانوں کا مرکز توجہ بنا رہا۔ مگر ۱۹۵۰ء میں یکایک پلٹ ڈاؤن مین کی حیثیت کو سخت دھکا لگا۔ جب طبقات الارض کے ایک عالم ڈاکٹر کنتھ آکلے (Kenneth Oakley) نے ایک کیمیاوی طریقے کو استعمال کر کے اس کی تاریخ معلوم کی۔

یہ ایک اصول ہے کہ کوئی ہڈی جتنے دنوں تک زمین میں دفن پڑی رہے گی وہ اسی کے بقدر زیادہ مقدار میں ایک مخصوص عنصر کو جذب کرتی ہے جس کا نام فلورین (Fluorine) ہے۔ ڈاکٹر آکلے کی آزمائش سے معلوم ہوا کہ حاصل شدہ ہڈیوں میں جتنی فلورین پائی جاتی ہے۔ اس کے لحاظ سے اس کی عمر صرف پچاس ہزار سال ہونی چاہئے نہ کہ پانچ لاکھ سال۔

بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ پلٹ ڈاؤن مین کی کھوپڑی کے متعلق آکلے کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ مگر اسی کی بنیاد پر اس نے جبڑے کی عمر بھی جو اسی قدر فرض کر لی تھی وہ صحیح نہیں تھی۔ جبڑا درحقیقت موجودہ زمانے کے ایک بندر کا تھا جو فرضی طور پر مذکورہ کھوپڑی کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔

آکلے کی مذکورہ دریافت نے پلٹ ڈاؤن کو دوبارہ ایک معما بنا دیا کیوں کہ پانچ لاکھ سال پہلے کے ایک ڈھانچے کو تو گم شدہ کڑی فرض کیا جا سکتا تھا مگر ایک ایسا جاندار جو صرف پچاس ہزار سال پہلے موجود رہا ہو اس کا گم شدہ کڑی ہونا بالکل ناقابل قیاس تھا۔

اس کے بعد ۱۹۵۳ء کی ایک شام کو لندن کی ایک دعوت میں آکلے کی ملاقات آکسفورڈ یونیورسٹی میں انسانیات کے ایک پروفیسر ڈاکٹر وینر (J.S. Weiner) سے ہوئی۔ ڈاکٹر وینر آکلے کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اس کے بعد گھر آ کر اس نے سوچنا شروع کیا کہ آخر اس کی حقیقت کیا ہے، سب سے زیادہ حیرانی اس کو پلٹ ڈاؤن مین کے دانت کے بارے میں تھی۔ "ایک بندر نما جبڑے میں انسانی دانت جو اس طرح ہموار ہیں جیسے کسی نے ریتی سے ...." یہ سوچتے ہوئے اچانک ایک نیا خیال اس کے ذہن میں آیا "ایسا تو نہیں ہے کہ کسی نے ریتی سے گھس کر ان دانتوں کو

چکا کر دیا ہو۔" اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ حقیقت کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اب وہ اپنے سامنے تحقیق کا ایک نیا میدان پا رہا تھا۔

وینر نے اپنے ایک ساتھی سر ولفرڈ لی گروز کلارک (Sir Wilfred Le Gros Clark) کی معیت میں چمپینزی (بندر کی ایک قسم) کا ایک داڑھ کا دانت لیا، اس کو ریت کر ہموار کیا اور اس کے بعد اسے رنگ کر دیکھا تو وہ پلٹ ڈاؤن کے دانت کے بالکل مشابہ تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں برٹش میوزیم گئے تاکہ پلٹ ڈاون مین کے جبڑے حاصل کرکے اس کے متعلق اپنے قیاس کی تحقیق کریں۔ لوہے کا ایک مقفل بکس جو خاص طور پر فائر پروف بنایا گیا تھا، اس کے دروازے کھلے اور اس کے اندر سے پلٹ ڈاون کے ڈھانچے کے مقدس ٹکڑے نکالے گئے تاکہ سائنسی طریقوں کے مطابق ان کا گہرا تجزیہ کیا جائے۔ ایکسرے مشین اور دوسرے جدید قسم کے آلات حرکت میں آگئے۔ ایک مخصوص قسم کا کیمیاوی طریقہ بھی استعمال کیا گیا جو نائٹروجن کی کمی کو معلوم کرکے یہ بتاتا ہے کہ اس پر کتنا وقت گزر چکا ہے۔

وینر کا قیاس صحیح تھا۔ ان مشاہدات سے معلوم ہوا کہ پلٹ ڈاون مین کے جبڑے کی ہڈی کوئی پرانی ہڈی نہیں تھی بلکہ عام قسم کے ایک بندر سے حاصل کی گئی تھی۔ ہڈی کا قدرتی رنگ چونکہ متحجر ہونے کے بعد بدل جاتا ہے، اس لئے فریب دہندہ نے نہایت ہوشیاری سے اس کو مہوگنی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ رنگ کو عین مطابق بنانے کے لئے چند مخصوص اجزاء استعمال کئے گئے تھے۔ گہرے مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ دانت کی سطح پر ایسے خراش موجود ہیں جو بلا اشتباہ اس بات کی خبر دے رہے ہیں کہ دانت مصنوعی طور پر رگڑا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے کناروں میں غیر فطری قسم کی تیزی بھی تھی جو کہ صرف ریتی سے رگڑنے ہی کی صورت میں ہو سکتی ہے۔

۱۹۵۳ء میں مندرجہ بالا تینوں محققین (آکلے، وینر، کلارک) نے اعلان کیا کہ جبڑا اور دانت بالکل فرضی ہیں ــــ اس کے بعد وینر نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اتنا بڑا فریب جو گھڑا گیا اس کا مصنف کون تھا۔ اس نے تمام ممکن تفصیلات جمع کرنا شروع کیں، ملک بھر کے سفر کئے تاکہ پلٹ ڈاؤن کے واقعہ سے متعلق جو افراد ہیں ان سے گفتگو کرے، جو لوگ مر چکے تھے وہ ان کے عزیزوں اور دوستوں سے ملا۔ اخبار کے قدیم فائلوں سے اس سلسلے کی تمام رپورٹیں پڑھ ڈالیں۔

اس گہرے مطالعہ کے بعد پلٹ ڈاؤن کے واقعہ سے تمام افراد بالکل بری نظر آئے۔ مگر ایک شخص (چارلس ڈاسن) اس سے مستثنیٰ تھا۔ جو اس واقعہ کا ہیرو تھا۔ تمام معلومات اشارہ

کر رہی تھیں کہ اس بے بنیاد بات کا اصل مصنف ڈاسن ہی ہے۔

چارلس ڈاسن ایک کامیاب قانون داں تھا۔ وہ انگلینڈ کے اس مخصوص خطے کا باشندہ تھا جہاں متحجرات (Fossils) کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ڈاسن کو متحجرات سے بہت دل چسپی پیدا ہو گئی اس کا یہی مشغلہ بن گیا کہ وہ متحجر ہڈیاں جمع کیا کرتا تھا۔ پلٹ ڈاؤن مین کے واقعے سے پہلے وہ دور قدیم کے متعدد جانوروں کے ڈھانچے حاصل کر کے لندن کے عجائب خانے میں بھیج چکا تھا۔

بعد کو ڈاسن کو وہ مذاق سوجھا جس نے ۴۰ سال سے زیادہ مدت تک اہل علم کو فریب میں مبتلا رکھا۔ ڈاسن کے ایک ملاقاتی نے بتایا کہ ایک مرتبہ وہ آواز دیئے بغیر ڈاسن کے کمرے میں چلا گیا اس نے دیکھا کہ ڈاسن کچھ تجربات میں مشغول ہے۔ وہ مختلف برتنوں میں کھاری اجزاء اور رنگین عرق ڈال کر ہڈیوں کو اس میں ڈبوئے ہوئے تھا۔ ڈاسن نے اس کو دیکھ کر گھبرائے ہوئے انداز میں وضاحت کی کہ وہ متحجر ہڈیوں کو رنگ رہا تھا۔ تاکہ یہ معلوم کرے کہ قدرتی طور پر ان کا جو رنگ ہے وہ کیسے بنا ہے۔ اس قسم کے اور واقعات معلوم ہوئے جنھوں نے اس خیال کی تصدیق کر دی کہ اس گھڑے ہوئے فریب کا مصنف ڈاسن ہے۔ مگر یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب کہ اس سے بہت پہلے ڈاسن ۱۹۱۶ء میں ۵۲ برس کی عمر میں عین اپنی شہرت کے وقت مر چکا تھا۔

ڈاسن نے اپنے جھوٹ کو مکمل کرنے کے لئے ایک اور تدبیر کی۔ اس نے پتھر کے کچھ اوزار پیش کئے اور بتایا کہ یہ اسے پلٹ ڈاؤن کے مقام پر ملے ہیں۔ چنانچہ یہ تسلیم کر لیا گیا کہ یہ پتھر کے وہ اوزار ہیں جن سے پانچ لاکھ سال پہلے کا ناقص انسان کام لیا کرتا تھا۔ مگر بعد کی تحقیقات نے ان کو بھی بالکل جعل ثابت کر دیا۔ ڈاسن نے اسی قسم کا ایک پتھر کا اوزار ہیری موریز (Harry Moris) کو دیا تھا۔ موریز ایک بنک کلرک تھا اور پتھر کے پرانے نمونے جمع کرنے کا شائق تھا۔ بعد کو موریز اپنی تحقیق سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ پتھر کا اوزار بالکل جعلی ہے۔ موریز نے اس پتھر کو اپنی مخصوص الماری میں دوسرے نمونوں کے ساتھ رکھ چھوڑا تھا۔ جب وینر کو اس کی اطلاع ملی تو اس کا شوق بڑھا مگر اس سے بہت پہلے موریز کا انتقال ہو چکا تھا۔

وہ پتھر کہاں ہے؟ وینر کو یہ سوال پریشان کرنے لگا۔ موریز کے مرنے کے بعد اس کی الماری دو ہاتھوں میں منتقل ہو چکی تھی تاہم وینر نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ الماری کھولنے پر معلوم ہوا کہ اس کے اندر بارہ خانے ہیں جن میں بہت سے نمونے لیبل لگے ہوئے رکھے ہیں۔ آخری خانے میں پلٹ ڈاؤن کا پتھر کا اوزار تھا اس پر موریز کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے یہ الفاظ درج تھے:

"Stained by C. Dawson with intent to defraud"

یعنی اس کو ڈاسن نے بالکل جعلی طور پر خود اپنے ہاتھ سے رنگا تھا تاکہ دنیا کو دھوکا دے کہ یہ بہت پرانے زمانے کا اوزار ہے۔ ایک نوٹ میں موریز نے یہ بھی بتایا تھا کہ ہائیڈروکلورک ایسڈ پتھر کے بھورے رنگ کو ختم کر کے اس کو معمولی سفید رنگ کے پتھر میں تبدیل کر دیتا ہے۔

تبصرہ

یہ واقعہ بتا رہا ہے کہ دور قدیم کی ہڈیوں کے ٹکڑے جمع کر کے ان کی بنیاد پر جو تیاسی ڈھانچے کھڑے کئے گئے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ بے شک دور قدیم میں کوئی ڈاسن موجود نہیں تھا جو ہم کو دھوکا دینے کے لئے ان ہڈیوں کا حلیہ بگاڑ دیتا۔ مگر لاکھوں اور کروروں برس تک آندھی، طوفان اور زلزلے زمین کے اوپر جو الٹ پلٹ کر رہے تھے ان کی وجہ سے ہڈیوں کے مقام اور ان کی ہیئت میں وہ ساری تبدیلیاں ہونا ممکن ہیں جن کا آج ہم نے "ڈاسن ہین" کی صورت میں تجربہ کیا ہے۔ پھر ارتقاء کے حامیوں کے پاس وہ کون سا علم یقین ہے جس کی بنیاد پر وہ نامعلوم ماضی کے بارے میں اتنی قطعیت کے ساتھ اپنا دعویٰ پیش کر رہے ہیں۔

اس موضوع پر اپنے مضمون کو ختم کرتے ہوئے ماہنامہ پاپولر سائنس (Popular Science) کا مضمون نگار آخر میں لکھتا ہے:

"پلٹ ڈاون کی خیالی داستان اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہے۔ مگر ایک معما ابھی تک حل نہ ہو سکا۔ وہ کیا مقصد تھا جس کے لئے ڈاسن نے اتنا بڑا جھوٹ تیار کیا؟ اس کو اس کام سے کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ برٹش میوزیم کو اس نے جو ہڈیاں فراہم کی تھیں وہ اس نے محض تحفہ کے طور پر پیش کی تھیں۔ اس نے ان کی کوئی قیمت وصول نہیں کی۔ پھر کیا شہرت اس کا مقصد تھا۔ کیا اس زبردست فریب کے ذریعہ وہ محض ایک مذاق کرنا چاہتا تھا۔ اس انگریز جعل ساز کو آخر کس چیز نے اس کام پر آمادہ کیا۔ اس کا معلوم کرنا کیمیاوی اور طبیعی تجربوں کی دسترس سے باہر ہے۔ اور شاید وہ ہمیشہ ایک راز ہی رہے گا۔"

یہ فقرہ درحقیقت اس بات کا اعتراف ہے کہ تجربی علم (Tested Knowledge) اپنی محدودیوں کی وجہ سے کائنات کی توجیہہ نہیں کر سکتا۔ وہ ہماری دنیا کے صرف بعض واقعات کا تجزیہ کر سکتا ہے، جب کہ ہمیں ایک ایسے علم کی ضرورت ہے جو تمام واقعات کا تجزیہ کرے۔ جو تمام حقیقتوں کو ہم پر آشکارا کر سکے۔ ایسا کامل علم صرف وحی کا علم ہے، اس کے سوا کوئی اور علم اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا۔

علم کا صدقہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: افضل الصدقۃ ان یتعلم المرء المسلم علماً ثم یعلمہ اخاہ المسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے اچھا صدقہ یہ ہے کہ مسلمان ایک علم سیکھے پھر اس کو اپنے مسلمان بھائی کو سکھائے۔

(رواہ احمد عن ابی ہریرہ)

صدقہ کیا ہے۔ صدقہ دراصل اس خیرخواہی کا نام ہے جو ایک بھائی کی طرف سے اپنے دوسرے بھائی کے لئے ظاہر ہوتی ہے۔ اس خیرخواہی کا اظہار کبھی مال کی صورت میں ہوتا ہے۔ کبھی ایک اچھی نصیحت کی صورت میں اور کبھی کسی دوسری صورت میں۔ خیرخواہی انسان کے سینہ میں جاری ہونے والا ربانی چشمہ ہے اور صدقۂ علم اس ربانی چشمہ کی خارجی سیرابی۔

علم (سچائی کی معرفت) بلاشبہ اس کائنات کی سب سے بڑی چیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ علم سب سے بڑا صدقہ ہے۔ آسمان کے نیچے ظاہر ہونے والے تمام واقعات میں یہ سب سے زیادہ انوکھا واقعہ ہے کہ ایک آدمی کسی دوسرے شخص کی بھلائی کے لئے تڑپے اور اس کو سچائی کا وہ نور پہنچائے جو اس کو خدا کی طرف سے ملا ہے۔

دوسرے کو علم دینا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی دوسرے کا خواہ بن جائے۔ اس کے لئے آدمی کو دوسرے کا درد اپنے سینہ میں محسوس کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے کو پانے والا بنانے کے لئے اپنے آپ کو نہ پانے پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ اپنی بات کو دوسرے کی نظر میں قابل قبول بنانے کے لئے اپنے آپ کو دوسرے کے مقام پر کھڑا کرنا پڑتا ہے۔ اپنے اور دوسرے کے درمیان سننے اور سنانے کی فضا بنانے کی خاطر یک طرفہ طور پر ان تمام جھگڑوں کو ختم کر دینا پڑتا ہے جو دونوں کے درمیان معتدل فضا کو برہم کئے ہوئے ہوں۔

علم کا صدقہ سب سے بڑی قربانی کی قیمت پر دیا جاتا ہے۔ یہ دینا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی اپنے آپ کو خالی دیکھنے پر راضی ہو جائے۔ اس دنیا میں دینے والا بننے کے لئے کھونے والا بننا پڑتا ہے۔ چوں کہ لوگ کھونے والا بننے کے لئے تیار نہیں ہوتے اس لئے وہ دینے والے بھی نہیں بنتے۔

دوسرا قرآن

ایک مسلمان نے اپنے ایک غیر مسلم دوست کو قرآن کا ترجمہ پڑھنے کے لئے دیا۔ غیر مسلم نے بڑے شوق اور احترام کے ساتھ قرآن کو لیا اور اس کو شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ اگلی ملاقات میں اس نے قرآن کا مذکورہ نسخہ واپس کرتے ہوئے کہا:

"اب دوسرا قرآن دیجئے"

مسلمان نے سمجھا کہ وہ قرآن کا دوسرا نسخہ مانگ رہے ہیں۔ چنانچہ وہ دوسرا نسخہ لائے اور اس کو مذکورہ غیر مسلم کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ غیر مسلم نے اس کو لے کر کچھ دیر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر کہا "یہ تو وہی قرآن ہے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اب وہ قرآن دیجئے جس پر آپ لوگ عمل کرتے ہیں۔"

غیر مسلم نے قرآن میں جو اسلام پڑھا وہ اس سے مختلف تھا جو اس نے مسلمانوں کی اپنی زندگی میں دیکھا تھا۔ غیر مسلم نے سمجھا کہ مسلمانوں کے یہاں شاید دو قرآن ہے۔ ایک وہ جس کو اس نے ابھی پڑھا ہے، دوسرا وہ جو ابھی اس کو پڑھنے کو نہیں ملا۔

بظاہر یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر امر واقعہ یہی ہے کہ مسلمانوں کا دو قرآن ہے۔ ایک وہ جو خدا کی طرف سے چودہ سو سال پہلے اترا تھا۔ دوسرا وہ جو انھوں نے خود لکھ رکھا ہے۔ اس دوسرے قرآن کا نام قرآن نہیں۔ اس کا نام قرآن کی تشریح و تعبیر ہے۔ مسلمانوں نے اپنی تشریح و تعبیر سے قرآن کے متوازی ایک اور قرآن لکھ رکھا ہے۔ اس دوسرے قرآن میں وہ سب کچھ ہے جس پر آج وہ عمل کر رہے ہیں۔

قرآن میں اسلام اطاعت کا نام ہے مگر مسلمانوں کی اپنی تشریح میں اسلام فخر کی چیز بن گیا ہے۔ قرآن کے مطابق نجات کا دارومدار عمل پر ہے مگر مسلمانوں کی تشریح کے مطابق نجات کے لئے یہ کافی ہے کہ آدمی اپنے کو مسلمان کہتا ہو۔ قرآن کا اسلام یہ ہے کہ آدمی اپنا احتساب کرے مگر مسلمانوں کی تشریح کے خانہ میں اسلام اس کا نام ہو گیا ہے کہ آدمی احتساب عالم کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہو۔ قرآن کا اسلام سارے عالم کا اسلام ہے۔ مگر مسلمانوں کے ذہنی خانہ میں وہ ایک قومی چیز بن کر رہ گیا ہے۔

اعلیٰ ظرفی

امیر معاویہ کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ اس زمانہ میں روم کی مشرقی سلطنت کے اکثر حصے فتح ہو چکے تھے۔ رومی بادشاہ پسپا ہو کر قسطنطنیہ (ترکی) کے قلعہ میں رہنے لگا تھا۔ تاہم سرحد پر وہ مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا۔ اسی قسم کی ایک جھڑپ میں ایک بار رومیوں نے کچھ مسلمانوں کو قید کر لیا جن میں قریش کا ایک آدمی بھی شامل تھا۔ رومی بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ وہ لوگ میرے سامنے حاضر کئے جائیں۔

مسلمان قیدی اس حال میں دربار میں لائے گئے کہ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ رومی بادشاہ نے ان سے ذلت آمیز گفتگو کی۔ اس نے کہا کہ تم جیسے لوگوں کی سزا یہی ہے۔ ہم تم کو اسی طرح سزا دیں گے یہاں تک کہ تم مر جاؤ اور تمہارے ہم قوموں کو عبرت ہو کہ وہ ہمارے علاقہ کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں۔

قریشی کو بادشاہ کا کلام سن کر غیرت آگئی۔ اس نے بادشاہ کو سخت انداز میں جواب دیا۔ اس نے کہا کہ جب تک تمہاری اسلام دشمنی باقی ہے تمہارے خلاف ہماری جنگ جاری رہے گی۔ اور تم جان لو کہ خدا کے راستہ میں ہمارا خون بہت سستا ہے مگر وہ اس وقت بہت قیمتی ہو جائے گا جب کہ تمہارے جیسا بادشاہ ہم کو قتل کرے۔

قریشی کا یہ جواب سن کر دربار کے ایک بطریق (Patriarch) کو غصہ آگیا۔ وہ اٹھ کر قریشی کے پاس آیا اور اس کے چہرہ پر دائیں بائیں دو طمانچہ مارا۔ قریشی کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اس لئے اس وقت وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اپنی اس بےعزتی پر وہ چیخ پڑا:

وصاح القرشی باعلی صوتہ۔ یامعاویۃ ابن انت لتنتقم من ھؤلاء الانذال الذین لطموا شریفا من اھلک۔ والتفت الی البطریق وقال، اقسم باللہ ان لی معک یوما ستعرف فیہ من انا۔

قریشی بلند آواز سے چیخا۔ اے معاویہ تم کہاں ہو کہ ان ذلیل لوگوں سے انتقام لو جنھوں نے تمہارے ایک شریف آدمی کو طمانچہ مارا ہے۔ پھر وہ بطریق کی طرف مخاطب ہوا اور کہا کہ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ میرا ایک دن آئے گا۔

جب کہ تم جان لوگے کہ میں کون ہوں۔

اس واقعہ کی خبر قسطنطنیہ سے دمشق پہنچی۔ امیر معاویہ کو اسے سن کر بہت رنج ہوا۔ انھوں نے عزم کیا کہ اس سلسلہ میں ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ امیر معاویہ نے اولاً رومی بادشاہ سے تبادلہ کی بنیاد پر مسلمان قیدیوں کی رہائی کی بات کی۔ یہاں تک کہ مسلم قیدیوں کی تعداد کے مقابلہ میں رومی قیدیوں کی زیادہ تعداد کو واپس کرکے اپنے قیدیوں کو رہا کرالیا۔

اس کے بعد امیر معاویہ نے نہایت خاموشی کے ساتھ ایک منصوبہ بنایا۔ انھوں نے تلاش کرکے صور (شام) کے ایک آدمی کو حاصل کیا۔ وہ تاجر تھا اور رومی زبان جانتا تھا۔ امیر معاویہ نے کثیر مقدار میں اس کو سونے کے دینار دئے۔ اس کو پورا منصوبہ بتایا اور کہا کہ تم جاؤ اور کسی نہ کسی طرح اس بطریق کو پکڑ کر دمشق لے آؤ۔

اس آدمی نے تاجر کے روپ میں سفر کیا اور اس طرح دمشق سے قسطنطنیہ پہنچا۔ بطریق کے بارہ میں معلومات حاصل کرکے اس سے تعلقات پیدا کئے۔ اس کو قیمتی تحفے (عطر، جواہرات، ریشمی کپڑے وغیرہ) پیش کئے۔ اس طرح وہ کئی بار دمشق سے قسطنطنیہ اور قسطنطنیہ سے دمشق آتا جاتا رہا اور بطریق کو تحفے دیتا رہا۔ یہ پورا معاملہ اتنی رازداری کے ساتھ ہوا کہ تاجر اور امیر معاویہ کے سوا کسی اور کو اس کی مطلق خبر نہ ہوسکی۔

اس طرح لمبا عرصہ گزر گیا۔ جب بطریق سے کافی تعلقات ہوگئے تو اس نے بطور خود کچھ خاص تحفے لانے کی فرمائش کی۔ تاجر اس سے وعدہ کرکے واپس ہوا۔ وہ دمشق آیا۔ یہاں اس نے نہایت تیز رفتار اونٹنی حاصل کی۔ اونٹنی کو ایک آدمی کے ساتھ لاکر ایک خاص مقام پر ٹھہرایا۔ اس کے بعد وہ بطریق کے پاس گیا اور کہا کہ میں تمہارے تمام تحفے لے کر آیا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو۔ اس طرح حیلہ کرکے وہ بطریق کو مذکورہ مقام پر لے گیا۔ یہاں دونوں نے اچانک بطریق کو پکڑ لیا۔ انھوں نے نہایت تیزی سے بطریق کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اس کو سواری پر بٹھا کر ہوا کی رفتار سے دمشق کی طرف روانہ ہوگئے۔

بطریق جب دمشق پہنچ گیا تو امیر معاویہ نے ایک مجلس میں بہت سے لوگوں کو جمع کیا اور مذکورہ قریشی کو بھی بلایا۔ اس کے بعد ایک پردہ ہٹایا گیا تو اس کے پیچھے مذکورہ بطریق موجود تھا۔ قریشی اس

و دیکھ کر حیران رہ گیا۔ تاریخ کے اگلے الفاظ یہ ہیں:

قال معاویة یخاطب القرشی یا ابن عمی ، لن تستطیع ان تشکر الصوری فقد نفذ کل تدبیر دبرته له دون ان یخیب ظنی فی اقل شئ۔ والان تستطیع ان تاخذ حقك من بطریق دون ظلم له۔

قال القرشی لولا انی اقسمت لعفوت عنه ، ورفع یده ولطمه لطمة واحدة وهو یقول هذه تکفی ، واعفو عنه فیما بقی۔

ونظر معاویة الی البطریق ، وقال : بعد هذا انت فی ضیافتنا ثلاثة ایام ومرت الایام الثلاثة فاعاده الصوری ومعه کل الهدایا التی کان قد طلبها وفی قصر ملك الروم التف البطارقة حول الملك یقول لهم لا تسیئوا الی اسری المسلمین منذ الان فما رأیت مثلهم عزة وکرامة واخلاقا۔ ولو اراد معاویة ان یخطفنی لما عجز لکنه لا یرضی۔

امیر معاویہ نے قریشی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے میرے چچا کے بیٹے ، اب تم اس صوری تاجر کا شکریہ ادا کرو۔ اس کو میں نے جو تدبیر بھی بتائی اس کو اس نے بغیر کسی ادنیٰ کمی کے نافذ کیا۔ اور اب تم اس بطریق سے اس پر ظلم کئے بغیر اپنا حق لے سکتے ہو۔ قریشی نے کہا کہ اگر میں نے قسم نہ کھائی ہوتی تو میں اس کو معاف کر دیتا۔ پھر ہاتھ اٹھایا اور اس کو ایک طمانچہ مارا اور کہا کہ بس یہ کافی ہے۔ بقیہ کو میں اس سے معاف کرتا ہوں۔ پھر معاویہ نے بطریق کی طرف دیکھا اور کہا کہ اب تم تین دن کے لئے ہمارے مہمان ہو۔ تین دن گزرنے کے بعد اس کو صوری تاجر نے اس حال میں واپس کیا کہ اس کے ساتھ وہ تمام تحفے تھے جن کو اس نے طلب کیا تھا۔ اس کے بعد قسطنطنیہ میں تمام بطریق رومی بادشاہ کے پاس جمع ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ اب مسلم قیدیوں کے ساتھ برا سلوک نہ کرو۔ کیوں کہ میں نے عزت اور شرافت اور اخلاق میں ان کے جیسا نہیں دیکھا۔ اور اگر معاویہ مجھ کو پکڑنا چاہتے تو وہ اس کے لئے عاجز نہ تھے مگر انھوں نے ایسا کرنا پسند نہیں کیا۔

الدعوة (مكة) ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ

بادشاہ بھی

يروى ان عبد الملك بن مروان خطب يوماً خطبة بليغة ثم قطعها وبكى بكاءً شديداً ثم قال: يارب ان ذنوبي عظيمة وان قليل عفوك اعظم منها۔ اللهم فامح بقليل عفوك عظيم ذنوبي۔ فبلغ ذالك الحسن فبكى وقال لو كان كلام يكتب بالذهب لكتب هذا الكلام

(الدعوۃ ۲ اجمادی الآخرۃ ۱۴۰۵ھ)

بیان کیا جاتا ہے کہ عبد الملک بن مروان نے ایک روز ایک بلیغ خطبہ دیا۔ پھر وہ رک گیا۔ اور شدت کے ساتھ رویا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ اسے میرے رب، بے شک میرا گناہ بہت زیادہ ہے مگر تیری تھوڑی معافی اس سے بھی زیادہ ہے۔ اسے اللہ، اپنی تھوڑی سی معافی سے میرے زیادہ گناہ کو مٹادے۔ یہ بات حضرت حسن بصری کو پہنچی تو اس کو سن کر وہ رو پڑے اور کہا کہ اگر کوئی کلام سونے سے لکھا جاتا تو یقیناً یہ کلام اس قابل تھا کہ اسے سونے سے لکھا جائے۔

عبد الملک بن مروان (۸۵ - ۲۳ھ) بنو امیہ کا نہایت ذہین اور مدبر خلیفہ تھا۔ حجاج بن یوسف ثقفی اسی کا عامل تھا جس نے مکہ پر چڑھائی کی اور عبد اللہ بن زبیر کو قتل کیا۔ عبد الملک بن مروان کا شمار تابعین کے گروہ میں ہوتا ہے۔

مذکورہ واقعہ بتاتا ہے کہ قدیم زمانہ کے جابر بادشاہ بھی خدا کے خوف سے خالی نہ تھے۔ کسی نہ کسی موڑ پر ان کا جذبہ پھوٹ پڑتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں بے حسی کا یہ عالم ہے کہ "دیندار" لوگ بھی خوف خدا سے خالی ہو گئے ہیں۔ ان کی نمازوں نے ان کے دلوں کو نرم نہیں کیا۔ ان کے ذکر نے ان کے سینہ کو چھلنی نہیں کیا۔ ان کا ایمان وہ ایمان نہیں بنا جو ان کو خدا کے سامنے کھڑا کردے۔

موجودہ زمانہ کے لوگوں پر قرآن کے یہ الفاظ صادق آتے ہیں: پھر تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھر کی مانند ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت۔ اور بعض پتھر تو ایسے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو پھٹ پڑتے ہیں پھر ان سے پانی نکل آتا ہے۔ اور بعض ایسے ہیں جو خدا کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو (البقرہ ۷۴)

دیکھنے والا دیکھ رہا ہے

یہ واقعہ نئی دہلی میں ۱۱ فروری ۱۹۸۵ کو پیش آیا۔

کناٹ پلیس کے ہوٹل تاج میں ایک تقریب تھی۔ یہ تقریب دہلی کے ایک تاجر مسٹر ایس پی سونی نے اپنے لڑکے کی شادی کے سلسلہ میں نہایت اہتمام کے ساتھ منعقد کی تھی۔ شرکار کی تعداد تقریباً چار سو تھی جو سب کے سب اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

لوگ تقریب کی رونقوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ اچانک ایک خاتون نے محسوس کیا کہ اس کا پرس چوری ہوگیا ہے۔ یہ مسز سنتوش سونی کا پرس تھا۔ اس میں پچاس ہزار روپئے نقد رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے اندر ایک قیمتی ہار بھی تھا جو خالص موتیوں کا بنا ہوا تھا۔

چوری کے واقعہ کو نہ پرس کی مالکہ نے دیکھا اور نہ دوسرے شرکار اس کو محسوس کر سکے۔ بظاہر یہ مکمل طور پر ایک راز تھا۔ چوری کرنے والا چوری کر چکا تھا۔ اور جس کی چوری ہوئی تھی اس کے لئے صرف یہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ اپنی خوشیوں کو غم میں تبدیل کر کے اپنے گھر واپس چلی جائے۔ حتی کہ ہوٹل کے ذمہ دار یہ ماننے کے لئے بھی تیار نہ تھے کہ چوری کا واقعہ ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بناوٹی بات ہے۔ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہوٹل والوں کی نظر میں یہ قصہ اتنا بے بنیاد تھا کہ انھوں نے اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھی کہ ہال کا دروازہ بند کر کے لوگوں کی تلاشی لیں۔

اتنے میں بعض افراد کو خیال آیا کہ شادی کی تقریب شروع سے آخر تک (Video film) پر ریکارڈ کی گئی ہے، کیوں نہ اس کا معائنہ کیا جائے۔

فوراً تقریب کے شرکار اور ہوٹل کے ذمہ داروں کے سامنے ویڈیو ٹیپ چلایا گیا۔ اس سے پہلے تمام شرکار کی نگاہیں زرق برق اسٹیج پر لگی ہوئی تھیں جہاں دولہا اور دلھن رونق افروز تھے۔ مگر اب ان کی توجہ کا مرکز دوسرا تھا۔ جس منظر کو اس سے پہلے انھوں نے صرف تفریح کی نظر سے دیکھا، اب اس کو انھوں نے تفتیش کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔

بہت جلد لوگوں کی نگاہیں ایک عورت پر جم گئیں جو ایک لڑکے کے ساتھ آیا کے روپ میں ہال کے اندر داخل ہوئی تھی۔ ابتداءً لوگوں نے یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ وہ معزز

مہانوں میں کسی مہمان کے ساتھ آئی ہے۔ مگر اب اس کو ایک امکانی مجرم کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

یہ عورت جو آیا کے روپ میں آئی تھی وہ اس سے بالکل بے خبر تھی کہ یہاں ویڈیو کیمرہ نصب ہے اور اس کی نظر میں ہر لمحہ اس کو دیکھ رہی ہیں۔ وہ اس کی ہر حرکت کا نہایت باریکی کے ساتھ ریکارڈ کر رہی ہیں۔ وہ مشتبہ انداز میں ادھر سے ادھر جا رہی تھی۔

آخر کار لوگوں نے دیکھا کہ اس "آیا" نے شال میں چھپا ہوا اپنا ہاتھ باہر نکالا اور نہایت تیزی سے مذکورہ پرس کو اٹھا کر عین اس وقت اس کو اپنے کپڑوں کے اندر چھپا لیا جب کہ پرس کی مالکہ فوٹو کھنچوانے کے پروگرام میں کھوئی ہوئی تھی۔

جو واقعہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھا اس کو ویڈیو کیمرہ کی نگاہ نے بتا دیا جو مجموعی طور پر سارے منظر کی تصویر کشی کر رہا تھا۔ فوراً پولیس بلالی گئی اور پولیس کے سامنے دوبارہ پوری فلم چلائی گئی۔ جرم ثابت ہو گیا تھا۔ مذکورہ عورت کو پولیس نے تلاش کر کے گرفتار کر لیا۔ اس کا نام اخبار میں شیلا بتایا گیا ہے جو سلطان پوری کی رہنے والی ہے۔ ہندستان ٹائمس (۱۶ مارچ ۱۹۸۵) نے یہ کہانی تفصیل کے ساتھ شائع کرتے ہوئے یہ معنی خیز جملہ لکھا ہے:

You can not only spot the thief
but see her commit the cirme.

آپ نہ صرف چور کو پکڑ سکتے ہیں بلکہ اس کو جرم کرتے ہوئے دیکھ بھی سکتے ہیں۔

یہ دنیوی واقعہ آخرت کے واقعہ کا آئینہ ہے۔ یہ واقعہ تمثیل کے انداز میں بتا رہا ہے کہ کوئی بالاتر دیکھنے والا ہے جو ہر ایک کو دیکھ رہا ہے۔ وہ ان باتوں کو نہایت باریکی کے ساتھ ریکارڈ کر رہا ہے جس کی خبر نہ قریب کے لوگوں کو ہوتی اور نہ دور کے لوگوں کو۔ وہ ان باتوں کو بھی جانتا ہے جس کو لوگ نہیں جانتے۔ وہ ان چیزوں کو بھی دیکھتا ہے جن کو لوگ نہیں دیکھتے۔

دنیا کے واقعات آخرت کی حقیقتوں کا آئینہ ہیں۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس میں ان واقعات کو دیکھا جا سکتا ہے جو کل کے دن پیش آنے والے ہیں۔ مگر اس مشاہدہ کے لئے بصیرت کی نگاہ درکار ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جو آنکھ والوں کے پاس بھی اکثر نہیں ہوتی۔

تباہی کی طرف

دوسری جنگ عظیم میں ۵ کروڑ افراد ہلاک ہوئے تھے اور ۹ کروڑ آدمی ہمیشہ کے لئے معذور ہو گئے۔ اس جنگ میں تقریباً چار ہزار ارب ڈالر کی جائداد تباہ ہوئی۔ اس سے پہلے جنگ عظیم اول میں تقریباً ایک کروڑ افراد ہلاک ہوئے تھے اور دو کروڑ افراد اپاہج ہو گئے تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اس قسم کی کوئی عالمی جنگ نہیں ہوئی مگر چھوٹی چھوٹی جنگیں مسلسل جاری رہی ہیں۔ ۱۹۸۲ تک ۳۵ سالوں کے اندر دنیا بھر میں جو چھوٹی چھوٹی جنگیں ہوئیں ان میں مجموعی طور پر ایک کروڑ افراد ہلاک ہو گئے اور تقریباً پانچ سو ارب ڈالر کی جائداد تباہ ہوئی۔ اس مدت میں ۱۵۰ لڑائیاں ہوئیں۔ یہ معلومات ماسکو کے ایک ہفتہ وار نیو ٹائمز نے شائع کی ہیں۔

موجودہ زمانہ میں دولت کا سب سے بڑا مصرف جنگ (یا دفاع) کی تیاری ہے۔ ورلڈ بینک کے صدر مسٹر کلاسین (A.W. Clausen) نے کہا کہ ۱۹۸۵ میں صرف ایک سال کے اندر دولتمند ممالک ہتھیاروں کی فراہمی پر جو رقم خرچ کریں گے اس کی مقدار ایک ہزار بلین ڈالر ہے (ٹائمس آف انڈیا، ۷ دسمبر ۱۹۸۴)

امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر نے ۱۵ جنوری ۱۹۸۱ کو امریکی ٹیلی وژن پر اپنی الوداعی تقریر کی تھی۔ انھوں نے قوم کو ایٹمی جنگ کے خطرہ سے آگاہ کیا جس کا ہونا ان کے خیال میں یقینی ہے۔ خواہ وہ دیر میں ہو یا جلد۔ اگر ایٹمی جنگ ہوئی تو آغاز جنگ کے ابتدائی چند گھنٹوں میں اتنے زیادہ آدمی ہلاک ہو چکے ہوں گے جتنا ساری تاریخ کی تمام جنگوں میں مجموعی طور پر ہلاک ہوئے ہیں۔ یہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا:

> Nuclear conflict would cause as much damage as a world war II every second. Survivers, if any, in despair amidst the poisoned ruins of a civilisation that had committed suicide.

ایٹمی جنگ ہر سکنڈ میں دوسری جنگ عظیم کے بقدر نقصان پہنچائے گی۔ اگر کچھ لوگ مرنے سے بچ جائیں گے تو وہ تہذیب کے زہریلے کھنڈر میں مایوسانہ پڑے ہوئے ہوں گے جو خودکشی کر چکی ہو گی (۱۶ جنوری ۱۹۸۱)

گواہی کا قانون

اسلام کے قانون شہادت میں دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر مانی گئی ہے قرآن میں قرض کے معاملہ کا قاعدہ بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ——— اپنے مردوں میں سے دو مرد کو گواہ بنالو۔ اور اگر دو مرد گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنائی جائیں۔ ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو۔ تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے ایک اگر بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے (البقرہ ۲۸۲)

حالیہ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ قرآن کا یہ قانون بالکل فطری ہے۔ کیونکہ وہ حیاتیاتی حقیقت کے عین مطابق ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جنوری ۱۹۸۵) میں یو پی آئی کے حوالے ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ یہ رپورٹ اخبار کے صفو ۹ پر ہے اور اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

MEMORISING ABILITY: Men have a greater ability to memorise and process mathematical information than women but females are better with words, a Soviet scientist says, reports UPI. 'Men dominate mathematical subjects due to the peculiaritics of their memory', Dr. Vladimir Konovalov told the Tass news agency. "The stronger sex shows greater difficulties in processing and adapting language material."

عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے اندر اس بات کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ریاضیاتی معلومات کو یاد رکھیں اور اس کو ترکیب دے سکیں۔ مگر عورتیں الفاظ میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ یہ بات ایک روسی سائنس داں نے کہی۔ ڈاکٹر ولادیمیر کونولوف نے تاس نیوز ایجنسی کو بتایا کہ مرد ریاضیاتی موضوعات پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ ان کے اندر حافظہ کی خصوصی صلاحیت ہے۔ صنف قوی لسانی مواد کو ترکیب دینے اور استعمال کرنے میں زیادہ مشکل محسوس کرتا ہے۔

مذکورہ آیت کا تعلق قرض سے ہے۔ یعنی وہ صورت جب کہ آج معاملہ کیا جائے اور آئندہ اس کی ادائگی ہو۔ ایسے معاملہ میں حکم دیا گیا کہ اس کے اوپر دو مرد گواہ ہوں۔ یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ مقرر کی جائیں۔ یہ بالکل واضح ہے کہ اس طرح کے معاملہ میں انصاف پسندی کے بعد دوسری چیز جو دیکھنے کی ہے وہ یادداشت ہے۔ اور جب حیاتیاتی طور پر عورت کی یادداشت مرد سے کم ہو تو یہ عین مطابق حقیقت ہے کہ ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ بنائی جائیں۔

ایک تقریر

دوستو، میری بوڑھی آنکھیں جن کے لئے وقت آگیا تھا کہ وہ قبر میں دفن ہوں، ان کے لئے خدا نے یہ مقدر کیا کہ وہ اس اجتماع کو دیکھیں۔ بخدا اگر آسمان سے آواز آئے کہ زمین پر ایک شخص ایسا ہے جس کو جلسہ اور اجتماع سے کوئی دلچسپی نہیں تو میں سمجھوں گا کہ یقیناً وہ میں ہی ہوں۔ اگر زمین پر کوئی ایک شخص ایسا ہو جس کی یہ تمنا ہو کہ وہ نہ کچھ بولے اور نہ کچھ لکھے بلکہ فطرت کی تنہائیوں میں گم ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ میں ہی ہوں گا۔ مجھے اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں کہ میری ان باتوں کو زمین و آسمان سن رہے ہیں اور قیامت میں وہ گواہی دیں گے کہ خدایا تیرے ایک عاجز بندے نے جو کچھ کہا تھا بالکل سچ کہا تھا۔

بخدا جس چیز نے میری تنہائیوں کو توڑا، جس چیز نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنے خون کو سیاہی کروں اور اپنی بے زبانی کو زبان بناؤں وہ صرف یہ احساس تھا کہ جو اصل بات ہے وہی ان کہی پڑی ہوئی ہے۔ خدا کے نام پر ہنگامے جاری ہیں مگر کوئی خدا کے گیت گانے والا نہیں۔ چڑیاں خدا کے نغمے گا رہی ہیں مگر انسان خدا کے نام پر دوسروں کی کبریائی کا چرچا کرنے میں مشغول ہے۔ سورج خدا کی روشنی بکھیرتا ہے مگر انسان کے پاس اپنے جھوٹے چراغوں کا بازار لگانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ دین کے نام پر بے شمار سرگرمیاں نظر آتی ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے دین اس کو سمجھا ہے کہ لفظی طلسمات کی نمائش کریں اور اس پر خدا کا بورڈ لگا دیں۔ اپنی ذات کا جھنڈا بلند کریں اور اس پر اعلاء کلمۃ اللہ کا طغرا لکھ دیں۔ اپنے دنیوی مفادات کی تجارت کریں اور اس کو آخرت کا عنوان دے دیں۔

بخدا میری کمزور زبان اس قابل نہیں کہ وہ بولے۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں یہ طاقت نہیں کہ کہ وہ لکھے۔ میرے کمزور قدموں میں اتنی جان نہیں کہ وہ چل کر کسی کے پاس پہنچے۔ مگر جس آدمی کا دل غم سے پھٹ رہا ہو وہ اپاہج ہو کر بھی گھسٹتا ہے۔ وہ بے زبان ہو کر بھی چیخنے کی کوشش کرتا ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میں اس زمین کا وہ کمزور ترین انسان ہوں جس کو اس کے دل کے کرب نے مجبور کر دیا ہے کہ وہ چلے اور اس کے غم کے بوجھ نے اس کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ بولے۔

میرے دوستو، آپ ایک لمبا جغرافی سفر طے کر کے یہاں آئے ہیں۔ اس کے لئے ہم یقیناً آپ کے شکر گزار ہیں۔ مگر ابھی آپ کو ایک فاصلہ اور طے کرنا ہے۔ یہ روحانی فاصلہ ہے جب تک آپ اس دوسرے فاصلہ کو طے نہ کریں ہمارا آپ کا یہاں آنا صرف انسانی ڈھانچوں کا آنا رہے گا، وہ روحوں کا آنا نہیں بن سکتا۔

دوستو، جو کچھ مجھے کہنا ہے اس کو سننے کے لئے کان نہیں بلکہ دل درکار ہیں۔ جو کچھ مجھے بولنا ہے اس کو سمجھنے کے لئے زبان دانی نہیں بلکہ حقیقت شناسی مطلوب ہے۔ جو بات میں آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں اس کو آپ تک پہنچنے کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ میرے اور آپ کے درمیان ہوا کی لہریں ہوں جو میرے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو آپ تک منتقل کر دیں۔ یہ بات تو اتنی نازک اور اتنی لطیف ہے کہ وہ صرف ان دیکھے روحانی تاروں ہی پر منتقل ہوتی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان لوگوں میں سے بنائے جو کان کے بجائے دل سے سنتے ہیں۔ جو لغت اور زبان کے بجائے حقائق کی روشنی میں باتوں کو سوچتے ہیں۔

بجلی کا بلب ہر شخص اپنے کمرہ میں لٹکا سکتا ہے مگر اسی شخص کا بلب روشن ہوتا ہے جس نے اپنے بلب اور پاور ہاؤس کے درمیان ربط قائم کر رکھا ہو، جس نے اپنے بلب کو پاور ہاؤس سے جوڑ لیا ہو۔ یہی معاملہ حقیقتوں کے دل نشین ہونے کا بھی ہے۔ ان باتوں کو وہی لوگ سمجھیں گے جو انسانوں کی عظمت کے بجائے خدا کی عظمت میں جیتے ہوں۔ جو دنیا کے بجائے آخرت کو اپنا مرکز توجہ بنائے ہوئے ہوں۔ جو دکھائی دینے والی حقیقتوں سے زیادہ ان حقیقتوں کو اہمیت دیں جو موجودہ آنکھوں سے کسی کو دکھائی نہیں دیتیں۔

آئینہ کے سامنے آپ کوئی چیز رکھیں تو آئینہ میں عین وہی چیز دکھائی دے گی جو اس کے سامنے رکھی گئی ہے۔ مگر الفاظ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ کوئی آدمی الفاظ ہی کے ذریعہ اپنی بات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ مگر الفاظ کا ذریعہ بے حد ناقص ذریعہ ہے۔ آدمی کہتا کچھ ہے اور سمجھنے والا اس کو کچھ سمجھ لیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سننے والا کسی بات کو اپنے ذہن سے سنتا ہے نہ کہ سنانے والے کے ذہن سے۔

ہائی اسکول کے ایک طالب علم کا لطیفہ ہے۔ جس زمانہ میں اس کا امتحان تھا اسی زمانہ میں اس

کے شہر میں ایک فلم چل رہی تھی جس کا نام تھا دو بدن۔ طالب علم نے اس فلم کو کئی بار دیکھا تھا۔ اس کے بعد اس کا امتحان ہوا۔ امتحان میں اس کے فارسی کے پرچہ میں ایک سوال تھا کہ دویدن کا مطلب بتاؤ۔ طالب علم کے ذہن پر چونکہ دو بدن کا لفظ گھوم رہا تھا۔ اس نے دویدن کو دو بدن پڑھ لیا اور دو بدن نامی فلم کے بارہ میں جو کچھ جانتا تھا وہ اس کے جواب میں لکھ ڈالا۔

یہی معاملہ دین کے بارہ میں بھی ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال لیجئے۔ ایک بزرگ نے پیغمبروں کے مشن کا یہ تصور قائم کیا کہ وہ حکومت پر قبضہ کر کے مکمل قانونی نظام قائم کریں۔ اس ذہن کے تحت انھوں نے سورہ اعراف پڑھنی شروع کی۔ یہاں تک کہ وہ اس مقام پر پہنچے جہاں موسیٰ اور فرعون کا مکالمہ درج ہوا ہے۔ ان کو نظر آیا کہ موسیٰ کے جواب میں فرعون مصر یہ جملہ کہہ رہا ہے یرید ان یخرجکم من ارضکم (وہ چاہتا ہے کہ تم کو تمہاری زمین سے نکال دے) یہ جملہ لے کر مذکورہ بزرگ نے فوراً یہ تقریر شروع کر دی کہ موسیٰ کا مشن یہ تھا کہ فرعون کو مصر کے تخت سے ہٹا کر اس پر قبضہ کریں اور مصری زندگی کے تمام شعبوں میں خدا کے مکمل قانون کو نافذ کریں۔

یہ استدلال سراسر بے بنیاد تھا۔ کیونکہ موسیٰ کا مشن موسیٰ کے کلمہ سے معلوم ہوگا نہ کہ فرعون کے کلمہ سے۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی مدد سے فرعون کو، اس کے لشکر کو اور اس کی تمام طاقت کو سمندر میں غرق کر دیا۔ اس کے بعد مصر میں موسیٰ کے لئے میدان بالکل صاف تھا۔ وہ نہایت آسانی سے مصر کے دارالسلطنت میں داخل ہو کر ملک کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے سکتے تھے۔ مگر حضرت موسیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس وہ صحرائے سینا کے غیر آباد علاقہ میں چلے گئے —— قرآن میں جو لفظ لکھا ہوا تھا وہ "دویدن" تھا مگر پڑھنے والے نے اپنے ذہنی رجحان کی وجہ سے اس کو "دو بدن" پڑھ لیا۔

غالباً دس سال پہلے کی بات ہے۔ مجھے مالیگاؤں کے ایک مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں تقریر کے لئے بلایا گیا۔ کافی بڑا اور سجا ہوا پنڈال تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ شامیانہ کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں جب مائک کے سامنے آیا تو میری زبان سے نکلا: "میں تقریر نہیں کروں گا بلکہ بے تقریر پیش کروں گا" یہ سن کر منتظمین اور سامعین کے اندر عجیب بے چینی پیدا ہوگئی۔ وہ سمجھے کہ میں واقعۃً تقریر نہیں کروں گا بلکہ تقریر کئے بغیر بیٹھ جاؤں گا۔ یہ دیکھ کر میں نے دوبارہ

کہا کہ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں سرے سے تقریر نہیں کروں گا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ میں کہوں گا وہ عام معنوں میں کوئی تقریر نہیں بلکہ ایک بے تقریر ہوگی۔

آج بھی میں اپنے ذہن میں اسی قسم کی کیفیت محسوس کر رہا ہوں۔ میرے پاس جو کچھ کہنے کے لئے ہے وہ ایک "بے تقریر" ہے پھر کیسے ان لوگوں کو مطمئن کیا جائے جو اس چیز کو سننے کے لئے اجتماعات میں آتے ہیں جس کو تقریر کہا جاتا ہے۔ آہ، ایک ایسا اجتماع کیسے کیا جائے جو بے اجتماع ہوتا ہے۔ ایک ایسی بات کیسے کہی جائے جو کہنے میں نہیں آتی۔ حق یہ ہے کہ جہاں الفاظ ختم ہو جائیں وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ جہاں زبان گنگ ہو جائے وہاں سے بات شروع ہوتی ہے۔ پھر کیسے وہ بات کہی جائے جو لفظوں میں نہیں سماتی۔ کیسے وہ حقیقت کھولی جائے جس کو کھولنے کی طاقت انسان کے پاس نہیں۔

میرے دوستو، یہ کوئی اجتماع اور تقریر کا معاملہ نہیں۔ یہ تو دل کے ساز پر ربانی نغمہ چھیڑنے کا معاملہ ہے۔ دنیا کا نغمہ مادی ساز کے تاروں پر چھڑتا ہے۔ ہر گیت کار دکان سے ایک ساز خرید کر اپنے راگ فضا میں بکھیر سکتا ہے اور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اس کو ہر کان میں داخل کر سکتا ہے۔ مگر آخرت کا نغمہ بازار سے خریدے ہوئے ساز پر نہیں چھڑتا۔ وہ تو دل کے ساز پر چھڑتا ہے۔ اور آدمی کا حال یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے دل کے ساز کو اپنے سینہ کے اندر بند کئے ہوئے ہے۔ پھر وہ نغمہ کیسے چھیڑا جائے جو صرف دل کے چھپے ہوئے تاروں پر چھڑتا ہے۔ وہ ساز کیسے بجایا جائے جو معانی کی زبان میں بجتا ہے اور روح کے کانوں سے سنا جاتا ہے۔

افراد کی سطح پر ہر زمانہ میں کچھ اللہ والے ہوئے ہیں۔ مگر اجتماعی سطح پر حقیقی اسلامی انقلاب تاریخ میں صرف ایک ہی بار پیش آیا۔ نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ تاریخ میں ایک ہی بار یہ واقعہ ہوا کہ انسانوں کی ایک جماعت نے اپنے دل حق کے حوالے کر دئے۔ انھوں نے اپنے سینہ کا ڈھکن کھول دیا کہ اس کے تاروں کو چھیڑا جائے۔ تاکہ ان کی فطرت کے ساز پر حق کا نغمہ گایا جا سکے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارہ میں خدا نے کہا کہ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ورنہ تاریخ کے ہر دور میں تو وہی کچھ پیش آتا رہا جس کی تصویر اس آیت میں کھینچی گئی ہے — یاحسرۃ علی العباد ما یاتیھم من رسول الا کانوا بہ یستھزؤن

ہمارے سامنے جو کام ہے وہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ یہ تاریخ کا سب سے زیادہ نازک اور سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ہم ان روحوں کو ریکروٹ کرنا چاہتے ہیں جو دنیا میں خدا کی عدالت بن سکیں۔ خدا چاہتا ہے کہ وہ دنیا میں اپنی ترازو کھڑی کرے۔ مگر خدا کا ترازو لوہے اور لکڑی سے نہیں بنتا۔ وہ زندہ روحوں اور تڑپتے ہوئے دلوں کے ذریعہ بنتا ہے۔ ہم کو وہ انسان درکار ہیں جن کے اوپر لوگوں کی سرکشی کو تولا جائے۔ جن کے آئینہ میں لوگوں کی جھوٹی دینداری کو بے نقاب کیا جائے۔ جن کی کسوٹی پر ظالم کا ظالم ہونا ثابت کیا جائے۔ ترازو اس وقت ترازو بنتا ہے جب کہ وہ اپنے پلہ پر من اور کوئنٹل کا بوجھ لادنے کو برداشت کرے۔ اسی طرح آپ بھی اس وقت خدا کے ترازو بن سکتے ہیں جب کہ آپ یک طرفہ طور پر دنیا کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار ہو جائیں یہ اپنے آپ کو حالات کے کولھو میں ڈال کر پس اٹھنا ہے۔ پھر کون ہے جو اپنے بیج کو دنیا کی مٹی میں دفن کرے تاکہ خدا اس کو آخرت میں ہرے بھرے درخت کی صورت میں اگائے۔

خدا کی ترازو بننے کا انعام بہت بڑا ہے۔ خدا آخرت میں فرشتوں کو اپنی ترازو بنائے گا مگر دنیا میں تو بہر حال انسان ہی اس کی ترازو بن سکتے ہیں۔ اس عمل کا اخروی انجام تو یقینی طور پر معلوم ہے اور وہ جنت ہے۔ مگر دنیا کا انجام معلوم نہیں۔ وہ حضرت یحیٰی اور حضرت مسیح جیسا بھی ہو سکتا ہے اور حضرت موسیٰ اور حضرت محمد جیسا بھی۔

دوستو، اسلام کی ایک نئی تاریخ بنانی ہے۔ یہ اجتماع اس لئے کیا گیا ہے کہ ہم یہ جانیں کہ آپ میں سے کون ہے جو اس مشکل کام میں ہمارا ساتھ دیتا ہے یہ مَن انصاری الی اللہ کی پکار ہے، اور اب یہ دیکھنا ہے کہ آپ میں سے کون ہے جو یہ کہنے کے لئے تیار ہو کہ نحن انصار اللہ۔

اسلام کی نئی تاریخ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی قلعہ پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگے یا کسی تخت پر مسلم بادشاہ بیٹھا ہوا دکھائی دے۔ اسلام کی نئی تاریخ کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی بگڑی ہوئی تصویر کو دوبارہ صاف کیا جائے اور اس کو اس کی صحیح صورت میں دنیا کے سامنے لایا جائے۔ دنیا کی دوسری قومیں ہمارے لئے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں مگر ہم نے ان کو فریق بنا لیا ہے اسلام آخرت کی صراط مستقیم ہے مگر اس کو دنیوی اور قومی جھگڑوں کا عنوان بنا دیا گیا ہے۔ خدا کا دین اس لئے اترا کہ اس کو دوسری قوموں تک پہنچایا جائے مگر ہم نے خدا کے دین کو اپنی

قومی سیاست کا ضمیمہ بنالیا۔ اس صورت حال کو بدلنا ہے۔ اسلام کو آخرت کی صراط مستقیم کے طور پر دنیا کے سامنے لانا ہے۔ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کے رشتہ کو بحال کرنا ہے۔

آج جو صورت حال ہے اس نے اس کام کو وقت کا مشکل ترین کام بنادیا ہے۔

۱۹۴۵ میں تاریخ میں پہلی بار یہ واقعہ ہوا کہ جاپان کے اوپر دو ایٹم بم گرایا گیا جس نے جاپان کی معاشیات کو بالکل برباد کر دیا۔ اس کے بعد جاپانی بادشاہ ہیرو ہٹو نے ریڈیو پر ایک تقریر کی۔ اس مختصر تقریر میں اس نے کہا :

> ہمیں ایک ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے۔ تاکہ ہم جاپان کی اگلی نسلوں کی تعمیر نو کر سکیں

کسی بھی چیز کی نئی تاریخ ہمیشہ قربانی کی قیمت پر بنتی ہے۔

قرآن میں بہت سے مقامات پر یہ بات کہی گئی ہے کہ اے ایمان لانے والو، میری مدد کرو۔ جس کے بدلے میں تم کو میں بہت بڑا انعام دوں گا (یاایھا الذین اٰمنوا ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم، محمد ۷) من ذا الذی یقرض اللہ قرضا حسنا فیضٰعفہ لہ، حدید ۱۱)

خدا تمام زمین و آسمان کا مالک ہے ہر قسم کی طاقتیں اسی کے پاس ہیں۔ وہ کسی کام کے لئے بھی کسی کا محتاج نہیں۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ میری مدد کرو، مجھے قرض دو، ظاہر کرتا ہے کہ خدا کی اتھاہ سلطنت میں کوئی گوشہ ایسا بھی ہے جہاں خدا کو اپنے بندوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی بندے کی اس سے بڑی خوش قسمتی نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے رب کے لئے استعمال ہو۔ اس کا وجود اپنے خدا کے کسی کام میں آجائے۔

یہ خدا کا کام کیا ہے جس کی ادائگی کے لئے اسے بندوں کی ضرورت ہے۔ یہ اعلان حق کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو ایک خاص منصوبہ کے تحت بنایا ہے۔ یہ منصوبہ امتحان کا منصوبہ ہے یعنی لوگوں کو پیدا کر کے انھیں آزاد ماحول میں رکھنا اور پھر دیکھنا کہ کون خدا کا تابعدار بن کر رہتا ہے اور کون اس کا سرکش بن جاتا ہے۔ اس کے بعد خدا دوسری کامل دنیا بنائے گا جہاں اپنے وفادار بندوں کو جنت میں داخل کرے گا اور سرکش لوگوں کو جہنم میں دھکیل دے گا۔ اس امتحانی

منصوبہ کا تقاضا تھا کہ پورے معاملہ کو غیب میں رکھا جائے۔ اگر خدا اور فرشتے اور جنت اور دوزخ سب سامنے ہوں تو پھر امتحان کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

خدا نے اپنے منصوبہ کو اشارات (آیات) کی زبان میں پوری کائنات میں پھیلا دیا ہے کائنات کی ہر چیز صد درجہ خدائی کنٹرول میں رہ کر بتا رہی ہے کہ یہاں انسانوں کو بھی اسی طرح پابند زندگی گزارنا ہے جس طرح ساری کائنات پابند نظام پر چل رہی ہے۔ اس کے ساتھ انسان کی فطرت میں خیر و شر کی تمیز رکھ دی گئی ہے۔ جو ہر وقت خاموش زبان میں اندر سے بولتی رہتی ہے کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

تاہم فطرت اور کائنات میں ہدایت کے اس انتظام کو خدا نے کافی نہیں سمجھا۔ کیوں کہ وہ انتہائی مکمل ہونے کے باوجود بہر حال خاموش زبان میں تھا۔ خدا نے چاہا کہ نطق کی زبان میں بھی انسان کو حقیقت واقعہ سے باخبر کر دیا جائے تاکہ فیصلہ کے دن کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ رہے کہ آپ ہم کو ایسے جرم کی سزا دے رہے ہیں جس سے ہمیں باخبر نہیں کیا گیا تھا۔ خدا کی طرف سے انسان کے اوپر آخری طور پر اتمام حجت ہو جائے (النساء ۱۶۵)

یہی وہ مقام ہے جہاں خدا کو انسان کی ضرورت ہے۔ خدا نے اپنے امتحانی منصوبہ کی وجہ سے ایسا کیا ہے کہ اپنی وسیع سلطنت کے ایک خاص گوشہ میں سارا اختیار رکھتے ہوئے اپنے کو بے اختیار کر لیا ہے۔ وہ زبان رکھتے ہوئے یہاں خاموش ہے۔ عیاں ہوتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو یہاں چھپا دیا ہے۔ ہر قسم کی قدرت رکھتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو بے قدرت کر لیا ہے۔

اب خدا کو کچھ انسان درکار ہیں جو لوگوں کے سامنے خدا کے نمائندے بن کر کھڑے ہوں۔ جو خدا کی زبان سے بولیں۔ جو چھپی ہوئی حقیقتوں کو اس طرح نمایاں کریں کہ وہ لوگوں کو کھلی ہوئی حقیقتوں کی طرح نظر آنے لگیں۔ وہ خدا کی جنت اور جہنم کو بے پردہ کر کے لوگوں کے سامنے رکھ دیں۔

یہ کام کوئی لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کرنے کا کام نہیں ہے۔ یہ خدائی مشن میں کامل درجہ کی شمولیت چاہتا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ آدمی اللہ کے کام کو اپنا کام بنائے۔ وہ زندگی اور مال کی ہر قیمت دینے کے لئے تیار ہو جائے۔ وہ اپنے آپ کو اتنا زیادہ اس میں شامل کرے کہ جو حقیقتیں کائناتی سطح پر غیب میں ہیں وہ اس کی ذات کی سطح پر شہود واقعہ بن جائیں۔

دہلی میں کچھ لوگ ہمارے یہاں آئے۔ انھوں نے الرسالہ کی بہت تعریف کی۔ میں نے پوچھا کہ الرسالہ کی کیا چیز آپ کو پسند آئی۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ میں سائنسی مضامین ہوتے ہیں اور ہم کو پسند ہے کہ اسلام کو سائنسی انداز میں پیش کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ الرسالہ میں چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے سبق نکالے جاتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ الرسالہ میں اقتصادی تعبیر کو بہت موثر انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ باتیں الرسالہ میں ہوتی ہیں۔ مگر وہ ضمنی اور اضافی ہیں۔ یہی باتیں الرسالہ کا مشن نہیں ہیں۔ ہمارا مقصد اسلام کا سائنسی مشاعرہ کرنا نہیں ہے۔ اور نہ کسو قسم کے پرلطف ادب کا بازار لگانا ہے۔ الرسالہ کا مشن اس سے کہیں زیادہ آگے ہے۔

ایسے لوگوں کے متعلق میں کہوں گا کہ انھوں نے ابھی تک الرسالہ کو نہیں پڑھا۔ اگر انھوں نے اس کو پڑھا ہوتا تو وہ کہتے کہ الرسالہ میں قیامت کی کڑک ہوتی ہے۔ اس میں حشر ونشر کی ہولناکیاں ہوتی ہیں۔ اس میں جنت اور جہنم کے مناظر ہوتے ہیں۔ اس میں خدائے ذو الجلال کی تجلیاں ہوتی ہیں۔ الرسالہ کی اصل چیزیں یہی ہیں۔ اسی شخص نے الرسالہ کو پڑھا ہے جس نے الرسالہ کو اس حیثیت سے پایا ہے۔

جیسا کہ اعلان کیا گیا تھا، یہ اجتماع الرسالہ کے مشن سے اتفاق رکھنے والوں کا اجتماع ہے۔ جو لوگ الرسالہ کو گہرائی کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں ان کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اس اجتماع کا مقصد اور اس کی نوعیت کیا ہے۔ تاہم آغاز ہی میں صاف لفظوں میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ اجتماع ہم نے اس لئے نہیں کیا ہے کہ ہم یہاں کوئی سائنسی مشاعرہ کریں یا ادبی اور تقریری کرتب کے نمونے آپ کے سامنے پیش کریں۔ اس قسم کی مصروفیت کو نہ ہم اپنے لئے جائز سمجھتے اور نہ آپ کے لئے۔ یہ اجتماع تو درحقیقت صرف اپنے جائزہ کے لئے کیا گیا ہے۔ اس کا اگر کوئی عنوان ہو سکتا ہے تو وہ حدیث کے الفاظ میں صرف یہ ہے کہ ——— حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا (اپنا حساب کر لو قبل اس کے کہ تمہارا حساب کیا جائے) عقل مند انسان وہ ہے جو خود ہی اپنا جائزہ لے لے۔ کیوں کہ جس کا جائزہ قیامت میں لیا جائے گا وہ ہلاک ہوا۔

فمن نوقش فقد ھلک)

ایسے بے شمار لوگ ہیں جنھوں نے انگریزی اور فرانسیسی فوجوں کو دیکھا کہ وہ مسلم دنیا کو روندرہی ہیں تو ان کا خون کھول اٹھا اور وہ ان سے اور ان کے حامیوں سے لڑنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ مگر ہمیں ایسے انسانوں کی تلاش ہے جو شیطان کی فوج کو دیکھ کر تڑپ ہیں اور لوگوں کو جہنم میں جاتا ہوا دیکھ کر بے قرار ہوں۔ ایسے افراد سے زمین بھری ہوئی ہے جو مسلم قوم کے خلاف غیر قوموں کی کارروائیوں کو دیکھ کر بھڑک اٹھے ہوں۔ مگر ہم ان انسانوں کو ڈھونڈنے نکلے ہیں جو ہواؤں کو دیکھ کر تڑپ ہیں۔ جن کو درختوں کا منظر بے قرار کر دیتا ہو۔ جو زمین و آسمان کو دیکھ کر مبہوت ہو گئے ہوں۔ لوگ انسانی واقعات میں گم ہیں۔ ہم ان انسانوں کو تلاش کر رہے ہیں جو خدائی واقعات میں گم ہو سکیں۔ لوگوں کو دنیا کی محرومی کا احساس متحرک کئے ہوئے ہے۔ ہم کو وہ انسان درکار ہیں جن کو آخرت کی محرومی کے احساس نے دیوانہ بنا رکھا ہو۔

الرسالہ کی پکار من انصاری الی اللہ کی پکار ہے۔ مگر یاد رکھئے کہ یہ ایک قربانی کا راستہ ہے یہاں پانا نہیں کھونا ہے۔ یہ دنیا کو برباد کر کے آخرت کی تعمیر کرنا ہے۔ یہ اپنے بیج کو فنا کرنا ہے تاکہ اس کے اندر سے خدا کا شاداب درخت نکلے۔ یہ اپنے کو مٹی میں ملانا ہے تاکہ اس کے اندر سے خدا کا باغ اگے۔ یہ دنیا ایسی دنیا ہے جہاں ٹوٹے ہوتے دلوں کی آواز ہی خدا کے گیت میں ڈھلتی ہے۔ جنت ان لوگوں کا انتظار کر رہی ہے جو اس خدائی کام کی طرف بڑھیں۔ جو اپنی بربادی کی قیمت پر خدا کے گھر کی تعمیر کریں۔ میرے دوستو، اس کام کی طرف آگے بڑھو، قبل اس کے کہ خدا کا فرشتہ قیامت کا بگل بجا دے اور کسی کے لئے نہ کچھ کرنے کا موقع باقی رہے اور نہ انعام خداوندی میں حصہ دار بننے کا۔

میرے دوستو، اللہ کو ایک باغ اگانا ہے، جنت کا باغ۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کو کچھ درخت درکار ہیں جو خدائی معیار پر پورے اتریں اور خدائی باغ میں لگائے جا سکیں۔ قرآن میں مومن کی مثال ہرے بھرے تناور درخت سے دی گئی ہے اور اس سلسلے میں فرمایا گیا ہے کہ اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء (ابراہیم) دنیا میں اگنے والا درخت مومن کی زندگی کی مادی تمثیل ہے۔ عام درخت زمین سے نکلتا ہے اور آسمان کی طرف بلند ہو کر پھیلتا ہے۔ اسی طرح مومن جس ربانی درخت کا نام ہے وہ دنیا میں اگتا ہے اور اس کو آسمان میں لگایا جاتا ہے۔

اسلام کا معاملہ کوئی نسلی معاملہ نہیں اور نہ وہ جیو منتر کا معاملہ ہے۔ اسی طرح اسلام کا معاملہ سیاسی ایکیٹر پھاڑ اور تقریروں اور تحریروں کا سیلاب بہانے کا نام بھی نہیں ہے۔ اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ آدمی اپنے وجود کو بیج کی صورت میں اس دنیا میں دفن کرنے کے لئے تیار ہو۔ زمین میں دفن ہونے والا بیج ہی اگ کر درخت بنتا ہے۔ اسی طرح دفن ہونے والی روح ہی دوبارہ زندگی پاکر سرسبز و شاداب بنتی ہے۔

اسلام اپنے آپ کی اور خدا کی دریافت ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دریافت کیسی عجیب اور کیسی لذیذ چیز ہے۔ ایک دریافت کو پاکر ارشمیدس ننگا حوض سے نکل کر بھاگا۔ اور ایک دریافت کو پاکر اصمعی بدو کا خیمہ سے نکل کر صحرا کی طرف دوڑ پڑا۔ اسلام اس بات کی دریافت ہے کہ میں کیا ہوں اور خدا کیا ہے۔ میں عاجز مطلق ہوں اور خدا قادر مطلق۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی دریافت کا نام اسلام ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں سارا اختیار خدا کی طرف ہے اور ساری بے اختیاری ہماری طرف۔ مگر اس حقیقت واقعہ پر انسانی اختیار کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ ہماری زندگی کے واقعات بظاہر ہمارے کئے سے ہو رہے ہیں مگر وہ حقیقۃً خدا کے کرنے سے ہو رہے ہیں۔ اسی پردہ کو پھاڑنے کا نام ایمان ہے۔ جس کو اس قسم کا ایمان حاصل ہوتا ہے وہ اس کے بعد بالکل دوسرا انسان بن جاتا ہے۔

(۱۰ اپریل ۱۹۸۲)

پیغام

چودھویں صدی ہجری پر اسلام کا ایک دور ختم ہوا ہے ، پندرہویں صدی ہجری میں اسلام کے نئے دور کا آغاز ہونا ہے۔ مزید یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج وہ تمام موافق حالات مکمل طور پر پیدا ہو چکے ہیں جو اسلام کا نیا دور شروع کرنے کے لئے درکار ہیں۔

جب رات کا اندھیرا ختم ہوتا ہے اور نئے دن کا سورج نکلنے کے آثار ظاہر ہوتے ہیں تو یہ فطرت کی طرف سے اس بات کا خاموش اعلان ہوتا ہے کہ روز و شب کی ایک گردش پوری ہوگئی۔ اب اس کی دوسری گردش شروع ہونے والی ہے۔ جو شخص چاہے اس کی روشنی میں اپنا سفر شروع کرے اور منزل پر پہنچ جائے۔

صبح کے وقت سورج کا نکلنا ہر آدمی کو دو چیزوں کے درمیان کھڑا کر دیتا ہے۔ ایک وہ موقع جو گزر چکا۔ دوسرا وہ موقع جو سامنے کھلا ہوا موجود ہے۔ جو شخص بھی ان مواقع کو استعمال کرے گا وہ لازماً اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔ تاہم امتحان کی اس دنیا میں مواقع صرف انھیں کے لئے ہوتے ہیں جو مواقع کو استعمال کریں۔ جو لوگ مواقع کو استعمال کرنے میں ناکام رہیں ان کے لئے کوئی موقع موقع نہیں۔ کامیابی دوسرے لفظوں میں موجود مواقع کو استعمال کرنے ہی کا دوسرا نام ہے۔

کوئی شخص پچھلے کل میں اپنا سفر شروع نہیں کر سکتا۔ سفر جب بھی شروع ہوگا "آج" سے شروع ہوگا نہ کہ گزرے ہوئے "کل" سے۔ جو لوگ آج کے دن بھی کل میں جئیں ان کے لئے اس دنیا میں بربادی کے سوا اور کوئی چیز مقدر نہیں۔

جو مواقع گزر چکے انھیں بھول جائیے۔ جو مواقع آج موجود ہیں ان کو جانیے اور انھیں استعمال کیجئے۔ انشاء اللہ آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔ یاد رکھئے گزرا ہوا دن کبھی کسی کے لئے واپس نہیں آیا۔ گزرا ہوا دن آپ کے لئے بھی واپس آنے والا نہیں۔

روداد سفر

لاہور میں قرآن اکیڈمی (زیر صدارت ڈاکٹر اسرار احمد صاحب) کی طرف سے ہر سال بڑے پیمانہ پر قرآنی سیمنار ہوتا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں مجھے اس کا دعوت نامہ ملا مگر بعض وجوہ سے میں سفر نہ کر سکا۔ اس سال پھر دعوت نامہ آیا تو میں نے طے کر لیا کہ اس بار ان شاء اللہ اس میں شرکت کروں گا۔ اس کے مطابق مارچ ۱۹۸۵ کا آخری ہفتہ لاہور میں گزرا۔

پہلا سفر

پہلی بار میں ۱۹۴۵ میں لاہور گیا تھا۔ اس وقت میری عمر تقریباً ۲۰ سال تھی۔ یہ میری زندگی کے اس دور کی بات ہے جب کہ میں "تلاش حق" کے کٹھن مرحلے سے گزر رہا تھا۔ میں اپنے ماحول میں ایک سیدھے سادے نوجوان کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ میرے چچازاد بھائی مولانا اقبال احمد سہیل (۱۹۵۵ - ۱۸۸۷) مجھ کو "مرزا پھویا" کہتے تھے۔ یہ حالات تھے کہ ۱۹۴۳ میں میرے ساتھ ایک شدید حادثہ گزرا۔ یہ گویا ایک قسم کا انفجار (Explosion) تھا جس نے میری بند شخصیت کو کھول دیا۔

یہ حادثہ بظاہر ایک مادی ناکامی کا واقعہ تھا مگر عملاً وہ میرے لئے روحانی ناکامی کا واقعہ بن گیا۔ اس حادثہ نے میری سوئی ہوئی فطرت کو جگا دیا۔ اچانک میں نے جانا کہ میں نہیں جانتا۔ میں نے اپنے نہ جاننے کو دریافت کیا۔ اس حادثہ نے میری زندگی کو سکون کے دور سے نکال کر اضطراب کے دور میں داخل کر دیا۔

میری کشتی اگرچہ "سمندر" میں ٹوٹی تھی مگر شاید کسی نامعلوم قوت نے میرے اندر پیدا ہونے والے نفسیاتی ہیجان کو استعمال کر کے مجھے تلاش حق کے "جزیرہ" میں ڈال دیا۔ اس زمانہ میں میں نے فانی بدایونی (۱۹۴۰ - ۱۸۷۹) پر ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون لکھنؤ کے رسالہ نگار میں چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا " فانی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں " یہ مضمون فانی سے زیادہ خود مضمون نگار کی اپنی تصویر تھا۔ میں نے تلاش حق میں اپنی سرگردانی کو فانی کے آئینہ میں دیکھ لیا تھا۔

یہ دور تقریباً پانچ سال تک رہا۔ اس وقت میرے اوپر جو حالات گزرے وہ استنے شدید تھے کہ کئی بار میں نے چاہا کہ میں خودکشی کرلوں۔ دیوانگی کے عالم میں کبھی میں کسی دور دراز بستی میں چلا جاتا اور کبھی کسی جنگل یا پہاڑ کی طرف نکل جاتا۔ ۱۹۴۵ میں لاہور کا سفر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ اس وقت پاسپورٹ اور ویزا کے مسائل نہیں تھے۔ میں شاہ گنج میں ایک اکسپریس ٹرین پر سوار ہوگیا۔ اس وقت شاہ گنج سے لاہور کا ریلوے کرایہ غالباً گیارہ روپئے تھا۔ ٹرین نے سیدھ لے جاکر مجھے لاہور میں اتار دیا۔

لاہور اسٹیشن پر اترنے والے تمام مسافر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ مگر میر دیوانگی کے عالم میں کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ کہاں جاؤں۔ کیوں کہ اس وقت لاہور میں کوئی بھی یہ جاننے والا نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب پلیٹ فارم خالی ہوگیا تو ایک خالی انجن دھواں اڑاتا ہوا یہ سے گزرا۔ میں اس کی طرف بڑھا کہ اپنے آپ کو اس کے نیچے ڈال دوں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی مخفی طاقت نے میرے قدموں کو پکڑ لیا ہے۔ چاہنے کے باوجود میں آخری اقدام سے با رہا۔

میں ریلوے اسٹیشن کے باہر آیا۔ میں اسٹیشن کی عقبی سڑک پر کھڑا تھا۔ لوگ اِدھر سے اُدھر آ جاتے نظر آرہے تھے۔ "یہ لوگ کیا کرتے ہیں اور کہاں جارہے ہیں" میرے دل نے سوال کیا۔ اتنے میں ایک کم عمر خوش پوشں آدمی ایک طرف سے دوسری طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ میں بڑھ کر اس کے پاس پہنچا۔ سلام علیک کے بعد میں نے پوچھا:

آپ کیا کام کرتے ہیں۔

میں کسی بنک میں کام کرتا ہوں۔

آدمی نے مختصر جواب دیا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ آدمی کسی بنک میں کلرک تھا۔ مگر اس ایسے پر اعتماد لہجہ میں جواب دیا جیسے کہ اس کو کوئی بہت بڑی چیز مل ہوئی ہو —— جو شخص راضی ہو جائے اس کو کبھی زیادہ نہیں ملتا۔

انگریزی دور میں یہاں کے ایک صاحب خواجہ محمد بخش مزدور کی حیثیت سے آسٹریلیا تھے۔ وہ واپس آتے تو لوگ ان کو محمد بخش آسٹریلیا کہتے تھے۔ ۱۹۲۵ میں انھوں نے ریلوے اسٹیشن

پاس ایک مسجد بنائی جوان کے نام پر آسٹریلیا مسجد (جامع آسٹریلیا) مشہور ہوگئی۔

میں ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلا تو یہی مسجد میرے سامنے تھی۔ چنانچہ میں نے آسٹریلیا مسجد میں اپنا مختصر سامان رکھا اور ایک اجنبی مسافر کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوا۔ میں کسی منصوبہ اور معلومات کے بغیر مختلف سڑکوں پر گھومتا رہا۔ یہاں تک کہ میں میورروڈ پہنچ گیا۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے بورڈ نے بتایا کہ یہ ڈاکٹر اقبال (۱۹۳۸ - ۱۸۷۷) کا مکان ہے۔ مکان بالکل اجاڑ دکھائی دے رہا تھا۔ میں وہاں ٹھہر گیا۔ سڑک سنسان تھی۔ میں بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے اکیلا کھڑا تھا۔ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور میری زبان پر یہ الفاظ جاری تھے:

خداوند تو کب آئے گا۔ میں کب تک تیرے آنے کا انتظار کروں

یہ دعائیہ کلمہ میری اس آتشیں کیفیت کو بتا رہا ہے جس کے تحت میں اس زمانہ میں لاہور گیا اور دوسرے مقامات کے سفر کئے۔

طبیعت کچھ تھمی تو مجھ کو پیاس کا احساس ہوا۔ اقبال کے مکان سے ملی ہوئی سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی معمولی طور پر بنی ہوئی مسجد دکھائی دی۔ میں وہاں پہنچا۔ دیکھا تو ایک ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ میں ہینڈ پمپ چلانے لگا۔ مگر دیر تک چلانے کے بعد بھی پانی نہیں نکل رہا تھا۔ اتنے میں ایک شخص سڑک سے گزرا۔ وہ میری حالت کو محسوس کر کے میری مدد کے لئے آیا۔ اس نے غور سے دیکھا اور پھر بتایا کہ پانی برابر آرہا ہے مگر باہر کی ٹونٹی بند ہے اس لئے سارا پانی پچھلے پائپ سے گزر کر حوض میں چلا جاتا ہے۔ اس نے ٹونٹی کھولی تو فوراً میرے سامنے پانی گرنے لگا۔

یہ میری زندگی کا پہلا "تعمیری" سبق تھا۔ اس واقعہ نے مجھے بتایا کہ اس دنیا میں صرف عمل کافی نہیں۔ عمل کے نتیجہ خیز بننے کے لئے دوسرے بہت سے اسباب کی موافقت بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی ایک ضروری سبب بھی موافقت نہ کر رہا ہو تو سارے عمل کے باوجود کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوگا۔

یہ آدمی جس نے میری مدد کی اس کا پورا نام اب یاد نہیں رہا۔ صرف یہ یاد ہے کہ اس کے نام کے آگے قریشی کا لفظ شامل تھا۔ پانی پینے کے بعد قریشی صاحب مجھے اپنے چھوٹے سے مکان پر لے گئے۔ اس کے بعد بقیہ ایام میں نے انھیں کے ساتھ گزارے۔

اس وقت لاہور کی مال روڈ (موجودہ شاہراہ قائد اعظم) پر ٹیلرنگ کی ایک بڑی دکان تھی جس کا نام بی لیلا رام اینڈ سنز تھا۔ یہاں کے ٹیلر ماسٹر ایک مسلمان تھے غالباً صاحب نے مجھ کو ان ٹیلر صاحب سے ملایا۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے کہا "یہ کسی اچھے خاندان کا لڑکا ہے اور غلطی سے یہاں آگیا ہے۔" انھوں نے اصرار کرکے مجھے واپسی پر آمادہ کیا۔ دو ہفتے کے بعد انھوں نے ٹکٹ خرید کر مجھے ٹرین پر بٹھا دیا اور میں اپنے وطن اعظم گڈھ واپس آگیا۔ جہاں تک یاد ہے واپسی ٹکٹ کا کرایہ میرے پاس نہیں تھا۔ وطن واپس آنے کے بعد میں نے منی آرڈر کے ذریعہ ٹیلر صاحب کی رقم انھیں بھیج دی۔

۲۷ مارچ ۱۹۸۵ کو میں نے دوبارہ میورروڈ جاکر اسے دیکھا "جاوید منزل" اب "علامہ اقبال میوزیم" بن چکا ہے۔ مکان کا تعمیری نقشہ وہی پرانا ہے۔ البتہ اس کو از سر نو مزین کیا گیا ہے۔ ایک تختی پر علامہ اقبال کے مختصر حالات لکھے ہوئے تھے۔ اس میں یہ فقرہ بھی تھا:

> ۱۹۳۰ میں الہ آباد کے مقام پر اپنے تاریخی خطبہ میں اس مسلم ریاست کا تصور پیش کیا جو اب پاکستان کی صورت میں قائم ہے۔

جاوید منزل سے ملی ہوئی چھوٹی سی مسجد رقبہ کے اعتبار سے اب بھی اتنی ہی بڑی ہے۔ البتہ اس کو دوبارہ دو منزلہ صورت میں تعمیر کیا گیا ہے۔

میورروڈ تعمیری لحاظ سے اب بھی تقریباً ویسا ہی نظر آیا جیسا کہ وہ ۴۰ سال پہلے تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ اب یہاں انسان زیادہ نظر آنے لگے ہیں۔ جب کہ ۱۹۴۵ میں وہ ایک سنسان سڑک کی مانند تھی۔

ریلوے اسٹیشن بھی معمولی اضافہ کے ساتھ تقریباً ویسا ہی ہے جیسا کہ وہ ۱۹۴۵ میں تھا۔ کوئی بڑی تبدیلی مجھے وہاں دکھائی نہیں دی۔

دوسرا سفر

لاہور کے لئے میرا دوسرا سفر فیروزپور کے راستہ سے مئی۔ جون ۱۹۷۱ میں ہوا۔ ۱۹۴۵ میں میں نے جو سفر کیا وہ ایک ہی ملک کے ایک حصہ سے اس کے دوسرے حصہ میں جانا تھا۔ اس وقت کسی "سرحد" کا وجود نہ تھا جہاں چیکنگ کی ضرورت پیش آئے۔ مگر ۱۹۷۱ میں تاریخ بدل

تھی۔ اب میں دہلی سے لاہور کے لئے روانہ ہوا تو میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں جا رہا تھا۔ نانچہ سرحد پر زبردست چیکنگ کا سامنا کرنا پڑا۔

ہندستانی چوکی پر نہ جاتے ہوئے کوئی خاص زحمت پیش آئی اور نہ آتے ہوئے۔ مگر پاکستانی چوکی پر ایسی سخت پریشانی پیش آئی کہ میں نے سوچا کہ میرے جیسے آدمی کو پاکستان جانا ہی نہیں چاہئے۔

واپسی میں پاکستانی چوکی پر متعین آدمی کا ظالمانہ رویہ اپنی آخری حد کو پہنچ گیا۔ میں جون کی تیز دھوپ میں کھلے میدان میں کھڑا ہوا تھا۔ خدا اور اسلام کا کوئی بھی حوالہ اس آدمی کے لئے بے اثر ثابت ہو رہا تھا۔ جو میری تمام کتابیں اور اوراق بکھیر کر میز کی دوسری طرف مجھے اس طرح فاتحانہ انداز میں دیکھ رہا تھا کہ میں کوئی مجرم ہوں۔ اس کا کھلا مطالبہ تھا کہ جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے وہ سب ہمارے حوالے کرو۔ ورنہ ہم جانے نہیں دیں گے۔

میں بے بس کھڑا ہوا تھا کہ اچانک ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی۔ جاتے ہوئے میں نے دیکھا تھا کہ پاکستان کی سمت میں ایک خیمہ لگا ہوا ہے جس میں ایک فوجی افسر ڈیوٹی پر رہتا ہے۔ جاتے ہوئے اتفاقاً میری اس سے کچھ بات چیت ہو گئی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ تفتیش کا آدمی مجھ کو چھوڑ نہیں رہا ہے تو میں نے کہا " یہ میجر صاحب مجھ کو جانتے ہیں کہئے تو ان کو بلا دوں " اس جملے نے جادو کا کام کیا اس کو سنتے ہی فی الفور آدمی کا رویہ بدل گیا۔ اس نے میرے بیگ سے ایک سادہ ڈائری نکالی اور کہا کہ جائیے۔

کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو خدا سے اتنا بھی نہیں ڈرتے جتنا وہ ایک فوجی افسر سے ڈرتے ہیں۔

لاہور پہنچ کر میں آٹو رکشا کے ذریعہ مولانا امین احسن اصلاحی کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ قریب پہنچ کر ڈرائیور نے کچھ لوگوں سے پوچھا " امین احسن اصلاحی کا گھر کون سا ہے " مگر لوگ سمجھ نہ سکے۔ کسی نے کہا " امین احسن مودودی " کسی نے کہا " ابو الاعلیٰ اصلاحی "۔ لوگ نہ پوری طرح مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کو جانتے تھے اور نہ پوری طرح مولانا امین احسن اصلاحی کو۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ جنرل یحییٰ خاں کی حکومت کے تحت ابھی حال میں جماعت اسلامی پاکستان

نے الکشن میں ناکام حصہ لیا تھا۔ لاہور کی دیواروں پر اب بھی ایسے پوسٹر لگے ہوئے تھے جو اگرچہ پھٹ چکے تھے۔ تاہم ان پر جلی حرفوں میں یہ الفاظ لکھے ہوئے پڑھے جاتے تھے :

انشاء اللہ جیتے گی ، جماعت اسلامی جیتے گی۔

جدید اسلامی تاریخ کا یہ ایک عجوبہ ہے کہ وہ لوگ جن کا تعارف ملک کے صرف ۵ فی صد تعلیم یافتہ طبقہ میں ہے وہ الکشنی سیاست میں کودتے ہیں جہاں جاہل عوام کی اکثریت کی رائے فیصلہ کن ہوتی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ بڑا عجوبہ یہ ہے کہ ان کا یہ بے معنی اقدام جب انھیں ناکامی سے دوچار کرتا ہے تو وہ فوراً یہ شور کرنے لگتے ہیں کہ الکشن میں دھاندلی ہوئی ہے۔ ان کے اندر نہ اتنی عقل ہے کہ سیاسی معاملات کو سمجھیں اور نہ اتنا حوصلہ ہے کہ اپنی شکست کا اعتراف کریں۔

لاہور میں میری ملاقات خاص طور پر مولانا مودودی سے ہوئی وہ کافی کمزور ہو چکے تھے چھڑی ٹیک کر بہت آہستہ آہستہ چلتے تھے۔ پہلی ملاقات ان کے مطالعہ کے کمرہ میں ہوئی۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ ان کا مطالعہ کا کمرہ ایک ایسا کمرہ ہے جہاں روشنی صرف بجلی کے بلب کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے۔ راقم الحروف کا ذوق اس معاملہ میں یکسر مختلف ہے۔ میں لکھنے پڑھنے کا کام ایسے کمرہ میں کرنا پسند کرتا ہوں جہاں سورج کی روشنی پوری طرح آتی ہو۔ اس میں صرف رات کا استثنا ہے۔ کیوں کہ رات کے وقت مصنوعی روشنی ایک ضرورت بن جاتی ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات ہوئی تو ان کو میں نے الجمعیۃ ویکلی کا ایک شمارہ (۲۷ نومبر ۱۹۷۰) پیش کیا۔ اس کو لیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "میں اس کو پڑھوں گا۔ آپ کی کوئی چیز ملتی ہے تو میں ضرور اس کو پڑھتا ہوں۔"

الجمعیۃ کے اس شمارہ میں ایک مضمون تھا جس میں مسلم ممالک میں اسلامی احیاء کے امکانات پر گفتگو تھی۔ اگلی ملاقات میں اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا مودودی نے کہا "آپ جیسے لوگ مسلم ممالک کے بارہ میں کافی خوش فہم رہتے ہیں۔ حالانکہ موجودہ مسلم ممالک میں اسلامی کام کے مواقع اس سے بھی کم ہیں جتنا غیر مسلم ملک میں ہیں۔"

میں نے کہا کہ اس کی وجہ اسلامی تحریکوں کی یہ نادانی ہے کہ وہ ملے ہوئے مواقع کا بیجا استعمال کرتی ہیں۔ مسلم ملک کی موجودہ اسلامی تحریکوں نے اسلام کا ایسا تعارف کرایا ہے گویا کہ اسلام

عمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی ایک تحریک ہے۔ اس بنا پر حکمراں طبقہ ان کا مخالف ہوگیا ہے۔ اگر وہ سیاسی ٹکراؤ سے بچ کر کام کریں تو حکمراں طبقہ ان کا تعاون کرے۔ اور زبردست کام ہونے لگے۔

واپسی کے بعد میں نے اپنی کتاب الاسلام کا دوسرا اڈیشن دستی طور پر مولانا مودودی کے لئے بھوایا تھا۔ یہ کتاب ان کو پہنچ گئی تھی اور اس کے ملنے کی اطلاع بھی مولانا مودودی کے دستخط سے مجھے بذریعہ ڈاک وصول ہو گئی تھی۔ اس خط پر ۱۱ فروری ۱۹۷۹ کی تاریخ درج ہے اور حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

محترمی و مکرمی سلام مسنون

آپ کی ارسال کردہ کتاب "الاسلام" مجھے مل گئی ہے۔ میں اس عنایت کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔

خاکسار ابوالاعلیٰ

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے لاہور کی ملاقات میں سب سے زیادہ دلچسپی اس سے ظاہر کی کہ اخبار مسلم (دہلی) اور اخبار الجمعیۃ (دہلی) کے وہ قدیم شمارے انھیں حاصل ہو سکیں جو کہ ان کی ادارت میں شائع ہوتے تھے۔ ان کی فرمائش کے مطابق ہندستان واپس آکر میں نے الجمعیۃ ویکلی میں اس کا اعلان شائع کیا تھا مگر وہ شمارے حاصل نہ ہو سکے۔ الجمعیۃ ویکلی ۲ جولائی ۱۹۷۱ صفحہ ۲ پر ایک چوکھٹے میں یہ اشتہار دیکھا جا سکتا ہے:

مندرجہ ذیل قدیم پرچے بہ قیمت درکار ہیں:

اخبار مسلم ۱۹۲۲ تا ۱۹۲۳

اخبار الجمعیۃ دسمبر ۱۹۲۴ تا دسمبر ۱۹۲۸

جن صاحب کے پاس مذکورہ فائل برائے فروخت موجود ہو، وہ مطلع فرمائیں اور مطلوبہ قیمت بھی تحریر کریں۔

یہ اعلان مولانا مودودی ہی کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔ اگرچہ عملاً مذکورہ پرچے دستیاب نہ ہو سکے۔ مولانا مودودی پہلے دن زیادہ تر اخبار مسلم اور اخبار الجمعیۃ کے مذکورہ فائل کے بارہ میں

بات کرتے رہے۔ وہ اگرچہ نہایت کمزور اور مریض تھے، تاہم انھوں نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔

ملاقات سے پہلے مولانا مودودی کے رفیق خاص (غالباً رحمت الٰہی صاحب) نے کہا تھا کہ مولانا کی طبیعت بہت ناساز ہے۔ اس لئے ان سے کوئی اختلافی بات نہ چھیڑی جائے۔ وہ ملاقات کے وقت برابر میرے پاس بیٹھے رہے۔ جب میں باہر نکلا تو میں نے مذکورہ رفیق سے کہا کہ میں بعض امور پر بات کرنا چاہتا تھا مگر وہ نہ ہو سکی۔ انھوں نے دوبارہ وہی بات کہی کہ موجودہ حالت میں اختلافی امور پر بات کرنا مناسب نہیں ہے۔ کافی اصرار کے بعد وہ اس پر راضی ہوئے کہ میں جو بات کرنا چاہتا ہوں اس کا خلاصہ پیشگی طور پر لکھ کر انھیں دے دوں۔

میں نے وہیں بیٹھ کر ایک کاغذ پر چند سطریں لکھیں۔ اس تحریر کی نقل میرے پاس محفوظ نہیں۔ مفہوم کے اعتبار سے وہ بات یہ تھی کہ ــــــ پاکستان اسلام کے نام پر بنا۔ اس سے آپ نے قیاس کیا کہ پاکستان کے لئے مسلم لیگ نے جو مومنٹم پیدا کیا تھا اس کو آپ اپنی تحریک کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے پوری طرح اپنی جماعت کو اس رخ پر ڈال دیا۔ مگر آپ کا یہ اندازہ صحیح نہیں۔ تاریخی اور عقلی طور پر ایسا ہونا ناممکن ہے کہ کسی کی پیدا کردہ حرکت کو کوئی دوسرا شخص اپنے حق میں استعمال کر سکے۔ اس قسم کی کوشش کا انجام ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے آپ کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ الکشن اور مطالبۂ نظام اسلامی جیسی سیاست کو چھوڑ کر دوبارہ وہی اصلاحی اور تدریجی انداز اختیار کریں جس پر آپ تقسیم سے پہلے عامل تھے۔

میری یہ تحریر مولانا مودودی کے حوالے کر دی گئی۔ اور میں یہ کہہ کر واپس آگیا کہ کل میں دوبارہ ملاقات کروں گا اور اس موضوع پر براہ راست گفتگو کروں گا۔ اگلے دن میں عصر کی نماز کے وقت اچھرہ (۵۔ اے ذیل دار پارک) پہنچا تو پچھلے دن کے برعکس مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا چہرہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ سخت برہم نظر آتے تھے۔ میں نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے رفیق خاص کے مشورہ پر عمل کیا اور مولانا کی ناسازی طبع کی بنا پر اختلافی مسئلہ پر گفتگو کئے بغیر واپس چلا آیا۔ عصر اور مغرب کی نمازیں میں نے ان کے ساتھ اچھرہ میں پڑھیں۔

۱۹۷۱ میں جب میں ہندستان سے پاکستان پہنچا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں دوسرے

درجہ کے ایک ملک میں آگیا ہوں۔ وہاں کی ہر چیز مجھے ہندستان کے مقابلہ میں معمولی نظر آئی۔ وہاں کی ٹرین، وہاں کی بسیں، وہاں کے پارک، وہاں کے مکانات، سب نمایاں طور پر کمتر دکھائی دئے۔ وہاں کے اخبارات کا حال یہ تھا کہ میں نے ایک پاکستانی تعلیم یافتہ سے کہا کہ میری سزا کے لئے یہ کافی ہے کہ مجھے کسی مکان میں بند کر کے پابند کر دیا جائے کہ تم پاکستان کے اخبارات پڑھتے رہو۔ معمولی معمولی چیزیں مثلاً دروازہ کے بولٹ اور قلم کی سیاہی بھی چین کی بنی ہوئی نظر آئی۔

تاہم ۱۹۸۵ کے سفر میں محسوس ہوا کہ پچھلے پندرہ سال میں پاکستان نے کافی ترقی کی ہے۔ ہر شعبہ میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ بہتر حالات نظر آتے۔

۱۹۷۱ کے سفر کی یادوں میں سے ایک یاد یہ ہے کہ ایک روز رات کا وقت تھا۔ میں اپنے میزبان کے ساتھ ان کے دومنزلہ مکان کی چھت پر کھڑا ہوا تھا۔ چاندنی چاندنی پوری آب و تاب کے ساتھ فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہم دونوں خاموش قدرت کے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک میرے میزبان نے گہرے تاثر کے انداز میں کہا:

"یہی چاند تو ہندستان میں بھی چمکتا ہوگا"

کیسی عجیب ہے وہ دنیا جہاں چاند کو ایک ملک سے لے کر دوسرے ملک تک چمکنے کی اجازت ہو مگر انسان کے لئے حد بندیاں کھڑی ہوئی ہوں۔ چڑیاں آزادانہ طور پر ایک طرف سے دوسری طرف اڑ رہی ہوں مگر انسان ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں جانا چاہے تو بے رحم سرحدی قوانین وہاں اس کا استقبال کرنے کے لئے موجود ہوں۔ کتنا خوش قسمت ہے چاند۔ اور کتنا بدقسمت ہے انسان۔

آسٹریلیا کو چھوڑ کر تمام براعظموں (ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ) ہر جگہ مجھے جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ جب بھی میں کسی دوسرے ملک میں گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ہندستان سے مختلف ایک ملک میں آیا ہوں۔ مگر ہندستان سے پاکستان جانا گویا ہندستان سے ہندستان میں جانا ہے۔ دونوں ملکوں میں اتنی زیادہ مشابہت ہے کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آدمی ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ گیا ہے۔ اس کے باوجود ہندستان اور پاکستان کے ایئر پورٹ پر دونوں ملکوں کے مسافروں کی جتنی تفتیش کی جاتی ہے اتنی تفتیش شاید کسی بھی دوسرے ملک میں آنے جانے والوں کی نہیں کی جاتی۔

۱. بنگلور میں تبلیغی جماعت کا اجتماع ۲۳-۲۵ فروری ۱۹۸۵ء کو ہوا۔ اس موقع پر الرسالہ اداره کی مطبوعات کا اسٹال لگایا گیا۔ خدا کے فضل سے اسٹال کامیاب رہا۔ کافی لوگوں نے کتابیں دیکھیں اور خرید کر اپنے ساتھ لے گئے۔ ایک تعلیم یافتہ صاحب اسٹال پر آئے۔ وہ الرسالہ کے مشن سے پہلے سے واقف تھے۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ میرے گھر والوں کی غذا ہے۔ پھر انھوں نے حاضرین کو مخاطب کرکے کہا ــــ "یہ کتابیں میں نے پڑھی ہیں۔ یہ کتابیں بندہ کو خدائے تعالی سے ملانے والی ہیں۔ جو شخص بھی اپنا تعلق خدا سے جوڑنا چاہتا ہے اس کو یہ کتابیں ضرور پڑھنا چاہئے۔ میں اپنے بارہ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں نے ان کتابوں کے ذریعہ حقیقی معنوں میں خدا کو پایا ہے۔

۲. ۳۱ مارچ ۱۹۸۵ کی شام کو مرکز میں ماہانہ درس قرآن کا اجتماع ہوا۔ یہ اجتماع ہر مہینہ کی آخری اتوار کو نماز مغرب کے بعد ہوتا ہے۔ اس بار اخبار قومی آواز میں اس کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ حاضرین کی تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ تھی۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر جو درس دیا اس کا ٹیپ مرکز میں محفوظ ہے۔

۳. اسلامی مرکز اب خدا کے فضل سے اس حد تک معروف ہو چکا ہے کہ اس کا تذکرہ عالمی خبروں میں جگہ پانے لگا ہے۔ مثال کے طور پر الرسالہ کے ایک بیرونی قاری کا خط (۲۹ اپریل ۱۹۸۵) ہمیں موصول ہوا ہے۔ مکتوب نگار نے اپنے خط میں جو باتیں لکھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

> Abdus Salam was listening to a Kuwaiti radio station the other day. They mentioned Maulana's book: الاسلام یتحدی during one of their talks: کما قال وحید الدین خان فی کتابہ It seems that this book is very well known in the Arab world.

۴. ۱۲ اپریل ۱۹۸۵ کی شام کو گول مارکٹ (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر تعلیم یافتہ اصحاب کے سامنے ملی مسائل پر اظہار خیال کیا۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے یہاں جو دے وہی پاتا ہے، جو نہ دے اسے کچھ نہیں ملتا۔ یہ تقریر آدھ گھنٹہ کی تھی۔ اس کا ٹیپ لے لیا گیا ہے جو مرکز میں محفوظ ہے۔

۵. مدرسہ مصباح العلوم (آسنسول) کی فرمائش پر صدر اسلامی مرکز نے ان کے سوونیر کے لئے

ایک "پیغام" بھیجا تھا۔ یہ پیغام اسی عنوان سے الرسالہ کی زیرنظر اشاعت (جون ۱۹۸۵) میں شامل ہے۔

۶. اللہ کے فضل سے کیسٹ میگزین کا اجرا ہو چکا ہے۔ یکم جون ۱۹۸۵ سے اس کی باقاعدہ روانگی شروع ہو رہی ہے۔ ابتدائی رپورٹ کے مطابق اس سلسلہ کو کافی پسند کیا جا رہا ہے۔

۷. پچھلی ڈاک سے مرکز کو ایک پیکٹ ملا۔ اس میں " مذہب اور جدید چیلنج " کا انڈونیشی ترجمہ تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انڈونیشی زبان میں بھی اس کتاب کا ترجمہ شائع ہو گیا ہے۔ ترکی اور عربی اور کئی دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے پہلے ہی شائع ہو چکے ہیں۔

۸. ہندی ترجمہ کے لئے ہمیں ایک لائق اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کی خدمات حاصل ہو گئی ہے۔ انشاءاللہ جلد ہی ہندی زبان میں مرکز کی مطبوعات کے ترجمے شائع کئے جائیں گے

۹. مولانا آزاد تعلیمی مرکز (اسرہٹہ ضلع جونپور) میں ۲۵ - ۲۶ اپریل ۱۹۸۵ کو ایک دو روزہ پروگرام رکھا گیا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز کی دو تقریریں اور ایک درس قرآن تھا۔ تعلیمی مرکز کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ اطراف کی بستیوں سے تعلیم یافتہ اور باشعور افراد ان پروگراموں میں شریک رہے۔ اس موقع پر الرسالہ اور مطبوعات کا بک اسٹال بھی لگایا گیا۔ لوگوں نے کتابیں حاصل کیں اور الرسالہ کی خریداری قبول کی۔

۱۰. ۲۸ اپریل ۱۹۸۵ کی شام کو مہینہ کے آخری اتوار کا درس قرآن ہوا۔ اس بار انگریزی اخبارات میں بھی اس کا اعلان شائع کیا گیا تھا۔ ہندستان ٹائمس (۲۸ اپریل ۱۹۸۵) نے اپنے مستقل کالم (What's on) میں اس کو پہلی خبر کے طور پر حسب ذیل الفاظ میں شائع کیا تھا:

THE ISLAMIC CENTRE: Maulana Wahiduddin Khan to speak on the meanings of the Qur'an; C-29, Nizamuddin West; 7 p.m.

۱۱. اسلامی مرکز کی کچھ کتابیں عرصہ سے ختم تھیں وہ دوبارہ چھپ کر آگئی ہیں۔ کچھ نئی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ نئی شائع شدہ کتابوں کے نام یہ ہیں: تذکیر القرآن پندرہ پارے، اسلامی زندگی، تبلیغی تحریک، سوشلزم اور اسلام۔ حل یہاں ہے (مع اضافہ)۔ دین کی سیاسی تعبیر صراط مستقیم۔ ان کے علاوہ ایک اور کتاب زیر طبع ہے " عظمت قرآن "

ایک گزارش

اسلامی مرکز کی ابتدا ۱۹۷۰ میں ہوئی۔ پچھلے پندرہ سال کے عرصہ سے وہ نہایت خاموشی کے ساتھ دعوت الی اللہ اور تعمیر ملت کے کام میں مصروف ہے۔ اردو اور انگریزی میں ماہنامہ الرسالہ جاری ہے اور ہندی اور دوسری زبانوں میں اس کے اجراء کی کوششیں جاری ہیں۔ مکتبہ الرسالہ کے تحت کئی درجن کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے ذرائع دعوت کو بھی حسب حالات استعمال کیا جا رہا ہے۔

کام میں اضافہ کے ساتھ بہت سی نئی ضرورتیں بھی سامنے آگئی ہیں۔ مثلاً پرنٹنگ پریس کا قیام دار الترجمہ، تعلیمی و تربیتی درس گاہ، دوسری ملکی زبانوں میں الرسالہ کا اجراء اور کتابوں کی اشاعت، مختلف مقامات پر فارغ کارکن مقرر کرنا وغیرہ

موجودہ کام کو چلانے اور دوسرے منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لئے کثیر وسائل کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں ہم آپ سے مالی تعاون کی اپیل کرتے ہیں۔

رقم بھیجتے وقت یہ ضرور صراحت فرما دیں کہ وہ کس مد کی رقم ہے۔

وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۳

الرسالہ مفت

آپ الرسالہ مفت پڑھ سکتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ آپ ایک بار ۳۶ روپے جمع کرکے الرسالہ کے سالانہ خریدار بن جائیں۔ اس کے بعد الرسالہ کے جو شمارے آپ کو پہنچیں ان کو پڑھنے کے بعد صفائی کے ساتھ محفوظ کرتے رہیں۔ جب بارہ پرچے اکٹھا ہو جائیں تو ہم کو واپس بھیج دیں۔ یہ بارہ شمارے آپ کی طرف سے ۳۶ روپے شمار ہوں گے۔ ان کے عوض دو بارہ اگلے سال آپ کے نام الرسالہ جاری کر دیا جائے گا۔ اسی طرح آئندہ سالوں میں بھی برابر کرتے رہیں اور الرسالہ آپ کو برابر پہنچتا رہے گا

منیجر الرسالہ

نئی مطبوعات

تذکیر القرآن (جلد اوّل) سورہ توبہ ۔ بنی اسرائیل	صفحہ	۸۰۰
اسلامی زندگی		۱۶۰
سوشلزم اور اسلام		۲۰۸
صراط مستقیم		۲۰۰
تبلیغی تحریک		۹۶
دین کی سیاسی تعبیر		۷۲

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارنبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے، تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپواکر دفتر الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ
کیسٹ

الرسالہ کیسٹ کی روانگی انشاء اللہ یکم جولائی سے شروع ہو گی
انفرادی خریدار اطلاع بھیج کر جلد اپنی خریداری درج کرا دیں۔
جو حضرات اس کی ایجنسی لینا چاہیں
وہ بھی اپنی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں۔
الرسالہ کیسٹ کی ایجنسی کم از کم پانچ کیسٹوں پر دی جائے گی۔

کمیشن :

۲۵ کیسٹ تک — ۲۰ فی صد
۲۵ کیسٹ سے زیادہ — ۲۵ فی صد

(ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ)

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

June 1985
Number 103

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

Rs 3.00

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

کامیابی صبر کے اُس پار ہے
مگر اکثر لوگ
کامیابی کو صبر کے اِس پار تلاش کرنے لگتے ہیں

اگست ۱۹۸۵ شمارہ ۱۰۵

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	30/-	ایمانی طاقت	3/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-	اتحادِ ملت	3/-
الاسلام	25/-	سبق آموز واقعات	3/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-	زلزلۂ قیامت	4/-
ظہورِ اسلام	25/-	حقیقت کی تلاش	3/-
احیاءِ اسلام	20/-	پیغمبرِ اسلام	2/-
پیغمبرِ انقلاب	25/-	حقیقتِ حج	2/
سوشلزم اور اسلام	25/-	آخری سفر	3/-
صراطِ مستقیم	25/-	اسلامی دعوت	3/-
		خدا اور انسان	3/
اسلامی زندگی	20/-	حل یہاں ہے	3/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-	سچا راستہ	2/-
دین کیا ہے	2/-	دینی تعلیم	3/
قرآن کا مطلوب انسان	5/-	حیاتِ طیبہ	3/
تجدیدِ دین	3/-	باغِ جنت	3/-
اسلام دینِ فطرت	3/-	نارِ جہنم	3/-
تعمیرِ ملت	3/-	تبلیغی تحریک	12/-
تاریخ کا سبق	3/-	دین کی سیاسی تعبیر	10/-
مذہب اور سائنس	5/-	عقل کا فیصلہ	
عقلیاتِ اسلام	2/-	کاروانِ اسلام	
فسادات کا مسئلہ	2/	رازِ حیات	
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-	The Way to Find God	4/
تعارفِ اسلام	3/-	The Teachings of Islam	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	3/-	The Good Life	5/-
راہیں بند نہیں	3/-	The Garden of Paradise	5/-
		The Fire of Hell	5/-
		Muhammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

حقیقت حج

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حقیقت حج

وَلِلّٰہِ علی الناس حج البیت مَن استطاع الیہ سبیلا (آل عمران ۹۷)

اور لوگوں پر خانہ کعبہ کا حج اللہ کا حق ہے جو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا و ھدًی للعالمین (آل عمران ۹۶)

پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور سارے جہان کے لئے رہنما۔

بنی الاسلام علی خمس شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکاۃ و حج البیت وصوم رمضان (حدیث)

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اور بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے مہینے کے روزے رکھنا۔

حج کی ادائگی (بشرط استطاعت) تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ وہ اسلام کے پانچ لازمی ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے۔

حج کے لفظی معنی ہیں قصد کرنا، زیارت کے لئے جانا۔ اسلامی شریعت میں حج سے مراد وہ سالانہ عبادت ہے جس میں آدمی مکہ جاکر خانہ کعبہ کا طواف کرتا ہے۔ عرفات کے میدان میں قیام کرتا ہے، اور دوسرے اعمال کرتا ہے جن کو مراسم حج کہا جاتا ہے۔

حج ایک جامع عبادت ہے۔ اس میں مال کا انفاق بھی ہے اور جسم کی مشقت بھی۔ اس میں اللہ کا ذکر بھی ہے اور اللہ کے لئے قربانی بھی۔ حج ایک ایسی عبادت ہے جس میں بقیہ عبادتوں کی روح بھی کسی نہ کسی اعتبار سے شامل ہوگئی ہے۔

حج کے فرائض کی ادائگی کا مرکز بیت اللہ ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ بیت اللہ ایک بندۂ خدا کی اس پوری مومنانہ زندگی کی یاد دلاتا ہے جس کے آغاز میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی تاریخ ہے اور جس کے اختتام پر نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ۔ بیت اللہ اس واقعہ کا ایک یادگاری نمونہ ہے کہ کس طرح اللہ کا ایک بندہ اللہ کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے۔ کس طرح وہ اپنی زندگی کو اللہ کی مرضی میں ڈھال لیتا ہے۔ کس طرح وہ اللہ کے مشن میں اپنے آپ کو ہمہ تن لگا دیتا ہے یہاں تک کہ اسی حال میں اس کی موت آجائے۔

خدا کی طرف سفر

حج کا سفر خدا کی طرف سفر ہے۔ وہ دنیا کی زندگی میں اپنے رب سے قریب ہونے کی انتہائی شکل ہے۔ دوسری عبادتیں اللہ تعالے کی یاد ہیں، جب کہ حج خود اللہ تعالےٰ تک پہونچ جانا ہے۔ عام عبادت اگر غیب کی سطح پر خدا کی عبادت ہے تو حج شہود کی سطح پر خدا کی عبادت ہے۔

حاجی جب کعبہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ ایسا محسوس کرتا ہے گویا وہ خود رب کعبہ کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ کعبہ کا طواف اس حقیقت کا مظہر ہے کہ بندہ اپنے رب کو پاکر پروانہ وار اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ جب وہ ملتزم کو پکڑ کر دعا کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے گویا اس کو اپنے آقا کا دامن ہاتھ آگیا ہے جس سے وہ بے تابانہ لپٹ گیا ہے اور اپنی ساری بات اس سے کہہ دینا چاہتا ہے۔

حج کی یہ خصوصیت اس لیے ہے کہ اس کے ادا کرنے کی جگہ ایک ایسا مقام ہے جہاں تجلیات الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ جس کو خدا نے اس مقصد کے لیے منتخب کیا کہ وہ خدا پرستانہ زندگی کے عظیم داعی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دینی عمل کا مرکز بنے۔ جہاں اسلام کی بنیاد پر بننے والی تاریخ ثبت ہے۔ جس کے ہر طرف اس مثالی ربانی انقلاب کے آثار پھیلے ہوئے ہیں جو خاتم النبیین کی رہنمائی میں چودہ سو سال پہلے واقع ہوا تھا۔

اس قسم کی روایات اور خصوصیات نے دیار حرم کو غیر معمولی اہمیت دے دی ہے۔ وہاں ایک خاص طرح کا روحانی اور تاریخی ماحول پیدا ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص بھی وہاں جاتا ہے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ آدمی حج ادا کرنے کے بعد اس طرح لوٹتا ہے جیسے کوئی گرد و غبار میں لپٹا ہوا آدمی دریا میں نہا کر واپس آئے۔

حج کو اسلامی عبادات میں ایک غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ایک حدیث میں اس کو افضل عبادت کہا گیا ہے۔ تاہم حج کی یہ خصوصی اہمیت اپنی روح کے اعتبار سے ہے نہ کہ محض اپنے ظاہر کے اعتبار سے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ محض دیار حرم میں جاکر واپس آجانے کا نام حج نہیں ہے بلکہ ان کیفیات کے حصول کا نام حج ہے جن کے لیے یہ فریضہ مقرر کیا گیا ہے۔ حج کے افضل عبادت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ——— جو شخص حج کو اس کی سچی روح اور صحیح آداب کے ساتھ ادا کرے اس کے لیے حج اس کی سب سے بڑی عبادت بن جائے گا۔

عبادتوں کا سردار

حج حق تعالیٰ سے ملاقات ہے۔ آدمی جب سفر کرکے مقامات حج تک پہونچتا ہے تو اس پر خاص طرح کی ربانی کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ "اپنی دنیا" سے نکل کر "خدا کی دنیا" میں پہونچ گیا ہے۔ وہ اپنے رب کو چھو رہا ہے۔ وہ اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ وہ اس کی طرف دوڑ رہا ہے۔ وہ اس کی خاطر سفر کر رہا ہے۔ وہ اس کے حضور اپنی قربانی پیش کر رہا ہے۔ وہ اس کے دشمن کو کنکریاں مار رہا ہے۔ وہ اس سے مانگ رہا ہے جو کچھ وہ مانگنا چاہتا ہے۔ وہ اس سے پا رہا ہے جو کچھ اسے پانا چاہیے۔

کعبہ زمین کے اوپر خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ وہاں بھٹکی ہوئی انسانی روحوں کا خدا کا آغوش دیا جاتا ہے۔ وہاں پتھرائے ہوئے سینوں میں عبدیت کے چشمے جاری کیے جاتے ہیں۔ وہاں بے نور آنکھوں کو خدا کی تجلیات دکھائی جاتی ہیں۔ تاہم سب کچھ اس شخص کے لیے ہے جو اس کی استعداد لے کر وہاں جائے۔ بے استعداد لوگوں کے لیے حج بس ایک قسم کی سیاحت ہے۔ وہ صرف اس لیے وہاں جاتے ہیں تاکہ جیسے گئے تھے ویسے ہی دوبارہ واپس چلے آئیں۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ الحج عرفة (عرفات کے میدان میں قیام حج ہے) اس سے عرفات کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ حج کے زمانے میں عرفات کا میدان گویا حشر کے میدان کا منظر پیش کرتا ہے۔ ایک خاص تاریخ کو خدا کے بندے قافلہ در قافلہ چاروں طرف سے آتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہ بڑا عجیب منظر ہوتا ہے۔ تمام لوگوں کے جسم پر ایک ہی سادہ لباس (احرام:

ہے ۔ ہر ایک اپنی امتیازی صفت کو کھو چکا ہے۔ سب کی زبان پر ایک ہی کلمہ جاری ہے لبیک اللّٰھم لبیک ، لبیک اللّٰھم لبیک ۔ دیکھنے والوں کو یہ دیکھ کر قرآن کی وہ آیت یاد آنے لگتی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ قیامت کے دن جب صور پھونکا جائے گا تو تمام لوگ قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف دوڑ پڑیں گے :

ونفخ فی الصور فاذا ھم من الاجداث الیٰ ربھم ینسلون (یس ۵۱) اور صور پھونکا جائے گا تو سب لوگ یکایک قبروں سے اپنے رب کی طرف چلنے لگیں گے ۔

عرفات کی یہ حاضری اس لیے ہے کہ آدمی حشر کے خدا کے سامنے اپنی حاضری کو یاد کرے۔ جو کچھ کل عملاً بیتنے والا ہے اس کو آج ہی تصوراتی طور پر اپنے اوپر طاری کرے ۔

حقیقت یہ ہے کہ حج تمام عبادتوں کا سردار ہے ۔ کعبہ کا جو درجہ دوسری مسجدوں کے درمیان ہے وہی درجہ حج کا دوسری عبادتوں کے درمیان ہے۔

حج کا پیغام

کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کو اس میں تردد تھا کہ اسلامی عبادتوں میں کون سی عبادت افضل عبادت ہے۔ جب انھوں نے حج ادا کیا تو اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اب مجھے یقین ہو گیا کہ حج تمام عبادتوں میں سب سے افضل عبادت ہے۔

حج کی اس فضیلت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ حج کا تعلق ایک عظیم خدائی منصوبہ سے ہے۔ حج ایک ایسے خدائی منصوبہ کی یادگار ہے جس کا آغاز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کی آخری تکمیل ہوئی۔

حج کے مختلف مناسک اسی خدائی منصوبہ کے مختلف مراحل ہیں جن کو حاجی علامتی طور پر دہراتا ہے۔ حاجی اپنے گھر سے نکل کر حجاز کے لئے روانہ ہوتا ہے جس طرح حضرت ابراہیم عراق سے نکل کر حجاز آئے۔ وہ مکہ کے قریب پہنچ کر سلے ہوئے کپڑے اتار دیتا ہے اور اپنے جسم پر دو چادریں لپیٹ لیتا ہے۔ یہ اسی قسم کی سادہ پوشاک ہے جو اس زمانہ میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی ہوتی تھی۔ حاجی مکہ پہنچتا ہے تو کعبہ کے گرد گھوم کر اس کا چکر لگاتا ہے۔ یہ وہی طواف ہے جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے عہد خداوندی کی توثیق کے لئے کیا تھا۔ حاجی صفا و مروہ کے درمیان سات بار سعی کرتا ہے۔ یہ حضرت ہاجرہ کی اس دوڑ کی نقل ہے جو انھوں نے اس بیابان میں پانی کی تلاش کے لئے کی۔ حاجی منیٰ جا کر قربانی کرتا ہے، یہ اس قربانی کا علامتی اعادہ ہے جو حضرت ابراہیم نے اولاً بیٹے کے لئے اور اس کے بعد خدا کے حکم سے مینڈھے کے لئے کی تھی۔ حاجی جمرات پر جا کر شیطان کو کنکریاں

مارتا ہے۔ یہ اس عمل کی یادگار ہے جو حضرت اسماعیل نے شیطان کی طرف کنکریاں مار کر کیا تھا۔ جب کہ اس نے انھیں بہکانے کی کوشش کی۔ پھر تمام حاجی عرفات کے میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ یہ اس عمل کی آخری صورت ہے جو لبیک اللہم لبیک کی صورت میں ہر حاجی کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ یہاں تمام حاجی کھلے میدان میں جمع ہو کر اپنے خدا سے اجتماعی عہد کرتے ہیں کہ وہ وہی کریں گے جس کا سبق انھیں حج کی صورت میں دیا گیا ہے۔ وہ اسی میں جئیں گے جس میں وہ لوگ جئے جن کی یادگار میں حج کی عبادت ادا کی جاتی ہے۔

حج کے مناسک کو قرآن میں شعائر کہا گیا ہے یعنی علامتی چیزیں۔ یہ سب دراصل حضرت ابراہیم اور ان کے خاندان پر گزرنے والے واقعات ہیں جو مذکورہ منصوبہ الٰہی کی تکمیل کے دوران پیش آئے۔ ان واقعات کو حاجی علامتی طور پر دہراتا ہے اور اس طرح یہ عہد کرتا ہے کہ وہ بھی اسی تاریخ کا جز رہے گا۔

حاجی گویا یہ عہد کرتا ہے کہ اگر ضرورت پیش آئی تو وہ اپنی دنیا کو اجاڑ کر حق کی طرف بڑھے گا۔ وہ آرام و راحت کو چھوڑ کر قناعت اور سادگی پر اپنے آپ کو راضی کرے گا۔ وہ خدا کے لئے دوڑے گا اور خدا کے گرد گھومے گا۔ وہ شیطانی بہکاوؤں کو پتھر مار کر اپنے سے دور بھگائے گا۔ خدا کا دین اس کو جہاں لے جائے وہاں وہ جائے گا۔ اور جس چیز کا تقاضا کرے گا اس کو وہ اس کے حوالے کر دے گا۔ وہ عمل کی زبان میں خدا سے کہتا ہے کہ اگر دوبارہ دین کے لئے ضرورت پیش آئی تو وہ اس آخری حد تک جانے کے لئے تیار ہے کہ اپنی اولاد کو ذبح کر کے دین کی ضرورت پوری کرے۔

حضرت ابراہیم کا عراق سے چل کر مکہ آنا اور یہاں مذکورہ واقعات کا پیش آنا ایک عظیم خدائی منصوبہ تھا جو ڈھائی ہزار سال میں بروئے کار لایا گیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اب سے پانچ ہزار سال پہلے انسانی ذہنوں پر شرک کا اتنا غلبہ ہو گیا تھا کہ زندگی کا کوئی شعبہ شرک سے خالی نہ تھا۔ یہ صورت حال نسل در نسل جاری رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی نسلوں میں شرک کا تسلسل قائم ہو گیا۔ اس زمانہ کی آبادیوں میں جو شخص بھی پیدا ہوتا وہ شرک کا ذہن لے کر پیدا ہوتا اور اسی پر اس کی پوری اٹھان ہوتی۔ اس بنا پر پیغمبروں کی توحید کی دعوت کسی طرح لوگوں کو اپیل نہیں کرتی تھی۔

اب خدا نے یہ منصوبہ بنایا کہ انسانوں کی ایک ایسی نسل تیار کی جائے جو مشرکانہ ماحول سے الگ ہو کر پرورش پائے تاکہ وہ مشرکانہ تسلسل سے آزاد ہو کر سوچ سکے۔ اس کے لئے شہری آبادیوں سے دور ایک غیر آباد مقام ہی مناسب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے عرب کے خشک علاقہ کا انتخاب کیا

گیا جو اس زمانہ میں آباد دنیا سے الگ تھلگ بالکل غیر آباد حالت میں پڑا ہوا تھا۔

اب اس بے آب و گیاہ علاقہ میں ایک نئی نسل تیار کرنے کے لئے وہ پہلا انسان درکار تھا جو موت کی قیمت پر وہاں بسنے کے لئے تیار ہو۔ اس نازک موقع پر حضرت ابراہیم کو خواب دکھایا گیا کہ آپ اپنے نوجوان بیٹے اسماعیل کو ذبح کر رہے ہیں۔ یہ جسمانی ذبح حقیقۃً صحرائی ذبح کی تمثیل تھی۔ اس کے ذریعہ یہ دیکھنا مقصود تھا کہ کیا ابراہیم اس کے لئے تیار ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خدائی منصوبہ میں اس طرح شامل کریں کہ اپنی محبوب اولاد کو لے جا کر حجاز میں بسا دیں جہاں خشک پہاڑوں اور ریتیلے صحراؤں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس زمانہ میں حجاز میں بسنا موت کی وادی میں بسنے کے ہم معنی تھا۔

قدیم زمانہ میں حجاز اسی لئے غیر آباد پڑا ہوا تھا کہ وہاں پانی اور سبزہ نہ تھا۔ قدیم حجاز کا مشرکانہ تمدن سے پاک رہنا اسی لئے ممکن ہوا کہ وہ زندگی کے سامان سے خالی تھا۔ قدیم حجاز کی وہ خصوصیت جس نے اس کو مشرک انسانوں سے خالی رکھا تھا، اسی نے اس کو اس قابل بنا دیا کہ وہاں موحدین کی ایک نئی نسل تیار کی جائے۔ حضرت ابراہیم کا اپنے نوجوان بیٹے (اسماعیل) کے گلے پر چھری رکھنا اس بات کا اظہار تھا کہ وہ اس قربانی کے لئے آخری طور پر تیار ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کو اس منصوبہ خداوندی کے لئے چن لیا گیا اور ان کو قدیم حجاز کے الگ تھلگ علاقہ میں بسا کر نئی نسل تیار کرنے کا عمل شروع کر دیا گیا۔

حضرت ابراہیم نے اسماعیل کی نسل میں ایک پیغمبر پیدا ہونے کی دعا کی تھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسی دعا کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، دعا اور اس کی قبولیت کے درمیان ڈھائی ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ اس تاخیر کا سبب یہ ہے کہ اس مدت کے دوران وہ نسل تیار کی جا رہی تھی جو شرک کے تسلسل سے منقطع ہو کر سوچ سکے اور صحرائی تربیت کے نتیجہ میں جس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ پیغمبر کا ساتھ دے کر اس مشکل مشن کو تکمیل تک پہنچا سکے۔ اسی لئے اس گروہ کو "خیر امت" کہا گیا۔ یہ امت تاریخ کی انوکھی امت ہے۔ ابتداءً ضرور اس کی ایک تعداد پیغمبر کی دشمن ہو گئی۔ مگر جب اس کی سمجھ میں آگیا تو اس نے بھرپور طور پر آپ کا ساتھ دیا۔

اس طرح جو نسل بنائی گئی اس کے اندر اگرچہ بعد کو اطراف کی دنیا سے کچھ شرک کے اثرات آگئے۔ مگر بنیادی طور پر وہ ایک محفوظ نسل تھی۔ کچھ ناقص افراد کو چھوڑ کر وہ لوگ صحیح فطرت پر قائم تھے۔ انھوں نے ابتداءً پیغمبر کی مخالفت بھی کی۔ مگر اس کا سبب زیادہ تر ناسمجھی تھا۔ جب ان کی سمجھ میں آگیا کہ واقعی یہ پیغمبر ہیں اور ان کا دین برحق ہے تو ان کی مخالفت دوبارہ موافقت میں تبدیل ہو گئی۔ وہ بھرپور طور پر آپ کے ساتھی بن گئے۔

حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے کو "ذبح" کرکے جو نسل تیار کی اس کا سب سے زیادہ نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ آزاد ذہن کے ساتھ حقیقت کو دیکھ سکتی تھی اور اس کا اعتراف کر سکتی تھی۔ حقیقت واقعہ کو ماننے کی صلاحیت اس کے اندر کامل درجہ میں موجود تھی۔ یہاں اس سلسلہ میں تین مختلف مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔ ایک شخص وہ جس نے حق کو سنتے ہی اسے مان لیا۔ دوسرا وہ جس نے ابتداءً انکار کیا مگر جب بات سمجھ میں آگئی تو اس نے اعتراف میں دیر نہیں کی۔ تیسرا وہ جس نے اگرچہ اپنی سرداری کی خاطر اعتراف نہیں کیا مگر وہ بھی اس صفت عام سے خالی نہ تھا۔

۱۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جو لوگ ابتدائی مرحلہ میں ایمان لائے ان میں سے ایک خالد بن سعید بن العاص تھے۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ: اے محمد، آپ کس چیز کی طرف بلاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں تم کو ایک اللہ کی طرف بلاتا ہوں جس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور یہ کہ تم پتھروں کی عبادت چھوڑ دو جو نہ سنتے اور نہ دیکھتے ہیں اور نہ نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کس نے ان کی عبادت کی اور کس نے ان کی عبادت نہیں کی (ولا یدری من عبدہ ممن لا یعبدہ) خالد نے یہ سن کر کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

حضرت خالد کے والد جو مشرک تھے جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کے بیٹے نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ تو انھوں نے ان کو پکڑا اور انھیں مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ مارتے مارتے لکڑی ٹوٹ گئی۔ جب حضرت خالد اسلام سے پھرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے تو باپ نے کہا کہ میں تمہارا کھانا پینا بند کر دوں گا اور تجھے گھر سے نکال دوں گا۔ حضرت خالد نے جواب دیا، خدا کی قسم محمد نے جو کہا سچ کہا اور میں ان کا پیرو ہوں (قد صدق واللہ واتبعتہ) دوسرے لفظوں میں یہ کہ محمد جب ایک حق بات کہہ رہے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ میں اسے نہ مانوں۔

۲۔ دوسری مثال سہیل بن عمرو کی ہے۔ صلح حدیبیہ کے وقت وہ مخالفین اسلام کے نمائندہ تھے۔ طویل گفت و شنید کے بعد جب معاہدہ لکھا جانے لگا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو املا کراتے ہوئے یہ الفاظ کہے:

ھذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللہ

سہیل بن عمرو نے ان الفاظ پر سخت اعتراض کیا۔ انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم اگر ہم جانتے کہ آپ [illegible]

ــــــمسد ذالک من البیت ولا قاتلناک

بعد کی تاریخ نے بتایا کہ سہیل بن عمرو ان الفاظ میں پوری طرح صادق تھے۔ وہ واقعۃً نہ سمجھنے کی وجہ سے مخالفت کر رہے تھے۔ چنانچہ بعد کو جب ان کی سمجھ میں آگیا کہ آپ سچے پیغمبر ہیں تو وہ ایمان لائے اور اس کے بعد اپنی پوری زندگی اسلام کی حمایت اور تائید میں وقف کر دی۔

۳۔ تیسری مثال ابوجہل کی ہے۔ ابوجہل نے اگرچہ اسلام قبول نہیں کیا۔ مگر اس کے یہاں بھی اس عرب کردار کا ایسا نمونہ ملتا ہے جس کی مثال مشکل سے کہیں دوسری جگہ ملے گی۔

مکی دور کا واقعہ ہے کہ ایک روز ابوجہل کی ملاقات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔ اس نے آپ کو بہت برا بھلا کہا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ یہ واقعہ مکہ کی ایک عورت دیکھ رہی تھی۔ اس نے آپ کے چچا حمزہ بن عبدالمطلب سے کہا کہ آج ابوجہل نے آپ کے بھتیجے سے بہت نازیبا انداز میں کلام کیا ہے۔ اس وقت حمزہ کے ہاتھ میں لوہے کی کمان تھی۔ وہ اس کو لئے ہوئے ابوجہل کے پاس آئے اور کمان سے اس کے سر پر اس طرح مارا کہ ان کا سر بری طرح زخمی ہوگیا۔ ابوجہل کے قبیلہ (بنو مخزوم) کے کچھ لوگ حمزہ کو مارنے کے لئے دوڑے۔ ابوجہل نے اپنے آدمیوں کو روک دیا اور کہا کہ حمزہ کو چھوڑ دو کیوں کہ خدا کی قسم میں نے ان کے بھتیجے کو آج بہت برا بھلا کہہ دیا تھا (دعوا ابا عمارة فانی واللہ قد سببت ابن اخیه سبا قبیحا)

ہرقل کے مشہور واقعہ میں آتا ہے کہ اس نے ابوسفیان سے پوچھا کہ کیا نبوت کے اعلان سے پہلے تم لوگوں نے محمد کو کبھی جھوٹ بولتے ہوئے پایا ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ نہیں۔ یہ واقعہ نقل کر کے ابن کثیر لکھتے ہیں،

وکان ابوسفیان اذ ذاک رأس الکفرة وزعیم المشرکین ومع هذا اعترف بالحق۔ (تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۱۲۰)

ابوسفیان اس وقت کافروں کے سردار اور مشرکوں کے لیڈر تھے، اس کے باوجود انھوں نے حق کا اعتراف کیا۔

یہ تھی وہ انسانی نسل جو حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کو "ذبح" کر کے بنائی۔ اور پھر اس کے منتخب افراد کے ذریعہ وہ "خیر امت" بنی جس نے دل و جان سے توحید کو قبول کیا اور بے مثال قربانی کے ذریعہ دور شرک کو ختم کر کے دور توحید کو برپا کیا۔

حضرت ابراہیم سے لے کر حضرت محمد تک یہ ایک ڈھائی ہزار سالہ منصوبہ تھا۔ اس کا مرکز عرب کا وہ علاقہ تھا جس کو حجاز کہا جاتا ہے اور جس میں مکہ واقع ہے۔ حج اسی تاریخ کا علامتی اعادہ ہے۔ حج کے ذریعہ

مسلمان دوبارہ یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ اس منصوبۂ خداوندی میں اپنے آپ کو شامل کریں گے۔ وہ لبیک اللّٰہم لبیک (ہم حاضر ہیں خدایا ہم حاضر ہیں) کہتے ہوئے ابراہیم اور اسماعیل کی سرزمین میں جمع ہوتے ہیں۔ جو کچھ ان لوگوں پر حقیقی طور پر گزرا تھا اس کو چند دن میں علامتی طور پر دہراتے ہیں۔ اس طرح وہ خدا سے کہتے ہیں کہ اگر ضرورت ہو تو وہ دوبارہ اس تاریخ کو دہرانے کے لئے تیار ہیں جو یہاں اس سے پہلے دہرائی گئی۔

آج زمانہ گھوم کر دوبارہ وہیں پہنچ گیا ہے جہاں وہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں تھا۔ اس وقت سارے عالم پر شرک کا غلبہ تھا، آج سارے عالم پر الحاد کا غلبہ ہے۔ قدیم زمانہ کا انسان اگر مشرکانہ طرز پر سوچتا تھا تو آج کا انسان ملحدانہ طرز پر سوچتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کا مسئلہ بھی وہی ہے جو قدیم زمانہ کا مسئلہ تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ قدیم زمانہ میں مشرکانہ شاکلہ لوگوں کے اوپر چھایا ہوا تھا۔ آج لوگوں کے اوپر الحادی شاکلہ چھایا ہوا ہے۔ اس شاکلہ (ذہنی سانچہ) کو توڑنا ہی آج اسلام کا اصل کام ہے۔ آج بھی اسلامی مہم اسی نہج پر طے ہوگی جس نہج پر قدیم زمانہ کی اسلامی مہم طے ہوئی تھی۔

اب دوبارہ کچھ لوگوں کو ذبح ہونا ہے۔ اب پھر کچھ لوگوں کو اپنی اولاد کو صحرا میں ڈالنا ہے تاکہ دین کی تاریخ دوبارہ زندہ ہو۔ ماضی میں دورِ شرک کو ختم کرنے کے لئے ایک نسل کی قربانی درکار تھی۔ آج دورِ الحاد کو ختم کرنے کے لئے دوبارہ ایک نسل کی قربانی درکار ہے ——— یہی حج کا سب سے بڑا سبق ہے۔ اسی کا حج آج حج مبرور ہے۔ جو حج کے بعد یہ عزم لے کر وہاں سے واپس آئے۔

حقیقت یہ ہے کہ حج سے فراغت کے بعد حاجی کا کام ختم نہیں ہو جاتا، حج سے فراغت کے بعد حاجی کا اصل کام شروع ہوتا ہے۔ حج کے سفر سے واپسی ایک نئے اہم تر سفر کا آغاز ہے۔

حاجی مراسم حج کے دوران بار بار لبیک اللّٰہم لبیک (حاضر ہوں خدایا میں حاضر ہوں) کہتا ہے۔ یہ کیا ہے۔ یہ عہدنامے کے الفاظ ہیں۔ حج خدا اور بندے کے درمیان ایک عہد ہے۔ عہد ہمیشہ آغاز ہوتا ہے، وہ اختتام نہیں ہوتا۔ یہی حج کی عبادت کا معاملہ ہے۔ جو شخص مراسم حج کو ادا کرکے واپس آتا ہے وہ گویا خدا سے ایک مقدس عہد کرکے واپس آتا ہے۔ واپس آنے کے بعد اسے مطمئن ہو کر بیٹھ نہیں جانا ہے بلکہ اپنے حالات اور صلاحیت کے اعتبار سے وہ کام شروع کر دینا ہے جس کا وہ اپنے رب سے عہد کرکے واپس آیا ہے۔

حج سے لوٹنا مقامِ عہد سے نکل کر مقامِ عمل کی طرف لوٹنا ہے۔ حج کے بعد آدمی کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں، حج کے بعد آدمی کی ذمہ داریاں ختم نہیں ہوتیں۔

حج کا عہد نامہ کیا ہے۔ یہ ایک تاریخ کو دہرانے کا عزم ہے۔ حج تاریخ ابراہیمی کو دوبارہ ظہور میں لانے کا اقرار ہے۔ حضرت ابراہیم نے جب دیکھا کہ عراق کے متمدن لوگ توحید اور آخرت کی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو انہوں نے اپنے عمل کا ایک نیا نقشہ بنایا انہوں نے اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو سخت ترین قربانی کے مرحلے سے گزار کر ایک نئی زندہ نسل پیدا کی۔ انہوں نے دعوت کے عمل کو ایک عظیم منصوبہ کا عمل بنادیا۔ انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو یہ مقصد ان سے کرنے کا تقاضا کر رہا تھا۔

اسی طرح آج حاجی کو وہ سب کچھ کرنا ہے جو آج کے حالات کا تقاضا ہو اور اس وقت تک کرتے رہنا ہے جب کہ اس کی موت آئے یا وہ منزل مقصود تک پہونچ جائے۔

حضرت ابراہیم کے زمانے میں جس طرح شرک کا عالمی غلبہ تھا۔ اسی طرح آج الحاد کا عالمی غلبہ ہے۔ اب حج سے لوٹنے والوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ دور الحاد کو ختم کرکے دوبارہ دورِ توحید کو لانے کے لیے ابراہیمی تاریخ کو دہرائیں۔ وہ ابراہیمی عمل کو از سر نو زندہ کریں۔ وہ اس مقصد کی راہ میں اپنا وہ سب کچھ لگادیں جس کو لگانے کا آج کے حالات ان سے تقاضا کرتے ہوں۔ وہ علامتی قربانی کو حقیقی قربانی بنادیں۔

حج ایک تاریخ کے اعادہ کا عزم ہے، ایام حج میں علامتی مناسک کی صورت میں اور ایام حج کے بعد حقیقی زندگی میں منصوبہ بند عمل کی صورت میں۔

یہ مقالہ ایک تقریر پر مبنی ہے جو اسلامی مرکز دہلی کے ماہانہ اجتماع ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۴ میں کی گئی۔

حج کی دعوتی اہمیت

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے بیت المقدس پیغمبرانہ ہدایت کا مرکز تھا۔ خاتم النبیین کے بعد بیت اللہ الحرام پیغمبرانہ ہدایت کا مرکز ہے (البقرہ ۱۴۴) حج ایک اعتبار سے دنیا بھر کے پیروان اسلام کا سالانہ دعوتی اجتماع ہے۔ وہ خاص دنوں میں حرم کے گرد جمع ہوتے ہیں تاکہ اس کی مقدس فضاؤں میں خدا سے اپنا تعلق استوار کریں۔ اپنے باہمی اتحاد کو مضبوط کریں اور داعیٔ اعظم حضرت ابراہیم کی دعوتی زندگی کے مختلف مراحل کو علامتی طور پر دہرا کر اس بات کا عزم کریں کہ وہ ہر حال میں خدا کے دین کے داعی بنے رہیں گے۔

حج کی تاریخ

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو امام ہدایت بنایا (انی جاعلک للناس اماما) یعنی آپ کو اس مستقل کام کے لئے چنا کہ آپ کے ذریعہ نبوت کا علم لوگوں تک برابر پہنچتا رہے۔ ابتدائی دو ہزار سال تک اس خدائی فیصلہ کا ظہور آپ کے صاحبزادہ اسحاق کی شاخ میں ہوا۔ حضرت اسحق سے لے کر حضرت مسیح تک اس نسل میں کثرت سے انبیاء پیدا ہوئے جنھوں نے فلسطین اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں دعوت حق کا کام مسلسل انجام دیا۔ حضرت مسیح کے بعد یہ دینی امامت آپ کے دوسرے صاحبزادہ اسماعیل کی نسل میں منتقل ہو گئی۔ ان کی اولاد میں آخری نبی پیدا ہوئے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر غلبہ کی نسبت دی تاکہ آپ کے ذریعہ کتاب الٰہی کی حفاظت کا یقینی انتظام ہو سکے اور دین کے مٹنے کا اندیشہ نہ رہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں اظہار دین (لیظہرہ علی الدین کلہ) کہا گیا ہے۔ عام پیغمبروں سے اصلاً صرف تبلیغ دین مطلوب تھی اور پیغمبر آخر الزماں سے تبلیغ دین کے ساتھ اظہار دین بھی

اسی مقصد کے لئے انسانوں کی ایک معاون جماعت درکار تھی جو تمام انسانی اوصاف سے متصف ہو۔ وہ پیغمبر آخر الزماں کا ساتھ دے کر اظہار دین کے منصوبہ کو تکمیل تک پہنچائے۔ اسی جماعت کی تیاری کے لئے حضرت ابراہیم نے اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے لڑکے اسماعیل کو قدیم مکہ کے غیر آباد اور خشک علاقے میں لاکر بسا دیا، تاکہ تمدن سے دور فطرت کے سادہ ماحول میں توالد و تناسل کے ذریعہ ایک ایسی قوم پیدا ہو جس کے اندر تمام اعلیٰ انسانی صلاحیتیں محفوظ ہوں۔ جو بے آمیز ڈھنگ سے سوچے۔ جس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔ جو ایک نظری حق کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا سکے۔ جس کے اندر پہاڑوں کی صلابت، صحرا کی وسعت اور آسمان کی بلندی ہو۔ اس طرح جب صحرائی ماحول میں پرورش پاکر ایک خیر امت وجود میں آگئی (آل عمران ۱۱۰) تو عین وقت پر اس کے اندر وہ نبی پیدا کر دئے گئے جس کے لئے حضرت ابراہیم نے تعمیر کعبہ کے وقت دعا کی تھی (البقرہ ۱۲۹)

حضرت ابراہیم کی بیوی سارہ کے بطن سے خدا کو ایک پیغمبر پیدا کرنا تھا۔ یہ پیغمبر حضرت ابراہیم ہی کی زندگی میں پیدا ہوگیا اور اس کا نام اسحاق رکھا گیا۔ دوسری طرف حضرت ابراہیم نے مکہ میں دعا کی کہ میرے لڑکے اسماعیل کی اولاد میں ایک نبی پیدا کر، تو اس دعا کی تکمیل میں دو ہزار سال سے زیادہ مدت لگ گئی۔ اس فرق کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ دونوں کے تاریخی کردار کا فرق تھا۔ پیغمبر آخر الزماں کو اپنا مطلوبہ کردار ادا کرنے کے لئے ایک زندہ قوم درکار تھی۔ اس طرح کی قوم اسباب کے پردہ میں بننے کے لئے دو ہزار سال سے زیادہ کی مدت لگ گئی۔ چنانچہ جب یہ قوم تیار ہوگئی تو آپ خدائی منصوبہ کے مطابق پیدا کر دئے گئے۔ تاہم یہ بھی ضروری تھا کہ تیاری کے اس طویل وقفہ کے دوران پیغمبرانہ دعوت کے تسلسل کو باقی رکھا جائے۔ اس لئے دوسرا انتظام یہ کیا گیا کہ حضرت ابراہیم کی نسل کی اسرائیلی شاخ میں انبیاء کی پیدائش کا سلسلہ قائم کر دیا گیا۔ اور ایک کے بعد ایک پیغمبر آکر لوگوں کو خدا پرستی کا پیغام دیتے رہے۔ تاآنکہ نبی آخر الزماں کے ظہور کا وقت آجانے کی وجہ سے اس کی ضرورت باقی نہ رہی۔

اس منصوبہ کے مطابق حضرت ابراہیم اپنے وطن عراق سے نکلے۔ ایک طرف آپ نے فلسطین (حبرون) میں اپنی بیوی سارہ کو بسایا جن سے اسحاق پیدا ہوئے۔ دوسری طرف آپ نے عرب (مکہ) میں اپنی دوسری بیوی ہاجرہ اور ان کے لڑکے اسماعیل کو رکھا اور یہاں کعبہ کی تعمیر کی۔ گویا حضرت ابراہیم کے ذریعہ ہدایت عالم کی جو منصوبہ بندی کی گئی اس کے ابتدائی جزء کا مرکز فلسطین تھا اور اس کے آخری جزء کا مرکز حجاز۔

حضرت ابراہیم کے بعد اولاً فلسطین ہدایت الٰہی کا مرکز بنا۔ اسی علاقہ میں اس زمانہ کے تمام انبیاء پیدا ہوئے ــــــ حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد،

حضرت سلیمان، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ وغیرہ۔ حضرت ابراہیم کے پوتے حضرت یعقوب کا دوسرا نام اسرائیل تھا۔ انھیں کی نسبت سے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ بعد کو جب بنی اسرائیل پر زوال آگیا اور پیغمبروں کی مسلسل فہمائش کے باوجود انھوں نے اپنی اصلاح نہ کی تو خدا نے ہدایت آسمانی کے حامل ہونے کی حیثیت سے انھیں معزول کر دیا اور یہ مقدس منصب ابراہیمی نسل کی دوسری شاخ بنو اسماعیل کو دے دیا۔ یہ واقعہ عین اس وقت ہوا جب کہ دو ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں ان کے اندر ایک ایسی زندہ قوم تیار ہو چکی تھی جو خدا کے دین کی حامل بن سکے۔ اس تبدیلی کی ایک ظاہری نشانی کے طور پر قبلۂ عبادت بدل دیا گیا۔ حضرت ابراہیم کے بعد تمام انبیاء بیت المقدس کی طرف رخ کر کے عبادت کرتے تھے۔ اب قدیم قبلہ کو منسوخ کر کے کعبہ کو قبلۂ عبادت کی حیثیت دے دی گئی۔

حج ایک دعوتی ادارہ

حج ابراہیمی تاریخ کا اعادہ ہے۔ حضرت ابراہیم کے ذریعہ دعوتِ حق کی جو عالمی منصوبہ بندی کی گئی، اسی کے مختلف مراحل کو حاجی علامتی طور پر دہراتا ہے اور اس طرح خدا سے یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسی ربانی مشن میں لگائے گا جس میں حضرت ابراہیم نے اپنے آپ کو لگایا، وہ ختم نبوت کے بعد نبوت کے کام کو اسی طرح جاری رکھے گا جس طرح خدا کے پاک پیغمبر نے اس کو انجام دیا۔

خدا کے دعوتی منصوبہ کی تکمیل کے لئے حضرت ابراہیم اپنے وطن سے نکلے، اسی طرح حاجی بھی اپنے وطن سے نکل کر زبانِ حال سے یہ کہتا ہے کہ وہ دین کی خاطر بے وطن ہونے کے لئے تیار ہے۔ انھوں نے بالکل سادہ اور معمولی زندگی پر قناعت کی اسی طرح حاجی احرام باندھ کر یہ عزم کرتا ہے کہ وہ صرف ناگزیر ضرورت پر اکتفا کر کے اپنی توجہ کو اصل مقصد کی طرف لگائے رہے گا۔ انھوں نے کعبہ کے گرد طواف کر کے خدا کے ساتھ اپنی وفاداری کو استوار کیا اسی طرح حاجی بھی کعبہ کا طواف کر کے خدا کا وفادار ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ دینی تقاضوں میں مصروف ہونے کی وجہ سے ان کے اہل خاندان پر یہ حالت گزری کہ پانی کی تلاش میں وہ صفا و مروہ کے درمیان دوڑے اسی طرح حاجی دونوں پہاڑوں کے درمیان سعی کر کے ظاہر کرتا ہے کہ خدا کی خاطر وہ اس آخری حد تک جانے کے لئے تیار ہے خواہ اس کے گھر والوں پر وہ کیفیت گزر جائے جو ہاجرہ اور اسماعیل پر گزری۔ حضرت ابراہیم کو شیطان نے خدا کے کام سے ہٹانے کی کوشش کی تو انھوں نے اس کے اوپر کنکریاں پھینکیں اسی طرح حاجی علامتی شیطان پر رمی کر کے اس ارادہ کا اظہار کرتا ہے کہ وہ بھی شیطان کے ساتھ یہی سلوک کرے گا اگر اس نے اس کو ورغلایا۔ حضرت ابراہیم کو خدا کی خاطر بیٹے کی جان تک پیش کرنی پڑی اسی طرح حاجی جانور کو قربان کر کے یہ اعلان کرتا ہے کہ دین کی خاطر وہ قربانی کی حد تک جانے کے

تیار ہے۔ حضرت ابراہیم کا دعوتی مشن آخرت سے آگاہ کرنے کا مشن تھا۔ چنانچہ حاجی میدان عرفات میں جمع ہوکر میدان حشر کو یاد کرتا ہے تاکہ اس سب سے بڑی حقیقت کی یاد کو وہ اپنے ذہن کا جزء بنائے اور اس کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کرے۔ حضرت ابراہیم کو جب جب ان کے رب نے پکارا وہ فوراً حاضر ہوگئے اسی طرح حاجی اٹھتے بیٹھتے اور حج کے ارکان ادا کرتے ہوئے بار بار کہتا ہے: لبیك اللّٰھم لبیك لا شریك لك لبیك ان الحمد والنعمة لك والملك لا شریك لك (میں حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں حاضر ہوں۔ تعریف اور نعمت تیرے ہی لئے ہے اور اقتدار میں تیرا کوئی شریک نہیں) اس طرح حاجی اعلان کرتا ہے کہ وہ اپنے رب کی پکار پر ہر وقت حاضر ہونے کے لئے تیار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بیت اللہ دعوت اسلامی کا مرکز ہے اور حج اسلام کے داعیوں کا عالمی اجتماع۔ حج کے موقع پر جو افعال کئے جاتے ہیں وہ سب وہی ہیں جو حضرت ابراہیم کی دعوتی زندگی کی یادگار ہیں۔ حج کے مناسک انھیں واقعات کا تمثیلی اعادہ ہیں جو حضرت ابراہیم کو اپنی دعوتی سرگرمیوں کے درمیان مختلف صورتوں میں پیش آئے۔ حاجی بطور شعار (علامت) انھیں حج کے دنوں میں دہراتا ہے اور اس طرح اس بات کا عزم کرتا ہے کہ وہ اسی طرح داعی بن کر رہے گا جس طرح حضرت ابراہیم دنیا میں خدا کے داعی بن کر رہے۔ ان میں سے کچھ دعوتی زندگی کے براہ راست مرحلے ہیں اور کچھ بالواسطہ مرحلے۔

حضرت ابراہیم کی زندگی بتاتی ہے کہ حج کے یہ مراسم ان کی دعوتی زندگی کا جزء یا ان کے دعوتی سفر کے مراحل تھے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لئے حج اور کعبہ کی زیارت محض ایک قسم کی سالانہ مذہبی رسم بن کر رہ گئی ہے۔ مسلمانوں میں اگر دعوتی شعور اور تبلیغی روح زندہ ہو تو حج کا اجتماع خود بخود دعوتی اہمیت اختیار کرے گا اور سالانہ دعوتی کانفرنس کے ہم معنی بن جائے گا۔ مگر جب مسلمانوں میں دعوتی روح ختم ہوجائے تو حج اسی طرح ایک بے روح عمل بن کر رہ جاتا ہے جیسا کہ وہ اس وقت مسلمانوں کے درمیان بنا ہوا ہے۔ وہ پتھر کے شیطان پر کنکریاں پھینکتے ہیں مگر زندہ شیطان کو زیر کرنے کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ وہ علامتی اعمال کو دہراتے ہیں مگر حقیقی اعمال کی ادائگی کے لئے ان کے اندر کوئی جذبہ نہیں بھڑکتا۔

حج ذریعۂ اتحاد

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا اختلاف و انتشار ہے۔ کیا وجہ ہے کہ حج جیسا نادر اجتماعی ادارہ ان کے درمیان پوری طرح موجود ہے، اس کے باوجود ان کے اندر باہمی اتحاد پیدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ حج اپنے سالانہ عالمی اجتماع کے ساتھ ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے اتحاد کا ایسا

طاقت ور ذریعہ ہونا چاہئے جس میں تمام اختلافات تحلیل کر رہ جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حج موجودہ حالت میں صرف ایک قسم کا روایتی ہجوم بن کر رہ گیا ہے نہ کہ کسی عظیم مقصد کے حاملین کا زندہ اجتماع۔

اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے درمیان کوئی ایسا مشترک مقصد موجود ہو جو ان کی توجہات کو بلند تر نصب العین کی طرف لگا دے۔ اگر ایسا کوئی بڑا مقصد سامنے موجود نہ ہوگا تو لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھ کر رہ جائیں گے اور بڑے بڑے اجتماعات کے باوجود مجتمع اور متحد نہ ہوں گے۔

دعوت، امت مسلمہ کا یہی عظیم مقصد ہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر دعوتی جذبہ ابھر آئے تو اچانک پوری امت ایک بڑے نشانہ کی طرف متوجہ ہو جائے گی۔ اس کے بعد حج کا اجتماع اپنے آپ مسلمانوں کے درمیان عالمی اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے گا اور اسی کے ساتھ اسلام کی دعوت کا عالمی مرکز بھی۔

حج ایک زندہ عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ھ میں آخری حج ادا فرمایا۔ اس موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کی موجودگی میں آپ نے ۹ ذی الحجہ کو میدان عرفات میں ایک مفصل خطبہ دیا جو خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کے اس حج کو حجۃ البلاغ بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں آپ نے اسلام کی تمام بنیادی تعلیمات کو امت تک پہنچا کر اس سے اس کا عہد لیا تھا۔ چنانچہ خطبہ کے آخر میں یہ الفاظ آتے ہیں:

الا فلیبلغ الشاھد الغائب۔ فرب مبلغ اوعی من سامع۔ وانتم تسألون عنی ماذا انتم قائلون۔ قالوا نشھد انک قد ادیت الامانۃ وبلغت الرسالۃ و نصحت فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باصبعہ السبابۃ یرفعھا الی السماء وینکتھا الی الناس: اللھم اشھد اللھم اشھد

خبردار، جو موجود ہیں وہ میری بات کو غیر موجود تک پہنچا دیں۔ کیونکہ پہنچائے جانے والے اکثر سننے والوں سے زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اور تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا پھر تم کیا جواب دو گے۔ لوگوں نے کہا ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے امانت ادا کر دی اور پیغام پہنچا دیا اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور پھر لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: اے اللہ تو گواہ رہ، اے اللہ تو گواہ رہ۔

اس واقعہ کے تین مہینے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔ اس وقت تک اسلام عملاً عرب کے ملک تک پھیلا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے اصحاب عرب سے باہر نکلے۔ انھوں نے

اپنے اسلام کو اپنا مشن بنالیا۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اور سارا اثاثہ دین کی اشاعت کی راہ میں لگا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی وفات کے پچاس سال کے اندر اسلام قدیم آباد دنیا کے بیشتر حصہ میں پھیل گیا۔

اب بھی حج باقاعدہ ادا کیا جاتا ہے اور " حجۃ البلاغ " سے زیادہ بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے امام حج ہر سال اسی قسم کی باتیں دہراتا ہے جو پیغمبر اسلام نے چودہ سو سال پہلے کہی تھیں۔ مگر آج ان باتوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے حج ایک زندہ عمل تھا، آج وہ ایک روایتی عمل بن گیا ہے۔ پیغمبر اسلام نے حج کے موقع پر جن لوگوں کو خطاب کیا تھا وہ اسی ارادہ اور عزم کے ساتھ وہاں جمع ہوئے تھے کہ ان کو جو ہدایت دی جائے اس کو انھیں پورا کرنا ہے۔ اس کے برعکس آج حاجیوں کی بھیڑ مکہ اور مدینہ صرف اس لئے جاتی ہے کہ وہ حج کے نام پر کچھ رسوم ادا کرکے واپس آجائے۔ اور جس حال میں پہلے تھی اسی حال میں دوبارہ رہنے لگے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حج کو ایک مؤثر عمل کی حیثیت سے زندہ کرنے کا کام سب سے پہلے "حاجیوں" کو زندہ کرنے کا کام ہے۔ جب تک حاجیوں، بالفاظ دیگر مسلمانوں میں شعور بیدار نہ کیا جائے، حج کی عبادت اسی طرح بے اثر رہے گی جیسے ایک غیر صالح بندوق جس کی لبلبی دبائی جائے مگر اس کے باوجود وہ فائر نہ کرے۔

حج کی تنظیم نو

حج کو دوبارہ اس کی اصل روح کے ساتھ زندہ کرنا یہ ہے کہ اس کو دعوتی ادارہ کی حیثیت سے زندہ کیا جائے۔ حج کو دعوت اسلامی کی عالمی منصوبہ بندی کا مرکز بنا دیا جائے۔ اس بین اقوامی موقع پر ہر ملک کے لوگ اپنے ملک کے دعوتی حالات پیش کریں۔ ایک جگہ کے لوگ دوسری جگہ کے تجربات کو جانیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔ حج کے خطبات میں دعوت کی اہمیت اور اس کے جدید مواقع کی وضاحت کی جائے۔ حج کے ادارہ کے تحت مختلف زبانوں میں موثر دعوتی لٹریچر تیار کرنے کا انتظام کیا جائے اور اس کو عالمی سطح پر پھیلایا جائے۔ وغیرہ

تاہم یہ بھی اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ حج کی نئی رخ بندی خود مسلمانوں کی زندگی کی نئی رخ بندی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ مسلمان کی اصل ذمہ داری شہادت علی الناس ہے۔ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔ مگر مسلمان موجودہ زمانہ میں اس حقیقت کو بالکل بھول گئے ہیں۔ انھوں نے ساری دنیا میں غیر مسلم اقوام کو اپنا مادی حریف اور قومی فریق بنا رکھا ہے۔ حج کو دعوتی ادارہ

ی حیثیت سے زندہ کرنے کے لئے سب سے پہلے مسلمانوں کو دعوتی گروہ کی حیثیت سے زندہ کرنا
دگا۔ مسلمانوں کو اس کے لئے آمادہ کرنا ہوگا کہ دنیا بھر میں وہ اپنی ان قومی سرگرمیوں کو ختم کر دیں جو
ن کے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کی فضا پیدا نہیں ہونے دیتیں۔ اگر آپ کے
ور دوسری قوموں کے درمیان معتدل فضا نہ ہو تو آپ کس کو تبلیغ کریں گے اور کون آپ کی تبلیغ
کو سنے گا۔

پھر اس مقصد کے لئے ضرورت ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تبلیغی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں، جن کا
نصاب اور نظام کامل طور پر دعوت رخی ہو۔ ایسے ادارے قائم کئے جائیں جہاں لوگوں کی تربیت داعیانہ
ندازسے کی جائے۔ ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو ایک طرف لوگوں کے اندر دعوتی ذہن بنائے اور
دوسری طرف ان کو دعوتی معلومات سے مسلح کرے۔ حتیٰ کہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ اسلام کا جدید
بنیادی لٹریچر دوبارہ تیار کیا جائے۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں تفسیر قرآن اور سیرت رسول پر جو کتابیں تیار
ہوئی ہیں وہ زیادہ تر ردعمل کی نفسیات کے تحت لکھی گئی ہیں، وہ غیر قوموں کے فکری اور عملی حملوں کے
جواب کے طور پر وجود میں آئیں نہ کہ دعوت اسلام کی مثبت وضاحت کے لئے۔

اب سے چودہ سو سال پہلے مکی دور میں چلے جائیے تو آپ دیکھیں گے کہ اسلام کا پیغمبر تنہا کعبہ کا
طواف کر رہا ہے۔ اس وقت اسلام ایک فی دنیا کی تعداد کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر آج ہر دن کثرت سے
لوگ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور حج کے زمانہ میں ساری دنیا کے لاکھوں انسان اس طرح ہجوم
کرکے مکہ آتے ہیں کہ مسجد حرام کی مسلسل توسیع کے باوجود ہر سال اس کی عمارت ناکافی ہوتی ہوئی نظر
آتی ہے۔ تعداد کی یہ کثرت کیسے ممکن ہوئی، جواب یہ ہے کہ دعوت کے ذریعہ۔ حقیقت یہ ہے کہ حج کا عالمی
اجتماع اسلام کی دعوتی قوت کا ایک سالانہ مظاہرہ ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اسلام کی دعوتی قوت ہی میں
اللہ تعالیٰ نے اس کی تمام ترقیوں کا راز چھپا دیا ہے۔ اسی میں اہل اسلام کی دنیوی نجات بھی ہے اور اسی میں
ان کی اخروی نجات بھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام کی قوت ہمیشہ دعوت رہی ہے۔ ابتدائی دور میں اسلام
اگرچہ مکہ کے عوام کو متاثر نہ کر سکا، مگر وہ سارے قیمتی افراد مکہ کے ابتدائی دور ہی میں ملے جو بعد کو اسلام کی
تاریخ کے ستون قرار پائے۔ یہ صرف اسلامی دعوت کا نتیجہ تھا کیونکہ اس وقت اسلام کے پاس کوئی دوسری
قوت موجود ہی نہ تھی۔ بعد کو مکہ کے جو لوگ اسلام لائے وہ بھی اسلام کی نظریاتی برتری سے متاثر ہو کر
اسلام لائے، مثلاً عمرو بن العاص اور خالد بن الولید وغیرہ۔

دوسرے مرحلہ میں مدینہ میں اسلام کا مستحکم ہونا بھی دعوت ہی کے ذریعہ عمل میں آیا۔ مدینہ پر کبھی

کوئی حملہ نہیں کیا گیا۔ صرف چند لوگ اسلام کے داعی بن کر مدینہ پہنچے، وہاں انھوں نے سادہ انداز میں اسلام کی دعوت شروع کی۔ اس کے نتیجہ میں لوگ جوق در جوق مسلمان ہونے لگے۔ یہاں تک کہ وہ نوبت آئی کہ مدینہ اسلام کا فکری اور عملی مرکز بن گیا۔

بعد کے دور میں مغلوں اور تاتاریوں کا مسئلہ اسلام کے لئے پیش آیا۔ یہ وحشی قومیں گھوڑوں پر سوار ہو کر تیر اور تلوار لئے ہوئے مسلم ملکوں پر ٹوٹ پڑیں اور ان کے طاقتی مراکز کو زیر و زبر کر ڈالا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی تاریخ اسی طرح ختم ہو جائے گی جس طرح اس سے پہلے بہت سی تہذیبوں کی تاریخ پیدا ہوئی اور ختم ہو گئی۔ مگر عین اس وقت اسلام کی دعوتی طاقت ابھری اور اس نے سارے مسئلہ کو اس طرح حل کر دیا کہ خود فاتح قوموں کو اسلام کا تبرز بنا دیا۔

حج اور بیت اللہ ایک عظیم دعوتی منصوبہ بندی کی علامت ہیں۔ حضرت ابراہیم کی آواز جب عراق اور شام اور مصر کے متمدن علاقوں میں نہیں سنی گئی تو آپ نے خدا کے حکم سے اپنی اولاد کو لا کر مکہ میں بسایا اور یہاں کعبہ کی تعمیر کی تاکہ وہ ہدایت الٰہی کے مستقل مرکز کے طور پر کام دے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَّهُدًى لِّلْعَالَمِينَ (آل عمران ۹۶)	پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور سارے جہان کے لئے رہنما۔

عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان الدین لیأرز الی الحجاز کما تأرز الحیۃ الی جحرھا ولیعقلن الدین من الحجاز معقل الاُرویۃ من رأس الجبل۔ ان الدین بدأ غریباً وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء وھم الذین یصلحون ما افسد الناس (اخرجہ الترمذی)	دین حجاز کی طرف سمٹ آئے گا جس طرح سانپ اپنے بل کی طرف سمٹ آتا ہے اور دین حجاز کے ساتھ باندھ دیا جائے گا جس طرح بکرے کو پہاڑ کے تھان پر باندھ دیا جاتا ہے۔ دین شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا۔ وہ دوبارہ اجنبی ہو جائے گا تو اجنبیوں کو مبارک ہو۔ یہی لوگ ہیں جو اس وقت لوگوں کی اصلاح کریں گے جب کہ وہ بگڑ جائیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حجاز دعوت اسلامی کا مرکز بنا اسی طرح آئندہ بھی جب دین لوگوں کے اندر سے گم ہو گا تو دوبارہ حجاز ہی خدا کے دین کو زندہ کرنے کا مرکز بنے گا۔ حج کا مقام خدا کی عبادت کا مقام بھی ہے اور خدا کے دین کی دعوت و تجدید کا مرکز بھی۔ ضرورت ہے کہ آج حج اور حج کے مراکز کو دوبارہ اسی حیثیت سے زندہ کیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں سائنسی انقلاب نے بہت سے نئے دعوتی امکانات کھول دیے ہیں۔ ان کے نتیجہ میں آج یہ بات ہمیشہ سے زیادہ بڑے پیمانہ پر ممکن ہوگئی ہے کہ حج کے عالم گیر اجتماع کو دعوت دین کی عالمی منصوبہ بندی کے لئے استعمال کیا جائے اور اس طرح اسلام کے طرز فکر کو دنیا میں دوبارہ غالب طرز فکر بنا دیا جائے۔ جیسا کہ ماضی میں وہ غالب طرز فکر بنا ہوا تھا۔ یہی وہ مقصود ہے جس کو قرآن میں اظہار دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کہا گیا ہے، اور اس کو پانے کا راز بلاشبہ حج کی دعوتی اہمیت کو دوبارہ زندہ کرنے میں چھپا ہوا ہے۔

نوٹ: یہ مقالہ (انگریزی میں) لندن کے انٹرنیشنل حج سیمینار (۴-۷ اگست ۱۹۸۲) کے موقع پر پڑھا گیا۔

رسول اللہ کا حج

حج کی عبادت کا نظام حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے قائم فرمایا تھا۔ اس کے بعد اگرچہ اس نظام میں بہت سے بگاڑ پیدا ہوتے، تاہم اس کا رواج برابر باقی رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں پیدا ہوئے تو حج جاہلی رسوم کی آمیزش کے باوجود پوری طرح زندہ تھا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کتنی بار حج ادا فرمایا۔ تاریخی اعتبار سے اس سوال کے دو حصے ہیں۔ ایک ہجرت سے پہلے۔ دوسرا ہجرت کے بعد۔ ثانی الذکر حصہ کے بارے میں ہم کو مکمل معلومات حاصل ہیں۔ مگر جہاں تک اول الذکر حصہ کا معاملہ ہے اس کی بابت قطعی معلومات حاصل نہیں۔

ہجرت کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک بار حج کا فریضہ ادا کیا جس کو عام طور پر حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ ہجرت سے پہلے آپ مکہ میں مقیم تھے۔ روایات سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مکہ کے زمانۂ قیام میں بھی آپ نے حج کا فریضہ ادا کیا۔ مگر اس کی قطعی تفصیل نہیں ملتی۔ سنن ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے کہ آپ نے ہجرت سے پہلے دو حج ادا کئے۔ صحیح مسلم میں صرف ایک حج کا ذکر موجود ہے۔ بعض محدثین کا قول ہے کہ آپ اہل مکہ کی عادت کے مطابق ہر سال حج ادا کرتے تھے۔ طبقات ابن سعد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کے بعد آپ نے ایک حج کے سوا اور کوئی حج ادا نہیں کیا۔ ایک طرف ہجرت سے قبل حج کے بارہ میں اتنی کم معلومات ہیں اور دوسری طرف حجۃ الوداع کے بارہ میں اتنی تفصیلی روایات ملتی ہیں کہ اس کے متعلق اول سے آخر تک مکمل ڈائری مرتب کی جا سکتی ہے۔

اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ زمانہ کا فرق ہے۔ ہجرت سے پہلے آپ کی حیثیت ایک ناقابل ذکر شخصیت کی تھی۔ لوگوں کی نظر میں آپ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ مگر حجۃ الوداع آپ کی آخری عمر میں اس وقت پیش آیا جب کہ آپ کی حیثیت عرب کے فاتح کی ہو چکی تھی۔ آپ کی زندگی کے دو دوروں کا یہی فرق ہے جس کی بنا پر آپ کے ابتدائی حج کے واقعات کو تاریخ نے باقاعدہ ریکارڈ نہیں کیا۔ اور آپ کے آخری حج کو تاریخ نے اتنی تفصیل کے ساتھ ریکارڈ کیا کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا جزء بھی غیر مذکور نہیں۔

روایات کے ذخیرہ میں حجۃ الوداع کی جو تفصیلات بکھری ہوئی ہیں ان کو بعض مولفین نے یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

السیرۃ النبویہ	امام ابو الفداء اسماعیل بن کثیر
زاد المعاد	علامہ شمس الدین ابن قیم الجوزیہ
شرح المواہب اللدنیہ	علامہ محمد بن عبد الباقی الزرقانی
حجۃ الوداع وجزء عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم	الشیخ محمد زکریا الکاندھلوی

ذیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حج کا بیان مختصر طور پر نقل کیا جاتا ہے:

حجۃ الوداع ۱۰ھ میں پیش آیا۔ اس کے تقریباً دو ماہ بعد مدینہ میں آپ کی وفات ہو گئی۔ آپ کے اس حج کو حجۃ الوداع اس لئے کہا جاتا ہے کہ آپ نے منی میں اور عرفہ کے خطبہ میں اس وقت کے اہل ایمان کو وداع کہا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ اس سال کے بعد آئندہ اس جگہ تم سے میری ملاقات نہ ہو سکے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حج مختلف پہلوؤں سے اہمیت رکھتا تھا۔ اسی لئے اس کو کئی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ مثلاً حجۃ الوداع، حجۃ الاسلام، حجۃ البلاغ، حجۃ الکمال، حجۃ التمام۔

مکہ رمضان ۸ھ میں فتح ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۸ھ اور ۹ھ میں حج کے لئے تشریف نہیں لے گئے۔ البتہ آپ کی ہدایت کے مطابق ۹ھ میں تین سو مسلمانوں کی ایک جماعت نے مدینہ سے مکہ جا کر حج ادا کیا۔ اس جماعت کے امیر حضرت ابوبکر صدیق تھے۔ اس حج میں عرب کے مشرکین بھی شریک تھے۔ مگر سورہ توبہ میں نازل شدہ حکم

کے مطابق ۹ھ کے حج میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ آئندہ سے کسی مشرک کو حج کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ یہ اعلان حضرت علی نے کیا (بخاری)

اگلے سال ۱۰ھ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حج کا ارادہ فرمایا۔ اسی کے ساتھ تمام قبائل میں اہتمام کے ساتھ اطلاعات بھیج دی گئیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ آپ کے ساتھ شریک ہوسکیں۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے بعد حج کی عبادت اگرچہ جاری تھی۔ مگر اس میں بہت سی جاہلی رسمیں شامل ہوگئی تھیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ بڑی تعداد میں لوگ آپ کو حج کے اعمال کرتے ہوئے دیکھ لیں اور آئندہ اسی کے مطابق حج ادا کرتے رہیں۔ اس قسم کے اعمال ہمیشہ دیکھ کر ہی سمجھ میں آتے ہیں، لفظوں میں بتانے سے سمجھ میں نہیں آتے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آپ اپنی سواری پر تھے اور رمی جمار کر رہے تھے۔ آپ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ لوگو، حج کے طریقے مجھ سے سیکھ لو۔ شاید اس سال کے بعد میں دوبارہ حج نہ کر سکوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر حج کی خبر اطراف ملک میں پھیلی تو لوگ آنا شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ مدینہ میں تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ آپ ۲۵ ذی قعدہ ۱۰ھ کو مدینہ سے روانہ ہوئے۔ راستہ میں بھی لوگ اس قافلہ میں شریک ہوتے رہے۔ آپ اس طرح مکہ کی طرف جارہے تھے کہ آپ کے چاروں طرف آدمیوں کا ہجوم تھا۔ حضرت جابر کہتے ہیں کہ میری نگاہ جہاں تک جاتی تھی مجھے ہر طرف انسان ہی انسان دکھائی دیتے تھے۔ مکہ پہنچ کر یہ مجمع تقریباً سوا لاکھ ہوگیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی اس اونٹنی پر سوار تھے جس کا نام قصواء تھا۔ یہ ایک غیر معمولی قسم کی تیز رفتار اونٹنی تھی۔ تاہم اس وقت اس کے اوپر جو کجاوہ بندھا ہوا تھا۔ اس کی قیمت چار درہم سے زیادہ نہ تھی۔ گویا ضرورت کی حد تک اعلیٰ معیار اور جہاں ضرورت کی حد ختم ہوجائے وہاں صرف سادگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روانگی سے پہلے ظہر کی چار رکعتیں لوگوں کے ساتھ پڑھیں۔ آپ نے ایک تقریر فرمائی جس میں بتایا کہ احرام باندھنے کے فرائض و آداب کیا ہیں۔ اس کے بعد آپ وہ الفاظ کہتے ہوئے روانہ ہوئے جن کو تلبیہ کہا جاتا ہے۔ یعنی لبیك اللهم لبيك لبيك لاشريك لك لبيك ان الحمد و النعمة لك و الملك لاشريك لك

(حاضر ہوں۔ خدایا میں حاضر ہوں۔ حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں حاضر ہوں۔ تعریف اور نعمت تیرے ہی لئے ہے اور بادشاہی میں تیرا کوئی شریک نہیں)

مدینہ سے پانچ میل کے فاصلہ پر ذوالحلیفہ ہے جو اہل مدینہ کی میقات ہے۔ یہاں پہنچ کر آپ نے رات گزاری۔ اگلے دن غسل کیا۔ ظہر کی نماز دو رکعت ادا کی اور حج وعمرہ (قران) کا احرام باندھا۔ پھر تلبیہ کہتے ہوئے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں کوئی ٹیلہ ملتا تو اس پر چڑھ کر بلند آواز سے اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) کہتے گویا کہ آپ سارے عالم کے سامنے خدا کی بڑائی کا اعلان کر رہے ہوں۔

آپ ۴ ذی الحجہ کو مکہ پہنچے۔ مدینہ سے مکہ کا سفر نو دن میں طے ہوا۔ یہ پہر کا وقت تھا۔ آپ چلتے ہوئے حرم میں داخل ہوئے۔ بیت اللہ پر نظر پڑی تو آپ کی زبان مبارک سے نکلا: اللھم زد بیتک ھذا تشریفا وتعظیما وتکریما ومھابۃ (اے اللہ تو اپنے اس گھر کے شرف اور عظمت اور بزرگی اور ہیبت میں اضافہ فرما) آپ اپنے ہاتھ کو اٹھا کر تکبیر کہتے اور فرماتے: اللھم انت السلام ومنک السلام حینا ربنا بالسلام (اے اللہ تو سلامتی ہے۔ تجھی سے سلامتی ہے۔ اے ہمارے رب ہم کو سلامتی کے ساتھ زندہ رکھ)

حرم میں داخل ہو کر آپ نے تحیۃ المسجد کا دوگانہ نہیں پڑھا بلکہ طواف قدوم شروع کر دیا۔ آپ حجر اسود کے پاس آئے اور بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر اس کا استلام کیا۔ پھر دائیں طرف سے چل کر سات بار اس کا طواف اس طرح کیا کہ کعبہ آپ کے بائیں طرف تھا۔ طواف کے پہلے تین شوط (پھیرے) میں آپ تیز تیز چلے جس کو رمل کہا جاتا ہے۔ باقی چار پھیروں میں آپ معمول کی چال چلے۔ آپ کے بائیں شانہ پر احرام کی چادر پڑی ہوئی تھی اور دایاں شانہ کھلا ہوا تھا۔ اس طریقہ کو اضطباع کہا جاتا ہے۔ طواف کے دوران جب آپ حجر اسود کے سامنے سے گزرتے تو اس کی طرف اشارہ کر کے اپنی چھڑی سے استلام کرتے۔

حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان یہ دعا ماثور ہے: ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار (اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا) اسی طرح طواف میں آپ سے بعض اور دعائیں بھی منقول ہیں۔

طواف کعبہ سے فراغت کے بعد آپ مقام ابراہیم کے پاس آئے اور قرآن کی یہ آیت

پڑھی: واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی (البقرۃ ۱۲۵) مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہوکر آپ نے دو رکعت نماز ادا کی۔ اس کے بعد حجر اسود کے پاس گئے اور اس کا بوسہ لیا۔ پھر صفا کی طرف روانہ ہوئے۔ قریب آئے تو فرمایا: ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ۔ ابدأ بما بدأ اللہ بہ (بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ میں اس سے شروع کرتا ہوں جس کا اللہ نے پہلے ذکر کیا ہے)

پھر آپ صفا پر چڑھے یہاں تک کہ کعبہ دکھائی دینے لگا۔ آپ نے قبلہ کی طرف متوجہ ہوکر یہ الفاظ کہے: لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ۔ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئی قدیر۔ لا الٰہ الا اللہ وحدہ انجز وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ (اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لئے ساری تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اس نے اپنے بندے کی مدد فرمائی اور تمام گروہوں کو تنہا شکست دی۔

پھر آپ صفا سے اتر کر مروہ کی طرف روانہ ہوئے۔ دونوں پہاڑیوں کے درمیان آپ نے اس طرح سعی فرمائی کہ جب آپ نشیب میں (میلین اخضرین کے درمیان) پہنچے تو دوڑنے لگے۔ نشیب ختم ہوا تو آہستہ چلنے لگے۔ مروہ پہنچ کر آپ اس کے اوپر اتنا چڑھے کہ کعبہ دکھائی دینے لگا۔ یہاں بھی آپ نے تکبیر وتہلیل کی اور دعا مانگی۔ اسی طرح آپ نے صفا ومروہ کے درمیان سات پھیرے کئے۔ بعض روایات کے مطابق آپ نے ابتدائی چند پھیرے پیدل کئے اور بقیہ پھیرے اپنی اونٹنی پر سوار ہوکر۔ آپ نے ایسا غالباً اس لئے کیا کہ دور تک پھیلا ہوا مجمع آپ کے عمل کو بخوبی طور پر دیکھ سکے۔ آپ کا ساتواں پھیرا مروہ پر ختم ہوا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ۴ ذی الحجہ کو مکہ میں مقام ابطح میں اترے تھے۔ یہاں آپ ۸ ذی الحجہ تک (چار دن) رہے۔ اور وہیں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ قصر کرکے نماز پڑھتے رہے۔ ۸ ذی الحجہ کو آپ اپنے تمام اصحاب کے ساتھ منیٰ گئے۔ جاتے وقت کوئی طواف نہیں کیا۔ اس دن ظہر اور عصر اور مغرب اور عشا کی نمازیں آپ نے منیٰ میں پڑھیں اور رات کو وہیں قیام کیا۔ صبح ۹ ذی الحجہ کو سورج نکلنے کے بعد آپ عرفات کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ نمرہ

(وادی عرنہ) کے ایک خیمہ میں ٹھہرے۔ صحابہ میں سے کوئی لبیک پکارتا تھا اور کوئی تکبیر کہتا تھا۔ کوئی ایک دوسرے پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔

جب زوال کا وقت آیا تو آپ اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر چلے اور میدان عرفہ کے بیچ میں ٹھہرے۔ یہاں موجودہ مسجد نمرہ کی جگہ اپنی سواری پر بیٹھے ہوئے آپ نے وہ خطبہ دیا جو خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ یہ خطبہ اور دوسرا خطبہ جو آپ نے منیٰ میں دیا، وہ متفرق طور پر حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ان کا مجموعہ اگلے صفحات میں نقل کیا جا رہا ہے۔

یہ جمعہ (۹ ذی الحجہ) کا دن تھا۔ جب آپ خطبہ دے چکے تو آپ نے حضرت بلال کو اذان کا حکم دیا۔ انھوں نے اذان دی۔ آپ نے ایک اذان اور دو اقامت سے ظہر اور عصر کی نماز جمع کر کے دو دو رکعت پڑھی۔ یہ جمعہ کی نماز نہیں بلکہ ظہر کی قصر نماز تھی۔ کیوں کہ آپ نے اس میں قرأت بالجہر نہیں کی۔ فرض کے علاوہ اس موقع پر کوئی سنت یا نفل آپ نے نہیں پڑھی۔

نماز سے فارغ ہو کر آپ عرفات کے اس مقام پر آئے جس کو وقوف کی جگہ کہا جاتا ہے۔ یہاں آپ نے اپنے اونٹ پر بیٹھے بیٹھے سورج ڈوبنے تک دعا کی۔ آپ نے فرمایا کہ اس دن کی دعا بہترین دعا ہے۔ اس وقت آپ کس قسم کے ربانی احساسات سے بھرے ہوئے تھے، اس کا اندازہ ان کلمات سے ہوتا ہے جو اس وقت آپ کی زبان سے نکل رہے تھے۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا:

اللّٰھم انك تسمع کلامی، وتری مکانی، وتعلم سری وعلانیتی، لا یخفی علیك شئ من امری، انا البائس الفقیر، المستغیث المستجیر، الوجل المشفق المقر المعترف بذنوبی، اسألك مسئلة المسکین وابتھل الیك ابتھال المذنب الذلیل، وادعوك دعاء الخائف الضریر، من خضعت لك رقبته وفاضت لك عیناہ وذل جسدہ ورغم انفه لك اللّٰھم: لا تجعلنی بدعائك رب شقیا وکن لی رؤفا رحیما، یاخیر المسئولین ویا خیر المعطین!

اے اللہ تو میری بات سن رہا ہے اور تو میری جگہ کو دیکھ رہا ہے۔ تو میرے چھپے اور کھلے کو جانتا ہے۔ میری کوئی بات تجھ سے چھپی ہوئی نہیں۔ میں مصیبت زدہ ہوں، محتاج ہوں، تجھ سے فریادی ہوں۔ تیری پناہ چاہتا ہوں۔ پریشان ہوں۔ خوف زدہ ہوں۔ اپنے گنا ہوں

اقرار و اعتراف کر رہا ہوں۔ تجھ سے بےکس آدمی کی طرح سوال کر رہا ہوں۔ اور گنہگار اور حقیر سان کی طرح تیرے سامنے گڑگڑا رہا ہوں۔ اور تجھ سے خوف زدہ اور آفت رسیدہ آدمی کی مانند سوال کرتا ہوں، جیسے وہ شخص جس کی گردن تیرے آگے جھکی ہوئی ہو اور اس کی آنکھیں تیرے لئے بہہ پڑی ہوں، اور اس کا جسم تیرے آگے فروتنی کئے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو۔ اے اللہ تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور تو میرے حق میں بڑا مہربان نہایت رحم والا بن جا۔ اے تمام مانگے جانے والوں سے بہتر اور اے سب دینے والوں سے اچھا۔

اس اثنا میں لوگ حج کے مسائل پوچھنے آتے تھے۔ کچھ نجدیوں نے پوچھا کہ حج کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ الحج عرفۃ (حج عرفات میں ٹھہرنے کا نام ہے) جو شخص یوم النحر سے پہلے یہاں آ جائے اس کا حج ہوگیا۔

قرآن کی آیت الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (المائدہ ۳) یہیں عرفہ میں خطبہ حجۃ الوداع کے بعد نازل ہوئی۔ سورج ڈوبنے کے بعد آپ عرفہ سے مزدلفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اسامہ بن زید کو اپنے پیچھے بٹھالیا۔ راستہ بھر آپ تلبیہ کرتے رہے۔ مزدلفہ پہنچنے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آپ نے لوگوں کو تیز چلنے سے منع فرمایا۔ آپ نے کہا: السکینۃ ایھا الناس السکینۃ ایھا الناس فان البر لیس بالایضاع (لوگو سکون اور اطمینان کے ساتھ چلو۔ دوڑنا کوئی ثواب کی بات نہیں)

مزدلفہ میں آپ نے حضرت بلال کو اذان کا حکم دیا۔ اذان کے بعد آپ کھڑے ہوئے اور اونٹوں کو بٹھانے اور سامان اتارنے سے پہلے مغرب کی نماز ادا کی اس کے بعد جب لوگوں نے سامان اتار لیا تو آپ نے عشاء کی نماز دو رکعت ادا فرمائی۔ یہاں بھی آپ نے ایک اذان اور دو اقامت سے دونوں نمازیں ادا کیں۔ فرض کے علاوہ آپ نے کوئی اور نماز نہیں پڑھی۔ اس کے بعد آپ لیٹ گئے اور صبح تک سوئے۔ صبح اٹھ کر فجر کی نماز آپ نے اول وقت میں پڑھی۔ یہ ذی الحجہ کی گیارہ تاریخ تھی۔ پھر آپ سواری پر بیٹھے اور مشعر حرام آئے یہاں قبلہ کی طرف رخ کر کے دعا اور تضرع کرتے رہے، یہاں تک کہ پوری طرح اجالا ہوگیا۔ سورج نکلنے سے پہلے آپ مزدلفہ سے روانہ ہوئے۔ آپ برابر تلبیہ کرتے رہے۔ فضل بن عباس آپ کے پیچھے سوار تھے۔ آپ نے ان کو حکم دیا کہ رمی جمار کے لئے یہاں سے سات کنکریاں چن لیں۔

جب آپ وادیٔ محسّر میں پہنچے تو لوگوں سے کہا کہ یہاں سے تیزی سے گزر جاؤ۔ اپنی اونٹنی بھی آپ نے تیز کر دی۔ وادی محسّر وہ جگہ ہے جہاں اصحاب فیل پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا۔ آپ چلتے رہے، یہاں تک کہ آپ منیٰ پہنچ گئے۔ پھر آپ جمرۃ العقبہ آئے۔ یہاں آپ اس طرح کھڑے ہوئے کہ مکہ آپ کے بائیں طرف تھا اور منیٰ داہنی طرف۔ آپ نے سواری پر بیٹھے ہوئے سورج نکلنے کے بعد ایک کے بعد ایک سات کنکریاں ماریں جس کو رمی کہا جاتا ہے۔ ہر کنکری کے ساتھ آپ تکبیر کہتے جاتے تھے۔ رمی جمار کے بعد آپ نے تلبیہ موقوف کیا۔ اس کے بعد آپ منیٰ واپس ہوئے۔ آپ نے دین کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان فرمایا:

اعبدوا ربکم وصلوا خمسکم وصوموا شهركم واطيعوا ذا امركم تدخلوا جنة ربكم

اپنے رب کی عبادت کرو۔ اور پانچ وقت کی نماز پڑھو اور رمضان کے مہینہ کا روزہ رکھو اور اپنے صاحب امر کی اطاعت کرو، اور اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔

منیٰ میں آپ نے ایک خطبہ دیا۔ یہ اہم خطبہ عرفہ کے خطبہ سے مشابہ تھا۔ یہ تکرار غالباً اس لئے تھی کہ جس نے وہاں نہ سنا ہو وہ یہاں سن لے۔ اور اچھی طرح یاد کر لے۔ یہاں آپ نے جن باتوں کا اعلان فرمایا ان میں سے یہ بھی تھا۔

لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي، ولا لاسود على احمر ولا لاحمر على اسود الا بالتقوى (مسند احمد، عن ابی نضرۃ)

کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں اور کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت نہیں۔ اور کسی کالے کو کسی سرخ پر فضیلت نہیں اور کسی سرخ کو کسی کالے پر فضیلت نہیں۔ فضیلت کا مدار صرف تقویٰ پر ہے۔

نیز آپ نے فرمایا:

الا ان الشيطان قد ايس ان يعبد فى بلدكم هذا ابدا ولكن ستكون له طاعة فيما تحقرون من اعمالكم فيرضى به (ترمذی)

سن لو، شیطان اس سے مایوس ہو گیا ہے کہ اب تمہارے اس شہر میں قیامت تک اس کی پرستش نہ ہوگی۔ مگر تم ایسے کاموں میں اس کی پیروی کروگے جن کی تمہاری نظر میں اہمیت نہ ہوگی اور وہ اس سے راضی

ہو جائے گا۔

اس کے بعد آپ منیٰ میں مقام نحر (قربانی کی جگہ) پر گئے۔ یہاں آپ نے ترسٹھ اونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح کئے۔ آپ کی عمر بھی ۶۳ سال ہوئی۔ اس کے بعد آپ رکے اور حضرت علی سے کہا کہ سو اونٹ میں جو تعداد باقی ہے اس کو تم پورا کردو۔ قربانی سے فارغ ہوکر آپ نے معمر بن عبد اللہ (حجام) کو بلایا اور اپنے بال منڈائے جس کو حلق کہا جاتا ہے اور ناخن کتروائے۔ عورتوں کو آپ نے صرف تقصیر (بال کتروانے) کا حکم دیا۔ مونڈنے سے منع فرمایا۔ اس کے بعد آپ اپنی سواری پر بیٹھ کر مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ قربانی مقام نحر کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی کی جاسکتی ہے۔ قربانی کا گوشت آپ نے تھوڑا سا پکا کر کھایا اور بقیہ سب خیرات کر دیا۔ آپ نے لوگوں سے کہا کہ قربانی کا گوشت کھاؤ اور کھلاؤ اور جب تک چاہے اس کو سکھا کر رکھو۔

۱۰ ذی الحجہ کو آپ مکہ پہنچے۔ یہاں آپ نے ظہر سے پہلے طواف افاضہ کیا جس کو طواف زیارت بھی کہا جاتا ہے۔ اس طواف میں آپ نے رمل اور اضطباع نہیں کیا اور نہ سعی کی۔ اس کے بعد آپ زمزم کے کنویں کے پاس آئے اور کھڑے ہوکر زمزم پیا۔ اس وقت حسب دستور خاندان عبد المطلب کے لوگ پانی نکال کر لوگوں کو پلا رہے تھے۔ اس کے بعد آپ اسی روز منیٰ کے لئے واپس ہو گئے۔ رات آپ نے منیٰ میں گزاری۔

اگلے روز ۱۱ ذی الحجہ کو آپ منی میں سورج ڈھلنے کا انتظار کرتے رہے۔ جب زوال کا وقت آیا تو آپ سواری سے اتر کر رمی جمار کے لئے گئے۔ پہلے آپ نے جمرہ اولیٰ پر ایک کے بعد ایک سات کنکریاں ماریں۔ اس کے بعد کچھ دیر تک دعا کرتے رہے۔ اور پھر جمرۂ وسطی پر اسی طرح کنکریاں ماریں۔ اس کے بعد پھر کچھ دیر تک دعا کرتے رہے۔ ہر کنکری پر آپ اللہ اکبر فرماتے رہے۔ اس کے بعد جمرۃ العقبہ کے قریب جاکر اس کو سات کنکریاں ماریں۔ پھر آپ وہاں سے ہٹ گئے۔

اس کے بعد ۱۲ ذی الحجہ اور ۱۳ ذی الحجہ (ایام تشریق کے تینوں دن تک) آپ منی ہی میں رہے۔ منیٰ میں آپ نماز قصر بغیر جمع پڑھاتے رہے۔ ۱۳ ذی الحجہ کو زوال کے بعد مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ آپ نے وادی محصّب (ابطح) کے ایک خیمہ میں قیام کیا۔ ظہر اور عصر اور مغرب اور عشا کی نمازیں یہیں پڑھیں۔ رات کو یہیں آرام کیا۔ رات کو پچھلے پہر اٹھ کر حرم گئے اور کعبہ

کا طواف (طواف الوداع) کیا اور وہیں فجر کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد قافلہ کو سفر کا حکم دیا۔ سب لوگ اپنے اپنے مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔ آپ مہاجرین اور انصار کے ساتھ مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مکہ میں داخل ہونے سے لے کر نکلنے تک آپ کا قیام کل دس دن رہا۔

جب ذو الحلیفہ (مدینہ کے قریب) پہنچے تو آپ ٹھہر گئے اور رات یہاں گزری۔ صبح کو طلوع آفتاب کے وقت مدینہ میں داخل ہوئے۔ جب آپ کی نظر سواد مدینہ پر پڑی تو آپ نے تین بار تکبیر کہی اور فرمایا:

اللہ اکبر لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئی قدیر۔ آئبون تائبون عابدون ساجدون لربنا حامدون۔ صدق اللہ وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ۔

اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ اکیلا ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہی ہے۔ اور اسی کے لئے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ہم لوٹ رہے ہیں توبہ کرتے ہوئے۔ عبادت کرتے ہوئے۔ سجدہ کرتے ہوئے۔ اپنے رب کی تعریف کرتے ہوئے۔ اللہ نے اپنا وعدہ سچا کیا۔ اور اس نے اپنے بندے کی مدد کی اور اس نے تمام گروہوں کو تنہا شکست دی۔

حضرت اسامہ بن شُریک کہتے ہیں کہ منیٰ میں لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے۔ کوئی شخص کہتا کہ اے خدا کے رسول، میں نے طواف سے پہلے سعی کرلی۔ کوئی کہتا کہ میں نے رمی جمار سے پہلے حلق کرالیا۔ کسی نے کہا کہ میں نے پہلے قربانی کی اور اس کے بعد رمی کیا۔ اسی طرح لوگ مختلف مسائل پوچھتے رہے۔ آپ اس قسم کے سوالات کے جواب میں فرماتے افعل ولا حرج، افعل ولا حرج (کرلو، کوئی حرج نہیں۔ کرلو کوئی حرج نہیں) حرج کی بات تو یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے بھائی کو بے عزت کرے۔ ایسا ہی شخص ظالم ہے۔ اسی نے حرج والا کام کیا اور ہلاک ہوا (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

خطبہ حجۃ الوداع

حجۃ الوداع کا خطبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی آخری اہم ترین تقریر ہے۔ یہ وہ خطبہ ہے جو آپ نے ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ کو عرفات کے میدان میں دیا تھا۔ حجۃ الوداع گویا زمانۂ نبوت کا سب سے بڑا اسلامی اجتماع تھا۔ اس موقع پر تقریباً سوا لاکھ اصحاب رسول جمع تھے۔ اس وقت اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ قبل آپ نے یہ خطبہ دیا۔ اس میں آپ نے ان تمام باتوں کا آخری اعلان فرمایا جس کے لیے آپ مبعوث کئے گئے تھے۔

حدیث کی کتابوں میں حجۃ الوداع کا نہایت تفصیلی تذکرہ ہے۔ مگر خطبہ حجۃ الوداع کسی روایت میں ایک کامل متن کی صورت میں مذکور نہیں۔ مختلف روایتوں میں اس کے متفرق اجزاء ملتے ہیں۔ متعدد اہل علم نے ان اجزاء کو جوڑ کر ایک مجموعہ بنانے کی کوشش کی ہے۔

یہ خطبہ، ایک لفظ میں، خدا کی عظمت اور انسان کی مساوات کا اعلان تھا۔ آپ نے بتایا کہ انسانوں کے درمیان صحیح تقسیم صرف ایک ہے اور وہ خدا پرست ہونے اور خدا پرست نہ ہونے کی ہے۔ اس کے سوا دوسری تمام تقسیمات مصنوعی ہیں۔ آپ نے انہیں باطل ٹھہرایا اور امت کو ذمہ دار بنایا کہ وہ ہمیشہ اس کا اعلان کرتی رہے۔

اس اعلان کا ایک عملی اظہار یہ تھا کہ جس وقت سوا لاکھ انسانوں کے درمیان آپ نے عظمتِ خداوندی اور مساوات انسانی کا یہ خطبہ دیا اس وقت آپ کے سب سے زیادہ قریب دو آزاد شدہ غلام تھے۔ ایک بلال حبشی جو آپ کی سواری کی مہار پکڑے ہوئے تھے۔ اور دوسرے اسامہ بن زید جو آپ کے سر پر کپڑے کا سایہ کئے ہوئے تھے۔

اگلے صفحات میں یہ اہم خطبہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اولاً خطبۂ نبوی کا عربی متن اور اس کے بعد اس کا اردو ترجمہ۔

نص الخطبة التي خطبها رسول الله ﷺ يوم عرفة

« إنّ دماءكم وأموالكم حرام عليكم كحرمة يومكم هذا ، في شهركم هذا ، في بلدكم هذا ، ألا كلّ شيء من أمر الجاهلية تحت قدمي موضوع ، ودماء الجاهلية موضوعة ، وإنّ أوّل دم أضعه من دمائنا دم ابن ربيعة بن الحارث كان مسترضعاً في بني سعد فقتلته هذيل ، وربا الجاهلية موضوع ، وأول ربا أضع من ربانا ربا العبّاس بن عبد المطلب ، فإنّه موضوع كله ، فاتقوا الله في النّساء ، فإنكم أخذتموهنّ بأمانة الله ، واستحللتم فروجهنّ بكلمة الله ، ولكم عليهنّ ألاّ يوطئن فرشكم أحداً تكرهونه ، فان فعلن ذلك فاضربوهن ضرباً غير مبرح ، ولهنّ عليكم رزقهنّ وكسوتهنّ بالمعروف ، وقد تركت فيكم ما لن تضلوا بعده ان اعتصمتم به كتاب الله وسنّة بنية ، وأنتم تسألون عنّي ، فماذا أنتم قائلون ؟ قالوا نشهد أنك قد بلغت وأدّيت ونصحت ، فقال بإصبعه السبابة يرفعها الى السماء وينكبها الى النّاس اللهم أشهد ثلاث مرات

نص الخطبة التي خطبها ﷺ في أوسط أيام التشريق.

« يا أيها النّاس ! هل تدرون في أيّ شهر أنتم وفي أيّ يوم أنتم وفي أيّ بلد أنتم؟ فقالوا : في يوم حرام ، وبلد حرام ، وشهر حرام ، قال : فإنّ دماءكم وأموالكم وأعراضكم عليكم حرام ، كحرمة يومكم هذا في شهركم هذا ، وفي بلدكم هذا ، الى يوم تلقونه ، ثم قال : اسمعوا منّي تعيشوا ، ألا ! لا تظلموا ، ألا ! لا تظلموا ، ألا ! لا

تظلموا ، إنّه لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه ، ألا ! وان كل دم ومال ومأثرة كانت في الجاهلية تحت قدمي هذه ، الى يوم القيامة وإنّ أوّل دم يوضع دم ربيعة بن الحارث بن عبد المطلب، كان مسترضعاً في بني ليث فقتلته هذيل ، ألا ! وإنّ كل ربا في الجاهليّة موضوع ، وان الله عز وجل قضى أنّ أوّل ربا يوضع ربا العبّاس بن عبد المطلب ، لكم رءوس أموالكم ، لا تَظلمون ولا تُظلَمون ، ألا ! وإنّ الزّمان قد استدار كهيئته يوم خلق السماوات والأرض ،ثم قرأ« إنّ عدة الشهور عند الله اثنا عشر شهراً في كتاب الله يوم خلق السماوات والأرض ، منها أربعة حرم ، ذلك الدين القيّم ، فلا تظلموا فيهن أنفسكم »، ألا ! لا ترجعوا بعدي كفاراً يضرب بعضكم رقاب بعض، ألا ! إنّ الشيطان قد أيس أن يعبده المصلون ، ولكنه في التحريش بينكم ، واتّقوا الله في النساء ، فإنهّن عندكم عوان لا يملكن لأنفسهنّ شيئاً ، وإن لهنّ عليكم حقاً ، ولكم عليهن حقاً ألاّ يوطئن فرشكم أحداً غيركم ، ولا يأذنّ في بيوتكم لأحد تكرهونه ، فإن خفتم نشوزهنّ ، فعظوهنّ ، واهجروهنّ في المضاجع واضربوهنّ ضرباً غير مبرح ، ولهنّ رزقهنّ وكسوتهنّ بالمعروف ، وإنّما أخذتموهنّ بأمانة الله ، واستحللتم فروجهنّ بكلمة الله عزّ وجلّ ، ألا ومن كانت عنده أمانة فليؤدّها الى من ائتمنه عليها وبسط يديه ، وقال : ألا ! هل بلّغت؟ ألا ! هل بلّغت ، ثم قال : ليبلّغ الشّاهد الغائب ، فإنّه ربّ مبلّغ أسعد من سامع

ترجمہ

بے شک تمہارے خون اور تمہارے مال تمہارے اوپر حرام ہیں جس طرح تمہارا یہ دن تمہارے اس مہینے میں تمہارے اس شہر میں حرام ہے۔ سن لو کہ جاہلیت کے معاملے کی ہر چیز میرے قدموں کے نیچے ہیں اور جاہلیت کے تمام خون باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلا خون جو میں باطل کرتا ہوں وہ ہمارا خون، ربیعہ بن حارث کا خون ہے۔ اس نے بنو سعد سے دودھ پلانے والی طلب کیا تھا پس اس کو ہذیل نے قتل کیا۔ اور جاہلیت کے تمام سود باطل ہیں۔ اور سب سے پہلا سود جو میں باطل کرتا ہوں وہ ہمارے خاندان کا سود، عباس بن عبد المطلب کا سود ہے وہ سب کا سب باطل ہے۔ تم لوگ عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو۔ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے۔ اور ان کی شرمگاہوں کو اللہ کے کلمہ سے حلال کیا ہے۔ اور ان کے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی غیر کو، جس کا آنا تمہیں پسند نہیں، نہ آنے دیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو تم ان کو ایسی مار مار سکتے ہو جو ظاہر نہ ہو۔ اور تمہارے اوپر ان کا حق یہ ہے کہ تم ان کو معروف طریقہ پر کھانا اور کپڑا دو۔ اور میں تمہارے درمیان ایک چیز چھوڑ رہا ہوں۔ اگر تم اس کو مضبوطی سے پکڑو گے تو تم گمراہ نہ ہو گے۔ وہ چیز خدا کی کتاب ہے۔ اور تم سے میری بابت پوچھا جائے گا۔ تو تم کیا کہو گے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے پہونچا دیا اور ادا کر دیا اور خیر خواہی کی۔ آپ نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور پھر اس کو لوگوں کی طرف کرتے ہوئے کہا کہ اے اللہ تو گواہ رہ، اے اللہ تو گواہ رہ، اے اللہ تو گواہ رہ۔

دوسرا خطبہ

اے لوگو کیا تم جانتے ہو کہ تم کس مہینہ میں ہو اور تم کس دن میں ہو اور تم کس شہر میں ہو۔ لوگوں نے کہا کہ حرام دن اور حرام شہر اور حرام مہینے میں آپ نے فرمایا کہ تمہارے خون اور تمہارے مال اور تمہاری عزتیں تمہارے اوپر اسی طرح قیامت تک کے لیے حرام ہیں جس طرح تمہارا یہ دن، تمہارا یہ مہینہ اور تمہارا یہ شہر حرام ہے۔ پھر فرمایا، میری بات سنو اور اس کے مطابق زندگی گزارو۔ خبردار، ظلم نہ کرنا، خبردار، ظلم نہ کرنا۔ بے شک کسی مسلمان آدمی کا مال لینا جائز نہیں الا یہ کہ وہ راضی ہو۔ سنو، جاہلیت کا ہر خون اور مال اور شرف قیامت تک کے لیے میرے دونوں قدموں کے نیچے ہیں اور پہلا خون جو باطل کیا جاتا ہے وہ ربیعہ ابن حارث ابن عبد المطلب کا خون ہے۔ اس نے بنو سعد سے دودھ پلانے والی طلب کیا تھا۔ پھر ہذیل

نے اس کو قتل کر دیا۔ جاہلیت کے تمام سود باطل کئے گئے اور اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ پہلا سود جو باطل کیا جائے وہ عباس ابن عبدالمطلب کا سود ہے۔ تمہارے لیے تمہارا راس المال ہے نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تمہارے اوپر کوئی ظلم کیا جائے۔ سنو، زمانہ گھوم گیا (پس وہ آج) اسی نقطہ پر ہے جس دن کہ خدا نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: خدا کے نزدیک مہینوں کی گنتی بارہ مہینے ہیں، خدا کی کتاب میں، جس دن کہ اس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ ان میں سے چار مہینے محترم ہیں۔ یہی سیدھا دین ہے، پس تم ان میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔ سنو، میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ سنو، شیطان اس سے مایوس ہو چکا ہے کہ نماز پڑھنے والے اس کی عبادت کریں، لیکن آپس میں تم کو برانگیختہ کر کے وہ اپنا مقصد حاصل کرے گا۔ اور عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ کیونکہ وہ تمہاری دست نگر ہیں۔ وہ اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتیں اور تمہارے اوپر ان کا حق ہے اور ان کے اوپر تمہارا حق ہے، یہ کہ تمہارے بستر پر وہ تمہارے سوا کسی اور کو نہ آنے دیں اور نہ ایسے شخص کو تمہارے گھر میں آنے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو۔ پھر اگر تم ان سے نافرمانی کا اندیشہ محسوس کرو تو ان کو نصیحت کرو۔ اور ان کو خواب گاہوں میں چھوڑ دو اور ان کو ہلکی مار مارو۔ اور انہیں معروف طریقے پر کھانے اور کپڑے کا حق ہے۔ تم نے ان کو خدا کی امانت کے طور پر لیا ہے۔ اور ان کی شرمگاہوں کو اللہ کے کلمہ سے حلال کیا ہے۔ سنو، جس کے پاس کوئی امانت ہو تو وہ اس کو صاحب امانت کو واپس کر دے۔ اس کے بعد آپ نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور فرمایا، کیا میں نے پہونچا دیا، کیا میں نے پہونچا دیا۔ پھر آپ نے کہا جو حاضر ہے وہ غیر حاضر کو پہونچا دے کیونکہ بہت سے وہ لوگ جنہیں پہونچایا جائے وہ سننے والوں سے زیادہ خوش بخت ہوتے ہیں۔ (مسند احمد)

حج میں کیا نہ کریں

حج کے دنوں میں جو کچھ کرنا منع ہے وہ وہی ہے جس کو بقیہ دنوں میں بھی کرنا منع ہے۔ حج کے دوران میں ان کی ممانعت بطور تربیت ہے۔ حج میں شریعت کی ان ممنوعات پر مبالغہ کے ساتھ عمل کرایا جاتا ہے تاکہ ان کے بارے میں آدمی کا احساس تیز ہو اور بقیہ دنوں میں ان سے بچنے کی خصوصی استعداد اس کے اندر پیدا ہو جائے۔

انسان جب اپنے گھر اور کاروبار میں ہوتا ہے تو وہ اپنے ذاتی معاملات میں الجھا رہتا ہے اور اس سے آگے کی حقیقتوں کو بھول جاتا ہے۔ اس لئے آدمی کو روزانہ نماز کی ادائگی کے لئے مسجد میں لایا جاتا ہے تاکہ کچھ دیر کے لئے وہ اپنے ذاتی ماحول سے علیحدہ ہو اور اپنے ذہن کو غیر متعلق چیزوں سے خالی کر کے یکسوئی کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہو سکے۔ حج کے دنوں میں اسی مقصد کے لئے آدمی کو اس کے محدود ماحول سے نکال کر زیادہ لمبی مدت کے لئے حجاز (عرب) کے مختلف مقامات پر لے جایا جاتا ہے۔ حج کسی آدمی کے لئے اس کے دنیوی ماحول سے کامل علیحدگی کا نام ہے تاکہ وہ کامل یکسوئی کے ساتھ اپنے خدا کی طرف متوجہ ہو سکے۔

عرب کے ساتھ بہت سی عظیم دینی روایتیں وابستہ ہیں۔ اس بنا پر حج کے مراسم کی ادائگی کے لئے عرب کا جغرافیہ نہایت موزوں جغرافیہ ہے۔ یہاں کعبہ ہے جس کے بارے میں ہزاروں سال سے تقدس کی روایتیں قائم ہو چکی ہیں۔ یہاں پیغمبروں کی قربانی کی داستانیں لکھی گئی ہیں۔ یہاں خدا کے نیک بندوں پر خدا کے انعامات کی یادگاریں ہیں۔ یہ وہ زمین ہے جہاں خدا کے آخری رسول اور آپ کے اصحاب کی زندگیوں کے نشانات ثبت ہیں۔ اس قسم کی تاریخی نسبتوں نے حج کے مقامات کے ساتھ غیر معمولی تقدس اور احترام کی فضا وابستہ کر دی ہے۔ یہاں کے ماحول میں پہنچتے ہی آدمی کے ذہن میں ایک پوری دینی تاریخ جاگ اٹھتی ہے۔ یہاں بالکل قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی دینی حس میں اضافہ ہو جائے۔ وہ زیادہ سنجیدگی اور انہماک کے ساتھ خدا کے مقرر کئے ہوئے فرائض کو ادا کرنے لگے۔ اسی مخصوص تاریخی اہمیت کی بنا پر اس علاقہ کو خدا نے اس کے لئے چنا کہ یہاں اسلامی زندگی کے بارے میں ایک علامتی مشق (ریہرسل) کرائی جائے اور پھر آدمی کو دوبارہ اس کے سابقہ ماحول میں واپس لایا جائے تاکہ وہ زیادہ بہتر طور پر خدا پرستانہ زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے۔

حج کے زمانہ میں مخصوص مراسم کی ادائگی کے دوران حاجی کے لئے جو چیزیں منع ہیں ان میں سے تین خاص چیزوں کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

۱۔ زبان سے کسی شخص کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔

۲۔ کسی جانور کو نہ مارنا اور نہ اس کو زخمی کرنا۔

۳۔ لذت اور آرائش کی چیزوں سے پرہیز۔ مثلاً ناخن کاٹنا، بال سنوارنا، سلا ہوا کپڑا پہننا، خوشبو لگانا، ازدواجی تعلقات، وغیرہ

مل جل کر رہنے میں لوگوں کو ایک دوسرے کی جس چیز سے سب سے زیادہ سابقہ پیش آتا ہے وہ زبان ہے۔ ایک شخص کو دوسرے شخص سے سب زیادہ تکلیف زبان ہی سے پہنچتی ہے۔ حج کے زمانہ میں بیک وقت بہت سے لوگوں کا ساتھ ہو جانے کی وجہ سے بار بار یہ موقع آتا ہے کہ آدمی کی زبان بے قابو ہو جائے اور ایک مسلمان سے دوسرے مسلمان کو ٹھیس پہنچے۔ چنانچہ حج کے موسم کو خصوصیت سے اس کی تربیت کا ذریعہ بنا دیا گیا۔ زبان سے کسی کو تکلیف پہنچانا عام دنوں میں اسلامی اخلاقیات کا ایک جزء ہے۔ مگر حج کے دنوں میں اس کو اسلامی عبادات کا لازمی جزء بنا دیا گیا تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اہتمام کرکے اپنے کو اس سماجی برائی سے بچائیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: حج کے چند معلوم مہینے (شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ) ہیں۔ جو شخص ان مہینوں میں اپنے اوپر حج مقرر کرے تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہو اور نہ بدکلامی اور نہ جھگڑا اور تکرار کیا جائے (بقرہ ۱۹۷)

زبان سے دوسروں کو تکلیف پہنچانے کی یہی تین خاص صورتیں ہیں۔ آدمی فحش باتیں اپنی زبان سے نکالتا ہے جو دوسروں کے لئے دل خراشی کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ دوسرے کو برے الفاظ سے یاد کرتا ہے اور اس کے بارے میں نازیبا کلمات بول کر اس کو بے آبرو کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بات چیت کے دوران تکرار اور سخت کلامی پر اتر آتا ہے۔ یہ تمام چیزیں حج میں بالکل حرام کر دی گئیں۔ تاکہ ان کے بارے میں آدمی کی حساسیت بڑھ جائے اور جب وہ حج کے مقدس سفر سے لوٹے تو اس کے اثر سے اس کی زبان ہمیشہ کے لئے ان چیزوں سے محفوظ ہو چکی ہو۔

حج کے لئے احرام باندھنے کے بعد خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا حاجی کے لئے حرام ہے۔ حتیٰ کہ شکار کئے ہوئے جانور کا گوشت بطور ہدیہ قبول کرنا، پرندکا پر اکھاڑنا، شکار میں مدد دینا، شکار کے جانور کو ذبح کرنے کے لئے چھری دینا، وغیرہ سب حاجی کے لئے حرام ہیں۔

حج کے دوران میں حاجی کسی موذی جانور مثلاً سانپ کو مار سکتا ہے۔ یا وہ قربانی کے جانور کو ذبح کرتا ہے جو حج کے مراسم کا ایک جزء ہے۔ اس کے علاوہ کسی جانور کو مارنا یا اسے تکلیف دینا حرام ہے۔ جانور کا شکار عام حالات میں بالکل جائز ہے مگر حج کے دوران شکار کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ دراصل ایک شرعی حکم پر مبالغہ کے ساتھ عمل کرانا ہے۔ آدمی پر یہ فرض ہے کہ وہ انسان کو نہ مارے، وہ کسی جان دار کو نہ ستائے۔ یہ شریعت کا ایک عام حکم ہے جو ہر آدمی سے ہر حال میں مطلوب ہے، مگر حج کے دوران اس کو شکار کے جانوروں تک وسیع کر کے اس حکم کے بارے میں آدمی کے احساس کو تیز کیا جاتا ہے تاکہ حج سے واپسی کے بعد وہ زیادہ اہتمام کے ساتھ اس کی تعمیل کر سکے۔

اسلامی زندگی کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھ کر زندگی گزاری جائے۔ حج کے سفر کو اس قسم کی پابند زندگی کے لئے خصوصی تربیت کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ حج کی یہ حیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے: جس شخص نے حج کے مراسم اس طرح ادا کئے کہ مسلمان اس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے محفوظ رہے تو اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دئے جائیں گے (مَن قضیٰ نُسُکَہ وسَلِمَ المسلمون

بمن لسانہ ویدہ ، غفر لہ ما تقدم من ذنبہ ، تفسیر ابن کثیر ، سورۃ البقرہ) گویا حج کا فریضہ ادا کرتے ہوئے حاجی کو جس چیز سے خاص طور پر بچنا ہے وہ یہ کہ اس کی زبان سے کسی بندۂ خدا کے دل کو ٹھیس نہ لگے ۔ اس کے ہاتھ سے کسی انسان کو تکلیف نہ پہنچے ۔ جو حج آدمی کے تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے وہ وہی حج ہے جس سے آدمی اس قسم کی زبان اور اس قسم کا ہاتھ لے کر واپس آیا ہو۔

حج کے دوران لذت اور آرائش کی چیزوں کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ حج کا عمل احرام سے شروع ہوتا ہے ۔ احرام ایک سادہ لباس (ایک سفید تہبند اور ایک سفید چادر) ہے جو حرم کے حدود میں داخل ہوتے ہی ہر حاجی اور زائر کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ احرام گویا ایک قسم کا فقیرانہ لباس ہے جو زیارت کعبہ کے لئے پہنا جاتا ہے۔ یہ پہلی علامتی تدبیر ہے جس کے ذریعہ سے خدا اپنے بندوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ سارے انسان برابر ہیں ۔ جن ظاہری چیزوں کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں یا کسی کو اونچا یا کسی کو نیچا سمجھتے ہیں وہ سب خدا کی نظر میں سراسر باطل ہیں۔ خدا سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے حج کے زمانہ میں لاکھوں حاجی ایک قسم کا لباس پہننے کی وجہ سے بالکل ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا حج کا احرام اسلام کے اس اصول کا ایک عملی مظاہرہ ہے کہ سب انسان برابر ہیں۔ جو لوگ خدا کے اچھے بندے بننا چاہتے ہیں ان کے لئے لازم ہے کہ وہ ہر قسم کے دوسرے "لباس" اپنے اوپر سے اتار دیں اور سب مل کر ایک ہو جائیں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ حاجی کون ہے ۔ آپ نے فرمایا "پراگندہ بال اور غبار آلود" ان الفاظ میں اصلی حاجی کی تعریف بتائی گئی ہے۔ الجھے ہوئے بال اور گرد سے اٹا ہوا جسم با مقصد آدمی کی پہچان ہے۔ جب کوئی شخص پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنے آپ کو کسی خاص کام کے لئے وقف کر دے تو اس کو آرائش و زیبائش کی فرصت نہیں رہتی۔ حج میں بالقصد اس قسم کا حلیہ بنانے کا حکم گویا با مقصد زندگی گزارنے کا ایک تاکیدی سبق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خدائی مقصد میں اپنے آپ کو اس حد تک مشغول کرے کہ اس کو اپنے ظاہر کو بنانے اور سنوارنے کی سُدھ نہ رہے۔ وہ وقتی لذتوں کو بھول جائے۔ برتر مقصد کو پانے کی دھن میں اس کو اپنے ذاتی تقاضے یاد نہ رہیں۔

حج کا حکم دیتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے: اور تم سفر حج میں تقویٰ کا زاد راہ لو، بہترین زاد راہ تقویٰ کا زاد راہ ہے۔ اے عقل والو اللہ سے ڈرو (بقرہ ۱۹۷)

قدیم عرب میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ حج کے لئے زاد راہ لے کر نکلنا دنیا دارانہ فعل ہے، جو شخص حج کے لئے اس طرح نکلے کہ وہ دنیا کا سامان لئے بغیر حج کے سفر پر چل پڑا ہو وہ بڑا پارسا اور دین دار خیال کیا جاتا تھا۔ ایسے لوگ اپنے بارے میں کہتے کہ ہم متوکل ہیں (نحن المتوکلون) ہم خدا کے سوا کسی چیز پر بھروسہ نہیں کرتے۔ مگر قرآن میں یہ بتایا گیا کہ اس قسم کی ظاہری نمائش کا نام دین داری نہیں ہے۔ دین داری کا تعلق دل اور ذہن سے ہے نہ کہ کسی قسم کے خارجی مظاہرہ سے۔ آدمی کو جس چیز سے بچنا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا دل اور اس کا ذہن غیر اللہ کے ڈر سے خالی ہو، نہ یہ کہ اس کی جھولی میں کوئی کھانے پینے کا سامان نظر نہ آتا ہو۔

نوٹ: یہ تقریر ۱۴ ستمبر ۱۹۸۰ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

مسائل حج

حج اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ ہر مسلمان مرد و عورت پر استطاعت کی صورت میں ایک بار حج کرنا فرض ہے۔ حج کی ادائگی کے پانچ دن ہیں۔ ۸ ذی الحجہ سے ۱۲ ذی الحجہ تک۔

حج کے لئے جانے والے مکہ پہنچنے سے پہلے ایک مقررہ مقام پر احرام (حج کا لباس) پہنتے ہیں۔ اس مقام کو میقات کہا جاتا ہے۔ ہندستان اور پاکستان کے باشندوں کی میقات یلم لم کی پہاڑی ہے۔ مدینہ کی طرف سے آنے والوں کے لئے ذوالحلیفہ۔ کوفہ، بصرہ اور بغداد کی طرف سے آنے والوں کے لئے ذات عرق۔ ترکی اور شام کی طرف سے آنے والوں کے لئے مجحفہ ہے۔ مکہ پہنچنے سے پہلے میقات پر احرام باندھ لینا ضروری ہے۔

۸ ذی الحجہ کو یوم ترویہ بھی کہتے ہیں۔ اس تاریخ کو رات میں یا صبح کی نماز کے فوراً بعد غسل کر کے احرام کی ایک چادر تہمد کی طرح پہن لیں اور دوسری اوڑھ لیں۔ خوشبو لگائیں۔ حرم میں پہنچ کر کعبہ کا طواف کریں۔ مقام ابراہیم پر دو رکعت نفل نماز واجب الطواف پڑھیں۔ دعا اور استغفار کریں۔ اس کے بعد دو رکعت نماز احرام کی نیت سے ادا کریں۔ جب یہ نماز پڑھیں تو سر احرام کی چادر سے ڈھکا ہوا ہو۔ نماز پوری کر چکیں تو سر سے چادر ہٹالیں اور اس طرح نیت کریں:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ الْحَجَّ فَیَسِّرْہُ لِیْ وَتَقَبَّلْہُ مِنِّیْ

اے اللہ میں حج کا ارادہ کرتا ہوں، تو اس کو میرے لئے آسان کر دے اور میری جانب سے اس کو قبول فرما

احرام باندھنے سے لے کر حج ختم ہونے تک اٹھتے بیٹھتے اور حج کے ارکان ادا کرتے ہوئے بار بار

مندرجہ ذیل دعا پڑھی جاتی ہے جس کو تلبیہ کہتے ہیں۔ مرد بلند آواز سے تلبیہ کہیں اور عورتیں آہستہ آہستہ:
لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ، لَبَّیْكَ لَاشَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَاشَرِیْكَ لَكَ
حاضر ہوں، اے اللہ حاضر ہوں، حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، حاضر ہوں، سب تعریفیں اور نعمتیں تیرے لئے ہیں اور بادشاہی میں تیرا کوئی شریک نہیں۔

حج کے دوران ایک مرتبہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا واجب ہے۔ یہ سعی عرفات کی حاضری سے پہلے یا نفلی طواف یا طواف زیارت کے بعد کرسکتے ہیں۔ طواف زیارت (منیٰ سے واپسی کے بعد) کرنا افضل ہے۔ کمزور لوگ، ہجوم کے خیال سے پہلے ہی اس ذمہ داری سے سبک دوش ہوسکتے ہیں۔

طواف کعبہ کے سات چکر ہیں۔ پہلے حجر اسود کا استلام کریں۔ اس کے بعد اضطباع کریں۔ یعنی ابتدائی تین چکر میں چادر کو داہنے مونڈھے کے نیچے سے نکال کر دونوں کونوں کو بائیں مونڈھے پر ڈال لیں اور تیزی سے اکڑ کر چلیں جس کو رمل کہتے ہیں (عورتوں کو اضطباع اور رمل کی ضرورت نہیں) باقی چار پھیرے معمول کے مطابق کریں۔ طواف کے دوران دعا پڑھتے رہیں۔ آخر میں مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھیں۔ اس کے بعد ملتزم پر آئیں اور خوب دعا کریں۔

اس کے بعد زمزم پئیں اور دعا کریں۔ پھر سعی کے لئے باب الصفا سے ہوکر صفا کی طرف چلیں۔ اور پھر صفا سے مروہ کی طرف۔ اب سعی کا ایک پھیرا پورا ہوگیا۔ اسی طرح سات پھیرے صفا سے مروہ اور مروہ سے صفا تک کریں۔ اس سعی کے دوران تکبیر و تہلیل اور دعا کرتے رہنا چاہئے۔ سعی میں مردوں کو میلین اخضرین کے درمیان دوڑ کر چلنا چاہئے۔ سعی میں سات پھیرے اس طرح کریں کہ ساتواں پھیرا مروہ پر ختم ہو۔

۸ ذی الحجہ کی صبح کو اس کے بعد منیٰ کے لئے روانہ ہونا ہے۔ دوپہر سے پہلے وہاں پہنچ جائیں تاکہ وہاں ظہر کی نماز ادا کرسکیں۔ منیٰ میں مجموعی طور پر پانچ دن قیام کرنا ہے۔ منیٰ میں پہلے ۸ ذی الحجہ کی ظہر سے ۹ ذی الحجہ کی فجر تک پانچ نمازیں حتی الامکان مسجد خیف میں پڑھی جاتی ہیں۔ ۹ ذی الحجہ کو یہاں سے عرفات جانا ہے اور وہاں ٹھہرنا ہے۔ یہ وقوف عرفہ ہی حج کا رکن اعظم ہے۔ یہاں ظہر اور عصر کی نماز اکٹھا پڑھی جاتی ہے۔ عرفات سے ۹ ذی الحجہ کو واپس آکر رات کو مزدلفہ میں ٹھہرنا ہے۔ پھر ۱۰ ذی الحجہ کو طلوع آفتاب سے پہلے مزدلفہ سے چل کر دوبارہ منیٰ آنا ہے۔ اس تمام دوران میں تلبیہ اور دعائیں جاری رہنا چاہئیں۔ ایک دعا یہ ہے:
لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِیْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وَھُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ ساری بادشاہت اور ساری تعریف اسی کے لئے ہے۔ وہ زندگی دیتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے
غروب آفتاب تک میدان عرفات میں رہنا مسنون ہے۔ ۹ ذی الحجہ کو مغرب کی نماز میدان عرفات میں پڑھے بغیر مزدلفہ جانا ہے۔ مزدلفہ میں رات کو مغرب اور عشا کی نماز ملا کر پڑھنا ہے۔ اس سفر میں وادی محسّر کے سوا ہر جگہ ٹھہرنا ہے۔ ۱۰ ذی الحجہ ہی کو پھر منیٰ آنا ہے۔ مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان تین مقامات ہیں جن کو جمرۃ الاولیٰ، جمرۃ الوسطیٰ اور جمرۃ العقبہ کہتے ہیں۔ ان مقامات پر مختلف اوقات میں تین بار سات سات کنکریاں ماری جاتی ہیں۔

رمی کے بعد منیٰ میں قربانی کریں۔ قربانی کے بعد حلق یا تقصیر (سر کے بال پورے منڈانا یا ترشوانا) ہے۔ اس کے بعد غسل کر کے معمول کے مطابق کپڑے پہن لیں۔ قربانی کے لئے مذبح جانا پڑتا ہے۔ قافلہ کے دو تین افراد وکیل بن کر سب کی طرف سے قربانی کر سکتے ہیں۔ ہر حاجی کو مذبح جانا ضروری نہیں۔ حجامت کے بعد احرام کی پابندیاں بجز رفث کے اٹھ جاتی ہیں۔

اب حاجی کو طواف زیارت کرنا ہے۔ ۱۰ تاریخ کو ان سب سے فارغ ہو کر غروب آفتاب سے پہلے اگر طواف زیارت کے لئے مکہ جا کر واپس آسکتے ہوں تو بہتر ہے۔ ورنہ ۱۲ تاریخ کو غروب آفتاب تک یہ طواف کیا جا سکتا ہے۔ طواف زیارت کے وقت زیادہ سے زیادہ ذکر اور دعا میں مشغول رہنا چاہئے۔

طواف زیارت کے بعد پھر منیٰ واپس آنا ہے اور گیارہ اور بارہ دونوں تاریخوں میں جمرہ کی رمی کرنا ہے۔ کنکریاں مارتے ہوئے یہ کہنا چاہئے: رَجْمًا لِلشَّيْطَانِ وَرِضًا لِلرَّحْمٰنِ (شیطان کو مارنے کے لئے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے) منیٰ واپس آکر رمی کرتے وقت پہلے چھوٹے شیطان، پھر درمیان والے شیطان اور پھر بڑے شیطان پر کنکریاں ماریں۔ یہی مسنون طریقہ ہے۔ مزدلفہ سے واپسی پر تین راتیں منیٰ میں گزارنا سنت ہے۔ دو رات گزار کر ۱۲ ذی الحجہ کو غروب سے پہلے منیٰ سے جا سکتے ہیں۔

اب آپ حاجی ہو گئے۔ اس کے بعد جتنے دن مکہ میں قیام ہو، روزانہ کعبہ کا طواف اور دعا کیجئے، اور روانگی کے دن طواف وداع کر کے یہاں سے رخصت ہوئیے۔

مدینہ کی حاضری

مدینہ جانا، مسجد نبوی میں نماز پڑھنا اور روضۂ رسول پر درود پڑھنا اگرچہ حج کے ارکان و فرائض میں داخل نہیں۔ تاہم اس کا بہت ثواب ہے اور حاجی کو ضرور وہاں بھی حاضری دینا چاہئے۔ حاجی کو چاہئے

کہ طواف وداع کے بعد مکہ سے مدینہ کے لئے روانہ ہو۔

مدینہ کے سفر میں زبان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے زیادہ سے زیادہ صلوٰۃ وسلام جاری رہنا چاہیئے۔ مدینہ پہنچ کر غسل کرے اور مسجد نبوی میں داخل ہوکر دو رکعت نماز پڑھے اور اس کے بعد دعا کرے۔ نماز کے بعد ادب کے ساتھ مواجہہ شریف کی جالیوں کے پاس آئے اور صلوٰۃ وسلام پڑھے۔

مدینہ کے قیام کے زمانہ میں نمازیں زیادہ سے زیادہ مسجد نبوی میں ادا کرے۔

مسجد نبوی میں نماز اور درود سے فارغ ہوکر مدینہ کے ان مقامات کی زیارت کرنا چاہیئے جن سے اسلام کی تاریخ وابستہ ہے مثلاً جنت البقیع جہاں بہت سے صحابہ کرام دفن ہیں۔ مسجد قُبا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آکر پہلی نماز پڑھی۔ جبل احد جہاں اسلام اور غیر اسلام کی دوسری بڑی جنگ ہوئی، مسجد قبلتین جہاں عین حالت نماز میں تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا، وغیرہ۔

ممنوعات حج

احرام باندھنے کے بعد حاجی پر یہ چیزیں حرام ہوجاتی ہیں۔

۱۔ لڑائی جھگڑا کرنا۔

۲۔ جھوٹ بولنا۔

۳۔ غیبت اور برائی کرنا

۴۔ کسی کے اوپر تہمت لگانا

۵۔ گالی دینا، فحش باتیں کرنا، وغیرہ

نوٹ: یہ چیزیں ہر حال میں حرام ہیں مگر حج کے دوران ان کی شناعت بہت بڑھ جاتی ہے۔

۶۔ خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا، یا دوسروں کو شکار کی ترغیب دینا۔

۷۔ بدن کے کسی حصے کا بال منڈانا، ناخن اور مونچھیں وغیرہ کتروانا۔

۸۔ موزے پہننا، ایسے جوتے پہننا جن سے پاؤں کی درمیانی ہڈی چھپ جائے۔

۹۔ عمامہ باندھنا یا ٹوپی پہننا۔

۱۰۔ سلے ہوئے کپڑے پہننا۔

۱۱۔ خوشبو لگانا، تیل لگانا یا سونگھنا۔

۱۲۔ بیوی سے ہم صحبت ہونا یا لطف ومحبت کی باتیں کرنا۔

ترتیب حج

۱۔ گھر سے روانگی۔

۲۔ ۸ ذی الحجہ کو حدود میقات پر پہنچ کر احرام باندھنا۔

۳۔ غسل یا وضو کرکے شہر مکہ میں داخل ہونا۔

۴۔ مسجد حرام میں داخل ہونا اور خانہ کعبہ کا طواف مقرر طریقے پر کرنا۔

۵۔ طواف کے بعد صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا۔

۶۔ ۸ ذی الحجہ کو طواف قدوم کرکے منیٰ کے لئے روانگی۔

۷۔ ۹ ذی الحجہ کو عرفات میں جانا اور ظہر و عصر کی نماز ملا کر پڑھنا۔

۸۔ ۹ ذی الحجہ کی شب کو مزدلفہ پہنچ کر مغرب و عشاء کی نماز اکٹھا پڑھنا، رات کو وہاں قیام کرنا۔

۹۔ ۱۰ ذی الحجہ کو مزدلفہ سے چل کر منیٰ میں آنا، جمرات پر کنکریاں مارنا۔

۱۰۔ قربانی کرنا اور سر کے بال منڈانا۔

۱۱۔ ۱۰ ذی الحجہ کو سر منڈانے کے بعد مکہ جاکر طواف زیارت کرنا اور پھر منیٰ واپس آنا، اور اگر ۸ ذی الحجہ کو سعی نہ کی ہو تو صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا۔

۱۲۔ ۱۱-۱۲ ذی الحجہ کو منیٰ میں قیام۔ تینوں جمرات پر بالترتیب کنکریاں مارنا۔

۱۳۔ اب آپ حاجی ہو گئے۔ ۱۳ ذی الحجہ کو مکہ واپس جاکر طواف کیجئے اور آب زمزم پی کر خدا کا شکر ادا کیجئے۔

اصطلات حج

میقات	مکہ سے پہلے کا وہ مقام جہاں سے احرام باندھا جاتا ہے
احرام	حج یا عمرہ کی نیت کرکے خاص طرح کا سادہ لباس پہننا
تلبیہ	لبیک اللّٰھم لبیک والی دعا پڑھنا
تہلیل	لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھنا
طواف	خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگانا۔ طواف کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً طواف قدوم، طواف زیارت، طواف وداع۔

مطاف	خانہ کعبہ کے گرد کی وہ جگہ جہاں گھوم کر طواف کیا جاتا ہے۔
عمرہ	حج اصغر، یعنی احرام باندھ کر کعبہ کا طواف کرنا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا۔
حج افراد	صرف حج کا احرام باندھنا۔ وہ شخص مفرد ہے جو اس طرح احرام باندھے۔
قران	حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھنا۔ ایسا کرنے والے کو قارن کہتے ہیں۔
تمتع	حج کے زمانہ میں احرام باندھ کر عمرہ کرنا اور پھر کچھ دنوں کے لئے احرام کھول کر حج کے لئے دوبارہ احرام باندھنا۔ ایسے شخص کو متمتع کہا جاتا ہے۔
رمل	طواف کے وقت اکڑ کر چلنا اور کندھوں کو ہلانا۔
اضطباع	احرام کی دو چادروں میں سے اوپر والی چادر کو دائیں بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈالنا۔
سعی	صفا اور مروہ کے درمیان سات مرتبہ آنا جانا۔
میلین اخضرین	وہ سبز ستون جن کے درمیان سعی کرنے والے کو تیز چلنا ہوتا ہے۔
شوط	کعبہ کے گرد ایک چکر یا صفا و مروہ کے درمیان ایک چکر لگانے کو شوط کہتے ہیں۔
استلام	حجر اسود کو چھونا یا اس کا بوسہ لینا یا دونوں ہتھیلی کو اس طرف کرکے چومنا۔
وقوف	عرفات کے میدان میں اور مزدلفہ میں پہنچ کر کچھ دیر ٹھہرنا۔
رمی	جمرہ پر کنکریاں پھینکنا۔ جمرات تین ہیں: جمرۂ اولیٰ، جمرۂ وسطیٰ، جمرۂ عقبہ۔
تحلیق	قربانی کے بعد بال منڈانا،
تقصیر	قربانی کے بعد بال ترشوانا۔
آفاقی	وہ مسلمان جو حج کے لئے حدود میقات کے باہر سے آیا ہو۔
حطیم	خانہ کعبہ کا وہ حصہ جو پہلے اس کا جزء تھا مگر اب اس سے باہر ہے۔
حجر اسود	وہ پتھر جو کعبہ کے جنوب مشرقی کونے میں نصب ہے۔
منیٰ	ایک مقام جو مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔
مزدلفہ	عرفات اور منیٰ کے درمیان ایک میدان جو منیٰ سے بجانب مشرق دو میل کے فاصلہ پر ہے۔
اہل حل	وہ لوگ جو میقات کی حدود کے اندر اور حدود حرم سے باہر رہتے ہوں۔
اہل حرم	مکہ اور حرم میں بسنے والے لوگ۔
ہدی	وہ جانور جو قربانی کی نیت سے حاجی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔
تقلید	قربانی کے جانور کے گلے میں پٹہ باندھنا۔

رفث	بے ہودہ باتیں کرنا۔ ایسی باتیں ایام حج میں حرام ہیں۔
نحر	قربانی جو رمی کے بعد منیٰ میں کی جاتی ہے۔
وادیٔ محسّر	مزدلفہ کا ایک مقام جہاں ابرہہ کی فوج کو خدا نے تباہ کیا تھا۔
جمرات	جمرۂ اولیٰ، جمرۂ وسطیٰ، جمرۂ عقبہ۔ یہ تینوں مسجد خیف کے پاس ہیں۔
ملتزم	حجر اسود اور کعبہ کے دروازہ کے درمیان کی جگہ جہاں خصوصی دعا کی جاتی ہے۔
رکن یمانی	کعبہ کا چوتھا گوشہ جہاں سے حجر اسود کا استلام کر کے طواف شروع کیا جاتا ہے۔
مقام ابراہیم	وہ پتھر جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔
کفارہ	حج کی ادائگی میں غلطی کی تلافی کے لئے قربانی دینا یا صدقہ کرنا۔

مقامات حج

مکہ	عرب کا مشہور شہر جہاں حضرت ابراہیم نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی۔
مدینہ	اس کا قدیم نام یثرب تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے یہاں آئے تو اس کا نام مدینہ پڑ گیا۔
بدر	وہ مقام جہاں مخالفین اسلام کے ساتھ پہلی جنگ پیش آئی۔
حدیبیہ	وہ مقام جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے بیعت رضوان لی تھی۔
یلملم	ہندوستان، پاکستان، یمن وغیرہ کی طرف سے آنے والے حاجیوں کی میقات۔
جحفہ	موجودہ نام رابغ۔ یہ مصر، شام، یورپ وغیرہ کی طرف سے آنے والے حاجیوں کی میقات ہے۔
ذات عراق	یہ عراق کی طرف سے آنے والے حاجیوں کی میقات ہے۔
قرن المنازل	ایک پہاڑی۔ یہ نجد والوں کی میقات ہے۔
ذوالحلیفہ	موجودہ نام بئر علی۔ یہ مدینہ کی طرف سے آنے والوں کی میقات ہے۔
حراء	مکہ کے قریب ایک غار جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی اتری تھی۔
احد	مدینہ کے قریب ایک پہاڑ کا نام جہاں مشہور غزوۂ احد پیش آیا تھا۔
صفا	بیت اللہ کے قریب کی ایک پہاڑی جہاں سے حاجی لوگ سعی شروع کرتے ہیں۔
مروہ	ایک پہاڑی چٹان جہاں سعی ختم کی جاتی ہے۔
جبل نور	مکہ کے قریب ایک پہاڑ جس کے اوپر غار حراء واقع ہے۔

جبل ثور	ایک پہاڑ جس کے غار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے موقع پر تین رات قیام کیا
جبل رحمت	میدان عرفات کی پہاڑی جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کا خطبہ دیا تھا۔
جبل ثبیر	منیٰ میں واقع ایک پہاڑ کا نام ہے۔
جبل قزح	مزدلفہ میں واقع ایک پہاڑ کا نام ہے۔
جنت المعلیٰ	مکہ کا قبرستان، جس میں حضرت خدیجہؓ وغیرہ کی قبریں ہیں۔
جنت البقیع	مدینہ کا بڑا قبرستان۔
مسجد قبا	مدینہ کے قریب ایک مسجد جو اسلام میں سب سے پہلے بنائی گئی۔
مسجد قبلتین	وادی عقیق کے قریب کی ایک مسجد جس میں تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا۔
مسجد خیف	منیٰ میں واقع ایک مسجد۔ یہاں حاجی ۸ر ذی الحجہ کو قیام کرتے ہیں۔
مسجد نمرہ	عرفات کے کنارے ایک مسجد جہاں ۹ر ذی الحجہ کو ظہر وعصر کی نماز جمع کرکے پڑھی جاتی ہے
المساجد الخمسہ	مدینہ کی پانچ مسجدیں۔ کہا جاتا ہے کہ غزوۂ احزاب کے موقع پر یہیں خندق کھودی گئی تھی۔
مزدلفہ	منیٰ اور عرفات کے درمیان ایک میدان کا نام۔
مشعر الحرام	مزدلفہ میں ایک مقام جہاں وقوف کیا جاتا ہے۔
محسر	مزدلفہ سے ملا ہوا ایک میدان جہاں اصحاب فیل پر عذاب نازل ہوا تھا۔
بئر عثمان	یہ مدینہ کے قریب ایک قدیم کنواں ہے جو حضرت عثمان کی طرف منسوب ہے۔
منیٰ	ایک مقام کا نام۔ یہیں جمرات پر رمی کی جاتی ہے۔
عرفات	ایک بڑا میدان جہاں حاجی ۹ر ذی الحجہ کو قیام کرتے ہیں۔

Regd. No. D(SE) 243
Regd R.N. No. 28822/76

August 1985
No 105

AL-RISALA MONTHLY
C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

Rs 3.00

الرسالہ

زیر سرپرستی

مولانا وحیدالدین خان

صدر اسلامی مرکز

پانے کے لئے ہمیشہ کچھ کھونا پڑتا ہے

لوگ کھونے کے لئے تیار نہیں ہوتے

اسی لئے اکثر لوگ پانے والے نہیں بنتے

نومبر ۱۹۸۵ شمارہ ۱۰۸

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	30/-
تذکیر القرآن جلد اول	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاء اسلام	20/-
پیغمبر انقلاب	25/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	[illegible]
تجدید دین	4 -
اسلام دین فطرت	3
تعمیر ملت	3/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	[illegible]
عقلیات اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2 -
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	3/-
راہیں بند نہیں	3/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبر اسلام	2
حقیقت حج	4/-
آخری سفر	3/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-
حل یہاں ہے	3/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیات طیبہ	3/-
باغ جنت	3/-
نار جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عقل کا فیصلہ	
کاروان اسلام	
راز حیات	

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

نومبر ۱۹۸۵ شمارہ ۱۰۸

فہرست

کامیاب انسان

لی آئی کوکا (Lee Iacocca) کی پیدائش ۱۹۲۴ میں ہوئی ۔ ان کے والدین بہت غریب تھے اور وہ تلاش معاش میں اٹلی چھوڑ کر امریکہ چلے گئے ۔ آئی کوکا نے محنت سے تعلیم حاصل کی اور انجنیرنگ میں ماسٹر کی ڈگری لی ۔ تعلیم کے بعد مسٹر آئی کوکا کو فورڈ موٹر کمپنی میں ملازمت مل گئی ۔ وہ ترقی کرتے رہے ۔ یہاں تک کہ وہ فورڈ کمپنی کے پریزیڈنٹ ہو گیے ۔ اس کے بعد ہنری فورڈ دوم سے ان کا اختلاف ہو گیا ۔ ۱۹۷۸ میں انھیں فورڈ کمپنی چھوڑ دینا پڑا ۔

آئی کوکا کو ایک اور کمپنی کی صدارت مل گئی جس کا نام کرسلر کارپوریشن (Chrysler Corporation) ہے ۔ یہ کمپنی اس وقت بالکل دیوالیہ ہو گئی تھی ۔ آئی کوکا نے تین سال کی غیر معمولی محنت سے اس کو کامیابی کے ساتھ چلادیا ۔ حتی کہ اب وہ فخر کے ساتھ کہتے ہیں :

I am the company

آئی کوکا نے اپنی سوانح عمری لکھی ہے جس کا نام ہے *(Iacocca: An Autobiography)* اس خود نوشت سوانح عمری میں بہت سے قیمتی تجربات ہیں انھوں نے اپنے ایک تجربہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

> The key to success is not information. It's people. And the kind of people I look for to fill top management spots are the eager beavers. These are the guys who try to do more than they're expected to . . .

کامیابی کی کنجی معلومات اور ڈگریاں نہیں ہیں ۔ یہ دراصل افراد ہیں ۔ اور میں اپنی کمپنی کے بڑے عہدوں کے لیے جس قسم کے افراد کی تلاش میں رہتا ہوں وہ عمل کے شائق لوگ ہیں ۔ یہ وہ آدمی ہیں جو اس سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں جتنی ان سے کرنے کی امید کی گئی ہو ۔

(ٹائمس آف انڈیا ۲۲ ستمبر ۱۹۸۵)

امید سے زیادہ کام کرنا سنجیدہ اور باعمل آدمی کی قطعی پہچان ہے ۔ جو لوگ امید سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کریں وہی وہ لوگ ہیں جو اپنی زندگی میں امید سے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں ۔

انداز کلام

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بولنے کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ہمیشہ واضح انداز میں بولتے تھے اور الفاظ کو ٹھہر ٹھہر کر ادا فرماتے تھے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بعد کے زمانہ کے لوگوں سے فرمایا:

ما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یَسرُدُ کسردکم ھٰذا۔ ولکن یتکلم بکلام بین فصل یحفظہ مَن جلس الیہ (زاد المعاد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کی طرح تیز تیز نہیں بولتے تھے۔ بلکہ آپ کے کلام میں فصل ہوتا تھا، آپ کے پاس بیٹھا ہوا آدمی اس کو یاد کر لیتا تھا۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن یسرد الحدیث کسردکم۔ کان یحدث حدیثا لوعدّہ العادّ لاحصاہ (متفق علیہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح تیز تیز باتیں نہیں کرتے تھے جیسے تم کرتے ہو۔ آپ اس طرح بات کرتے تھے کہ اگر گننے والا گنے تو اس کو گن لے۔

مومن کا کلام ایک ایسے شخص کا کلام ہوتا ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہو۔ مومن کو یقین ہوتا ہے کہ اس کا ہر لفظ فرشتے لکھ رہے ہیں۔ وہ اپنے ہر قول کے لیے خدا کے یہاں جواب دہ ہونے والا ہے۔ مومن کا یہ یقین اس کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ وہ جب بولتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ خدا اور فرشتوں کے سامنے بول رہا ہے۔ یہ تصور اس کی زبان پر لگام لگا دیتا ہے۔ وہ بولنے سے پہلے سوچتا ہے۔ وہ جب بولتا ہے تو الفاظ تول کر اپنے منہ سے نکالتا ہے۔ خدا کا خوف اس سے تیز کلامی کا انداز چھین لیتا ہے۔ آخرت کی جواب دہی کا احساس اس کی جوش تقریر کے لیے رکاوٹ بن جاتا ہے۔

جو شخص اس قسم کے شدید احساسات سے دبا ہوا ہو وہ آخری حد تک سنجیدہ انسان بن جاتا ہے اور سنجیدہ انسان کی گفت گو کا انداز وہی ہوتا ہے جس کا نقشہ حضرت عائشہؓ کی مذکورہ روایت میں نظر آتا ہے۔

مشتعل نہ ہو

برٹرینڈرسل ایک انتہائی آزاد خیال آدمی تھا۔ وہ اکثر ایسی غیر روایتی باتیں کرتا تھا جس سے قدامت پسند طبقہ بگڑ جاتا۔ اپنے ایک لکچر کے دوران پیش آنے والا واقعہ وہ اس طرح نقل کرتا ہے:

A man rose in fury, remarking that I looked like a monkey; to which I replied, 'Then you will have the pleasure of hearing the voice of your ancestors'.

ایک آدمی طیش میں آکر کھڑا ہوگیا۔ اس نے کہا کہ میں ایک بندر دکھائی دیتا ہوں۔ میں نے اس کو جواب دیا: پھر تو آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آپ اپنے پرکھوں کی آواز سُن رہے ہیں ——— (آٹوبیاگرافی، صفحہ ۵۶۵)

برٹرینڈرسل کا یہ جواب نظریۂ ارتقاء کے پس منظر میں ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان بندر کی نسل سے ہے۔ تاہم یہاں ہم کو اس نظریہ کی صحت سے بحث نہیں۔ یہ واقعہ ہم نے اس لیے نقل کیا ہے کہ یہ غیر مشتعل انداز میں جواب دینے کی ایک اچھی مثال ہے۔ جب کوئی شخص آپ کے خلاف کوئی سخت جملہ کہے یا آپ پر تیز و تند تنقید کرے تو اس وقت ایک صورت یہ ہے کہ آپ اس کو سُن کر بگڑ جائیں اور اس کی سخت بات کا سخت اور شدید انداز میں جواب دیں۔ یہ جواب دینے کا غیر سنجیدہ طریقہ ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ اشتعال انگیز بات سن کر مشتعل نہ ہوں۔ کوئی شخص خواہ کتنی ہی سخت کلامی کرے آپ اپنے توازن کو باقی رکھیں۔ آپ کا جواب ردعمل کا جواب نہ ہو بلکہ مثبت طور پر سوچا سمجھا ہوا جواب ہو۔

جواب کا پہلا انداز صرف اشتعال میں اضافہ کرتا ہے۔ جب کہ دوسرا انداز اشتعال کو ٹھنڈا کرنے والا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آگ پر پانی ڈال دیا جائے۔

مزید یہ کہ دوسرا طریق جواب قائل کو خاموش کرنے کی بہترین تدبیر ہے۔ مذکورہ واقعہ میں برٹرینڈرسل کا جواب جتنا موثر ثابت ہوا وہ اس وقت کبھی اتنا موثر نہ ہوتا جب کہ برٹرینڈرسل نے ردعمل والا جواب دیا ہوتا۔

جھوٹا فخر

عبدالواحد ایک ادیٹر عمر کے چپراسی ہیں جو دہلی کے ایک اردو اخبار میں کام کرتے ہیں۔ ان کی تعلیم برائے نام ہے تاہم باتیں بہت دلچسپ کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے پوچھا کہ مسلمان اتنا زیادہ لڑتے جھگڑتے کیوں ہیں۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا:

مسلمان اپنے رعب میں رہتا ہے

یہ چھوٹا سا جملہ مسلمانوں کی نفسیات کی بہترین ترجمانی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے آپ کو سب سے اونچا سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی بڑائی میں گم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کی رعایت نہیں کرپاتے۔ وہ اس طرح عمل کرتے ہیں جیسے کہ دنیا میں صرف ان کا وجود ہے۔ ان کے سوا کسی اور کا کوئی وجود نہیں۔

اس نفسیات کے لیے دوسرا لفظ جھوٹا فخر ہے۔ یہی مسلمانوں کی اصل بیماری ہے۔ ان کے تمام مسائل جن میں وہ آج مبتلا ہیں اسی ایک چیز سے پیدا ہوئے ہیں۔

موجودہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں کوئی آدمی اپنی اہلیت کے بقدر اپنی قیمت پاتا ہے۔ ایسی دنیا میں جھوٹے فخر سے زیادہ قاتل کوئی چیز نہیں۔

جھوٹا فخر آدمی کو غیر حقیقت پسند بنا دیتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر سے عمل کا جذبہ چھین لیتا ہے جس شخص یا قوم کے اندر جھوٹا فخر پیدا ہو جائے اس کے اندر یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی کہ وہ دوسرے کے ہنر کا اعتراف کرے یا دوسروں کے ساتھ موافقت کرکے رہ سکے۔ ایسا آدمی "پدرم سلطان بود" اور "ہم چو من دیگرے نیست" کی نفسیات میں مبتلا رہتا ہے اور موجودہ دنیا میں بلاشبہ اس سے زیادہ ہلاکت خیز نفسیات اور کوئی نہیں۔

ایسے لوگوں کے لیے موجودہ دنیا میں صرف یہ مقدر ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں سے لڑتے رہیں۔ وہ احتجاج اور شکایت کی فضا سے کبھی باہر نہ آسکیں۔ اپنی ہر ناکامی کے لیے وہ صرف دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرائیں۔ وہ انھیں بے فائدہ مشغلوں میں مبتلا رہیں یہاں تک کہ مر کر قبر میں چلے جائیں۔

Speech Technology

You just say it and it will be done. That is not a sales line from any enthusiastic service retailer. Thanks to the advancement of "speech technology", the time has already come when machines can be expected to operate on just verbal command. Among domestic appliances today, some can turn off lights while other robots can use vacuum cleaners on being told to do so. Two kinds of telephones, which are already in the market in the United States, offer to place calls upon spoken commands like "call the office". Such products are reaching beyond the consumer sector. Speech chips are being used by the military, by doctors and by industries. At Chicago's international airport, luggage these days is routed to appropriate destinations by handlers calling out the name of the place to a computer that just sends the bag to the correct container.

Speech technology includes speech synthesis—or the science of teaching computer chips how to talk—and speech recognition—the science of teaching them to listen. Synthesising a voice is an easier task. Getting robots to listen has also progressed substantially, though speech chips today are generally dependent on particular speakers. In other words, they can be used by one person only. Research is going on to create a system that would respond to anyone's voice. If all this sounds like faddish gimmickry, it would be useful to listen to the voice of *Speech Technology magazine*. It estimates the industry's current size at $ 450 million, which may grow to $ 1 billion by 1990 in the United States. Meanwhile, the Japanese too are hard at work teaching their machines how to talk and listen.

The Times of India, September 6, 1985

Voice Commands

Since the dawn of the auto age 2,000 companies have produced nearly 5000 makes of cars in the U.S. But the theory of auto operation has changed little over the last century — most cars still run on the four-stroke interval-combustion engine design. But today's cars do ride more smoothly, use less fuel, last longer, handle and require less maintenance than those of 15 to 20 years ago. The biggest advance in cars comes in a small size — a microprocessor. Hidden in on-board computers in the latest cars, they regulate car operations and warn of malfunctions. Why, cars even talk today — and may be one day they'll even argue. Synthesized commands instruct or rebuke the driver: 'Please fasten your seat belts," "A door is ajar," "Your fuel is low." And you can talk to the cars too. The Ford Motor Company has developed a system by which voice commands turn on car lights, raise the antenna, start the windshield wiper, or activate other electrical systems.

Span monthly, May, 1984

کن فیکون

اس سے پہلے کسی مشین کو متحرک کرنے کے لیے ضروری ہوتا تھا کہ آدمی اپنا ہاتھ اس کی سوئچ تک لے جائے۔ سوئچ کو دبا کر ہی کسی مشین کو متحرک کیا جا سکتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں ایک نیا سائنسی شعبہ وجود میں آیا ہے جس کو اسپیچ ٹکنالوجی کہتے ہیں۔ یعنی بات چیت کی ٹکنالوجی۔ یہ ایک قسم کا مشینی کلام ہے۔ آپ اپنی زبان سے صرف لفظی حکم دیں اور مشین اپنا کام کرنے لگے گی۔ یہ فن اتنی تیزی سے ترقی کر رہا ہے کہ امریکہ میں مستقل میگزین نکل رہا ہے جس کا نام ہے اسپیچ ٹکنالوجی میگزین۔

گھریلو سامانوں میں ایسے سامان بنائے گیے ہیں کہ آپ اپنی زبان سے کہیں کہ روشنی بجھا دو اور مشینی نظام روشنی بجھا دے گا۔ آپ کو اپنے کمرے کی صفائی کرنا ہے۔ آپ مشینی انسان (روبوٹ) سے زبانی طور پر کہیں گے کہ کمرہ کی صفائی کر دو اور وہ مشینی جھاڑو کے ذریعہ کمرہ کی صفائی کرنے لگے گا۔

امریکہ کے بازار میں ایسے ٹیلی فون فروخت ہو رہے ہیں کہ آپ زبانی طور پر کہیں کہ فلاں جگہ کا نمبر ملاؤ اور وہ اپنے آپ وہاں کا نمبر ملا دے گا۔ شکاگو ایرپورٹ پر مختلف مقامات کے سامان کی تقسیم اس طرح کی جا رہی ہے کہ آدمی زبان سے جگہ کا نام لیتا ہے اور کمپیوٹر فوراً اس کو مذکورہ جگہ کے خانہ میں پہونچا دیتا ہے۔ تاہم اس قسم کی مشینیں ابھی اتنا زیادہ قیمتی ہیں کہ عام آدمی ان کی خریداری کا تحمل نہیں کر سکتا۔ صرف حکومتیں یا بڑے بڑے تجارتی ادارے ہی ان کو خرید کر اپنے یہاں رکھ سکتے ہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۲ ستمبر ۱۹۸۵)

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ جب کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے (النحل ۴۰) قدیم زمانہ کے انسان کو یہ بات قابل فہم نظر نہیں آتی تھی کہ لفظ بولنے سے کس طرح عملی واقعات ظہور میں آئیں گے۔ مگر آج اسپیچ ٹکنالوجی نے اس کو بالکل قابل فہم بنا دیا ہے۔ یہ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جو ایک بڑی حقیقت کا چھوٹی سطح پر مظاہرہ کر رہی ہے۔

امامت عالم کاراز

نومبر ۱۸۴۷ کی چار تاریخ تھی۔ اسکاٹ لینڈ کے ایک ڈاکٹر کے کمرہ میں اس کا ملازم داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر اور اس کے دو ساتھی اپنی کرسیوں سے گر کر فرش پر اوندھے منھ بے ہوش پڑے ہوئے ہیں۔ ملازم نے سمجھا کہ ان لوگوں نے شاید آج کوئی تیز قسم کی شراب پی لی ہے اس بنا پر ان کا یہ حال ہوا ہے۔ اس نے ان کے کپڑے درست کیے اور خاموشی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ مگر بات دوسری تھی۔ یہ دراصل سر جیمز سمپسن (۱۸۱۱-۱۸۷۰) اور ان کے دو اسسٹنٹ تھے۔ انھوں نے انسانی جسم پر کلوروفارم کے اثرات کا تجربہ کرنے کے لیے پہلی بار اس کو سانس کے ذریعہ اپنے اندر داخل کر لیا تھا۔

سمپسن ایک غریب نانبائی کے سات لڑکوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ چار سال کی عمر میں اس نے اپنے گاؤں کے اسکول میں تعلیم شروع کی۔ اس نے تعلیم میں اتنی دلچسپی دکھائی کہ اس کا باپ اور چچا بھائی اس پر راضی ہو گئے کہ خود انتہائی ضروری مصارف پر قناعت کر کے اس کو اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر بھیجیں۔ اس طرح وہ اڈنبرا یونیورسٹی پہونچا اور ڈاکٹری میں اس وقت کی سب سے اونچی ڈگری (ایم ڈی) حاصل کی۔

ڈاکٹر سمپسن کو اپنے مطالعہ کے دوران معلوم ہوا کہ کلوروفارم میں بے ہوش کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس نے اس کی تحقیق شروع کر دی۔ وہ اس نتیجے پر پہونچا کہ آپریشن کے وقت اگر مریض کو وقتی طور پر کلوروفارم کے ذریعہ بے ہوش کر دیا جائے تو اس کو چیر پھاڑ کی بھیانک تکلیف سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ اس نے اپنی تحقیق جاری رکھی۔ یہاں تک کہ خود اپنے آپ پر تجربہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ کلوروفارم تو بے ضرر بے ہوشی کے لیے کامیاب طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح غریب نانبائی کا یہ لڑکا انسان کو وہ چیز دے سکا جس کو ڈاکٹر براؤن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے —— دکھی انسانوں کے لیے خدا کا ایک بہترین تحفہ :

---- one of God's best gifts to his suffering children.

جدید دنیا میں مغرب کی امامت کا راز اس کے اسی قسم کے باحوصلہ افراد ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو کھویا تاکہ وہ انسانیت کو دیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالا تاکہ وہ دوسروں کو خطرہ سے بچا سکیں۔

پیغام

زندگی ایک امتحان ہے۔ یہ اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اور اسی حقیقت کو سمجھنے میں ہماری تمام کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے، خواہ وہ دنیا کی کامیابی ہو یا آخرت کی کامیابی۔

آخرت کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو دنیا میں جو کچھ ملا ہوا ہے وہ بطور آزمائش ہے نہ کہ بطور استحقاق۔ آدمی کو چاہیے کہ اس کو وہ اپنی ذاتی چیز نہ سمجھے بلکہ اس کو خدا کی چیز سمجھے۔ یہ چیزیں صرف اس وقت تک آدمی کے قبضہ میں ہیں جب تک اس کی مدت امتحان پوری نہ ہو۔ مدت پوری ہوتے ہی سب کچھ اس سے چھین لیا جائے گا۔ اس کے بعد آدمی کے پاس جو کچھ بچے گا وہ صرف اس کے اپنے اعمال ہوں گے نہ کہ وہ ساز و سامان جن کے درمیان آج وہ اپنے آپ کو پاتا ہے۔

دنیا کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جس طرح ایک شخص کو آزادی حاصل ہے اسی طرح یہاں دوسرے شخص کو بھی پوری آزادی حاصل ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے یہ دنیا اس چیز کا ایک میدان بن گئی ہے جس کو مقابلہ (Competition) کہا جاتا ہے۔ یہاں ہر آدمی آزاد ہے، اس لیے یہاں ہر ایک شخص اور دوسرے شخص یا ہر ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان کھلا مقابلہ جاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہر کامیابی دوسروں کے بالمقابل اپنے آپ کو کامیاب بنانے کا نام ہے۔ یہاں وہی شخص جیتتا ہے جو زندگی کے دوڑ میں دوسروں سے بازی لے جائے۔ یہاں اسی شخص کو ملتا ہے جو دوسروں سے آگے بڑھ کر لے لینے کا حوصلہ کر سکے۔

جن لوگوں کے پاس غیر اللہ کے سہارے ہوں وہ آخرت کی دنیا میں اپنے آپ کو بے قیمت پائیں گے۔ اسی طرح جو لوگ صرف تعصب اور امتیاز کی اصطلاحوں میں سوچنا جانتے ہوں وہ موجودہ دنیا میں بے جگہ ہو کر رہ جائیں گے، وہ مقابلہ کی اس دنیا میں اپنے لیے کوئی حقیقی مقام حاصل نہیں کر سکتے۔

بڑا کام

ولیم بلیک (William Blake) نے کہا ہے کہ عظیم کام اس وقت ہوتے ہیں جب کہ انسان اور پہاڑ ملتے ہیں۔ کوئی عظیم کام سڑک پر دھکم دھکا کرنے سے نہیں ہوتا:

Great things are done when men and mountains meet.
This is not done by jostling in the street.

ولیم بلیک کی یہ بات صد فی صد درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑے کام کے لیے بڑا عمل درکار ہوتا ہے۔ پہاڑوں کی کٹھن چڑھائی کے بعد آدمی چوٹی پر پہونچتا ہے۔ سڑکوں پر شور وغل کرنے یا جلسوں میں الفاظ کے دریا بہانے سے کوئی بڑا مقصد کبھی حاصل نہیں ہوتا۔

حقیقی معنوں میں کوئی بڑا انجام پانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ حالات کو انتہائی گہرائی کے ساتھ سمجھا جائے۔ اپنے وسائل اور خارجی امکانات کی پوری رعایت کرتے ہوئے منصوبہ بندی کی جائے۔ سفر شروع کیا جائے تو اس حقیقت کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے کیا جائے کہ راستہ میں دوسرے بہت سے مسافر بھی موجود ہیں۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی ہر وہ قربانی دے جو اس کا مقصد اس سے تقاضا کرے۔ کہیں وہ مال کی قربانی دے اور کہیں وقت کی۔ کہیں وہ رائے کی قربانی دے اور کہیں جذبات کی۔ کہیں وہ دوسروں سے نمٹے اور کہیں وہ خود اپنا احتساب کرے۔ کہیں وہ چلے اور کہیں شدید ہیجان کے باوجود رک جائے۔

پہاڑ کی چڑھائی جیسی محنت کیے بغیر کوئی بڑا کام انجام نہیں پاتا۔ ہر بڑا کام بڑی جدوجہد چاہتا ہے۔ ایسا کام جو آدمی کے مرنے کے بعد بھی اپنے مثبت اثرات باقی رکھے۔ ایسا کام جو مستقبل کی نقشہ گری کرنے والا ہو، ایسا کام جو تاریخ کے رُخ کو موڑ دے، بے پناہ محنت چاہتا ہے۔ ایسے کام کے لیے اتھاہ دانش مندی درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا کام وہی لوگ کر پاتے ہیں جو فی الواقع پہاڑ کی چڑھائی جیسے عمل کا ثبوت دیں۔ اس کے برعکس جو لوگ سڑکوں پر شور وغل کرنے کو کام سمجھیں وہ صرف اجتماعی کثافت میں اضافہ کرتے ہیں۔ وہ تاریخ کو کوئی حقیقی تحفہ دینے کی توفیق نہیں پاتے۔

جرأت مندی

احمد اور اقبال دونوں ایک ہی شہر میں رہتے تھے۔ احمد بی اے پاس تھا۔ جب کہ اقبال کی تعلیم صرف آٹھویں کلاس تک ہوئی تھی۔

ایک بار اقبال کو ایک سرکاری دفتر میں جانا تھا۔ وہ وہاں جانے لگا تو احمد بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ دونوں مذکورہ دفتر میں پہونچے۔ احمد نے دیکھا کہ اقبال وہاں مسلسل انگریزی بول رہا ہے۔ جب دونوں باہر نکلے تو احمد نے کہا کہ تم بالکل غلط سلط انگریزی بول رہے تھے۔ میں تو کبھی اس طرح بولنے کی ہمت نہیں کروں گا۔ اقبال کو احمد کے اس تبصرے سے کوئی شرمندگی نہیں ہوئی۔ اس نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا:

غلط بولو تاکہ تم صحیح بول سکو۔

اقبال نے مزید کہا کہ تم اگرچہ بی اے ہو اور میں کچھ بھی نہیں ہوں مگر دیکھ لینا کہ میں انگریزی بولنے لگوں گا اور تم کبھی بھی نہ بول سکوگے۔

اس واقعہ کو اب بیس سال ہو چکے ہیں۔ اقبال کے الفاظ صد فی صد صحیح ثابت ہوئے۔ احمد آج بھی وہیں ہے جہاں وہ بیس سال پہلے تھا۔ مگر اقبال نے اس مدت میں زبردست ترقی کی۔ وہ اب بے تکلف انگریزی بولتا ہے اور بہت کم ایسے لوگ ہیں جو اس کی گفتگو میں زبان کی غلطی پکڑ سکیں۔

اقبال کے اس جرأت مندانہ مزاج نے اس کو بہت فائدہ پہونچایا۔ اس سے پہلے شہر میں اس کی ایک معمولی دکان تھی۔ مگر آج اسی شہر میں اس کا ایک بڑا کارخانہ قائم ہے "غلط بولو تاکہ تم صحیح بول سکو" اس کے اپنے حق میں صد فی صد درست ثابت ہوا۔

اقبال کے اس طریقہ کا تعلق صرف زبان سے نہیں بلکہ زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ موجودہ دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو حوصلہ کے مالک ہوں، جو بے دھڑک آگے بڑھنے کی ہمت کر سکیں۔ جو خطرہ مول لے کر اقدام کرنے کی جرأت رکھتے ہوں۔ اس دنیا میں غلطی کرنے والا ہی صحیح کام کرتا ہے۔ جس کو یہ ڈر لگا ہوا ہے کہ کہیں اس سے غلطی نہ ہو جائے وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔ اس کے لیے آگے کی منزل پر پہونچنا مقدر نہیں۔

اقتصادی حملہ

ہوائی (Hawaii) بحرالکاہل کا جزیرہ ہے۔ اس کے ایک ساحلی مقام کا نام پرل ہاربر ہے۔ پرل ہاربر کو امریکہ نے ایک فوجی بندرگاہ کے طور پر ترقی دی۔ یہ بحرالکاہل میں امریکہ کا سب سے زیادہ مضبوط بحری اڈہ بن گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ۷ دسمبر ۱۹۴۱ کو جاپان نے پرل ہاربر پر بمبار ہوائی جہازوں سے حملہ کیا۔ اس وقت امریکہ کے تقریباً ایک سو جنگی جہاز یہاں موجود تھے۔ جاپانی بمباری نے ان میں سے اکثر کو تباہ کر دیا۔

اس کا بدلہ امریکہ نے اس طرح لیا کہ ۶ اگست ۱۹۴۵ کو اس نے دو ایٹم بم جاپان پر گرائے۔ جس کے نتیجہ میں جاپان کے دو اہم ترین صنعتی شہر بالکل تباہ ہو گیے۔ تاہم یہ دونوں شہر (ہیروشیما اور ناگاساکی) اب دوبارہ زیادہ شاندار طور پر تعمیر کر لیے گیے ہیں۔ ۱۹۴۵ میں وہ جاپان کی بربادی کی علامت تھے۔ ۱۹۸۵ میں وہ جاپان کی غیر معمولی ترقی کی علامت ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ جاپان کی مکمل شکست پر ہوا تھا۔ مزید یہ کہ امریکہ نے اس کے اوپر اپنی فوجی اور سیاسی بالادستی قائم کر لی۔ مگر جاپان نے حیرت انگیز طور پر اس کا ثبوت دیا کہ وہ اپنے آپ کو حالات کے مطابق بدل لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے وہ ہتھیاروں پر یقین رکھتا تھا مگر جنگ کے بعد اس نے خود اپنی مرضی سے ہتھیار الگ رکھ دیئے اور خالص پُرامن انداز میں اپنی نئی تعمیر شروع کر دی۔ جاپان نے لڑائی کے میدان کو چھوڑ دیا جو اس کے لیے بند ہو گیا تھا۔ اس نے تعمیر کے میدان کو اختیار کر لیا جو اب بھی اس کے لیے کھلا ہوا تھا۔

دوسری تدبیر پہلی تدبیر سے زیادہ کامیاب ہوئی۔ جاپان صنعت و تجارت میں اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ آج وہ دنیا کی دوسری سب سے بڑی اقتصادی طاقت سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ کے مقابلہ میں اس کا ٹریڈ سرپلس ۷۰ بلین ڈالر کے بقدر زیادہ ہے۔ جنگ کے فاتح امریکہ کو مفتوح جاپان نے اقتصادیات کے میدان میں شکست دے دی۔

اس صورت حال سے امریکہ کے لوگ بے حد پریشان ہیں۔ وہ جاپان کے موجودہ حملہ کو

قتصادی پرل ہاربر (Economic Pearl Harbour) کا نام دیتے ہیں۔ امریکہ میں ایک کتاب چھپی ہے جو اس وقت امریکہ اور جاپان میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب بن گئی ہے۔ اس کتاب کا نام ہے، جاپان نمبر ایک (Japan -- Number One)

اس کتاب میں دکھایا گیا ہے کہ جاپان اور امریکہ کے درمیان تجارت میں جاپان بہت زیادہ آگے بڑھ گیا ہے۔ اور عنقریب وہ برطانیہ سے بھی آگے بڑھ جانے والا ہے۔ بیرونی اثاثہ کے اعتبار سے جاپان آج دنیا کی سب سے زیادہ دولت مند قوم ہے۔ اس کا بیرونی اثاثہ ۱۹۸۴ کے آخر میں ۷۴ بلین ڈالر تھا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۳۔۱۴ جون ۱۹۸۵)

جاپان نے اپنی فوجی شکست کو اقتصادی فتح میں کس طرح تبدیل کیا۔ جواب یہ ہے کہ اس کا راز یہ تھا کہ جاپان نے ازسرنو وہاں سے اپنا سفر شروع کیا جہاں حالات نے اس کو پہونچا دیا تھا۔ اس نے اشتعال کے بجائے صبر کا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے ٹکراؤ کے میدان سے ہٹ کر پرامن میدان میں اپنی قوتوں کو استعمال کیا۔ جو امکان برباد ہو گیا تھا، وہ اس کا فریادی نہیں بنا۔ بلکہ جو امکان باقی رہ گیا تھا اس نے اپنی ساری توجہ اس پر لگا دی۔

خلاصہ یہ کہ جاپان نے دوسروں کو الزام دینے کے بجائے اپنے آپ کو الزام دیا اور اس کے بعد فوراً اس کی نئی تاریخ بننا شروع ہو گئی جو اس وقت تک نہ رکی جب تک وہ تکمیل کی حد کو نہ پہونچ گئی۔

آپ اس دنیا میں اکیلے نہیں ہیں بلکہ یہاں دوسرے بہت سے لوگ بھی ہیں۔ اور وہ سب بڑھنے اور غالب ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس صورت حال کے مقابلہ میں آپ کا طریقہ دو قسم کا ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ جہاں کوئی دوسرا آپ کو اپنی راہ میں حائل نظر آئے وہاں آپ اس سے لڑنا شروع کر دیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ٹکراؤ سے بچ کر اپنی مثبت تعمیر کرنے کی کوشش کریں۔

تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں صرف دوسرا طریقہ کامیاب طریقہ ہے۔ اس کے برعکس پہلا طریقہ صرف بربادی کا طریقہ ہے۔ سمندری جہاز کو اگر چلتے ہوئے راستہ میں چٹان مل جائے تو وہ اس سے کترا کر نکل جاتا ہے۔ اور جو جہاز اس سے لڑ کر جانا چاہے وہ ٹوٹ کر ختم ہو جاتا ہے۔ ایسے جہاز کے لیے منزل پر پہونچنا مقدر نہیں۔

تکرار نہیں

مسٹر جوگندر سنگھ ایم اے پیدائش (۱۹۲۴) نے ۹ جولائی ۱۹۸۵ کی ملاقات میں اپنا ایک واقعہ بیان کیا۔ وہ ۱۹۵۶ میں پروفیسر ایس۔ پی۔ کنال کے طالب علم تھے۔ موصوف کا خاص مضمون یونانی فلسفہ تھا۔ وہ ۳۰ سال تک یہی مضمون پڑھاتے رہے اور دہلی یونیورسٹی سے ریڈر ہوکر ریٹائر ہوئے۔

مسٹر جوگندر سنگھ نے بتایا کہ پروفیسر ایس۔ پی۔ کنال کی ملازمت کے آخری دنوں میں ایک بار وہ ان سے ملے۔ جب وہ پروفیسر موصوف کے گھر پہونچے تو انھوں نے دیکھا کہ وہ یونانی فلسفہ پر ایک کتاب پڑھ رہے ہیں۔

مسٹر جوگندر سنگھ کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا۔ انھوں نے اپنے استاد سے کہا: آپ نے تو یونانی فلسفہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ پھر اسی مضمون کو آپ ۳۰ سال سے برابر پڑھا رہے ہیں۔ اب تو آپ کو وہ سب یاد ہوگیا ہوگا۔ پھر آپ اب بھی کیوں اسی مضمون کو پڑھ رہے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے جواب دیا:

Every successive reading gives me a new thought

ہر اگلا مطالعہ مجھ کو نیا فکر دیتا ہے۔

اگر آدمی کا شعور بیدار ہو، اگر اس کے ذہن میں جاگ پیدا ہو چکی ہو تو اس کا مطالعہ صرف انھیں محدود الفاظ کا مطالعہ نہیں ہوتا جن کو اس نے کاغذ کے صفحہ پر پڑھا ہے۔ پڑھنے کے دوران اس کا اپنا ذہن مزید غیر مکتوب پہلوؤں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ وہ جتنا پڑھتا ہے اس سے زیادہ وہ اپنے لیے حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح اس کا مطالعہ مسلسل اس کے علم کو بڑھاتا رہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "تکرار" کی شکایت صرف وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس اپنی طرف سے شامل کرنے کے لیے کچھ نہ ہو۔ جن کے پاس اپنی طرف سے شامل کرنے کے لیے ہو وہ ایک ہی چیز کو بار بار پڑھ کر بھی نہیں اکتاتے۔ کیوں کہ ہر بار مطالعہ سے وہ نئی چیز حاصل کر لیتے ہیں۔

الٹی خوراک

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لئے سارے عالم اسلام میں کوششیں کی
ہیں۔ یہ کوششیں ماضی کی تمام احیائی کوششوں کی مجموعی مقدار سے بھی زیادہ ہیں۔ اس کے
ہود نتیجہ بالکل صفر ہے۔ شاندار کوششوں کے بے شان انجام کی یہ ایسی مثال ہے جس کی کوئی
سری نظیر ساری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس عظیم ناکامی کی وجہ اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ ہوگی "الٹی خوراک" یعنی مسلمانوں
د وبارہ متحرک کرنے کے لئے ان کے اندر جو مزاج بنانا تھا، اس کے برعکس دوسرا مزاج ان کے اند
گیا۔ چنانچہ مصلحین کی تمام کوششیں اور قربانیاں اصل مقصد کے اعتبار سے رائیگاں ہو کر
ئیں۔

موجودہ زمانہ کے مصلحین نے ملت کی اصلاح کے لئے جو طریقے اختیار کئے وہ ظاہری طور پر
ایک دوسرے سے مختلف تھے مگر ان سب کا خلاصہ صرف ایک تھا۔ انھوں نے ملت کے احساس
ابھارا۔

ہمارے مصلحین نے ماضی کی عظمت کو یاد دلاکر حال میں دوبارہ عظیم بننے کا پیغام دیا — ہمارا
سب سے زیادہ کامل ہے، ہمارا رسول سب سے زیادہ افضل ہے، ہماری تاریخ سب سے
شاندار ہے۔ ہماری شریعت سب سے زیادہ اعلیٰ ہے، ہمارے اکابر سب سے زیادہ باکمال
۔ ہماری امت تمام امتوں میں خیر الامم ہے۔ یہی وہ فکری غذا ہے جو موجودہ زمانہ کے تمام
لحین نے ایک انداز سے یا دوسرے انداز سے دی ہے۔ اس میں غالباً کسی مصلح کا کوئی استثنار
یں۔

اس قسم کی باتوں کا نتیجہ موجودہ حالات میں صرف ایک ہی ہو سکتا تھا اور وہی ہوا۔ اور وہ ہے
ٹا احساس فخر۔ ایک زوال یافتہ قوم کے لئے جھوٹے فخر کی غذا ہمیشہ سب سے زیادہ مرغوب غذا
ی ہے۔ چنانچہ قوم کی قوم ان رہنماؤں کے پیچھے دوڑ پڑی۔ مگر قوم کی موجودہ حالت میں یہ خوراک
کے لئے الٹی خوراک ثابت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف ہمارے شاعروں اور خطیبوں کے

الفاظ سے زمین و آسمان بھر رہے ہیں، دوسری طرف قوم جہاں تھی وہیں بدستور پڑی ہوئی ہے۔ وہ ایک قدم آگے نہ بڑھ سکی۔

حقیقت واقعہ تو یہ تھا کہ قوم زندگی کے دوڑ میں پچھڑ گئی تھی۔ وہ ہر میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے ہوگئی تھی۔ ایسی حالت میں اصل ضرورت یہ تھی کہ کھونے کا احساس دلا کر اس کے اندر پانے کا جذبہ بیدار کیا جائے۔ اس کے برعکس مذکورہ قسم کی باتوں نے یہ کیا کہ جن چیزوں کو ہم نے واقعہ ہی کھو دیا تھا ان سے وراثتی رشتہ جوڑ کر ان کو اپنے خانہ میں لکھ لیا۔ جو چیز واقعاتی اعتبار سے اپنی نہ تھی اس کو وراثتی اعتبار سے اپنی بنا لیا۔ یہی وہ چیز ہے جس کو کسی نے "پدرم سلطان بود" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اور حقائق کی اس دنیا میں پدرم سلطان بود سے زیادہ بری نفسیات اور کوئی نہیں۔

انسان کا اصل سرمایہ عجز ہے نہ کہ بڑائی۔ فخر اور بڑائی کی نفسیات پیدا کرنا گویا انسان کو غذا والی خوراک دینا ہے۔ خدائی غذا پر انسان کی تعمیر کرنا ہے۔ اس قسم کی الٹی خوراک صرف ایسے انسان پیدا کر سکتی تھی جو جھوٹے جنون عظمت (Paranoia) میں مبتلا ہوں۔ اور جھوٹا جنون عظمت ذلت اور بربادی کے سوا اور کہیں آدمی کو نہیں پہنچاتا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصل بیماری، ایک لفظ میں، جھوٹا فخر ہے۔ یہ عین وہی بیماری ہے جو بعد کے زمانہ میں یہود کے اندر پیدا ہوئی۔ اور اب وہ مسلمانوں میں پوری شدت کے ساتھ پیدا ہو چکی ہے۔

فخر کی نفسیات دینی لحاظ سے بھی غلط ہے اور دنیاوی لحاظ سے بھی۔ دینی لحاظ سے اس کی غلطی یہ ہے کہ خدائے ذوالجلال پر ایمان آدمی کے اندر تواضع کا مزاج پیدا کرتا ہے اور فخر کا مزاج عین اس کا ضد ہے۔

دنیا کے لحاظ سے اس کی غلطی یہ ہے کہ یہ دنیا اسباب کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو اس کے عمل کے بقدر حصہ ملتا ہے۔ مگر فخر کی نفسیات عمل اور جدوجہد کی قاتل ہے۔ ایسا آدمی کبھی عمل کے تقاضے پورے نہیں کرتا اور جب قانون قدرت کے مطابق ناکام ہوتا ہے تو دوسروں کی شکایت کرتا ہے۔ وہ پانے سے بھی محروم رہتا ہے اور جاننے سے بھی۔

آدم و ابلیس کا قصہ

اسلام میں زندگی کا جو تصور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کو امتحان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ہر آدمی جو اس دنیا میں آتا ہے وہ اس لیے آتا ہے کہ وہ یہاں لوگوں کے درمیان رہ کر امتحان دے اور پھر اپنے عمل کے مطابق اپنا انجام پانے کے لیے دوبارہ خدا کے یہاں چلا جائے۔

آدمی کا امتحان کس چیز میں ہے، اس کو آدم اور ابلیس کے قصہ میں بتایا گیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان (آدم) کو پیدا کیا تو فرشتوں سے اور ابلیس سے کہا کہ اس کے آگے جھک جاؤ۔ فرشتے فوراً خدا کے حکم کے مطابق آدم کے سامنے جھک گئے۔ مگر ابلیس جھکنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس نے کہا کہ تو نے آدم کو مٹی سے بنایا ہے اور مجھ کو آگ سے بنایا ہے۔ اس لیے میں آدم سے بہتر ہوں۔ میں آدم کے آگے نہیں جھکوں گا۔

اس وقت خدا نے آدم اور ابلیس دونوں کو زمین پر بھیج دیا۔ ابلیس نے کہا کہ میں آدم کی تمام نسل کو بہکاؤں گا۔ خدا نے کہا کہ: آدم کی اولاد میں جو لوگ تیری راہ چلیں گے تو میں تجھ کو اور ان کو سب کو دوزخ میں ڈال دوں گا (فمن تبعك منهم لأملئن جهنم منك ومن الناس اجمعين)

اب دیکھئے کہ ابلیس کی وہ راہ کیا تھی جس پر وہ چلا۔ وہ یہ تھی کہ اس کے اندر آدم کے مقابلہ میں بڑائی کی نفسیات آگئی (انا خیر منه) اس نے سمجھا کہ میں آدم سے بہتر ہوں اس لیے میں آدم کے مقابلہ میں نہیں جھکوں گا۔ میں آدم کا احترام نہیں کروں گا۔

دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کا معاملہ دوسرے شخص سے پڑتا ہے۔ اب اگر آپ ایسا کریں کہ سامنے کا آدمی جب آپ کو اونچا اور طاقت ور دکھائی دے تو آپ اس کا لحاظ کریں اور اس کا حق اسے دیں۔ اور جب سامنے کا آدمی نیچا اور کمزور نظر آئے تو اس کو نظر انداز کریں اور اس کا حق ادا کرنے سے انکار کردیں۔ اگر آپ ایسا کریں تو یہ شیطانی طریقہ کی پیروی کرنا ہوگا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ آپ کا سلوک معلوم اصولوں کا پابند ہو۔ آپ ہر حال میں انھیں اعلیٰ اصولوں کی پابندی کریں، خواہ دوسرا فریق اونچا دکھائی دیتا ہو یا نیچا۔ خواہ وہ کمزور ہو یا طاقت ور۔

ایمان

قرآن میں ساتویں پارہ کے شروع میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو نجران سے آئے تھے۔ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قرآن کا کچھ حصہ سنا۔ ان پر کھل گیا کہ یہ دین برحق ہے وہ اسی وقت ایمان لائے اور روتے ہوئے سجدے میں گر پڑے، واذا سمعوا ما انزل الی الرسول ترٰی اعینھم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق یقولون ربنا اٰمنا فاکتبنا مع الشاھدین (المائدہ ۸۳)

اس آیت میں ایمان کو معرفت کہا گیا ہے (مما عرفوا من الحق) یعنی حق کو پہچان لینا۔ جس چیز کی پہچان ہو اسی کے لحاظ سے آدمی کے اندر تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ خدا چوں کہ سب سے بڑی طاقت ہے اس لیے خدا کی پہچان سے آدمی کے اندر عجز اور تضرع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ نجران کے لوگوں میں جب خدا کی معرفت پیدا ہوئی۔ جب ان پر خدا کی عظمت منکشف ہوئی تو ان کا سینہ پھٹ گیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ بے اختیار ہو کر سجدے میں گر پڑے۔

اسی طرح صحیح مسلم میں ایک روایت ہے جو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے نقل ہوئی ہے۔ وہ کہتے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من مات وھو یعلم انہ لا الٰہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ (جو شخص اس حال میں مرا کہ وہ جانتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ جنت میں داخل ہوگا)

اس حدیث میں ایمان کو علم کہا گیا ہے۔ یعنی جاننا، آگاہ ہونا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان ایک جاننے کا واقعہ ہے۔ وہ ایک شعوری دریافت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان اسی قسم کا ایک گہرا تجربہ ہے جس کو موجودہ زمانہ میں ڈسکوری (دریافت) کہا جاتا ہے۔ ایمان ایک ڈسکوری ہے۔ ایمان ایک ایسی ہستی کی موجودگی کو پا لینا ہے جو بظاہر ہمارے سامنے موجود نہیں۔ ایمان اس گہرے ادراک کا نام ہے جب کہ آدمی کے لیے غیب کا پردہ پھٹ جاتا ہے اور وہ خدا کو نہ دیکھتے ہوئے بھی اسے دیکھنے لگتا ہے۔

ایمان بندے اور خدا کے درمیان اس اتصال کا قائم ہونا ہے جس کی ایک مادی مثال بلب اور پاور ہاؤس کے اتصال کی صورت میں ملتی ہے۔ بلب کا تعلق جب پاور ہاؤس سے قائم ہوتا ہے تو وہ اچانک چمک اٹھتا ہے، وہ وہ ہو جاتا ہے جو وہ پہلے نہیں تھا۔ اس کا اندھیرا اُجالے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک بندہ جب اپنے رب کو حقیقی معنوں میں پا تا ہے تو اس کی ہستی خدا کے نور سے جگمگا اٹھتی ہے۔ اس کے اندر ایسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو اس کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتے ہیں۔

صحابہ کرام کے لیے ایمان کا مطلب یہی تھا۔ صحابہ کرام کا ایمان ان کے لیے ایک زندگی سے نکل کر دوسری زندگی میں داخل ہونا تھا۔ یہ ان کے لیے تاریکی کے مقابلے میں روشنی کی دریافت تھی۔ حضرت حذیفہ ایک بار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کر رہے تھے تو ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: یارسول اللہ کنا فی جاھلیۃ وشر فجاءنا اللہ بھذا الخیر (اے اللہ کے رسول۔ ہم جاہلیت اور شر میں تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس خیر کو لے آیا)

اس طرح جو ایمان ملتا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو روایتی یا تقلیدی طور پر کسی آدمی کو مل جائے۔ تقلیدی ایمان آدمی کو متحرک نہیں کرتا جب کہ معرفت والا ایمان آدمی کو دائمی طور پر متحرک کر دیتا ہے۔ تقلیدی ایمان سے آدمی کے اندر کوئی ذاتی نگاہ پیدا نہیں ہوتی۔ جب کہ معرفت والا ایمان آدمی کے اندر ذاتی نگاہ پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ چیزوں کو دیکھے اور خود اپنی بصیرت سے فیصلہ کر سکے۔

تقلیدی ایمان سے صرف جامد عقیدہ پیدا ہوتا ہے۔ جب کہ معرفت والا ایمان آدمی کے اندر انقلاب بن کر داخل ہوتا ہے، وہ آدمی کے فکر و عمل کی دنیا میں ایک ہیجان پیدا کرتا ہے۔ تقلیدی ایمان سے بے جان افراد پیدا ہوتے ہیں۔ جب کہ معرفت والے ایمان سے جاندار افراد ظہور میں آتے ہیں۔ اور جاندار افراد ہی وہ لوگ ہیں جو کہ تاریخ بناتے ہیں۔ جو انسانیت کے لیے کوئی نیا مستقبل ظہور میں لاتے ہیں۔

تقلیدی ایمان آدمی کو اپنی قوم سے ملتا ہے اور معرفت والا ایمان براہ راست اللہ تعالیٰ سے۔

مسلمان بھی

قدیم مکہ کے مشرکین اپنے آپ کو حضرت ابراہیم سے منسوب کرتے تھے۔ مگر انھوں نے قرآن کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ قرآن حضرت ابراہیم ہی کی اصل تعلیمات لے کر آیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرکین کی نظر میں حضرت ابراہیم کی وہ تصویر بسی ہوئی تھی جو ان کی قومی روایات کے ذریعہ بنی تھی۔ چوں کہ ان کی روایتی تصویر اور قرآن کی تصویر میں فرق تھا۔ اس لیے وہ قرآن کی اہمیت سمجھنے سے قاصر رہے۔

یہی معاملہ یہود و نصاریٰ کا تھا۔ یہود حضرت موسیٰ پر فخر کرتے تھے اور نصاریٰ حضرت مسیح پر۔ مگر دونوں نے قرآن کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حالاں کہ قرآن کی تعلیمات عین وہی تھیں جن کو لے کر حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح بھیجے گئے تھے۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی روایات میں حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح کی تصویر اس سے مختلف بنا رکھی تھی جو قرآن میں تھی۔ وہ دونوں میں مطابقت نہ پا سکے اس لیے وہ قرآن کے منکر بن گئے۔

یہی معاملہ مسلمانوں کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین اگرچہ قرآن اور سنت کی صورت میں پوری طرح محفوظ ہے۔ مگر عین ممکن ہے کہ آپ کے بعد مسلمانوں کے درمیان ان کی جو قومی روایات جمع ہوں ان میں پیغمبر اور قرآنی تعلیم کی تصویر بگڑ کر کچھ سے کچھ ہو جائے۔ ایسی حالت میں جب قرآن کا بے آمیز دین ان کے سامنے پیش کیا جائے گا تو وہ اس کو اپنے مانوس قومی دین کے مطابق نہ پائیں گے اور اس بنا پر قرآنی دعوت کو ماننے سے انکار کر دیں گے۔ مسلمانوں کا اپنا بنایا ہوا دین ان کے لیے اصل اسلام کو سمجھنے میں اسی طرح رکاوٹ بن جائے گا جس طرح پچھلی قوموں کے لیے ان کا خود ساختہ دین رکاوٹ بن گیا تھا۔

مسلمانوں کے اپنے روایتی دین میں اگر ظواہر عبادت کی اہمیت ہو جائے تو وہ ایسی دعوت کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے جو حقیقت عبادت پر زور دے رہی ہو۔ مسلمانوں کے ذہن پر اگر اپنے اکابر کی عظمت چھا جائے تو خدائی عظمت کی باتیں ان کے ذوق کو اجنبی معلوم ہوں گی۔ مسلمانوں کے درمیان اگر تقلیدی مذہب کا رواج ہو جائے تو ایسی آواز ان کو غیر مانوس معلوم ہوگی جو براہِ راست قرآن و سنت سے دین اخذ کرنے کی تلقین کر رہی ہو۔

تاریخ سے

راجر دوم (۱۱۵۴ - ۱۰۹۵) سسلی کا بادشاہ تھا۔ وہ نارمن سلطنت کا بانی تھا۔ قرون وسطیٰ کے مغربی بادشاہوں میں اس کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس کا دارالسلطنت پلرمو (Palermo) تھا۔ راجر دوم نے سسلی کو ایک خوش حال ملک بنا دیا۔ ایک مضبوط انتظامیہ قائم کی۔ طاقت ور بحری بیڑہ تیار کیا۔ راجر دوم کو یہ کامیابی، ایک مغربی مورخ کے الفاظ میں، اس لیے ملی کہ اس نے سسلی کو یورپی اور عربی علماء کا مرکز بنا دیا تھا:

Roger made Sicily a meeting place of European and Arabic scholars. (VIII/634)

الادریسی اسی راجر دوم کا ہم عصر تھا۔ وہ مراکش میں پیدا ہوا۔ اس نے اسپین کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ایشیا اور افریقہ اور یورپ کے سفر کیے۔ وہ علم جغرافیہ میں اپنے وقت کا سب سے بڑا ماہر تھا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ راجر دوم نے الادریسی کو سسلی بلایا تاکہ اس کے لیے وہ دنیا کا ایک نقشہ بنائے۔ الادریسی راجر دوم کا ایک قریبی دوست اور مشیر تھا۔ سسلی کے اس نارمن بادشاہ کے دربار میں الادریسی سرکاری جغرافیہ داں کے طور پر رہا:

Al-Idrisi was a close friend and adviser to Roger II, at whose court he served as official geographer. Roger II invited Al-Idrisi to Sicily to make a map of the world for him. (9/198)

گزرے ہوئے زمانہ میں مسلمانوں کو جو اونچا مقام ملا اور انھوں نے ساری دنیا میں اسلام کا جو غلبہ قائم کیا، اس کا راز یہی تھا۔ یہ عظمت انھیں نہ احتجاج اور مطالبہ سے ملی اور نہ تیر اور تلوار سے۔ یہ عظمت انھیں صرف اس لیے ملی کہ وہ دنیا کے لیے مفید بنے۔ انھوں نے علوم وفنون میں اتنی ترقی کی کہ وہ دنیا کے فکری امام بن گیے۔ انھوں نے صدیوں تک انسانیت کی علمی رہنمائی کی۔ انھوں نے دنیا کو وہ دیا جو دنیا کے پاس موجود نہ تھا۔ یہی امامت کا راز ہے ماضی کے لیے بھی اور حال اور مستقبل کے لیے بھی۔

اختلاف رائے

حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ دو سردار خلیفہ اول کے پاس ئے۔ ان کا نام عُیَینَہ بن حِصن اور اقرع بن حابس تھا۔ ان دونوں کو فتح ہوازن کے بعد سو سو نٹ دیئے گیے تھے۔ انھوں نے حضرت ابوبکر سے ایک زمین طلب کی۔ آپ نے تالیف قلب ہ لیے انھیں یہ زمین دیدی اور ان کے لیے باقاعدہ ایک تحریر لکھ دی۔ عیینہ اور اقرع نے چاہا دوسرے بڑے صحابہ کی تصدیق بھی اس عطیہ کے حق میں حاصل کرلیں۔ اس سلسلہ میں وہ ضرت عمر فاروق کے پاس گیے۔ حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کے فرمان کو لے کر پاڑ دیا :

ءعيينة والاقرع يطلبان ارضًا الى ، بكر فكتب له الخط فمزّقه عمر قال هذا شئ كان رسول الله صلى الله ليه وسلم يعطيكموه ليتألفكم على لاسلام والآن فقد اعزّ الله الاسلام إغنىٰ عنكم. فرجعوا الى ابى بكر قالوا الخليفة انت ام عمر فقال و ان شاء ووافقه

(التفسير المظهري ، جلد ۴ ، صفحہ ۲۳۶)

عیینہ اور اقرع حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور ایک زمین طلب کیا۔ آپ نے ان کے حق میں ایک تحریر لکھ دی۔ پھر حضرت عمر نے اس تحریر کو پھاڑ دیا۔ اور کہا کہ یہ وہ چیز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کو تالیف قلب کے طور پر دیتے تھے۔ مگر اب اللہ نے اسلام کو طاقتور بنا دیا ہے اور تم سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ لوگ حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور کہا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمر۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا، وہی ہیں اگر وہ چاہیں اور انھوں نے حضرت عمر کی رائے سے اتفاق کیا۔

یہ واقعہ تنقید کی ایک نہایت شدید مثال ہے۔ مگر اس شدید تنقید کو نہ تو حضرت بوبکر نے بُرا مانا اور نہ صحابہ نے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں تنقید اور اختلاف رائے کی کتنی زیادہ آزادی دی گئی ہے۔

دو مثالیں

دمشق کی مسلم خلافت جس زمانہ میں ولید بن عبد الملک اموی کے ہاتھ میں تھی۔ خلیفہ کی طرف سے موسیٰ بن نصیر شمالی افریقہ کے حاکم تھے۔ اسپین میں مسلمانوں کا داخلہ انھیں موسیٰ بن نصیر کی ماتحتی میں انجام پایا۔ موسیٰ بن نصیر نے اولاً معلومات حاصل کرنے کے لیے سردار طریف کو ۵۰۰ آدمیوں کے ساتھ اسپین بھیجا۔ سردار طریف کی واپسی کے بعد طارق بن زیاد (ایک بربری غلام) کی سرداری میں سات ہزار کا لشکر روانہ کیا گیا۔ یہ لوگ مراکش کے ساحل سے کشتیوں پر روانہ ہوئے اور تقریباً دس میل کا سمندری سفر طے کرکے اسپین کے ساحل پر اتر گئے۔

طارق بن زیاد کو اسپین میں داخل ہوتے ہی ایک بڑی فوج سے سابقہ پیش آیا۔ طارق ابن زیاد کے ساتھ صرف سات ہزار آدمی تھے اور دوسری طرف ایک لاکھ کی فوج جو ہر لحاظ سے زیادہ مسلح اور زیادہ بہتر حالت میں تھی۔ ۲۸ رمضان ۹۲ھ (جولائی ۷۱۱ء) کو دونوں فوجوں کے درمیان مقابلہ ہوا۔ اس درمیان میں مزید ۵ ہزار فوج طارق کی مدد کے لیے مرکز سے آگئی۔ بارہ ہزار مسلمانوں نے ایک لاکھ عیسائیوں سے نہایت بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا اور ان کے اوپر فتح حاصل کی۔ اس طرح طارق ابن زیاد نے اسپین میں مسلم سلطنت کی بنیاد رکھی۔

طارق بن زیاد نے فتح کی خبر اپنے امیر موسیٰ بن نصیر کے پاس روانہ کی۔ امیر موسیٰ بن نصیر نے اس کے جواب میں طارق بن زیاد کو لکھا کہ تم نے ملک کا جتنا حصہ فتح کیا ہے اسی پر قائم رہو اور اس سے آگے مت بڑھو۔ اس کے بعد موسیٰ بن نصیر ۱۸ ہزار فوج کے ساتھ اسپین کی طرف روانہ ہوئے۔

امیر موسیٰ بن نصیر کا مذکورہ خط طارق بن زیاد کو ملا تو ان کی اور ان کے ساتھیوں کی رائے یہ ہوئی کہ اس وقت پیش قدمی سے رکنا درست نہیں ہے۔ ہم کو آگے بڑھ کر ملک کے بقیہ حصوں کو بھی فتح کرنا چاہیے ورنہ عیسائی طاقتیں اکٹھا ہو کر ہمارے اوپر حملہ کر دیں گی اور ہمارے لیے موجودہ قبضہ کو باقی رکھنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ طارق بن زیاد نے امیر کے مشورہ کے خلاف اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور قرطبہ اور طلیطلہ وغیرہ علاقے فتح کر ڈالے۔

امیر موسیٰ جب اسپین پہونچے تو وہ یہ دیکھ کر سخت ناراض ہو گئے کہ طارق نے ان کے حکم کی پروا

ین کی اور پیش قدمی جاری رکھی۔ امیر موسیٰ نے طارق کو اس حکم عدولی پر قید کر دیا۔ تاہم یہ صرف ایک ہری کارروائی تھی جو انھوں نے اس لیے کی کہ دوسرے سرداروں کو یہ سبق ہو جائے کہ ماتحت ے لیے افسر کے حکم کی تعمیل کرنا ضروری ہے، وہ دل سے طارق کی بہادری اور حسن کارکردگی پر خوش تھے انچہ وقتی تنبیہ کے بعد امیر موسیٰ نے طارق کی اس طرح قدردانی کی کہ ان کو اسپین کی تمام افواج کا پہ سالار بنا دیا۔

یہ صورت جو طارق بن زیاد کے ساتھ پیش آئی تھی یہی جلد ہی بعد خود موسیٰ بن نصیر کے ساتھ بھی پیش ئی۔ خلیفہ ولید بن عبد الملک کو جب موسیٰ بن نصیر کی فتوحات کا علم ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ موسیٰ ن نصیر اسپین کو فتح کر کے فرانس میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو خلیفہ نے موسیٰ بن نصیر کو لکھا کہ تم یورپ میں زید پیش قدمی نہ کرو اور بلا تاخیر دمشق واپس آجاؤ۔ خلیفہ کے اس حکم کی تعمیل میں موسیٰ بن نصیر اندلس سے دمشق کی طرف روانہ ہوئے۔ انھوں نے اندلس کی حکومت اپنے لڑکے عبد العزیز کے سپرد کی اور کثیر ال غنیمت اور سونے چاندی کے ساتھ روانہ ہو کر مراکش اور مصر ہوتے ہوئے شام پہونچے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں خلیفہ ولید بن عبد الملک سخت بیمار ہو گیا جو اس کے لیے مرض الموت ثابت ہوا۔ ولید بن عبد الملک کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبد الملک تخت پر بیٹھنے والا تھا۔ سلیمان کو جب یہ معلوم ہوا کہ موسیٰ بن نصیر کثیر اموال کے ساتھ شام پہونچ گیے ہیں تو اس نے موسیٰ کے پاس پیغام بھیجا کہ تم ابھی باہر رُکے رہو اور دمشق میں داخل ہونے میں جلدی نہ کرو۔ سلیمان بن عبد الملک کا منشا یہ تھا کہ خلیفہ ولید کی وفات کے بعد امیر موسیٰ دمشق آئیں اور اسپین کا مال غنیمت میرے خلیفہ بننے کے بعد دربار میں لایا جائے۔ اس طرح میری تخت نشینی کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ مگر امیر موسیٰ سلیمان بن عبد الملک کے اس پیغام کی رعایت نہ کر سکے اور وہ تیزی سے سفر کر کے دمشق پہونچ گیے۔

امیر موسیٰ کے دربار میں حاضری کے صرف چند دن بعد خلیفہ ولید بن عبد الملک کی وفات ہو گئی اور ۱۶ جمادی الثانی ۹۶ھ کو سلیمان بن عبد الملک خلیفہ قرار پایا۔ سلیمان بن عبد الملک کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ امیر موسیٰ کی حکم عدولی کو حسن نیت پر محمول کر کے معاف کر دے۔ مگر وہ ان کو معاف نہ کر سکا۔ اس نے امیر موسیٰ کے ساتھ سخت سلوک کیا حتیٰ کہ ان کو قید میں ڈال دیا۔ موسیٰ بن نصیر شدید مایوسی اور ناکامی کے عالم میں اگلے ہی سال ۹۷ھ میں وفات پاگیے۔ بوقت وفات ان کی عمر ۷۸ سال تھی۔

تزکیہ

قرآن میں پیغمبر کے دو خاص کام بتائے گئے ہیں ــــــــ تعلیم کتاب اور تزکیہ۔ تعلیم کتاب سے مراد قرآن کی تعلیم ہے۔ یعنی خدائی متن کو فرشتہ سے لے کر انسانوں تک پہنچانا۔ دوسری چیز تزکیہ ہے۔ تزکیہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں ایجوکیٹ کرنا یا باشعور بنانا کہا جاتا ہے۔ یعنی لوگوں کے فکر کو ربانی فکر بنانا۔ ان کی ذہنی تربیت کر کے انھیں اس قابل بنانا کہ وہ اس طرح سوچیں جس طرح خدا چاہتا ہے کہ سوچا جائے۔ اور اس طرح فیصلہ کریں جس طرح خدا چاہتا ہے کہ فیصلہ کیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم مصلحین اٹھے ان میں مشترک طور پر یہ بنیادی خامی پائی جاتی ہے کہ انھوں نے "تزکیہ" سے اپنے کام کا آغاز نہیں کیا۔ تقریباً ہر ایک کا یہ حال ہوا کہ مسلمانوں کے کچھ احوال اس کے سامنے آئے اور ان کو دیکھ کر وہ پر جوش طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ ذہن بنائے بغیر اس نے عملی اقدامات شروع کر دئے ــــــ کسی نے انگریزی استعمار سے بگڑ کر جہاد آزادی کا نعرہ لگا دیا۔ کوئی مغربی تہذیب کے غلبہ کو دیکھ کر میدان عمل میں آگیا۔ کسی کو "شردھانند" کے قتل کے بعد پیدا ہونے والے حالات نے مجاہد اسلام بنا دیا۔ کوئی شدھی سنگھٹن کی تحریک سے بے چین ہو کر سرگرم عمل ہو گیا۔ کسی کو مسلم خلافت کے زوال نے جان دینے پر آمادہ کر دیا۔ وغیرہ

یہ سب کام کا غیر پیغمبرانہ طریقہ ہے۔ کام کا پیغمبرانہ طریقہ یہ ہے کہ اس کو تزکیہ سے شروع کیا جائے نہ کہ اقدام سے۔

تزکیہ کا ایک مطلب یہ ہے کہ افراد کو دین کا صحیح علم حاصل ہو جائے۔ وہ صحیح دینی انداز میں سوچنا جان لیں۔ ان کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ غیر اسلامی نقطۂ نظر کے مقابلے میں اسلامی نقطۂ نظر کو پہچان سکیں۔ وہ مختلف قسم کے حالات میں یہ فیصلہ کر سکیں کہ کس وقت انھیں کیا کرنا ہے اور کس وقت انھیں کیا نہیں کرنا ہے۔

تزکیہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ افراد کے اندر زمانہ شناسی کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ وہ جان لیں کہ دنیا کے حالات کیا ہیں اور ان حالات میں دین کو کس طرح منطبق کیا جا سکتا ہے۔

گھمنڈ کا نقصان

ٹائمس آف انڈیا (۲۱ جولائی ۱۹۸۵) نے لتا منگیشکر کا ایک انٹرویو شائع کیا ہے۔ یہ انٹرویو نیویارک میں لیا گیا تھا۔ لتا منگیشکر ہندستان کی مشہور ترین خاتون سنگر ہیں۔ انٹرویور نے ان سے کہا کہ آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ کی مقبولیت نے آپ کو مغرور بنا دیا ہے۔ خاتون سنگر نے اس کا جو جواب دیا وہ اخبار کے الفاظ میں یہ تھا :

Surely. I'm no tyrant. I cannot afford to be nasty or arrogant. The day that happens — and I assure you it never will — there would be no sweetness in my music.

یقینی طور پر میں مغرور نہیں ہوں۔ میں بدطینت اور مغرور ہونے کا تحمل نہیں کر سکتی۔ جس دن ایسا ہوگا، اور میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اس دن میرے گانے میں کوئی مٹھاس باقی نہیں رہے گی۔

یہ اگرچہ ایک سنگر کی بات ہے مگر سنگر نے اس میں ایک بڑی اہم حقیقت بیان کر دی ہے۔ یہ حقیقت ایک داعی کے لیے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی ایک سنگر کے لیے۔

انسان کا اصل حسن تواضع ہے نہ کہ گھمنڈ۔ گھمنڈ کرنے والے آدمی کی صورت بگڑ جاتی ہے۔ مگر جو شخص تواضع اختیار کرے اس کے اندر اپنے آپ ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ متکبر کی آواز کڑوی آواز ہوتی ہے اور متواضع انسان کی آواز میٹھی آواز۔

خدا کا داعی خدا کے گیت گانے والا ہوتا ہے۔ وہ انسانی زبان میں ابدی حقیقت کے نغمے بکھیرتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کا سینہ تواضع اور رمزتا سے بھرا ہوا ہو۔ اس نے اپنے آپ کو انا کے جذبہ سے خالی کر رکھا ہو۔ جس شخص میں یہ بات ہوگی اسی کی زبان سے وہ میٹھے بول نکلیں گے جو لوگوں کو تڑپائیں۔ وہی وہ گیت چھیڑ سکے گا جو روحوں میں وجد پیدا کر دیں۔ سچائی کی عظمت کو وہی شخص بیان کر سکتا ہے جس کا دل ذاتی عظمت سے اس طرح خالی ہو جائے کہ وہ ذاتی عظمت کے احساس کا تحمل نہ کر سکے۔

نکاح وطلاق

ایک مرد اور ایک عورت جب اپنے آپ کو نکاح کے رشتہ میں وابستہ کرتے ہیں تو ہمیشہ اسی جذبہ کے تحت وابستہ کرتے ہیں کہ دونوں ساری عمر ایک ساتھ رہیں گے اور ایک ساتھ زندگی گزاریں گے۔ اس کے بعد جب قدرت ان کے درمیان ایک بچہ پیدا کرتی ہے تو یہ گویا ایک قسم کی زنجیر ہوتی ہے جو اس بات کی ضمانت ہوتی ہے کہ دونوں زیادہ گہرائی اور پائداری کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو چکے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں مغربی ملکوں کے اعداد وشمار کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ بے اولاد جوڑوں میں طلاق کا رجحان اس سے زیادہ پایا گیا جتنا کہ ان جوڑوں میں جو صاحب اولاد ہیں:

Childless couples tend to have a higher divorce rate than couples with children. (7/163-64)

ایک مغربی جج نے اپنے فیصلہ میں اس فطری حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا کہ ہر چھوٹا بچہ جو ایک جوڑے کے یہاں پیدا ہو وہ ایک مزید ضمانت ہے کہ ان کی شادی کسی طلاق کی عدالت میں کبھی ختم نہ ہوگی:

Every little youngster born to a couple is an added assurance that their marriage will never be dissolved in a divorce court.

تاہم اس قسم کی تمام فطری اور نفسیاتی بندھنوں کے باوجود کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مرد یا عورت یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے علحدہ ہو جانا چاہیے۔ قدیم زمانہ میں یہ صورت حال بہت کم پیش آتی تھی۔ مگر موجودہ زمانہ میں، خاص طور پر مغربی ملکوں میں، طلاقوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

طلاق زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ مگر طلاق کی کثرت بلاشبہ ایک تہذیبی ہے جو موجودہ زمانہ میں مختلف اسباب کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک سبب عورتوں کے روزگار کی آسانی بھی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ صنعتی دور نے عورتوں کے لیے یہ بات زیادہ آسان کر دی کہ وہ اپنی معاشش خود حاصل کر سکیں، خواہ وہ تنہا ہوں یا شادی شدہ

ہوں یا مطلقہ ہوں یا بیوہ ہوں۔ اس سلسلہ میں یہ بات دل چسپی کے ساتھ نوٹ کرنے کی ہے کہ ۱۹۳۰ کے بعد کے زمانہ میں پیدا ہونے والی عظیم کساد بازاری نے امریکہ میں طلاقوں کے اضافہ کی تعداد کو ایک عرصہ کے لیے روک دیا تھا:

Industrialization has made it easier for women to support themselves, whether they are single, married, divorced, or widowed. In this connection, it is interesting to note that the Great Depression of the 1930s stopped the rise in the number of divorces in the United States for a time. (7/163)

طلاق کا حکم

نکاح کا مسئلہ زندگی کا اصل مسئلہ ہے جب کہ طلاق کا مسئلہ صرف ایک استثناء ہے۔ تاہم چوں کہ ایسا استثناء بار بار پیش آتا ہے اس لیے الٰہی قانون اور وضعی قانون دونوں میں اس کی بابت احکام مقرر کیے گیے ہیں۔

الٰہی شریعت کی صحیح اور کامل نمائندگی اب صرف وہ ہے جو قرآن کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ کیوں کہ قرآن ایک محفوظ کتاب ہے۔ قرآن میں، اور اسی طرح اس کی مستند شرح کے طور پر سنت میں، طلاق کی بابت بہت سے احکام دیے گیے ہیں۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ —— طلاق انتہائی ناگزیر حالات میں دی جائے۔ چنانچہ حدیث میں اس کو البغض المباحات (سب سے زیادہ ناپسندیدہ حلال) کہا گیا ہے۔ اور دوسری چیز یہ کہ جب طلاق کا معاملہ کیا جائے تو اس طرح کیا جائے کہ دونوں عزت اور شرافت کے ساتھ علیحدہ ہو جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ایک یا دوسرے کے اندر ضد کی نفسیات پیدا ہو جائے اور وہ فریق ثانی کو بے عزت یا بے سہارا کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

قرآن میں طلاق کے حکم کے ذیل میں ارشاد ہوا ہے: وسرحوهن سراحاً جميلاً (الاحزاب ۴۹) یعنی جب انھیں طلاق دے کر رخصت کرو تو بھلے طریقہ سے اور شریفانہ انداز سے رخصت کرو۔

متاع کا مطلب

طلاق کے احکام میں سے ایک حکم وہ ہے جس کے لیے قرآن میں "متاع" کا لفظ آیا ہے۔ اس سلسلہ میں سورہ البقرہ کی دو آیتیں حسب ذیل ہیں:

لاجناح علیکم ان طلقتم النساء مالم تمسوهن او تفرضوا لهن فریضة ومتعوهن على الموسع قدره وعلى المقتر قدره متاعاً بالمعروف حقا على المحسنين (۲۳۶)

وللمطلقات متاع بالمعروف حقاً على المتقين (۲۴۱)

تم پر کچھ گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو اس وقت طلاق دو کہ ان کو تم نے ہاتھ نہ لگایا ہو اور ان کے لیے کچھ مہر مقرر نہ کیا ہو۔ اور ان کو کچھ دو، وسعت والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر اس کے موافق ہے، دستور کے مطابق۔ لازم ہے نیکی کرنے والوں پر ...... اور طلاق دی ہوئی عورتوں کو فائدہ دینا ہے دستور کے موافق۔ لازم ہے پرہیزگاروں کے لیے۔

فقہی تفصیلات سے قطع نظر، پہلی آیت (۲۳۶) کا سادہ مطلب یہ ہے کہ نکاح کے وقت اگر مہر نہیں ٹھہرایا گیا تھا اور نہ مرد نے عورت کو ہاتھ لگایا تھا، اور اس سے پہلے مرد نے طلاق دیدیا تو مرد پر لازم ہے کہ عورت کو رخصت کرتے ہوئے اسے کچھ دے۔ یہ دینا اپنی حیثیت کے مطابق ہوگا۔ ایسی صورت میں مہر دینا لازم نہیں۔

دوسری آیت (۲۴۱) میں یہی حکم عمومی انداز میں طلاق کے تمام واقعات کے لیے ہے۔ جب بھی کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے تو آخری علحدگی کے وقت اس کو چاہیے کہ حسن جدائی کی علامت کے طور پر عورت کو کچھ دے۔ مثلاً کپڑا یا اور کوئی چیز۔ بعض فقہار کے نزدیک پہلی صورت میں "متاع" دینا ضروری ہے۔ جب کہ دوسری صورت میں متاع دینا صرف مستحب ہے۔

مزاج شریعت

اس آیت کے سلسلہ میں فقہار کے درمیان ضمنی اختلافات ہیں۔ تاہم یہ بات تمام فقہار کے درمیان متفق علیہ ہے کہ اس کا تعلق اس مسئلہ سے ہے کہ طلاق واقع ہونے کے بعد وقتی طور سابق بیوی سے کیا سلوک کیا جائے۔ اس مسئلے سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں ہے کہ طلاق اور علحدگی کی تکمیل کے باوجود مطلقہ عورت کو مرد کی طرف سے مستقل گذارہ (Maintenance) دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دوسرا تصور تمام تر جدید تہذیب کی پیداوار ہے۔ یہ تصور کبھی بھی الٰہی شریعت میں نہیں پایا گیا ہے۔ نہ اسلام میں اور نہ اسلام سے پہلے کی آسمانی شریعتوں میں۔ مسلم فقہار

کے درمیان آیت کے عملی انطباق کے سلسلہ میں بہت کچھ جزئی اختلافات ہیں۔ مگر فقہا میں سے کسی کی بھی یہ رائے نہیں ... اس آیت کے تحت مرد کے اوپر لازم ہے کہ وہ باقاعدہ طلاق واقع ہونے کے بعد بھی مستقل طور پر اپنی سابقہ بیوی کو گذارہ دیتا رہے۔ ایک شخص بطور خود اس قسم کا خیال ظاہر کرے۔ مگر قرآن یا حدیث کے اندر اس کے حق میں کوئی دلیل یا ماخذ موجود نہیں۔ اور نہ اسلامی فقہا میں سے کسی بھی فقیہہ کی یہ رائے ہے۔

اسلامی فقہ میں اسی لیے اس متعہ کو متعہ طلاق کہتے ہیں نہ کہ متعہ حیات۔ یعنی وہ متعہ (کچھ مال) جو طلاق دے کر رخصت کرتے وقت عورت کو دیا جائے۔

قرآن ہر مسئلہ کو فطری انداز میں حل کرنا چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات سراسر قرآنی روح کے خلاف ہے کہ جس مرد سے نباہ نہ ہونے کی بنا پر عورت کی جدائی ہوئی ہے اسی مرد سے اس عورت کا نفقہ دلوایا جائے۔ یہ چیز سماج میں منفی ذہنیت پیدا کرنے کا ذریعہ بنے گی۔ چنانچہ قرآن میں نکاح وطلاق کے احکام کے ذیل میں ارشاد ہوا ہے:

وان یتفرقا یغن اللہ کلاً من سعتہ وکان اللہ واسعاً حکیما (النساء ۳۰)	اور اگر دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی وسعت سے بے نیاز کر دے گا اور اللہ وسعت والا حکمت والا ہے۔

اللہ کی وسعت سے مراد وہ وسیع فطری نظام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنے بندوں کے لیے مہیا کر رکھا ہے — عورت کو جب طلاق ہو جائے تو اس کے تمام خونی رشتوں میں فطری طور پر اس سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کسی دباؤ کے بغیر اس کی مدد اور سرپرستی کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ خود عورت کے اندر نئی قوت ارادی ابھرتی ہے اور وہ اپنے مسئلہ کے حل کے لیے اکثر ایسے کام کر ڈالتی ہے جو اس نے اس سے پہلے سوچا بھی نہیں تھا۔ سابقہ تجربات اس کو زیادہ سمجھ دار اور محتاط بنا دیتے ہیں اور اس طرح وہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ اگر وہ دوبارہ کسی سے رشتہ نکاح میں منسلک ہو تو زیادہ کامیابی کے ساتھ رشتہ کو نباہ سکے۔ وغیرہ

طلاق کے بعد

اس سلسلہ میں دوسرا سوال یہ ہے کہ طلاق کے بعد ایک عورت کے لیے اپنے ضروری

اخراجات پورا کرنے کی صورت کیا ہے۔ اس کا ایک جواب اسلام کا قانونِ وراثت ہے۔ اسلام نے خاندانی جائداد میں عورتوں کا جو حصہ مقرر کیا ہے اگر اس پر باقاعدہ عمل درآمد ہو تو عورت کے لیے بے سہارا ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ خاندانی جائداد میں عورت کا مستقل حصہ مقرر کرنا ایک اعتبار سے اسی لیے ہے کہ عورت ہنگامی حالات میں اپنی کفالت آپ کر سکے۔

تاہم اسلام نے عورت کے معاشی مسئلہ کو تمام تر وراثت پر منحصر نہیں رکھا۔ کیوں کہ وراثت کا معاملہ ہمیشہ یقینی نہیں ہوتا۔ اس کا مزید انتظام اسلام کے قانون نفقات میں موجود ہے۔ اس سوال کی اہمیت مسلّم ہے۔ مگر اس کا تعلق قانونِ طلاق سے نہیں ہے بلکہ قانونِ نفقات سے ہے۔ آدمی کو اس کا جواب اسلام کے قانونِ نفقات میں تلاش کرنا چاہیے نہ کہ اسلام کے قانونِ طلاق میں۔ یہاں ہم مختصراً چند پہلوؤں کا ذکر کریں گے۔

۱۔ مطلقہ عورت اگر بے اولاد ہے یا اولاد کمانے کے قابل نہیں ہے تو اسلامی شریعت کے مطابق اس کے اخراجات کی ذمہ داری اس کے والد پر ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہی صورت دوبارہ لوٹ آئے گی جو شادی سے پہلے تھی۔ شادی سے پہلے باپ اپنی لڑکی کا کفیل تھا۔ طلاق کے بعد دوبارہ وہ اپنی لڑکی کا کفیل ہو جائے گا:

فالاناث علیہ نفقتھن الی أن یتزوّجن اذا لم یکن لھنّ مال ولیس لہ ان یواجرھن فی عمل ولا خدمۃ وإن کان لھن قدرۃ واذا اطلقت وانقضت عدتھا عادت نفقتھا علی الاب

فتح القدیر، جلد ۳، صفحہ ۳۴۴

باپ پر اس کی لڑکیوں کا نفقہ اس وقت تک ہے جب تک وہ شادی نہ کریں جب کہ لڑکیوں کے پاس مال نہ ہو۔ اور باپ کو حق نہیں کہ وہ انھیں کسی عمل یا خدمت پر لگائے، اگرچہ ان کے اندر اس کی قدرت کیوں نہ ہو۔ اور جب لڑکی کو طلاق ہو جائے اور اس کی عدت پوری ہو جائے تو اس کا نفقہ دوبارہ باپ پر لوٹ آئے گا۔

۲۔ مطلقہ عورت اگر ماں ہے۔ یعنی وہ ایسی اولاد رکھتی ہے جو صاحب معاش ہے تو ایسی صورت میں اس کے اخراجات کی پوری ذمہ داری اس کی اولاد پر ہوگی:

انّ جمیعَ ما وجب للمرأۃ وجبَ للاب — وہ سب جو بیوی کے لیے واجب ہے وہ سب

والأم على الولد من طعام وشراب وكسوة وسكنى حتى الخادم
رد المحتار على الدر المختار، جلد ۲، صفحہ ۹۲۳

باپ اور ماں کے لیے لڑکے پر واجب ہوگا، یعنی کھانا، پینا، کپڑا، مکان، یہاں تک کہ خادم بھی۔

۳۔ اگر مطلقہ عورت کا باپ نہ ہو یا اس کی اولاد اس کی کفالت کرنے کے قابل نہ ہو تو دوسرے قریبی اور محرم اعزہ اس کی معاشی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے۔ مثلاً چچا، بھائی، وغیرہ۔ اگر یہ تیسری صورت بھی موجود نہ ہو تو اسلامی شریعت کی رو سے ریاست کا بیت المال اس کے اخراجات کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ مطلقہ عورت کو قانونی طور پر یہ حق ہوگا کہ وہ ریاست سے اس کو وصول کرے۔

شریعت کے اسی اہتمام و انتظام کی وجہ سے اسلام کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا اور نہ آج ایسا ہے کہ مسلمان عورتیں طلاق پاکر بے سہارا پڑی ہوئی ہوں اور کوئی ان کی کفالت اور سرپرستی کرنے والا موجود نہ ہو۔

تہذیب جدید کا مسئلہ

موجودہ زمانہ میں مغربی تہذیب نے بہت سے مسئلے پیدا کیے ہیں۔ یہ مسئلے حقیقی سے زیادہ مصنوعی ہیں۔ مغربی تہذیب نے بہت سے معاملات میں غیر فطری انداز اختیار کیا۔ اس کے نتیجہ میں غیر فطری مسائل پیدا ہوئے۔ اس کے بعد مزید غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے غیر فطری طور پر ان کو حل کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح مسائل میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

انھیں میں سے ایک طلاق کا مسئلہ بھی ہے۔ مغرب میں آزادیٔ نسواں کے نام پر جو تحریک شروع ہوئی وہ اپنے ابتدائی جذبہ کے اعتبار سے بالکل غلط نہ تھی۔ مگر اس کے علم بردار اس کی حد کو نہ جانتے تھے۔ چنانچہ آزاد سماج بنانے کی کوشش بالآخر اباحیت پسند سماج (Permissive society) تک جا پہونچی۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان لامحدود اختلاط شروع ہو گیا۔ اس نے نکاح کے بندھن کو کمزور کر دیا۔ مرد اور عورت میاں اور بیوی نہ رہے بلکہ حدیث کے الفاظ میں ذواقین اور ذواقات بن گئے۔ اس کو مزید تقویت صنعتی دور کی اس آسانی سے حاصل ہوئی کہ عورت فوراً ہی اپنے لیے آزاد معاش حاصل کر سکتی تھی۔ جدید صنعتی معاشرہ میں ایک عورت جتنی آسانی سے اپنے لیے ذریعہ معاش حاصل کر لیتی ہے

وہ اس سے پہلے کبھی عورت کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس کی وجہ سے مرد کی قوامیت متاثر ہوئی اور عورتیں مرد کے زیر اثر رہنے پر راضی نہ ہو سکیں اور معاشرتی زندگی میں وہ مسائل پیدا ہوئے جنھوں نے طلاقوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھا دی۔

طلاق کو روکنے کے لیے مغربی حکماء نے یہ تدبیر کی کہ مرد پر یہ قانونی پابندی لگا دی کہ طلاق کے بعد بھی اس پر لازم ہوگا کہ وہ عورت کو گزارہ دیتا رہے۔ یہ گزارہ مغربی معیار کے مطابق مقرر ہوا۔ چنانچہ اکثر حالات میں طلاق کے معنی مرد کے لیے یہ ہو گئے کہ وہ اپنے سرمایہ کا بڑا حصہ اپنی مطلقہ بیوی کو دیدے اور مزید زندگی بھر کما کما کر اس کا حصہ اسے ادا کرتا رہے۔

اس غیر فطری صورت حال کی ایک مثال لارڈ برٹرینڈ رسل ہے۔

برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰ - ۱۸۷۲) ایک نہایت ذہین اور تعلیم یافتہ انگریز تھا۔ اس کو ایک ایسی عورت درکار تھی جو اس کی ذہنی سطح کے مطابق اس کی رفیق حیات بن سکے۔ اس نے شادی کی مگر تجربہ کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کی بیوی اس کی پسند کے مطابق نہیں ہے۔ ناموافقت ظاہر ہونے کے بعد اس نے فوراً اس سے علحدگی اختیار نہیں کی۔ سخت ذہنی اذیت کے باوجود اس کے بعد بھی وہ تقریباً دس سال تک اس کے ساتھ نباہ کرتا رہا۔ آخر کار اس نے اس کو طلاق دے کر دوسری شادی کی۔ دوسری عورت سے بھی نباہ نہ ہو سکا اور پھر اس کو چھوڑ کر برٹرینڈ رسل کو تیسری شادی کرنی پڑی۔

یہ طلاق برٹرینڈ رسل کو بہت مہنگا پڑا۔ طلاق کے بعد اس کو ازروئے قانون اپنی بیویوں کو جو رقم ادا کرنی پڑی اس نے برٹرینڈ رسل کی معاشیات کو برباد کر دیا۔ چنانچہ وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے:

> The financial burden was heavy and rather disturbing: I had given £ 10,000 of my Nobel Prize cheque for a little more than £ 11,000 to my third wife, and I was now paying alimony to her and to my second wife as well as paying for the education of my younger son. Added to this, there were heavy expenses in connection with my elder son's illness: and the income taxes which for many years he had neglected to pay now fell to me to pay
>
> Bertrand Russell, *Autobiography*, Unwin Paperbacks, 1978, pp. 563-64

مالیاتی بوجھ میرے اوپر بہت بھاری اور پریشان کن تھا۔ مجھ کو اپنے نوبیل انعام کے گیارہ ہزار پاؤنڈ میں سے دس ہزار پاونڈ اپنی تیسری بیوی کو دے دینا پڑا۔ اور اب میں اس کو اور اپنی دوسری بیوی کو نان نفقہ کی رقم بھی ادا کر رہا تھا۔ اور اسی کے ساتھ اپنے چھوٹے بچے کی تعلیم کی ذمہ داری بھی میرے ذمہ تھی۔ مزید اضافہ یہ کہ میرے بڑے لڑکے کی بیماری کے سلسلہ میں بھی بھاری اخراجات تھے۔ اور اس لڑکے کا کئی سال کا انکم ٹیکس

جو وہ ادا نہیں کر سکا تھا وہ بھی مجھ کو ہی ادا کرنا پڑا۔

مغرب کا یہ قانون بظاہر عائلی زندگی میں اصلاح کے لیے بنایا گیا تھا۔ مگر وہ مغربی ممالک کے لیے الٹا پڑا۔ برٹرینڈ رسل کے مذکورہ تجربہ جیسے تجربات بے شمار لوگوں کو پیش آئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں انھیں اس کی بہت بڑی رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ لوگوں کو نکاح کا طریقہ بے حد مہنگا معلوم ہوا۔ حتی کہ ان کے اندر نکاح کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت اور مرد نکاح کے بغیر ایک ساتھ رہنے لگے۔ چنانچہ آج مغرب کی نئی نسل میں ۵۰ فیصد سے زیادہ وہ لوگ ہیں جو غیر منکوحہ بیویوں کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

ہندستان کا تجربہ

طلاق کو مشکل بنانے کا دوسرا تجربہ وہ ہے جو ہندستان میں پیش آیا۔ ہندستان کے قدیم مصلحین نے بظاہر عورت کے تحفظ کے لیے مذہبی طور پر طلاق کو ممنوع قرار دے دیا۔ مزید یہ کہ عورت کے اندر طلاق کا رجحان روکنے کے لیے انھوں نے یہ کیا کہ طلاق کے بعد عورت کے لیے نکاح ثانی کا راستہ تمام تر بند کر دیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو قوانین بنائے اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک بار جب شادی ہو جائے تو اس کے بعد نہ مرد اسے طلاق دے سکتا ہے اور نہ عورت کے لیے ممکن ہے کہ وہ پہلے شوہر سے جدائی کے بعد دوسرا نکاح کر سکے۔

مگر یہ اصلاح غیر فطری تھی چنانچہ ہندو سماج کو اس کی بہت مہنگی قیمت دینی پڑی۔ عورت اور مرد اگر نکاح کے بعد ایک دوسرے کو مطمئن نہ کر سکے تو ان کی ساری زندگی بدترین تلخی میں گزرتی تھی۔ کیوں کہ نہ مرد کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور نہ عورت کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے پہلے شوہر سے جدا ہو کر اپنا دوسرا نکاح کر سکے۔ اس کے لیے صرف یہ ممکن تھا کہ ساری عمر ایک غیر مطلوب مرد کے ساتھ پُر اذیت زندگی گزارتی رہے اور اگر اس کا شوہر درمیان میں مر جائے تو اپنے آپ کو جلا کر ستی ہو جائے۔

موجودہ زمانہ میں اس مسئلہ نے نئی شکل اختیار کی ہے۔ قانونی طور پر اگرچہ علٰحدگی یا نکاح ثانی کو جائز کر دیا گیا ہے مگر ہندو سماج عملاً آج بھی انھیں روایات پر چل رہا ہے جو ہزاروں برس سے اس کے درمیان بنی ہیں۔ چنانچہ ہندو عورتوں کے بارہ میں کثرت سے اطلاعات مل رہی ہیں کہ وہ شوہروں سے ناموافقت کی بنا پر خودکشی کر لیتی ہیں۔ اس کا سبب مذکورہ بالا مسئلہ ہے۔ یہ عورتیں جانتی ہیں کہ اولاً تو شوہروں سے علٰحدگی مشکل ہے اور اگر کسی طرح علٰحدگی ہو جائے تو دوسرا نکاح اس سے بھی زیادہ مشکل۔

مذہب کی حقیقت

مذہب ابتداءً خدائی مذہب کے طور پر شروع ہوتا ہے اور بعد کے زمانہ میں وہ انسانی مذہب بن جاتا ہے۔ اس میں کسی بھی مذہب کا کوئی استثنار نہیں، حتیٰ کہ اسلام کا بھی نہیں، اس فرق کے ساتھ کہ دوسرے مذاہب عملی طور پر بھی انسانی مذاہب بنے اور ان کی کتابیں بھی محرف ہو کر انسانی کتابیں بن گئیں۔ جب کہ اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ اس کو ماننے والے اگرچہ بعد کے زمانہ میں اپنے علمار اور بزرگوں سے وابستہ ہو گیے۔ مگر قرآن اور سنت کی شکل میں اس کا جو متن ہے وہ آج بھی اپنی اصلی اور ابتدائی حالت میں کامل طور پر محفوظ ہے۔

مذہب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے اس کا نام ہے کہ انسان اس حقیقت کو پالے کہ اس کائنات کا ایک خالق اور مالک ہے اور وہ اپنے تمام اعمال کے لیے اس خالق و مالک کے سامنے جواب دہ ہے۔ خدا کی دریافت اور اس کے سامنے اپنی جواب دہی کے احساس سے جو زندگی بالکل لازمی نتیجے کے طور پر ابھرتی ہے اسی کا نام مذہبی زندگی ہے۔

اس کے بعد آدمی ایک نیا آدمی بن جاتا ہے۔ یہ دریافت آدمی کے لیے ایک ایسی عظیم حقیقت کی دریافت ہوتی ہے جو اس سے ذاتی بڑائی کے تمام احساسات کو چھین لے۔ ایسا آدمی جب بولتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی زبان پر خدا کی لگام لگی ہوئی ہے۔ وہ عمل کرتا ہے تو اس طرح کرتا ہے جیسے وہ خدا کی گائڈ بک اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے۔ جب وہ کسی سے معاملہ کرتا ہے تو اس طرح معاملہ کرتا ہے جیسے اس کے ساتھ اس کا خدا کھڑا ہو۔

یہی اصل مذہب ہے۔ اور یہی وہ مذہب ہے جو تمام پیغمبروں کو دیا گیا۔ مگر بعد کے زمانہ میں لوگ خدائی مذہب کو چھوڑ کر اپنے بزرگوں کے مذہب پر چل پڑے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کا حال بھی اس معاملہ میں دوسروں سے کچھ مختلف نہیں۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی اہتمام کے تحت قرآن کو کامل طور پر محفوظ کر رکھا ہے۔ جو اللہ کا بندہ خدا کی مرضی کو جاننا چاہے اسے قرآن پڑھنا چاہیے۔ کسی اور ذریعہ سے وہ خدا کے دین کو نہیں پا سکتا۔ دوسری کتابوں میں بگڑا ہوا دین ہے اور قرآن میں محفوظ دین۔

ایک سفر

آئن سٹائن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کسی نے ایک بار اس کو پانچ سو پونڈ کا ایک چیک دیا۔ آئن سٹائن کو اس کا کیش کرانا یاد نہ رہا۔ وہ اس چیک کو اپنے مطالعہ کے دوران بک مارک (Book mark) کے طور پر استعمال کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی مقررہ مدت گزر گئی۔

ایسا ہی کچھ معاملہ حال میں میرے ساتھ پیش آیا۔ مارچ ۱۹۸۴ میں میں جامعہ اسلامیہ کی دعوت پر مدینہ منورہ گیا تھا۔ اسی وقت یہ پروگرام تھا کہ واپسی کے بعد مجھے حیدر آباد کا سفر کرنا ہے۔ جامعہ اسلامیہ (مدینہ) کے ذمہ داروں نے ازراہِ عنایت دہلی اور حیدر آباد کے درمیان سفر کے لیے فرسٹ کلاس کا ایک ایر ٹکٹ بنوا کر میرے حوالے کر دیا۔ اس ٹکٹ کا حوالہ نمبر یہ ہے :

065/4403/270/732 (Saudia, Medina, 10-3-1984)

یہ ٹکٹ ۱۰ مارچ ۱۹۸۴ سے ۱۰ مارچ ۱۹۸۵ تک کے لیے تھا۔ مگر دن گزرتے رہے اور میں حیدر آباد کا پروگرام نہ بنا سکا۔ اب حیدر آباد کا سفر پیش آیا تو معلوم ہوا کہ ٹکٹ کی مدتِ استعمال ختم ہو چکی ہے۔ ٹکٹ قانونی طور پر بیکار ہو گیا تھا۔ چنانچہ حیدر آباد کے سفر کے لیے مجھ کو دوسرا ٹکٹ لینا پڑا۔ یہ صرف میری بھول تھی۔ ورنہ مذکورہ ٹکٹ جو سعودی ایر لائنز (مدینہ) سے اشو کیا گیا تھا۔ اس پر واضح طور پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے : ان ھذہ التذکرۃ ھی صالحۃ للنقل لمدۃ سنۃ واحدۃ من تاریخ اصدارھا (یہ ٹکٹ اپنے تاریخ اجراء سے ایک سال تک کے لیے لائقِ استعمال ہے)

انسان ایک کام میں مشغول ہو تو وہ دوسرے کام کو بھول جاتا ہے۔ یہ صرف خدائے واحد کی صفت ہے کہ وہ بیک وقت ہر کام کو یاد رکھے خواہ کاموں کی فہرست کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو۔

دہلی سے جہاز چلنا شروع ہوا تو حسب معمول اناؤنسر نے اپنے اعلان میں کہا :

دلی سے حیدر آباد تک کی دوری ایک گھنٹہ ۴۵ منٹ میں پوری کی جائے گی۔

یہ الفاظ میں نے سنے تو میرے دل نے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کیسا عجیب احسان ہے کہ اس نے

فاصلوں کو انسان کے لیے بالکل قریب کر دیا ہے۔ ۱۲ سو سال پہلے اموی شہزادہ عبدالرحمن الداخل دمشق سے روانہ ہوا تو اس کو اسپین تک پہونچنے میں پانچ سال لگ گئے۔ آج اس قسم کا سفر صرف چند گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔

۱۳ جولائی ۱۹۸۵ کی صبح کو میں دہلی سے حیدر آباد گیا اور ۱۵ جولائی کی صبح کو دہلی واپس آیا۔

۱۳ جولائی کو میں جس جہاز سے گیا اسی سے آندھرا پردیش کے گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما بھی سفر کر رہے تھے۔ وہ نہایت شریف اور سادہ مزاج کے آدمی ہیں۔ اردو بہت اچھی جانتے ہیں۔ اور مسلم تہذیب سے قریب رہے ہیں۔ واپسی کے بعد ان کے نام الرسالہ اردو جاری کر دیا گیا ہے۔

۱۳ جولائی کی صبح کو جب میں حیدر آباد جانے کے لیے انڈین ایر لائنز کے جہاز نمبر ۴۰۳ میں بیٹھا تو اچانک مجھے خیال آیا کہ اس وقت میں اگر جہاز کا بیرونی رُخ دیکھنا چاہوں تو میں اس کو نہیں دیکھ سکتا ہوائی جہاز جب اپنے دونوں پروں کو پھیلائے ہوئے رن وے پر دوڑتا ہے اور جب وہ زمین سے فضا میں اڑان کرتا ہے تو یہ بڑا عجیب منظر ہوتا ہے۔ مگر جہاز کے مسافر کے لیے اس کا یہ منظر دیکھنا مقدر نہیں۔ کوئی شخص بیک وقت جہاز کا سوار اور جہاز کا مشاہد نہیں بن سکتا۔ اگر کوئی آدمی جہاز کے ان مناظر کو دیکھنا چاہتا ہے تو اس کو جہاز سے باہر آنا پڑے گا۔

یہی معاملہ وسیع تر معنوں میں دنیا کا بھی ہے۔ آپ اگر دنیا میں داخل ہو کر اس سے متمتع ہونا چاہتے ہیں تو آپ دنیا کی حقیقت سے باخبر نہیں ہو سکتے۔ دنیا کی حقیقتوں کو گہرائی کے ساتھ جاننے کے لیے دنیا سے محرومی پر راضی ہونا پڑے گا۔ یہی بات حضرت مسیح نے ان الفاظ میں فرمائی

حیدر آباد میں پروگرام

۱۳ جولائی ۱۹۸۵	۱۱ بجے صبح	اسلامی مرکز (حمایت نگر) گفتگو، سوال وجواب	
	۵ بجے شام	مدینہ ٹکنکل اسکول میں خطاب "تعمیر ملت"	
۱۴ جولائی ۱۹۸۵	۱۱ بجے صبح	مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ، اسلام اور عصر حاضر	
	۵ بجے شام	مسجد عامرہ،	قرآن خدا کی کتاب

حیدر آباد کی مذکورہ چاروں تقریروں کا ٹیپ کئی لوگوں نے لیا، اسلامی مرکز میں بھی ان کا ٹیپ موجود ہے۔

کہ "تم خدا اور دولت دونوں سے ایک ساتھ محبت نہیں کر سکتے" اور یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے کہ ــــــ ما زهد عبد في الدنيا الا انبت الله الحكمة في قلبه وانطق بها لسانه وبصره عيب الدنيا داءها ودواءها)

جہاز جب بلندی پر اڑ رہا تھا تو میں نے کھڑکی سے باہر کی طرف نظر ڈالی۔ اس وقت دیکھنے میں ایسا معلوم ہوا جیسے ہم سمندر کے اوپر اڑ رہے ہوں۔ پانی جیسی ہموار سطح کے درمیان جگہ جگہ سمندر کی جھاگ دار لہروں کا سا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ مگر جلد ہی میری غلط فہمی دور ہوگئی جب مجھے یاد آیا کہ دہلی اور حیدرآباد کے راستہ میں کوئی سمندر نہیں ہے۔ یہ سارا سفر خشکی کے اوپر طے ہوتا ہے۔ یہ دراصل بادل تھے۔ جہاز چونکہ بادل کے اوپر سے اڑ رہا تھا اس لیے ہمارے نیچے سمندر کا سا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

کچھ دیر سفر کرنے کے بعد "لہروں" کی اونچائی بڑھنا شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی طرح اونچی دکھائی دینے لگیں۔ اس فرق کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ جہاز منزل سے قریب ہونے کی وجہ سے نیچے آنا شروع ہوا۔ جب تک ہم بادل سے دور تھے، وہ ہم کو سمندر کی لہروں یا کھیتوں کی مینڈھ کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ جب ہم اس کے قریب آگیے تو وہ پہاڑ کی طرح بلند دکھائی دینے لگا۔ اکثر مشاہدات محض اضافی ہوتے ہیں مگر انسان غلطی سے ان کو حقیقی سمجھ لیتا ہے۔

حیدرآباد ایرپورٹ سے ہمارا قافلہ شہر کے لیے روانہ ہوا تو راستہ میں ایک صاحب نے کہا کہ "گلی قاسم جان" میں تو آپ سے ملنے کے لیے جانا ایک مسئلہ ہوتا تھا۔ کیوں کہ اطراف کی سڑکوں پر ہر وقت اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ کسی بھی سواری سے سفر کرنا سخت مشکل ہے، اب نئی دہلی میں مرکز کی موجودہ عمارت کا کیا حال ہے۔ میں نے کہا کہ ہماری موجودہ عمارت کے ساتھ یہ مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں کھلی سڑکیں ہیں اور عمارت بھی بالکل پارک کے کنارے ہے۔ موصوف مسکرا کر بولے "دہلی کا مرکز پارک کے کنارے واقع ہے۔ مگر اس کی حیدرآباد کی شاخ ایسی ہے کہ خود اس کے اندر پارک واقع ہے۔"

حیدرآباد میں میرا قیام مرکز کی شاخ کی عمارت میں تھا جو یہاں ۱۹۸۳ سے قائم ہے۔

مغرب کے وقت ہم لوگ مرکز میں پہونچ گیے۔ ۱۰ بجے رات تک ملاقاتوں کا سلسلہ رہا۔ کچھ نوجوان ملنے کے لیے آئے جو برابر الرسالہ پڑھ رہے ہیں۔ ایک نوجوان جو ایم بی اے (M.B.A.)

کا کورس کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا "الرسالہ فطرتِ انسانی کا ترجمان ہے۔ اسی لیے میں اس کو پسند کرتا ہوں۔ اور اس کی پندرہ کاپی منگا کر اپنے دوستوں اور رشتہ داروں میں پہونچاتا ہوں"

کچھ بزرگوں نے کہا کہ الرسالہ میں تنقید نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے کہا کہ تنقید کسی گروہ کے زندہ گروہ ہونے کی سب سے بڑی علامت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے رسول اور اصحاب رسول کے واقعات بتائے کہ وہ لوگ تنقید اور اختلاف کو نہ صرف گوارا کرتے تھے بلکہ پسند کرتے تھے۔

پھر میں نے ایک واقعہ بتایا کہ ایک صاحب یورپ اور امریکہ کے کئی سالہ قیام کے بعد واپس آئے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مغربی قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا:

ڈیسنٹ کو مقدس مقام دینا

حقیقت یہ ہے کہ اختلاف (Dissent) زندگی کی اہم ترین قدر ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ مثال کے طور پر جنگ بدر کے لیے "اختلاف" ہی کی وجہ سے زیادہ بہتر میدان کا انتخاب کیا جا سکا۔ ہم کو چاہیے کہ تنقید کو ختم کرنے کے بجائے تنقید کے بارہ میں لوگوں کی غیر ضروری حساسیت کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔

حیدر آباد میں قیام کے درمیان ہر وقت لوگ آتے رہے اور ان سے مختلف دینی و ملی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ ۱۱ فروری کی صبح کو ایک صاحب تشریف لائے۔ ان کے اندر قومی اور ملی تعمیر کا کافی جذبہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کی کتابیں وغیرہ تو نہیں پڑھی ہیں۔ تاہم میرے پاس فاضل زمین اور فاضل مکان ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اس کو لے کر اس کو ملی تعمیر کے کام میں استعمال کریں۔

میں نے کہا کہ آپ کا جذبہ بہت قابل قدر ہے۔ مگر اتحاد عمل سے پہلے اتحاد خیال ضروری ہے پہلے ہم آپ ایک دوسرے کے ذہن کو سمجھیں۔ اس کے بعد ان شاء اللہ مل کر کام کریں گے۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں نے بار بار ایک غلطی کی ہے۔ وہ مسائل (Issues) پر اتفاق کو اتفاق سمجھ لیتے ہیں اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتے ہیں مگر جلد ہی اختلاف رائے پیدا ہوتا ہے اور سب الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اشوز پر اتفاق رائے کافی نہیں ہے۔ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ کسی اشو کو

ہی کس زاویہ نظر سے دیکھتا ہے۔

مصر میں " فاروق ہٹاؤ " مہم پر بہت سے لوگ متحد ہوگیے مگر شاہ فاروق کے ہٹنے کے بعد جب " اسلام لاؤ " کا سوال آیا تو وہ ٹکرا کر الگ ہوگیے۔ پاکستان میں " بھٹو کا احتساب " کے نعرہ پر تمام اسلام پسند متحد ہوگیے۔ مگر بھٹو کے خاتمہ کے بعد اسلام کے نفاذ کا سوال ہوا تو وہ متحد نہ رہ سکے۔ ہندستان میں فساد کے مسئلہ پر تمام جماعتیں آل انڈیا مجلس مشاورت کے تحت متحد ہوگئیں۔ اس کے بعد ان کے لیڈر ایک دوسرے سے لڑکر الگ ہوگیے۔ مسلم یونیورسٹی کے سلسلے میں مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ

کہ ایں سررشتۂ تعلیم ما در دست ما باشد

جدوجہد کے بعد یہ مطالبہ پورا ہوگیا تو اب متحد ہوکر یونیورسٹی کو ترقی دینے کے بجائے وہ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اشوز پر اتفاق کافی نہیں ہے۔ اشوز کے ساتھ زاویہ نظر میں بھی اتفاق ہونا لازمی طور پر ضروری ہے ورنہ تعمیر کے بجائے تخریب پیدا ہوگی۔

الرسالہ کیا ذہن پیدا کر رہا ہے۔ اس کا اندازہ ان چند واقعات سے ہوگا جو اس سفر کے دوران میرے علم میں آئے۔

ایک تاجر باقاعدہ الرسالہ پڑھتے ہیں اور ہماری مطبوعات میں سے بھی اکثر پڑھ چکے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے یہاں انکم ٹیکس محکمہ کی ریڈ (Raid) ہوئی۔ تاجر طبقہ جانتا ہے کہ " ریڈ " کسی تاجر کے لیے کس قدر بھیانک واقعہ ہوتا ہے۔ تاہم تاجر نے بتایا کہ ریڈ کرنے والی ٹیم جب ان کے دفتروں میں گھس گئی تو ان کو بالکل ڈر نہیں معلوم ہوا۔ انھوں نے کہا کہ جو کچھ آپ دیکھنا چاہتے ہیں دیکھ لیں۔ مگر ریڈ کے اس دنیوی واقعہ سے ان کا ذہن آخرت کی طرف مڑ گیا۔ انھوں نے سوچا ـــــ " اگر خدا اسی طرح ریڈ کر دے تو میں کیا کروں گا "

ایک صاحب نے اپنے مطالعہ کی روداد بتاتے ہوئے کہا کہ " میں نے آپ کے یہاں کی مختلف کتابیں پڑھیں۔ پھر میں نے احیار اسلام پڑھی۔ احیار اسلام کو پڑھتے ہوئے جب میں اس صفحہ پر پہونچا جہاں آپ نے جنت کا ذکر کیا ہے تو .... یہ کہتے ہوئے ان کی زبان اچانک بند ہوگئی۔ میں نے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اس کے بعد وہ اس مجلس میں دوبارہ گفتگو

نہ کر سکے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ ہمارا ایک کارخانہ ہے۔ یہ کارخانہ پہلے شہری علاقہ میں تھا۔ ہمارے پڑوسیوں کو شکایت تھی کہ تمہاری چمنی سے دھواں نکلتا ہے اور وہ ہمارے گھروں کو خراب کرتا ہے میں ہمیشہ جواب دیتا کہ ہمارا کارخانہ باقاعدہ سرکاری اجازت کے تحت قائم ہے۔ اگر آپ کو اعتراض ہے تو آپ جا کر مقدمہ قائم کیجیے۔ تاہم الرسالہ پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں تبدیلی ہوئی۔ ایک روز میں اپنے کارخانہ سے نکلا۔ میرے ایک پڑوسی اپنے گھر کے باہر صحن میں سفید شیروانی پہن کر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھ کو دیکھ کر بلایا اور کہا کہ آپ میری شیروانی کو دیکھئے۔ آج ہی میں نے یہ دُھلی ہوئی شیروانی پہنی ہے اور وہ آپ کے کارخانہ کے دھوئیں سے کالی ہو رہی ہے۔ میں نے ان کی شیروانی پر کوئلہ کی راکھ دیکھی تو اچانک یہ خیال آیا۔ "اگر میں اپنے پڑوسی کی جگہ پر ہوتا اور اس کے کارخانہ کی چمنی سے میری شیروانی کالی ہو رہی ہوتی تو میں کیا کرتا۔ میرے دل نے کہا کہ مجھے وہی شکایت ہوتی جو میرے پڑوسی کو ہو رہی ہے۔

اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنے کارخانہ کو یہاں سے ہٹا دیں گے۔ چنانچہ ہم نے شہر کے باہر صنعتی علاقہ میں ایک بڑی زمین خریدی اور کارخانہ کو شہر سے اس نئے مقام پر منتقل کر دیا۔ پہلے ہمارا کارخانہ ایک ہزار گز زمین پر تھا۔ اب ہمارا کارخانہ پندرہ ہزار گز زمین پر ہے۔ نیز بہت سی سہولتیں جو شہر میں حاصل نہیں تھیں یہاں حاصل ہیں۔ ہم نے پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی کر لی ہے۔

ایک صنعت کار نے کہا کہ الرسالہ ہر آدمی کے لیے بہترین گائڈ ہے، میں نے اپنی کاروباری زندگی کے کئی مسائل الرسالہ کی تعلیمات کو استعمال کر کے حل کیے ہیں۔

مرکز میں ایک فلسطینی نوجوان ملاقات اور انٹرویو کے لیے آئے۔ انھوں نے مختلف سوالات کیے۔ اسلامی مرکز کے مشن کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہمارے نزدیک اصل کام عقیدہ کو زندہ کرنا اور عمل صالح کی روح پیدا کرنا ہے۔ سیاست اور حکومت اضافی چیزیں ہیں نہ کہ حقیقی چیزیں۔

انھوں نے کہا کہ یہی تصور شیخ حسن البنا کا بھی تھا۔ میں نے کہا کہ پھر شیخ حسن البنا اور

ے ساتھی شاہ فاروق کو اس کے سیاسی تخت سے بے دخل کرنے کی مہم میں کیوں شریک ہو گئے۔
ون نے کہا کہ شاہ فاروق مصر میں اسلام کے احیاء کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ اس لیے اس کو ختم
نا ضروری تھا۔ میں نے کہا، کیا شاہ فاروق کے تخت سے ہٹنے کے بعد مصر میں اسلام کے احیاء کی
ہموار ہو گئی۔ انھوں نے کہا کہ ظالم اگر ظلم کرے تو کیا اس کا ہاتھ نہ پکڑا جائے۔ میں نے کہا کہ
باشیخ اور ان کے ساتھی ظالم کا ہاتھ پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔

اکثر لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ لوگ تضاد میں جیتے ہیں۔ اسی لیے
ہ کوئی گہرا دینی کام نہیں کر پاتے۔ ایک طرف وہ دعوت حق کا نام لیتے ہیں، اور دوسری طرف
می جھگڑوں اور سیاسی ہنگاموں کو اسلامی جہاد قرار دے کر اس میں بھی کود پڑتے ہیں۔ حالانکہ
س دنیا میں ایک کام کو کرنے کے لیے دوسرے کام کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اگر آپ دہلی سے کلکتہ جانا
ہتے ہیں تو دہلی سے امرتسر کی ٹرین آپ کو چھوڑنی پڑے گی۔ یہ ناممکن ہے کہ آپ قومی جھگڑوں
ور سیاسی ہنگاموں کو اسلامی جہاد بتا کر عوام کی لیڈری حاصل کریں۔ اور اسی کے ساتھ
پ کو دعوت الی اللہ اور شہادۃ علی الناس کے کام کی توفیق بھی حاصل ہو۔

لوگ صرف یہ جانتے ہیں کہ انھیں "کیا کرنا ہے" وہ اس سے بے خبر ہیں کہ انھیں "کیا نہیں
کرنا ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے اقدامات کے باوجود انھیں کوئی حقیقی کامیابی حاصل نہیں
ہوتی۔ وہ کرنے والے کام کی باتیں کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ نہ کرنے والے کام میں اپنے آپ
کو الجھا دیتے ہیں۔ آج سب سے پہلا کام لوگوں کو اس بے شعوری سے نکالنا ہے۔ اس کے بغیر
آگے کا کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔

اس سے قبل میں تقریباً ڈیڑھ سال پہلے حیدر آباد گیا تھا۔ اس وقت ۱۱ فروری ۱۹۸۴
کی شام کو اسلامی مرکز کی شاخ حیدر آباد کا افتتاح ہوا تھا۔ جناب سید مکرم شاہ صاحب (چیئرمین
لیجسلیٹو کونسل، آندھرا پردیش) اور جناب سید ہاشم علی صاحب (موجودہ وائس چانسلر علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی) مہمان خصوصی کے طور پر اسٹیج پر موجود تھے۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں مسلمانوں
کو نہایت قیمتی مشورے دیئے۔ مرکز کا وسیع لان پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ شہر کا تعلیم یافتہ طبقہ
بہت بڑی تعداد میں اس موقع پر جمع ہو گیا تھا۔ اور اس نے آخر تک نہایت توجہ کے ساتھ تقریروں

کو سنا۔ آخر میں راقم الحروف کی تقریر ہوئی۔

اس کے بعد اب جولائی ۱۹۸۵ میں حیدر آباد کا سفر ہوا۔ اندازہ ہوا کہ اس مدت میں حیدر آباد میں اسلامی مرکز کی آواز پہلے سے زیادہ پھیل گئی ہے۔ ہر اجتماع میں غیر معمولی طور پر کافی زیادہ تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ اور کثرت سے ملاقاتیں کرتے رہے۔ اکثر لوگوں نے کہا کہ اس قسم کی باتیں ہم کو پہلی بار سننے میں آرہی ہیں۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ مزید قیام کر کے اور زیادہ اجتماعات کیے جائیں اور حیدرآباد کے اطراف (محبوب نگر وغیرہ) میں بھی ضرور پروگرام رکھا جائے۔ مگر میرے لیے زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہیں تھا۔

۱۵ جولائی کی صبح کو میں واپس ہو کر دہلی کے ہوائی اڈے پر اُترا۔ یہاں مسافروں کا استقبال کرنے کے لیے ان کے عزیزوں اور دوستوں کے مسکراتے ہوئے چہرے موجود تھے۔ میرے دل نے کہا: ہر مسافر کے لیے وہ لمحہ بہت قریب آگیا ہے جب کہ اس کا ایک اور سفر ہو۔ دنیا سے آخرت کی طرف سفر۔ وہاں کسی کا استقبال کرنے کے لیے خدا کے فرشتے کھڑے ہوں گے۔ اور کوئی ہوگا جس کا وہاں کوئی استقبال کرنے والا نہ ہوگا۔ آہ کیسا عجیب ہوگا سفر کا یہ خاتمہ۔ کیسا عجیب ہوگا مسافروں کا یہ انجام۔

صدر اسلامی مرکز کی آواز میں ماہانہ "الرسالہ کیسٹ" خدا کے فضل سے پابندی سے تیار ہو رہا ہے اور ہر ماہ خریداروں کے نام روانہ کیا جا رہا ہے۔ موجودہ منصوبہ کے مطابق دسمبر ۱۹۸۵ تک کے کیسٹ کی تفصیل حسب ذیل ہے:

کیسٹ نمبر	۱	ایمان
کیسٹ	۲	جدید امکانات
کیسٹ	۳	اسلامی اخلاق
کیسٹ	۴	اتحاد
کیسٹ	۵	تعمیر ملت

عنقریب انشاء اللہ ان تمام کیسٹوں کی تقریریں کتاب کی صورت میں بھی شائع کر دی جائیں گی۔

خبرنامہ اسلامی مرکز۔ ۱۳

۲۵ اگست ۱۹۸۵ کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔ حسب معمول مرکز میں ماہانہ درس قرآن کا اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے "قربانی" سے متعلق آیات کی روشنی میں ایک گھنٹہ کا درس دیا۔ اس اجتماع کی اطلاع اسی دن کے انگریزی اخبارات میں بھی شائع ہو گئی تھی۔ مثلاً ٹائمس آف انڈیا انڈین اکسپریس، اسٹیٹمین، نیشنل ہرلڈ (۲۵ اگست)

۔ مدرسہ باب العلوم (کلکتہ) نے اپنے سالانہ مجلہ کے لیے پیغام کی فرمائش کی تھی۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے ان کو ایک پیغام روانہ کیا۔ یہ پیغام زیر نظر اشاعت میں شامل ہے۔

۲۔ صدر اسلامی مرکز سے ملنے کے لیے روزانہ مرکز میں مختلف قسم کے لوگ آتے ہیں اور ان سے مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۸۵ کو ایک ڈاکٹر صاحب ملنے کے لیے آئے جو ایک عرب ملک کے اسپتال میں کام کرتے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ باہر کے لیے الرسالہ کا سالانہ چندہ کتنا ہے۔ صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ بیرونی ملک کے لیے سالانہ چندہ کی مقدار تو آپ کو نیچے کے دفتر میں الرسالہ کے منیجر صاحب بتائیں گے۔ البتہ اتنی بات میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ آپ الرسالہ کا سالانہ چندہ جمع کریں اور ایک سال تک اس کے بارہ شمارے پڑھیں آخر میں اگر آپ کو یہ احساس ہو کہ الرسالہ اس قابل نہ تھا کہ میں اتنی رقم اس کے لیے خرچ کرتا تو آپ سال کے بارہ شمارے ہمیں واپس بھیج دیں آپ کو آپ کی پوری رقم بغیر کسی کمی کے لوٹا دی جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ سن کر کہا: آپ کا مرکز تو بالکل انوکھا مرکز ہے۔ ایسا تو دنیا کا کوئی بھی پرچہ نہیں کرے گا۔

۴۔ اللہ کے فضل سے "جدید اسلوب میں اسلامی تعلیمات" اب اسلامی مرکز کی امتیازی صفت بن چکی ہے۔ جو لوگ بھی اس موضوع پر کچھ لکھنا یا بولنا چاہتے ہیں وہ اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ الرسالہ یا ادارہ الرسالہ کی مطبوعات سے مدد لیں۔ وہ مختلف طریقوں سے اس کو استعمال کرتے ہیں اگرچہ قوم میں اعتراف کی نفسیات نہ ہونے کی وجہ سے اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ الرسالہ یا ادارہ الرسالہ کا حوالہ دیے بغیر یہ کام کر رہے ہیں۔ عدم اعتراف کے پردہ میں اس اعتراف کی مثالیں ہر روز کثرت سے سامنے آرہی ہیں۔ مثال کے طور پر تعمیر حیات (لکھنؤ) نے اپنی

اشاعت ۱۰ستمبر ۱۹۸۵ میں صدر اسلامی مرکز کا ایک مضمون "عورت کی یادداشت" کے عنوان سے نقل کیا ہے مگر صدر اسلامی مرکز کا نام اس میں شامل نہیں۔

۵۔ اسلامی مرکز کے افکار خدا کے فضل سے عربی اخبارات ورسائل میں برابر شایع ہوتے رہتے ہیں اس طرح اسلامی مرکز کا پیغام وسیع تر مسلم دنیا میں پہونچ رہا ہے۔ سودی عرب کے انتہائی کثیرالاشاعت ہفت روزہ الدعوة (۹ستمبر ۱۹۸۵) میں رسالہ کے ایک مضمون کا عربی ترجمہ اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس کا عنوان ہے: الامتحان الدنیوی سنة الهية۔ اس سے پہلے اسی الدعوة (۳۰ جون ۱۹۸۳) میں صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو چھپ چکا ہے۔ جس کا عنوان تھا: مع المفكر الاسلامي الكبير وحيد الدين خان

۶۔ اسلامی مرکز کی دو کتابیں، الاسلام اور احیار اسلام، کا ترجمہ عربی زبان میں شائع ہوگیا ہے اول الذکر کتاب کا عربی نام واقعنا ومستقبلنا فی ضوء الاسلام ہے۔ اور ثانی الذکر کتاب کا عربی نام قضية البعث الاسلامى: المنهج والشروط ہے۔ یہ دونوں کتابیں دار الصحوة قاہرہ نے شائع کی ہیں۔

۷۔ ایک صاحب سودی عرب سے لکھتے ہیں: ۳ اگست ۱۹۸۵ شام ساڑھے چار بجے ریڈیو ریاض سے آپ کی کتاب "الاسلام یتحدی" اور تحریک الرسالہ پر تبصرہ نشر کیا گیا تھا۔ جس میں "عبد الرحمن صالح العسماوی" نے جناب کے فکر کو بہت سراہا خاص طور پر آپ جدید حالات سے جو سبق لے کر امت مسلمہ کو ایک نئی انرجی عطا کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ آپ نے اپنی مختلف تصانیف میں ذکر کیا ہے۔ یہ بات عبد الرحمن صاحب نے بڑے مضبوط انداز میں پیش کی۔ یہ نشریہ روزانہ پیش کیا جاتا ہے کسی بھی بڑے مصنف ومفکر وادیب کی کتاب میں سے جس کا عنوان ہوتا ہے "قراة من الكتاب" خدائے تعالی کا شکر ہے الرسالہ تحریک عالم اسلام کی اہم تحریکوں میں اور اپنی حیثیت میں منفرد تحریک کا مقام حاصل کر چکی ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ اس عظیم تحریک میں ہیں وہ استعمال ہونے اور لگنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

۸۔ ایک صاحب دھولیہ سے لکھتے ہیں: الرسالہ کیسٹ نمبر ۲ (جدید امکانات) کے لیے مبارکباد قبول فرمایئے۔ آپ نے صحیح راستہ کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔ ان دنوں یہاں مولانا ......

کی ایک تقریر قرآن پر پابندی کے سلسلہ میں بہت دھوم کر رہی ہے۔ اس کے بعد جب "جدید امکانات" کو میں نے سنا تو میں سکتے میں رہ گیا کہ یہ بھی ایک طریقہ ہے اور وہ بھی ایک طریقہ تھا۔ وہ طریقہ چندہ پر ختم ہوا اور یہ دینی تبلیغ پر ختم ہوتا ہے (۷، ستمبر ۱۹۸۵)

ایک صاحب بمبئی سے لکھتے ہیں: الرسالہ میں ایک منفرد بات یہ ہے کہ اسے کسی بھی شخص کو خواہ وہ کسی بھی شعبہ کا ہو اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو دینے میں ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ یہ بات کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔ ہمیں کوئی بھی پرچہ دینے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے اور بہت سی جگہ نہ دینے پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ الرسالہ خدا کا خوف، حضور سے شدید محبت اور ایمان مضبوط کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ غصہ، تکبر، گھمنڈ کم ہوتا ہے اور آخرت کا ڈر اور اسلام کو پھیلانے کا احساس بڑھتا ہے۔ ایک پروفیسر صاحب الرسالہ (انگریزی) پر نظر ڈالتے ہوئے خود بخود کہہ اٹھے، بے شک بے شک ــــ آج کے دور میں کم خرچ، کم وقت اور زیادہ مناسب طریقہ پر ہم غیر مسلموں میں اسلام کو "انگریزی" الرسالہ کے ذریعے ہی پیش کر سکتے ہیں۔

۱۰۔ مالیگاؤں سے ایک ندوی عالم لکھتے ہیں: الرسالہ جولائی ۱۹۸۵ موصول ہوا۔ "طلاق کا مسئلہ" پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی بے آب وگیاہ صحرا میں آبلہ پا اور خشک دہن پانی کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ اچانک کسی نے آب زلال کا ایک چھلکتا ہوا جام میرے سامنے کر دیا ہو۔ یہ بالکل اپنے دلی تاثر کی سچی اور غیر مبالغہ آمیز، نیز غیر عقیدت آمیز ترجمانی ہے۔ فی الواقع یہ مختصر سا مضمون موجودہ مشکلات ومسائل کے ایک نہایت اہم مسئلے کا مثبت اور مدلل جواب ہے جو یقیناً بے چین اور تڑپتی ہوئی اور بے چارگی وبے بسی کے احساس سے پیچ وتاب کھاتی ہوئی روحوں کے لیے تسکین کا سامان ہے۔ یعنی نفقہ مطلقہ کے متعلق ہماری عدالت عالیہ کے فیصلہ سے مخلصان اسلام اور دردمندان شریعت کو جو قلبی اذیت وجراحت پہونچی ہے۔ اس کی جلن اور سوزش کا مرہم ہے۔

۱۱۔ جناب ڈاکٹر اوصاف علی صاحب نے اطلاع دی ہے کہ "پیغمبر انقلاب" کا ترجمہ انڈونیشی زبان میں شائع ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر اوصاف علی صاحب کے خط کا عکس یہاں دیا جا رہا ہے۔

INDIAN INSTITUTE OF ISLAMIC STUDIES

Phones : 653817
344236

TUGHLAQABAD
NEW DELHI-11(

27/ ستمبر 1985

مکرمی و محترمی ! السلام علیکم ۔

اگست میں میں انڈونیشیا گیا ہوا تھا ۔ وہاں ایک کتب خانہ میں مجھے آپ کی کتاب نظر آئی جسکا عنوان یہ ہے ۔ (Revolusi Pemikiran Islam) معلوم نہیں مترجم نے آپ سے ترجمہ کرنے کی اجازت لی یا نہیں اور آپ کو ترجمہ کا کوئی نسخہ بھیجا یا نہیں ۔ آج کل انڈونیشیا میں بے شمار کتابوں کے ترجمے شائع ہو رہے ہیں ۔ آپ کی کتاب کے ناشر کا پتہ ذیل میں درج ہے ۔ میں وہاں تک نہیں پہونچ سکا ورنہ آپ کے لئے ایک نسخہ خرید لاتا ۔

Media Da'wah
Jl. Karamat Raya 45
Jakarta Pustat

امید ہے آپ امریکہ میں ہونے والی عالمی مذاہب کانفرنس میں شرکت کی تیاری کر رہے ہوں گے ۔

والسلام

اوصاف علی

اوصاف علی

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ
کیسٹ

الرسالہ کیسٹ کی روانگی شروع ہوگئی ہے

انفرادی خریدار اطلاع بھیج کر جلد اپنی خریداری درج کرادیں۔

جو حضرات اس کی ایجنسی لینا چاہیں

وہ بھی اپنی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں۔

الرسالہ کیسٹ کی ایجنسی کم از کم پانچ کیسٹوں پر دی جائے گی۔

کمیشن:

۲۵ کیسٹ تک — ۲۰ فی صد

۲۵ کیسٹ سے زیادہ — ۲۵ فی صد

(ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ)

الرسالہ کیسٹ

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دھلی ۱۱۰۰۱۳

Regd. No D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

November 1985
Issue No. 108

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

الرسالہ کیسٹ

ماہانہ کیسٹ سیریز



عصری اسلوب میں اسلامی تعلیمات

مولانا وحیدالدین خاں کی آواز میں

ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ	ششماہی (۶ کیسٹ) ۱۴۰ روپیہ	سالانہ (۱۲ کیسٹ) ۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے ۵ ڈالر امریکی	۲۵ ڈالر امریکی	۵۰ ڈالر امریکی

مزید معلومات کے لیے لکھیں

الرسالہ کیسٹ

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

AL-RISALA CASSETTE C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

2/26/2

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

الرسالہ

کامیابی کسی آدمی کی اس صلاحیت کا نام ہے کہ
وہ غیر موافق حالات کو موافق حالات میں تبدیل کر سکے

شمارہ ۱۰۹

دسمبر ۱۹۸۵

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

الله اکبر	30/-
تذکیر القرآن جلد اول	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاء اسلام	20/-
پیغمبر انقلاب	25/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	5
تجدید دین	4/-
اسلام دین فطرت	3 -
تعمیر ملت	3 -
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	5
عقلیات اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	3/-
راہیں بند نہیں	3/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبر اسلام	2/-
حقیقت حج	4/-
آخری سفر	3/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-
حل یہاں ہے	3/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیات طیبہ	3/-
باغ جنت	4/-
نار جہنم	3/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عقل کا فیصلہ	
کاروان اسلام	
راز حیات	

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۰۹ دسمبر ۱۹۸۵

فہرست

تعصب کی قیمت

اسپین یورپ کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ وہ ہزاروں برس سے ایک انتہائی پسماندہ ملک کی
ت رکھتا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں عرب مسلمان اس ملک میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد
بار اسپین کی ترقی شروع ہوئی۔ عربوں کی آٹھ سو سالہ حکومت کے دوران اسپین نے غیر معمولی ترقی کی۔
کہ یورپ کے اسی پسماندہ ملک سے یورپ کی جدید شاندار ترقیوں کا آغاز ہوا۔

مگر تعصب اندھا ہوتا ہے۔ عیسائیوں نے اپنی متعصبانہ ذہنیت کی بنا پر مسلمانوں کے کارناموں کا
راف نہیں کیا۔ انھوں نے اسپین کی مسلم سلطنت کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ مسلمانوں کے
ی اختلافات نے انھیں موقع دیا۔ یہاں تک کہ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں اسپین سے مسلم
لطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ تین ملین مسلمان یا تو ملک سے نکال دیے گئے یا بے رحمی کے ساتھ مار ڈالے گئے
سٹری آف دی عربس، صفحہ ۵۵۶)

مگر اسپین کے عیسائیوں کا یہ عمل ان کے لیے الٹا پڑا۔ اس سے انھیں اپنے متعصبانہ ذہن کی تسکین
سوا اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ مسلمانوں کے نکلنے کے بعد اسپین کبھی دوبارہ ترقی نہ کر سکا۔ مشہور مورخ
ن پول نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> The Moors were banished; for a while Christian Spain shone, like the moon, with a borrowed light; then came the eclipse, and in that darkness Spain has grovelled ever since.
>
> Lane-Poole, *Moors in Spain* p. 280

بی مسلمان ملک سے نکال دیے گئے۔ عیسائی اسپین ایک لمحہ کے لیے چاند کی طرح غیر کی روشنی سے چمکا۔
راس پر گرہن آ گیا۔ اور اسپین اس وقت سے آج تک اسی تاریکی کی ذلت میں پڑا ہوا ہے۔ ایک
ت تھا کہ مسلمانوں کا کسی ملک میں جانا وہاں ترقی کا جانا تھا اور مسلمانوں کا وہاں سے نکلنا ترقی کا نکل جانا۔
معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ دوسری طرف اسپین اور اس کے جیسے دوسرے ممالک کے لیے بھی اس
سبق ہے۔ وہ یہ کہ تعصب بظاہر دوسرے کے خلاف کیا جاتا ہے۔ مگر اس کی سب سے بڑی قیمت خود
قوم کو ادا کرنی پڑتی ہے جس نے تعصب کا معاملہ کیا تھا۔

آہ یہ انسان

انسان خدا کو ناراض کرنے والے الفاظ بولتا ہے ، وہ بھول جاتا ہے کہ اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ انسان جہنمی افعال کرتا ہے ، حالانکہ جہنم کی ایک آنچ سہنے کی طاقت بھی اس کے اندر نہیں۔ آہ ، کتنا زیادہ کمزور ہے انسان ، اس کے باوجود وہ کتنا زیادہ ڈھیٹ بنا ہوا ہے ۔

انسان کے سامنے ایک سچائی آتی ہے جس کا وہ انکار نہ کر سکے ، اس کے باوجود وہ اس کو حقارت کے ساتھ نظر انداز کر دیتا ہے ۔ انسان کی غلطی دن کی روشنی کی طرح اس پر واضح کی جاتی ہے ، پھر بھی وہ اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتا ۔ انسان کے پاس اپنے ناصح کو رد کرنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہوتی ، مگر وہ عیب جوئی اور الزام تراشی کر کے ظاہر کرتا ہے کہ ناصح اس قابل ہی نہیں کہ اس کی بات مانی جائے ۔

انسان خود ظالم ہوتا ہے اور وہ دوسرے کے ظلم کا اعلان کرتا ہے ۔ انسان اپنے قدموں کے نیچے فساد برپا کیے ہوئے ہوتا ہے اور دوسروں کو مفسد قرار دے کر وہ ان کے خلاف تخریب کاری کی مہم چلاتا ہے ۔ انسان اپنے حقوق کی ادائیگی میں آخری حد تک غافل ہوتا ہے اور دوسروں کے حقوق کا جھنڈا اٹھا کر زمین و آسمان ایک کر دینا چاہتا ہے ۔

انسان اپنی قیادت کی خاطر جھوٹے نعرے لگاتا ہے ، خواہ اس کے نتیجہ میں پوری قوم ہلاکت کا شکار ہو جائے ۔ انسان اپنے کو بڑا بنانے کے لیے دوسروں کو چھوٹا کر دینا چاہتا ہے ، خواہ دوسرے کو چھوٹا کرنے کی یہ کوشش خدائی حقیقت کو چھوٹا کرنے کے ہم معنی کیوں نہ ہو ۔ انسان خوش خیالیوں میں جیتا ہے ، حالانکہ اس دنیا میں حقیقت کے سوا کوئی چیز نہیں جہاں آدمی کو زندگی کا سایہ مل جائے ۔

انسان کا حال یہ ہے کہ وہ بالکل بے حقیقت ہوتا ہے اور اپنے کو حقیقت کے روپ میں ظاہر کرتا ہے انسان اپنی بڑائی کے گنبد کو باقی رکھنے کے لیے اپنی ساری طاقت لگا دیتا ہے حالاں کہ آخر کار جو واقعہ ہونے والا ہے وہ یہ کہ وہ اور اس کا گنبد دونوں ایک ہی مشترک قبرستان میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائیں ۔

انسان کو خدا نے جنت میں بسنے کے لیے بنایا تھا ، مگر انسان کو جہنم کے راستوں میں دوڑنے کے سوا کسی اور چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ۔

زمانہ کے خلاف

شہر کی پوش کالونی میں ایک آدمی آواز لگا رہا تھا :

برتن قلعی والا ، برتن قلعی والا

وہ آواز لگاتا ہوا تمام سڑکوں پر گھومتا رہا۔ مگر شاندار مکانات میں سے کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہ دی۔ ساری کالونی میں کسی کے یہاں بھی اس کو کام نہ ملا۔

کیا یہ تعصب کا معاملہ تھا۔ کیا ظلم اور گھمنڈ کی وجہ سے لوگوں نے "برتن قلعی والے" کو کام نہیں دیا۔ ہو سکتا ہے کہ "برتن قلعی والا" اسی طرح سوچتا ہو۔ وہ ایک جاہل آدمی تھا۔ اس کے باپ دادا یہی کام کرتے تھے۔ وہ خود چالیس سال سے یہی کام کر رہا ہے۔ اس بنا پر اس کا ذہن "برتن قلعی" میں اتنا گم ہو چکا ہے کہ وہ اس سے باہر نکل کر سوچ نہیں سکتا۔

مگر جو شخص "برتن قلعی" سے باہر کی حقیقتوں کو جانتا ہو ، جو وسیع تر دائرہ میں سوچ سکے ، وہ بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ برتن قلعی والے کو کالونی میں کام نہ ملنے کی وجہ کیا تھی۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ قلعی کا کام تانبے پیتل کے برتنوں میں ہوتا ہے ، جب کہ کالونی کے تمام مکانات میں اسٹین لس اسٹیل کے برتن استعمال ہو رہے تھے۔ پھر یہاں برتن قلعی والے کو کام ملتا تو کس طرح ملتا۔

موجودہ دنیا میں کامیابی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی وقت کو پہچانے۔ وہ زمانہ کے تقاضوں سے واقف ہو۔ جو شخص وقت اور زمانہ کو نہ جانے اس کا حال وہی ہو گا جو مذکورہ آدمی کا ہوا۔ وہ اسٹین لس اسٹیل استعمال کرنے والوں کے درمیان "برتن قلعی" کی آواز لگاتا رہے گا اور وہاں کوئی بھی شخص نہ ملے گا جو اس کا خریدار بن سکے۔ وہ اپنی خلاف زمانہ دکانداری کی بنا پر ناکام ہو گا اور پھر دوسروں کو الزام دے گا کہ انھوں نے تعصب اور ظلم کی وجہ سے میری دکان چلنے نہ دی۔ لیاقت کے دور میں تحفظ کا مطالبہ ، معانی کی دنیا میں الفاظ کا کرتب دکھانا ، حقیقت کے بازار میں خوش خیالی کی قیمت پر سودا حاصل کرنے کی کوشش ، یہ سب اسی قسم کی خلاف زمانہ حرکت ہے۔ اور ایسی ہر کوشش کا ایک ہی انجام ہے ، اور وہ یہ کہ ان کا کوئی انجام نہیں۔

حکمت کی بات

قال ابن عباس : ما انتفعت بشیء بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم انتفاعی بکلمات کتبھن الی امیر المومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ قال : کتب الی : بسم اللہ الرحمن الرحیم . امابعد : فان المرء یفرح بادراک مالم یکن لیفوتہ ـ ویغتم بفوت مالم یکن لیدرکہ ـ فاذا آتاک اللہ من الدنیا شیئاً فلا تکثرن بہ فرحاً . واذا منعک منہا فلا تکثرن علیہ حزنا . ولیکن ھمک لما بعد الموت . والسلام

حضرت عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد جس کلام سے مجھ کو سب سے زیادہ فائدہ حاصل ہوا وہ امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ایک خط تھا۔ انھوں نے مجھے لکھا :
بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ آدمی ایک ایسی چیز کو پاکر خوش ہوتا ہے جس کو وہ کھونے والا نہ تھا۔ اور ایک ایسی چیز کو کھو کر غمگین ہوتا ہے جس کو وہ پانے والا نہ تھا۔ پس جب اللہ تم کو دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز دے تو تم اس کو پاکر بہت زیادہ خوش نہ ہو۔ اور جب اللہ دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز تم سے روکے تو تم اس پر بہت زیادہ غمگین نہ ہو۔ اور تمہاری فکر اس چیز کے لیے ہونا چاہیے جو موت کے بعد ہے۔ والسلام

کیوں ایسا ہے کہ لوگ کوئی چیز پاتے ہیں تو اس پر ناز کرنے لگتے ہیں اور اگر وہ کوئی چیز کھوتے ہیں تو غم اور مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ پانے کو کامیابی سمجھتے ہیں اور کھونے کو محرومی۔ حالانکہ اس دنیا میں نہ تو پانا کامیابی ہے اور نہ کھونا محرومی۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں پانا اور کھونا دونوں امتحان کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ تعالٰے ہر آدمی کو جانچنا چاہتا ہے۔ اسی مصلحت کے تحت وہ کبھی کسی کو ایک چیز دیتا ہے اور کبھی کسی سے کوئی چیز چھین لیتا ہے۔ دونوں ہی کا مقصد آزمائش ہے۔ اللہ تعالٰی یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کا بندہ پاکر کیسا بنتا ہے اور کھو کر اس کا کیسا حال ہوتا ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جان لے تو پانے پر فخر وناز کرنا بھی اس کو اتنا ہی بے معنی معلوم ہوگا جتنا کھونے پر آہ وفغاں کرنا۔

بادشاہی

دور اول میں خلافت اسلامی کو غیر معمولی پھیلاؤ ہوا۔ اس کے باوجود بنو امیہ کے عہد تک خلافت کا ایک ہی مرکز (دمشق) تھا۔ عباسی انقلاب کے بعد اندلس میں علاحدہ سلطنت قائم ہوئی۔ اس طرح حکومتِ اسلامی کے دو مرکز ہوگیے۔ جلد ہی بعد مراکش میں تیسرا آزاد سیاسی مرکز قائم ہوا۔ پھر مصر میں خود مختار حکومت قائم ہوگئی۔ اس طرح ایک کے بعد ایک آزاد مسلم سلطنتیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ ایک عظیم مسلم سلطنت بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی۔

انھیں آزاد سلطنتوں میں سے ایک وہ تھی جس کو دولت سامانیہ کہا جاتا ہے۔ سامانی سلطنت ایران میں ابھری اور تقریباً ڈیڑھ سو سال تک قائم رہ کر ختم ہوگئی۔

اسی سامانی سلطنت کا ایک حاکم نصر بن احمد بن سامان (۳۰۱ - ۳۳۱ ھ) تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس نے نیشاپور کو اپنی سلطنت میں شامل کیا تو نیشاپور میں داخل ہوکر وہاں اس نے ایک دربار کیا۔ جب وہ اپنے مخصوص تخت پر بیٹھا تو اس کی فرمائش کے مطابق تخت نشینی کی افتتاحی رسم قرآن کی تلاوت سے شروع ہوئی۔ مجلس میں ایک عالم اور حافظ موجود تھے۔ انھوں نے قرآن کی تلاوت کی۔ انھوں نے سورہ المومن کا ایک حصہ پڑھا جس میں یہ آیت بھی تھی:

یوم ھم بارزون لا یخفیٰ علی اللہ منھم شئ. لمن الملک الیوم للہ الواحد القھار (المومن ۱۶)	جس دن کہ وہ ظاہر ہوں گے۔ اللہ سے ان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ آج بادشاہی کس کے لیے ہے۔ اللہ واحد و قہار کے لیے۔

مذکورہ بزرگ جب قرآن پڑھتے ہوئے اس آیت پر پہونچے تو سلطان نصر بن احمد پر لرزہ طاری ہوگیا۔ وہ ہیبت زدہ ہوکر تخت سے اتر پڑا۔ تاج کو اپنے سر سے اتارا اور سجدہ میں گرگیا۔ اس نے کہا: اے میرے رب، بلاشبہ بادشاہی تیری ہے نہ کہ میری۔

سلطان کو جس چیز نے تخت سے اترنے پر مجبور کیا وہ اس کی حقیقت پسندی تھی۔ یہ حقیقت پسندی بلاشبہ انسان کی سب سے بڑی صفت ہے۔ حقیقت پسند انسان ہی سچائی کا اعتراف کرتا ہے۔ حقیقت پسند انسان ہی اس دنیا میں اعلیٰ کارنامے انجام دیتا ہے۔

ہار میں جیت

دوسری عالمی جنگ (۴۵ - ۱۹۳۹) میں ابتداءً امریکہ براہ راست شامل نہ تھا۔ تاہم ہتھیار اور سامان کے ذریعہ اس کی مدد برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کی طاقت کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ جاپان نے امریکہ کے خلاف ایک خفیہ منصوبہ بنایا۔ اس نے ۷ دسمبر ۱۹۴۱ کو اچانک امریکہ کے بحری اڈہ پرل ہاربر (Pearl Harbor) پر شدید حملہ کیا اور اس کو تباہ کردیا۔ تاہم امریکہ کی ہوائی طاقت بدستور محفوظ رہی۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ امریکہ میں ایٹم بم کی پہلی کھیپ زیر تکمیل تھی۔ چنانچہ اس کے مکمل ہوتے ہی امریکہ نے جاپان سے مطالبہ کیا کہ وہ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دے ورنہ اس کو برباد کردیا جائے گا۔ جاپان کو امریکہ کی جدید قوت کا اندازہ نہ تھا۔ اس نے اس کو منظور نہیں کیا۔ چنانچہ ۱۴ اگست ۱۹۴۵ کو امریکہ نے جاپان کے دو صنعتی شہروں، ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے ایک لمحہ میں جاپان کی فوجی طاقت تہس نہس ہو کر رہ گئی۔ جاپان نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈالنے کا اعلان کردیا۔

اس کے فوراً بعد جنرل میکارتھر (Douglas Macarthur) امریکی فوجوں کے ساتھ جاپان میں اتر گئے۔ جاپان کے اوپر مکمل طور پر امریکہ کا فوجی قبضہ ہو گیا۔

جاپان اگرچہ خالص ہتھیار کے اعتبار سے شکست کھا چکا تھا مگر جاپانیوں کے درمیان جنگی جنون بدستور باقی تھا۔ جاپانیوں کا جنگی جنون اس زمانہ میں اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ اپنے جسم میں بم باندھ کر جہازوں کی چمنی میں کود جاتے تھے۔ اب جنرل میکارتھر کے سامنے یہ سوال تھا کہ اس جنگی جنون کا خاتمہ کس طرح کیا جائے۔ جنرل میکارتھر نے اس کا حل اس تدبیر میں تلاش کیا کہ جاپانیوں کے جذبہ کو جنگ سے ہٹا کر معاشی سرگرمیوں کی طرف پھیر دیا جائے۔ ایک امریکی مبصر اینتھونی لیویس (Anthony Lewis) نے لکھا ہے:

When Japan surrendered, 40 years ago, Gen. Douglas Macarthur undertook not just to occupy but to remake the country. If he had been asked then what his most extravagant hope was, I think he might have said: to channel the drive of this aggressive people away from militarism and into economic ambition.

جب جاپان نے ۴۰ سال پہلے ہتھیار ڈالے تو جنرل میکارتھر نے نہ صرف جاپان پر فوجی قبضہ کر لیا بلکہ اسی کے ساتھ ان کی مہم یہ تھی کہ وہ ملک کی از سر نو تشکیل کریں۔ اگر اس وقت ان سے پوچھا جاتا کہ ان کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے تو میرا خیال ہے کہ وہ یہ کہتے کہ جاپان کے جارح عوام کے جوشش کو جنگ کے بجائے اقتصادی حوصلوں کی طرف موڑ دینا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ اگست ۱۹۸۵)

اب جاپان کے لیے ایک صورت یہ تھی کہ وہ اپنے ذہن کو باقی رکھتا۔ اگر کھلے طور پر میدان جنگ میں لڑنے کے مواقع نہیں تھے تو خفیہ طریقہ پر امریکہ کے خلاف اپنی مقابلہ آرائی کو جاری رکھتا۔ آخری درجہ میں وہ اس کام کو کرسکتا تھا جس کا نمونہ ہندستان کے مسلمانوں میں نظر آرہا ہے۔ یعنی اپنے مفروضہ حریف کے خلاف الفاظ کی بے فائدہ جنگ جاری رکھنا۔

مگر جاپان نے فاتح کی پیش کش کو قبول کرتے ہوئے فوراً اپنے عمل کا رُخ بدل دیا۔ اس نے امریکہ سے براہ راست ٹکراؤ کو مکمل طور پر ختم کر دیا اور اپنی تمام قوتوں کو سائنسی تعلیم اور ٹکنکل ترقی کے راستہ میں لگا دیا۔

اس کا نتیجہ عظیم الشان کامیابی کی شکل میں برآمد ہوا۔ جاپان نے تیزی سے اقتصادی ترقی شروع کی۔ اس نے ۱۹۷۱ میں چھ بلین ڈالر کا تجارتی سامان امریکہ بھیجا تھا، اس کے بعد جاپانی مصنوعات کی مقبولیت امریکہ میں بڑھتی رہی یہاں تک کہ موجودہ اندازہ کے مطابق ۱۹۸۵ میں جاپان کے مقابلہ میں امریکہ کا تجارتی خسارہ (Trade deficit) کی مقدار ۴۵ بلین ڈالر تک پہونچ جائے گا (ٹائمس آف انڈیا ۴ ستمبر ۱۹۸۵)

نیوز ویک (۱۲ اگست ۱۹۸۵) میں ایک رپورٹ بعنوان *(JAPAN: The 40-year Miracle)* چھپی ہے۔ اس میں ۱۹۴۵ میں جاپان کی کامل بربادی کے چالیس سال بعد اس کی غیر معمولی ترقی کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جاپانی قوم افسانوی پرندہ کی طرح خود اپنی راکھ کے اندر سے اٹھ کھڑی ہوئی:

The nation rose like the mythical phoenix from its own ashes.

جاپان کو خود اپنے فاتح کے مقابلے میں یہ کامیابی اس لیے حاصل ہوئی کہ اس نے اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔ حقیقت کا اعتراف ہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔ اگرچہ بہت سے نادان لوگ حقیقت کے انکار میں کامیابی کا راز تلاش کرنے لگتے ہیں۔

زمانہ کی قسم

وَالْعَصْرِ. اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ. قسم ہے زمانہ کی۔ بے شک انسان بڑے خسارہ میں ہے، سوا ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔

عصر کا مطلب ہے گزرا ہوا زمانہ۔ "گزرتے ہوئے" زمانہ میں انسان ایک "ٹھہری ہوئی" مخلوق ہے۔ وہ بقیہ کائنات کے سرگرم قافلہ کے ساتھ لازمی طور پر بندھا ہوا نہیں ہے۔ انسانی زندگی کی یہ آزاد نوعیت بتاتی ہے کہ اس دنیا میں کامیابی کے لیے آدمی کو بالارادہ کوشش کرنا ہے، جب کہ ناکامی اس کی طرف اپنے آپ چلی آرہی ہے۔

ایک بزرگ نے کہا کہ سورہ عصر کا مطلب میں نے ایک برف بیچنے والے سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ لوگو اس شخص پر رحم کرو جس کا اثاثہ گھل رہا ہے، لوگو اس شخص پر رحم کرو جس کا اثاثہ گھل رہا ہے۔ اس کی پکار کو سن کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ جس طرح برف پگھل کر کم ہوتا رہتا ہے اسی طرح انسان کو ملی ہوئی عمر بھی تیزی سے گزر رہی ہے۔ عمر کا موقع اگر بے عملی یا بُرے کاموں میں کھو دیا جائے تو یہی انسان کا گھاٹا ہے (تفسیر کبیر امام رازی)

انسان اپنی عمر رواں کے ساتھ آخرت کے ابدی انجام کی طرف چلا جا رہا ہے۔ وہ ایسے فیصلہ کن مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں کامیابی صرف اس شخص کے لیے ہے جس نے اپنے عمل سے اس کا استحقاق پیدا کیا ہو۔ جو شخص عملی استحقاق کے بغیر وہاں پہونچے اس کے لیے آخرت کے دن ابدی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

موجودہ دنیا ایک انتہائی مکمل دنیا ہے۔ یہاں انتہائی بامعنی قسم کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اور یہ سب کچھ ایک پابند نظام کے تحت ہو رہا ہے۔ وسیع کائنات اپنے بے شمار اجزاء کے ساتھ ایک زبردست خدائی قانون میں جکڑی ہوئی ہے۔ ہر چیز ٹھیک وہی کرنے پر مجبور ہے جس کے لیے اس کو بنایا گیا ہے۔ مگر انسان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ انسان، دوسری تمام چیزوں کے برعکس، بالکل آزاد ہے۔ اگرچہ انسان کی فلاح بھی تمام تر اسی میں ہے کہ وہ بقیہ کائنات کا ہم سفر بن جائے۔ تاہم کائناتی طریقہ کو اختیار

کرے یا نہ کرے کا معاملہ تمام تر اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے، وہ چاہے تو اس کو اپنا لے اور چاہے تو نہ اپنائے۔

کائنات کے مقابلہ میں انسان کی مثال ایسی ہے جیسے ٹرین کے مقابلہ میں اسٹیشن پر کھڑے ہوئے مسافر کی۔ ٹرین اپنے تمام اجزار سمیت انجن کے ساتھ بھاگی چلی جارہی ہے۔ ٹرین کا ہر ڈبہ انجن سے بندھا ہوا ریل کی پٹری پر دوڑ رہا ہے۔ مگر مسافر اور ڈبہ میں یہ فرق ہے کہ ڈبہ تو انجن سے بندھا ہوا اپنے آپ چلا جارہا ہے۔ مگر انسان اس وقت ٹرین کا مسافر بنتا ہے جب کہ وہ بالقصد اپنے کو اس کے اندر داخل کر کے اس کا شریک سفر بننے پر راضی ہو جائے۔ گویا ہم کو ٹرین کا ہم سفر بننے کے لیے تو ارادی عمل کی ضرورت ہے مگر ٹرین سے بچھڑنے کے لیے کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ بچھڑنے کا واقعہ اپنے آپ ہو رہا ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے برف پگھل کر ختم ہونے کا واقعہ اپنے آپ ہو رہا ہے۔ مگر اس کو بیچ کر اس سے نفع حاصل کرنے کے لیے بالقصد عمل کی ضرورت ہے۔ یا جیسے کسی طالب علم کے امتحان میں ناکام ہونے کے لیے تو صرف اتنی بات کافی ہے کہ وہ کچھ نہ کرے۔ لیکن اگر وہ کامیاب ہونا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ امتحان کے نظام میں اپنے آپ کو شریک کرے اور ان تقاضوں کو پورا کرے جو تعلیم کے ذمہ داروں نے مقرر کیا ہے۔

انسان کی زندگی کا زیادہ بڑا حصہ وہ ہے جو موت کے بعد شروع ہونے والا ہے۔ موت سے پہلے کی زندگی اس کے پورے عرصۂ حیات کا محض ایک ابتدائی وقفہ ہے۔ یہی مختصر وقت انسان کا اصل سرمایہ ہے کیوں کہ اسی پر اس کی آئندہ آنے والی طویل تر زندگی کا فیصلہ ہوتا ہے۔

اس مختصر وقت کو صحیح طور پر استعمال کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اس میں معمولی غفلت بھی ناقابلِ تلافی نقصان کی صورت میں انسان کو بھگتنی پڑے گی۔

اس مختصر وقت کو صحیح استعمال کرنے والا کون ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو موجودہ دنیا میں تین باتوں کا ثبوت دے سکے۔ ایک وہ جس کو ایمان کہا جاتا ہے۔ یعنی حقیقت کا شعور اور اس کا اعتراف۔ دوسرے عمل صالح۔ یعنی عین وہی کرنا جو کرنا چاہیے اور وہ نہ کرنا جو نہیں کرنا چاہیے۔ تیسرے حق و صبر کی تواصی۔ یعنی حقیقت کا ادراک اتنا گہرا ہو کہ آدمی اس کا داعی اور مبلغ بن جائے۔

ایک تجربہ

گجرات کی ایک مسلم برادری ہے جس کا نام مومن برادری ہے۔ عام طور پر اس کو چلیا برادری کہا جاتا ہے۔ یہ ایک تجارت پیشہ برادری ہے۔ ان کے افراد مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بمبئی میں یہ برادری تقریباً ۲۵ ہزار کی تعداد میں آباد ہے۔

تجارت سے آدمی کے اندر ایک مخصوص کردار پیدا ہوتا ہے۔ یہ کردار اس برادری میں پوری طرح موجود ہے۔ مثلاً، وہ ملازمت کرنے کے بجائے اپنی محنت سے کمانا پسند کرتے ہیں۔ ان کی زندگی نہایت سادہ ہوتی ہے۔ حتی کہ شادیوں میں ان کے یہاں جہیز کا کوئی رواج نہیں۔ وہ سیاسی جھگڑوں سے بالکل دور رہتے ہیں۔ ان کے درمیان باہمی اختلافات دوسرے مسلمانوں کی نسبت سے بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی باہمی اختلاف پیدا ہو جائے تو وہ اپنے بڑوں کے فیصلہ پر راضی ہو کر اختلاف ختم کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے اختلافی معاملات کے لیے کبھی عدالت میں نہیں جاتے۔

چلیا برادری کے اس مزاج کی وجہ سے اس کو دینی فائدہ بھی مل رہا ہے اور دنیوی فائدہ بھی۔ ان کے مزاج کی سادگی، حقیقت پسندی، بات کو مان لینے، کا نتیجہ یہ ہوا کہ تبلیغی تحریک کو اس نے بہت جلد قبول کر لیا۔ تبلیغ میں شامل ہونے سے مزید ان کے اندر اعتماد اور یقین کی نفسیات پیدا ہوئی۔ وہ ترقی کی راہ میں آگے بڑھتے چلے گئے۔

چلیا برادری کی مذکورہ نفسیات کا دوسرا زبردست فائدہ انھیں اتحاد کی صورت میں ملا۔ اس برادری کے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ بہت جلد تجارتی شرکت کو قبول کر لیتے ہیں۔ ان کی اکثر تجارتیں آپس کے مشترک سرمایہ سے چل رہی ہیں۔ ان کا ایک آدمی کہے گا کہ فلاں ہوٹل دس لاکھ روپے میں بک رہا ہے۔ آؤ ہم مل کر اس کو خرید لیں۔ اس کو نہایت آسانی سے سرمایہ لگانے والے افراد مل جائیں گے اور وہ مشترک سرمایہ سے ہوٹل کو خرید کر اس کو منظم انداز سے چلاتے رہیں گے اور ان کے درمیان کبھی کوئی جھگڑا نہیں پیدا ہوگا۔

موجودہ زمانہ میں کوئی بڑا کام کرنے کے لیے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سرمایہ عام طور پر

بینک فراہم کرتے ہیں۔ اسلام میں چونکہ سود کو حرام قرار دیا گیا ہے اس لیے بہت سے ترقی پسند یہ کہتے ہیں کہ اسلام اقتصادی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے کیوں کہ اقتصادی ترقی بینک کے سودی قرضوں سے ہوتی ہے اور سودی قرضہ پر کاروبار کرنے کی اسلام میں گنجائش نہیں۔

بمبئی کی چلیا برادری اس الزام کی عملی تردید ہے۔ چلیا برادری کا نمونہ بتاتا ہے کہ اقتصادی عمل کے لیے سودی مالیات لازمی نہیں ہیں۔ یہاں سودی مالیات کا ایک بدل موجود ہے۔ اور وہ ہے مشارکتی مالیات۔ یعنی حصہ داری کی بنیاد پر مشترک سرمایہ فراہم کرنا اور اس کے ذریعہ سے کئی آدمیوں کا مل کر کاروبار کرنا۔

یہ وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں کوآپریٹو سسٹم کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوآپریٹو نظام سودی نظام کا اسلامی بدل ہے۔ مگر کوآپریٹو نظام کے تحت اقتصادی عمل جاری کرنے کے لیے ایک لازمی شرط ہے اور وہ ہے اتحاد کا مزاج۔ چلیا برادری میں یہ مزاج پوری طرح پایا جاتا ہے اس لیے ان کے درمیان تجارتی مشارکت کامیاب ہے۔ عام مسلمانوں میں یہ مزاج موجود نہیں۔ اس لیے ان کے یہاں تجارتی مشارکت بھی نہیں پائی جاتی۔

اتحاد و اتفاق ایک ایسی چیز ہے جو ہر اعتبار سے مفید ہے، دین کے اعتبار سے بھی اور دنیا کے اعتبار سے بھی۔ مگر یہی وہ سب سے قیمتی چیز ہے جو آج مسلمانوں میں سب سے کم پائی جاتی ہے۔

زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت قومی مزاج کی ہوتی ہے۔ قوم کے اندر اگر تعمیری مزاج ہو تو اس کا ہر معاملہ اپنے آپ درست ہوتا چلا جائے گا۔ اس کے اندر وہی قیادت ابھرے گی جو واقعۃً صحیح قیادت ہو۔ غیر صالح قیادت اس کے اندر اپنی زمین نہ پا سکے گی۔ اس کے افراد کسی مفید کام کے لیے نہایت آسانی سے متحد ہو جائیں گے۔ دوسری قوموں سے اس کا غیر ضروری ٹکراؤ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

قومی مزاج کے صالح ہونے پر ہی قوم کی تمام ترقیوں کا انحصار ہے۔ اور اگر قوم کا مزاج بگڑا ہوا ہو تو ایسی قوم کو کوئی چیز بربادی سے نہیں بچا سکتی۔ اگر آپ کو قوم کی اصلاح کرنی ہو تو اس کے مزاج کی اصلاح کر دیجئے۔ اس کے بعد تمام چیزوں کی اصلاح اپنے آپ ہو جائے گی۔

جوہر شناسی

علامہ ابن قیم (۷۵۱ - ۶۹۱ھ) نے اپنی کتاب طرق الحکمیتہ میں ایک واقعہ اس طرح نقل کیا ہے :

روی عن عبدالعزیز بن ابی حازم عن ابیہ عن سھل بن سعد قال: تلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قولہ عز وجل: (افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا) وغلام جالس عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: بلی واللہ یارسول اللہ - ان علیھا لاقفالھا - ولایفتحھا الا الذی اقفلھا۔ فلما ولی عمر بن الخطاب طلبہ لیستعملہ وقال: لم ذالک الامن عقل (صفحہ ۶۶)

حضرت سہل بن سعد کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سورۂ محمد کی یہ آیت تلاوت فرمائی: کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر اس کے تالے پڑے ہوئے ہیں۔ اس وقت ایک لڑکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آیت سن کر کہا: ہاں، خدا کی قسم اے اللہ کے رسول، بیشک دل پر اس کے تالے ہوتے ہیں۔ اور ان کو کوئی نہیں کھول سکتا سوا اس کے جس نے اس کو لگایا ہے۔ پھر جب حضرت عمر بن خطابؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے اس لڑکے کو بلایا تاکہ اس کو کسی کام پر لگائیں۔ اور انھوں نے کہا: لڑکے نے یہ جو بات کہی وہ عقل سے کہی۔

جو لوگ اجتماعی معاملات کے ذمہ دار ہوں ان کے لیے افراد کی بے حد اہمیت ہوتی ہے۔ کسی ادارہ یا کسی اجتماعی عمل کی حسن کارکردگی کے ضامن ہمیشہ اس کے افراد ہوتے ہیں۔ ایسے افراد ہمیشہ معاشرہ میں موجود رہتے ہیں مگر جن ذمہ داروں کے ہاتھ میں افراد کے انتخاب کی ذمہ داری ہو ان کے اندر ایک صفت لازمی طور پر پائی جانی چاہیے۔ اور وہ یہ کہ وہ آدمی کے جوہر ذاتی کی بنیاد پر اس کا انتخاب کریں نہ کہ کسی اور بنیاد پر۔

ادارہ کے ذمہ دار میں اگر خویش پروری کا جذبہ ہو۔ اگر وہ خوشامدی انسانوں کو پسند کرتا ہو۔ اگر وہ یہ چاہتا ہو کہ اس کے گرد وپیش تمام لوگ اس سے کمتر صلاحیت کے ہوں تاکہ اس کی ذاتی بڑائی قائم رہے، ذمہ دار کے اندر اگر اس قسم کا مزاج ہو تو وہ ادارہ کو بے کار انسانوں کا کباڑ خانہ بنادیگا اس کے برعکس اگر اس کے اندر وہ مزاج ہو جس کا ایک نمونہ اوپر کے واقعہ میں نظر آتا ہے تو اس کا ادارہ ایک ایسا باغ ہوگا جس میں ہر قسم کے بہترین درخت لگے ہوئے ہوں، اور ہمیشہ وہ اپنا پھل دیتا رہے۔

اسلامی حکمراں

صلاح الدین ایوبی (۱۱۳۸ - ۱۱۹۳) مصری سلطان کی فوج میں معمولی سپاہی تھے۔ اپنے غیر معمولی
اموں کی وجہ سے وہ ۳۱ سال کی عمر میں مصری افواج کے سپہ سالار مقرر کیے گئے۔ اسی کے ساتھ
ں مصر کا وزیر بھی بنا دیا گیا اور انھیں مَلِک کا خطاب دیا گیا۔ بعد کو ایک انقلاب کے نتیجہ میں وہ
کے خود مختار سلطان ہو گئے۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ طویل صلیبی جنگوں کے درمیان یورپ کی مسیحی طاقتوں نے یروشلم (فلسطین)
بضہ کر لیا تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے مسلم حکمرانوں میں یہ تبلیغ کی کہ وہ اپنی متحدہ کوشش ہی سے
ی یلغار کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ مصر، شام وغیرہ ممالک کو متحد کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے پوری قوم میں جہادی روح پیدا کر دی۔ انھوں نے زبردست
ی کے بعد جولائی ۱۱۸۷ء میں حطین (فلسطین) کے مقام پر مسیحی افواج پر حملہ کیا اور ان کو فیصلہ کن شکست
۔ اس کے بعد سلطان صلاح الدین کی فوجوں نے تیزی سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ یروشلم
ے پہونچ گئیں اور بالآخر یروشلم کو فتح کر کے فلسطین کو دوبارہ اسلامی خلافت کا حصہ بنا دیا۔

تاہم سلطان صلاح الدین کی فوجی کارروائی نمایاں طور پر مسیحی اقوام کی کارروائیوں سے مختلف
ں۔ مسیحی اقوام نے فلسطین پر قبضہ کرنے کے بعد نہایت وحشیانہ انداز میں مسلمانوں کا قتل عام کیا
ا۔ اس کے برعکس سلطان صلاح الدین ایوبی نے مکمل ضبط سے کام لیا۔ انھوں نے کسی قسم کی
قامی کارروائی نہیں کی۔ اس سلسلہ میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے اعتراف
تے ہوئے لکھا ہے:

> Saladin's crowning achievement and the most disastrous blow to the whole crusading movement came on October 2, 1187, when Jerusalem, holy to both Muslim and Christian alike, surrendered to the Sultan's army after 88 years in the hands of the Franks. In stark contrast to the city's conquest by the Christians, when blood flowed freely during the barbaric slaughter of its inhabitants, the Muslim reconquest was marked by the civilized good faith and courteous behaviour of Saladin and his troops.
>
> *Encyclopaedia Britannica*, 1984 Volume 16, p. 177

صلاح الدین کی شاندار کامیابی اور پوری صلیبی تحریک کی سب سے زیادہ تباہ کن شکست ۲ اکتوبر ۱۱۸۷ء کو ظہور میں آئی جب کہ یروشلم، جو کہ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے نزدیک مقدس ہے، وہ ۸۸ برس تک مسیحیوں کے قبضہ میں رہنے کے بعد دوبارہ سلطان کی فوجوں کے قبضہ میں آگیا۔ مسیحیوں نے جب شہر پر قبضہ کیا تھا تو انھوں نے وحشیانہ طور پر اس کے باشندوں کو قتل کیا اور آزادانہ طور پر لوگوں کا خون بہایا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا دوبارہ قبضہ مہذب انسانوں کا قبضہ تھا۔ صلاح الدین اور اس کی فوجوں نے مفتوح کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کیا۔

رعایا کے ساتھ سلطان صلاح الدین ایوبی کا یہ انصاف محض اتفاقی نہ تھا۔ یہ اس کی اسلامیت کا نتیجہ تھا۔ صلاح الدین صرف ایک بہادر اور حوصلہ مند شہسوار ہی نہ تھا۔ وہ ایک خدا ترس اور عبادت گذار آدمی تھا۔ اس کا ذہن اسلامی تعلیمات کے تحت بنا تھا۔

اسلامی تعلیمات کے اثر سے سلطان صلاح الدین کا یہ حال تھا کہ وہ دنیا سے زیادہ آخرت کو اہمیت دیتا تھا۔ وہ اس بات سے ڈرتا تھا کہ قیامت میں اس سے اس کی رعایا کے بارہ میں پوچھ ہوگی۔ اسلام اس کے لیے اس میں مانع بن گیا تھا کہ اس کے اندر گھمنڈ کا مزاج پیدا ہو۔ اس کے برعکس اس کے اندر زہد اور تواضع کا مزاج تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے سلطان صلاح الدین کے زہد و تقویٰ کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ... and on March 4, 1193, he died. While his relatives were already scrambling for pieces of the empire, his friends found that the most powerful and most generous ruler in the Muslim world had not left enough money to pay for his grave. (16/178)

اور ۴ مارچ ۱۱۹۳ء کو صلاح الدین کا انتقال ہوگیا۔ جب کہ اس کے رشتہ دار ابھی سلطنت کے ٹکڑوں کے لیے آپس میں کشمکش کر رہے تھے، اس کے دوستوں نے پایا کہ مسلم دنیا کے سب سے زیادہ طاقت ور اور سب سے زیادہ فیاض حکمراں نے اپنے پیچھے اتنی رقم بھی نہیں چھوڑی ہے جو اس کی قبر کے اخراجات کو پورا کر سکے۔

مواقع کا استعمال

اسلامی تاریخ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ اجتماعی حکمت کی ایک عظیم الشان مثال ہے۔ مکہ کے قریش نے اگرچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی سخت مخالفت کی۔ مگر شروع ہی سے ان کے درمیان ایک عنصر موجود تھا جو یہ چاہتا تھا کہ ہم محمدؐ سے براہ راست نہ ٹکرائیں۔ بلکہ ان کا رُخ دوسرے عرب قبائل کی طرف پھیر دیں۔

مکہ کے سرداروں میں ایک ممتاز سردار عُتبہ بن ربیعہ تھا۔ ہجرت سے قبل کا واقعہ ہے کہ قریش نے ایک بار عُتبہ کو اپنا نمائندہ بنا کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا۔ اس ملاقات کا تفصیلی بیان سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ عُتبہ جب آپ سے گفتگو کے بعد واپس آیا تو اس نے قریش سے کہا:

یامعشر قریش اطیعونی وخلوا بین هذا الرجل وبین ماهو فیه فاعتزلوه. فان تُصِبْهُ العرب فقد کُفیتموهُ بغیرکم وان یَظْهَرْ علی العرب فملکه ملککم وعِزُّه عزّکم

(سیرت ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۳۱۴)

اے قریش کے لوگو، میری بات مانو اور اس آدمی کے درمیان اور جس میں وہ ہے اس کے درمیان حائل نہ ہو۔ اور اسے چھوڑ دو۔ اگر عرب اس سے نمٹ لیں تو وہ تمہارے لیے کافی ہو گیے۔ اور اگر وہ عرب پر غالب آگیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت ہے اور اس کی عزت تمہاری عزت ہے۔

اسی طرح ہجرت کے بعد جب قریش رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ بدر چھیڑنے کے لیے نکلے تو راستہ میں آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ اس وقت عتبہ نے قریش کے ایک گروہ کی نمائندگی کرتے ہوئے مکہ والوں سے کہا:

یامعشر قریش، انکم واللہ ماتصنعون بان تلقوا محمداً واصحابه شیئاً. واللہ لئن اصبتموه لایزال الرجل ینظر فی وجه رجل یکره النظر الیه۔۔۔ قتل ابن عمه او ابن خاله اورجلامن عشیرته۔

اے قریش کے لوگو، خدا کی قسم محمد اور ان کے اصحاب سے ٹکرا کر تم کچھ بھی حاصل نہ کرسکو گے۔ خدا کی قسم اگر ان سے تمہاری مڈبھیڑ ہوئی تو ہمارے ہر آدمی کے سامنے کسی ایسے آدمی کا چہرہ ہو گا جس کو قتل کرنا اسے پسند نہ ہو۔ یعنی چچا کا لڑکا، ماموں کا لڑکا یا اپنے قبیلہ

فارجعوا وخلّوا بین محمد وبین سائر العرب۔ فان اصابوہ فذالك الذی اردتم وان كان غیر ذالك الفاكم ولم تعرضوا منه ماتریدون

(سیرت ابن ہشام، الجزء الثانی، صفحہ ۲۶۳)

کا کوئی آدمی۔ اس لیے تم لوٹ چلو اور محمد اور عرب قبائل کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ اگر اہل عرب محمد پر غالب آگیے تو یہ وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو۔ اور اگر محمد عرب قبائل پر غالب آگیے تو محمد تم کو اس حال میں پائیں گے کہ تم نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی ہوگی (تمہاری پوزیشن محفوظ ہوگی)

موجودہ دنیا امتحان اور مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں یہ ممکن نہیں کہ فریق ثانی کو عین اپنی پسند کی شرطوں پر راضی کیا جاسکے۔ بیشتر حالات میں خود اپنے آپ کو فریق ثانی کی شرطوں پر راضی کرنا پڑتا ہے۔ یہی آدمی کی حکمت اور تدبیر کا امتحان ہے۔ یہاں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ فریق ثانی کی شرطوں میں کہاں وہ گنجائش ہے جس کو مان کر ہم اپنے لیے مستقبل کی تعمیر کا راستہ نکال سکتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر یہی کیا۔ آپ نے کمال دانش مندی کے ساتھ قریش کے مذکورہ ذہن کو سمجھا اور اس کو انتہائی حکمت کے ساتھ استعمال کیا۔ چنانچہ حدیبیہ کے مقام پر جب قریش نے آپ کو آگے بڑھنے سے روک دیا، اس وقت آپ نے قریش کو جو پیغام بھیجا اس میں یہ الفاظ بھی شامل تھے:

انا لم نجئ لقتال أحد ولكن جئنا معتمرین۔ وانّ قریشًا قد نهكتهم الحرب واضرّت بهم فان شاؤا ماددتهم مدة ویخلّوا بینی وبین الناس۔ فان أظهر فان شاؤا أن یدخلوا فیما دخل فیه الناس فعلوا والّا فقد جمّوا۔

ہم کسی سے لڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ بلکہ ہم عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اور جنگ نے قریش کا برا حال کر رکھا ہے اور ان کو سخت نقصان پہونچایا ہے۔ اگر وہ چاہیں تو میں ان کے لیے ایک مدت (صلح کی) مقرر کردوں اور وہ میرے اور دوسرے عرب قبائل کے درمیان سے ہٹ جائیں۔ اگر میں غالب رہا تو وہ چاہیں تو اس دین میں داخل ہوجائیں گے جس میں لوگ داخل ہوئے ہیں۔ اور اگر میں غالب نہ ہوا تو ان کا مدعا حاصل ہے۔

فتوحات کا راز

یورپ کے ملک اسپین اور افریقہ کے ملک مراکو کے درمیان ایک سمندری پٹی ہے جس کی چوڑائی بعض مقامات پر صرف ۸ میل ہے۔ یہاں اسپین کی جانب دو ساحلی مقامات کے نام یہ ہیں: طریفہ (Tarifa) اور جبرالٹر (Gibraltar)۔ یہ دونوں اسپینی شہر دو مسلم سرداروں کے نام پر ہیں۔ جن میں سے ایک کا نام طریف اور دوسرے کا نام طارق تھا۔ یہ دونوں مسلم سردار ۷۱۱ء (۹۲ھ) میں مراکو (مراکش) کے راستے سے کشتیوں کے ذریعہ اسپین میں داخل ہوئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اسپین میں شاہ لرزیق (King Roderick) کی حکومت تھی۔ بادشاہ کے مظالم سے بگڑ کر خود اسپین کے لوگوں نے مسلمانوں کو اسپین پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ مسلمانوں کی فوج جو ابتداءً اسپین میں داخل ہوئی اس کے ساتھ ایک اسپینی سردار کاؤنٹ جولین (Count Julian) بھی شامل تھا اور مسلمانوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اعتراف کیا ہے کہ ـــــ اسپین پر مسلمانوں کا حملہ گاتھ لوگوں کی دعوت کا نتیجہ تھا نہ کہ مسلمانوں کا اپنا اقدام:

> But the Muslim invasion of Spain was the result of Visigoth invitation rather than Muslim initiative (17/414).

اسپین کے لوگ بادشاہ کے مظالم سے تنگ آچکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اسپینی باشندوں نے تعجب خیز طور پر طارق ابن زیاد کی رضاکارانہ اطاعت قبول کرلی:

> Much to his surprise, many Spaniards submitted to him voluntarily (17/414).

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے مزید لکھا ہے کہ مسلمانوں کی فتح نے اسپینی سماج کے بہت سے عناصر کو فائدہ پہونچایا۔ ٹیکسوں کا بوجھ مجموعی طور پر اس سے کم سخت ہوگیا جو گاتھ عہد کے آخری برسوں میں اسپین میں تھا۔ غلام مزدور جنھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا ان کو آزاد حیثیت حاصل ہوگئی۔ یہود اب ستائے نہیں جا رہے تھے اور انھیں اب دوسرے اسپینی فرقوں کے برابر کا درجہ

حاصل تھا۔ اس طرح آٹھویں صدی کے نصف اول میں اسپین میں ایک نیا اور بالکل مختلف سماج پیدا ہوگیا۔

> The Muslim conquest brought advantages to many elements of society: the burden of taxes was on the whole less onerous than it had been in the last years of the Visigoth epoch; serfs who converted to Islam advanced into the category of freedom; Jews were no longer persecuted and were placed on an equal footing with the Hispano-Romans and Goths. Thus, in the first half of the 8th century, there was born a new quite different society in Muslim Spain (17/414).

یہاں جو بات اسپین کے مسلم عہد کے بارے میں کہی گئی ہے وہی مسلمانوں کی دوسری فتوحات کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں مسلمان جس طرح دنیا کے بڑے حصہ پر چھا گئے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ ممالک اپنے ملکی حکمرانوں کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ وہ کسی نئے نجات دہندہ کے انتظار میں تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہر جگہ مسلمانوں کو خوش آمدید کہا۔ بادشاہوں سے ضرور مسلمانوں کی لڑائیاں ہوئیں مگر ان ملکوں کے عوام کے دل اکثر مقامات پر مسلمانوں کے ساتھ تھے انھوں نے نہایت آسانی سے ہر جگہ مسلمانوں کی اطاعت قبول کرلی۔

اسپین کا آٹھ سو سالہ مسلم عہد تہذیب کی تاریخ میں انتہائی شاندار عہد تھا۔ مسلمانوں نے اس دور میں ہر اعتبار سے اعلیٰ ترین مثال قائم کی۔ کسی عیسائی پر کبھی مذہب کی بنیاد پر ظلم نہیں کیا گیا۔ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، اسلام کی خوبیوں سے آگاہ ہو کر آزادانہ طور پر کیا۔ انصاف کا حال یہ تھا کہ سلطان عبدالرحمٰن ثانی پر ایک عیسائی نے قاضی کے یہاں دعویٰ دائر کیا اور سلطان کو ایک عام آدمی کی طرح قاضی کی عدالت میں جانا پڑا۔

مسلمانوں نے تمام ملک میں سڑکوں اور نہروں کا جال بچھا دیا۔ جگہ جگہ پل بنائے گئے۔ تعلیم، تعمیر، معدنیات، زراعت، باغبانی، جہازرانی، صنعت، غرض کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں انھوں نے اسپین کو غیر معمولی ترقی نہ دی ہو۔

مگر تعصب اندھا ہوتا ہے، مسیحی لوگ تعصب کی بنا پر مسلمانوں کے دشمن ہوگئے۔ اس کی قیمت انھیں یہ دینی پڑی کہ اسپین پھر دوبارہ ترقی نہ کرسکا۔ مسلمانوں کی تاریخ ختم کرنے کی کوشش میں ان کی اپنی تاریخ بھی ختم ہوگئی۔

الرسالہ (انگریزی)

الرسالہ (اردو) ۱۹۷۶ میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس کا انگریزی اڈیشن فروری ۱۹۸۴ سے نکل رہا ہے اور ہر ماہ پابندی کے ساتھ خریداروں کے پاس پہنچ رہا ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کو اللہ کے فضل سے ملک کے اندر اور ملک کے باہر غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اہل زبان انگریزی دانوں نے اس کی زبان کی خوبی کا اعتراف کیا ہے اور اس کے لسانی اور علمی معیار کو سراہا ہے۔

مسلم دنیا میں بہت سے انگریزی رسالے اور اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ بظاہر ان کے نام مختلف ہیں۔ تاہم اگر مضامین کے اعتبار سے ان کا کوئی ایک مشترک نام رکھنا ہو تو وہ پروٹسٹ (احتجاج) ہوگا۔ ان جرائد کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ان کے پاس اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف شکایت اور احتجاج کے سوا کوئی اور لکھنے کی چیز نہیں۔ انھوں نے نہ خدا کو پایا جس کی وہ کبریائی بیان کریں۔ ان کو نہ جہنم کی لپٹیں محسوس ہوئیں جس کی وہ دنیا کو خبر دیں۔ ان کو نہ جنت کے کسی جھونکے کا تجربہ ہوا جس کو وہ خدا کے بندوں تک پہنچائیں۔ ان کو بس ایک ہی چیز معلوم ہے۔ اور وہ مسلمانوں کے قومی مسائل ہیں اور وہ انھیں کو دہراتے رہتے ہیں۔

مسلمانوں کے جرائد ساری دنیا میں ایک قسم کا احتجاج نامہ بن کر رہ گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک عام انسان کو اس میں پڑھنے کی کوئی چیز ملتی ہی نہیں۔ عام انسان جو اپنی فطرت کے زور پر سچائی کی تلاش میں ہے اس کو مسلمانوں کی قومی چیخ پکار سے کیا تعلق۔ نتیجہ یہ ہے کہ بظاہر اگرچہ مسلمانوں کے بہت سے انگریزی جرائد ساری دنیا میں نکل رہے ہیں مگر دین حق کے تعارف کے اعتبار سے ان کی کوئی افادیت نہیں۔

الرسالہ (انگریزی) مسلم دنیا میں غالباً پہلا رسالہ ہے جو لوگوں کے سامنے اسلام کا مثبت تعارف پیش کرتا ہے جو احتجاج اور شکایت سے بلند ہو کر انسان کو برتر سچائیوں کی طرف بلاتا ہے۔ جو انسان کی ابدی فطرت کا ترجمان ہے نہ کہ کسی قوم کے وقتی مسائل کا ترجمان۔

ایسے ایک پرچہ کا وجود میں آنا آپ پر زبردست ذمہ داری ڈالتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ اس کے ساتھ تعاون کریں۔ آپ اس کی ایجنسی لیں۔ آپ لوگوں کو اس کا خریدار بنائیں۔ اس کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لئے آپ اپنی ساری طاقت لگا دیں۔

منیجر الرسالہ (انگریزی)

والدہ کا انتقال

۸ اکتوبر ۱۹۸۵ کو میری والدہ زیب النساء کا انتقال ہوگیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے موت کے لمحات کو اپنی آنکھ سے دیکھا۔

میرے والد جناب فریدالدین خاں صاحب کا انتقال ۳۰ دسمبر ۱۹۲۹ کو ہوا تھا۔ اس وقت میری عمر صرف پانچ سال تھی۔ والد مرحوم کے انتقال کے ۵۵ سال بعد میری والدہ کا انتقال ہوا۔ اپنی تقریباً سو سالہ عمر کا بیشتر حصہ انھوں نے میرے بڑے بھائی عبدالعزیز خاں صاحب (چیرمین لائٹ اینڈ کمپنی لمیٹڈ، الہ آباد) اور میرے چھوٹے بھائی عبدالمحیط خاں (جوائنٹ ڈائرکٹر ٹکنکل ایجوکیشن۔ یو پی) کے ساتھ گزارا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ آخری ڈیڑھ سال وہ میرے ساتھ دہلی میں رہیں۔

والدہ کو مجھ سے بہت زیادہ تعلق تھا۔ غالباً اپنے بچوں میں وہ مجھ کو سب سے زیادہ مانتی تھیں۔ اکثر اپنا ایک خواب بڑے شوق سے بیان کرتی تھیں۔ جب میں پیٹ میں تھا تو آخری دنوں میں والدہ نے رات کو خواب دیکھا کہ میری پیدائش ہوئی ہے۔ اس کے بعد ہی ایک بڑا سا ہاتھی آتا ہے۔ وہ مجھ کو سونڈ سے اٹھا کر اپنی پیٹھ پر رکھتا ہے اور مجھ کو لے کر چلا جاتا ہے۔ والدہ خواب میں کہہ رہی ہیں —— "دیکھو اتنا اچھا لڑکا تھا اس کو ہاتھی اٹھا لے گیا"۔ اسی رات کے بعد آنے والی صبح کو میری پیدائش ہوئی۔ والدہ یہ خواب بیان کرکے مسکراتیں اور کہتیں کہ "پتہ نہیں اس خواب کا کیا مطلب ہے"

والدہ معمولی پڑھی ہوئی تھیں۔ تاہم ان کو میرے کام سے بہت گہرا قلبی تعلق تھا۔ وہ الرسالہ پڑھوا کر سنتیں اور دعا دیتیں۔ الرسالہ کیسٹ بن کر آیا تو اس کو بھی منگوا کر سنا اور اس کو سن کر بہت خوش ہوئیں۔

۲۹ نومبر ۱۹۶۸ کو میں نے دہلی میں خواب دیکھا تھا کہ ایک بڑی سی ٹوکری ہے۔ میں نے اس میں مختلف قسم کے پھل کاٹ کاٹ کر رکھے۔ اس کے بعد لوگ کھانے کے لیے جمع ہوئے۔ یہ سب زیادہ تر میرے اپنے خاندان کے لوگ ہیں اور والدہ بھی ان کے ساتھ موجود ہیں۔ پھلوں کی ٹوکری درمیان میں رکھی ہے اور کنارے کنارے لوگ بیٹھ کر کھا رہے ہیں۔ اس درمیان میں والدہ نے پھلوں کی ٹوکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا :

" وحید کا خیال ہے کہ اس کا کوئی عالمی مرکز قائم کرے "

خواب میں اس جملہ کا مطلب ذہن میں یہ ہے کہ پھلوں (دین رحمت) کی ایسی دعوت ترتیب دی جائے جس سے سارے عالم کے لوگ رزق حاصل کر سکیں۔

والدہ مرحومہ میرے بھائیوں کے پاس ہر طرح سکون اور آرام کے ساتھ تھیں۔ وہ لوگ مجھ سے کہیں زیادہ ان کی خدمت کر سکتے تھے اور کر رہے تھے۔ مگر آخر عمر میں ان کی بہت زیادہ خواہش ہوئی کہ وہ اپنی زندگی کا بقیہ حصہ میرے پاس گزاریں۔ میرے بارہ میں والدہ مرحومہ کا خیال تھا کہ میں ان کا اللہ والا لڑکا ہوں۔ وہ اکثر مجھ کو " اللہ والے وحید " کہتی تھیں۔ اس بنا پر ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کی آخری رسوم میرے ہاتھ سے ادا ہوں۔

۳۰ اپریل ۱۹۸۴ کو میں نے گونڈہ (یوپی) کا ایک سفر کیا تھا اور وہاں ۲ مئی ۱۹۸۴ تک رہا۔ اس سفر کی روداد الرسالہ ماہ نومبر ۱۹۸۴ میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ سفر دراصل والدہ سے ملاقات کے لیے تھا۔ بار بار والدہ کا پیغام آتا تھا کہ وہ مجھ کو دیکھنا چاہتی ہیں چنانچہ میں اپنے عزیز جناب یمین الاسلام خاں صاحب (انجینیر) کے ساتھ گونڈہ گیا اور وہاں والدہ کے ساتھ تین دن رہا۔

والدہ بار بار کہتی تھیں کہ مجھے دہلی لے چلو۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا آخری وقت تمہارے ساتھ گزرے۔ مگر میں ہر بار یہی کہتا رہا کہ یہاں آپ کو زیادہ آرام ہے، آپ یہیں رہیئے۔ میں والدہ سے معذرت کر کے دہلی آگیا۔ مگر صبح وشام مجھے ان کی بات یاد آتی تھی۔

واپسی کے دو دن بعد میں صبح کو نظام الدین (دہلی) میں اپنے مکان کی چھت پر ملحقہ پارک کی طرف رُخ کیے ہوئے کھڑا تھا اور بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اتنے میں میری اہلیہ وہاں آگئیں۔ میری حالت دیکھ کر پوچھنے لگیں کہ کیا بات ہے۔ میں نے کہا کہ " والدہ یہاں آنا چاہتی تھیں اور میں ان کو نہیں لایا۔ اگر ان کا انتقال ہو گیا تو یہ گھر مجھے کاٹنے لگا " اہلیہ نے کہا کہ پھر اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ میں جا کر انھیں یہاں لاتی ہوں۔

اس کے بعد میں نے اپنے گھر کے سب لوگوں کو جمع کیا۔ میں نے کہا کہ تم سب لوگ ایک بات کا عہد کرو تب والدہ کو یہاں بلایا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ بوڑھے اور بیمار لوگوں کے اندر ہمیشہ جھنجلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ والدہ آئیں گی تو یقیناً ان کی طرف سے ناخوش گواری کی باتیں پیش آئیں گی۔ مگر

تم لوگوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرتا ہے۔ وہ خواہ کچھ بھی کہیں، مگر تم لوگوں کو کچھ بھی نہیں بولتا ہے۔ سب نے مل کر عہد کیا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔

اس کے بعد میں نے اہلیہ اور اپنے لڑکے ثانی اثنین کو گونڈہ بھیجا جہاں والدہ اس وقت میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ مقیم تھیں۔ وہ لوگ والدہ کے راحت و آرام کا پورا لحاظ کرتے ہوئے ان کو نہایت اہتمام کے ساتھ دہلی لے آئے۔ اس طرح وہ ۸ مئی ۱۹۸۴ کو گونڈہ سے دہلی آئیں اور ڈیڑھ سال بعد ۸ اکتوبر ۱۹۸۵ کو اس دنیا سے چلی گئیں۔

عجیب بات ہے کہ ۱۹۸۰ کے آغاز میں میں نے والدہ کے بارہ میں ایک خواب دیکھا تھا جو میری ڈائری میں نوٹ ہے۔ میں نے دیکھا کہ قیامت کا میدان ہے اور میں والدہ کا ہاتھ پکڑ کر انھیں لے جا رہا ہوں۔ ہمارے آگے آگے روشنی ہے۔ اس خواب کا مطلب غالباً یہی تھا کہ والدہ کا آخری سفر میرے یہاں سے ہوگا اور میں ان کے جسد خاکی کو اٹھا کر قبر کی طرف لے جاؤں گا۔ جو گویا اگلی دنیا میں داخلہ کا دروازہ ہے۔

والدہ کے دہلی آنے سے پہلے میں اکثر ان کو خواب میں دیکھتا تھا۔ یہ شاید قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ مجھے ان کو دہلی لانا چاہیے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے ایسے حالات پیدا کیے کہ میں ان کو دہلی لا سکا۔ ان کو مجھ سے خصوصی تعلق تھا۔ وفات کے بعد بھی کئی بار ایسا ہوا کہ مجھے بالکل والدہ کی محبت بھری آواز میں سنائی دیا " وحید "۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ میرے اپنے ذہن کا ٹیپ بج رہا تھا یا والدہ کی روح مجھے پکارتی ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔

والدہ نہایت مضبوط اعصاب کی خاتون تھیں۔ وہ جس مجلس میں رہتیں اپنے قوت کلام سے چھا جاتیں۔ آخر عمر میں اگرچہ ان کو بعض بیماریاں لاحق ہو گئی تھیں۔ مگر ان کے اکثر اعضاء کان، آنکھ، حافظہ، وغیرہ خدا کے فضل سے آخر وقت تک محفوظ تھے۔ ان کا معدہ بھی کافی حد تک درست تھا۔ اپنی اکثر ضروریات وہ خود سے پوری کر لیتی تھیں۔

والدہ میرے پاس نہایت خوش تھیں۔ ذاتی طور پر مجھ سے انھیں کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ میرے بارہ میں وہ کہا کرتی تھیں کہ تمہارا مزاج بچپن سے نہایت عجیب تھا۔ مثلاً میں نے والدہ سے

کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں کی۔ جب میں مدرسہ (الاصلاح اعظم گڈھ) میں پڑھتا تھا اور جمعہ کی تعطیل میں گھر آتا تو والدہ کے بیان کے مطابق میں نے کبھی ان سے یہ نہیں کہا کہ آج فلاں کھانا پکائیے۔ وہ اکثر مجھ سے پوچھتیں کہ تمہارے لیے کیا چیز پکاؤں۔ مگر میں ہمیشہ یہی جواب دیتا کہ جو چاہے پکائیے سب ٹھیک ہے۔

تاہم قدرتی طور پر میرا یہ جی چاہتا تھا کہ اس آخر عمر میں ان سے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگ لوں۔ مگر اس خیال سے چپ رہتا کہ وہ شاید سوچیں کہ میری زندگی کی طرف سے اب یہ لوگ مایوس ہوگیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی ایسی ہوئی کہ یکم اکتوبر کو جب کہ میں ان کی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا غیر متوقع طور پر انھوں نے خود یہ کہا کہ تم لوگ مجھے معاف کردو۔ اس طرح مجھے موقع مل گیا۔ میں نے فوراً کہا کہ ماں باپ کی کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ غلطی ہمیشہ لڑکوں کی ہوتی ہے۔ اس لیے آپ ہم لوگوں کو معاف کر دیں۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک میں ان سے معافی مانگتا رہا اور وہ بار بار سب معاف ہے، سب معاف ہے کہتی رہیں۔ وفات کے بعد ۱۲ اکتوبر کی رات کو میں نے خواب میں والدہ کو دیکھا وہ بہت خوش اور تندرست تھیں اور میری ضروریات کا سامان کرنے میں منہمک تھیں۔ اس خواب کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ ان کی روح مجھ سے خوش ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ معافی مانگنے کے صرف دو دن بعد ۳ اکتوبر کو ان پر خاموشی طاری ہوگئی اور پھر وہ کبھی نہیں بولیں۔ وہ اب بھی کسی حد تک سنتی اور سمجھتی تھیں مگر بولنا تقریباً بند ہوگیا۔ چونکہ اس قسم کی خاموشی یا نیم بے ہوشی کی کیفیت اس سے پہلے کئی بار ہو چکی تھی اور پھر وہ ٹھیک ہو گئی تھیں اس لیے ہم لوگ سمجھے نہیں کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ علاج شروع کیا گیا تو اس سے فائدہ بھی محسوس ہوا۔ ہم لوگ اس امید میں تھے کہ پہلے کی طرح چند دن کے بعد وہ اچھی ہو جائیں گی مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

چار دن تک وہ خاموش حالت میں پڑی رہیں۔ چائے وغیرہ کے لیے پوچھا جاتا تو ہاتھ یا سر کے اشارہ سے ہاں یا نہیں کر دیتیں۔ یہاں تک کہ ۸ اکتوبر کی صبح کو ۸ بجے ان کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ یہ موت سے پہلے کی غشی تھی۔ یہ غشی گویا قدرت کی طرف سے ایک عمل تخدیر (Anesthesia) تھا تاکہ موت کی تکلیف کو ان کے لیے آسان کر دے۔

موت سے ایک دن پہلے میں نے رات کو تین بجے خواب دیکھا کہ ہمارے مکان کے دروازہ کی گھنٹی

بھی مگر قبل اس کے کہ دروازہ کھولا جائے ایک اجنبی آدمی اندر داخل ہوا اور سیڑھیاں چڑھ کر والدہ کے کمرہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہ آدمی سفید لباس میں تھا۔ اس خواب کے بعد میری نیند کھل گئی۔ میں نے فوراً اٹھ کر والدہ کو دیکھا تو وہ سو رہی تھیں۔ اسی رات کو فجر سے کچھ پہلے والدہ کی سانس اکھڑ گئی۔ اس کے بعد کبھی اکھڑی سانس آتی اور کبھی ٹھیک ہو جاتی۔ ۸ اکتوبر کو فجر کی نماز کے بعد میں والدہ کے کمرہ میں گیا تو سانس زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ان کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تقریباً دو گھنٹہ تک غیر معمولی طور پر تیز سانس آتی رہی۔ ۸ بجے زور سے ایک ہچکی آئی۔ اس کے بعد اسی طرح دوبار اور ہچکی آئی اور اچانک سانس بند ہو گئی۔ میں نے فوراً اپنے لڑکے ثانی اثنین کو بلایا۔ انھوں نے نبض اور آنکھ دیکھی۔ اس کے بعد وہ کچھ بول نہ سکے۔ تاہم ان کا چہرہ خاموش زبان میں کہہ رہا تھا۔ "دادی کا انتقال ہو چکا ہے"

آخر وقت تک مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ والدہ کا آخری وقت ہے۔ تاہم جب معلوم ہو گیا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے تو میں نے والدہ کے ہاتھ اور پاؤں سیدھے کیے۔ ان کی آنکھ کو اور منھ کو بند کیا۔ ان کا پُر رونق چہرہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ مگر اس میں سے جان نکل چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں ان کی زندگی کو دوبارہ لوٹانا چاہوں تو میں ہرگز نہیں لوٹا سکتا۔ موت کے فیصلہ کو بدلنا کسی بھی شخص کے لیے ممکن نہیں۔ یہ تمام تر خدا کے اختیار میں ہے کہ وہ جب تک چاہے کسی کو زندہ رکھے اور جب چاہے اُس کو اِس دنیا سے اٹھا لے۔

انتقال کے فوراً بعد بڑے بھائی کو ٹیلی فون کرنے کی کوشش کی گئی اور چھوٹے بھائی کو ارجنٹ تار دیا گیا۔ مگر ٹیلی فون پر ربط قائم نہ ہو سکا اور تار کافی دیر بعد پہونچا۔ ہندستان ایک طرف الکٹرانک دور میں داخل ہو رہا ہے، دوسری طرف وہ معمولی تار اور ٹیلی فون کے دور میں بھی داخل نہ ہو سکا۔

نماز جنازہ نظام الدین (نئی دہلی) میں ہوئی۔ تبلیغی جماعت کے بزرگ حضرت مولانا اظہار الحسن صاحب قبلہ نے نماز پڑھائی۔ میرے اعزہ کے علاوہ تبلیغی مرکز کے کافی لوگ جنازہ میں شریک تھے۔ تقریباً ایک ہزار آدمیوں کی جماعت ہوئی۔

نماز جنازہ سے پہلے حضرت مولانا اظہار الحسن صاحب نے ایک مختصر تقریر فرمائی۔ یہ تقریر اس وقت بے حد موثر ثابت ہوئی۔ حضرت مولانا نے ہماری فرمائش پر بعد کو یہ تقریر قلم بند کرادی۔ وہ

انھیں کے اپنے لفظوں میں مکمل طور پر یہاں نقل کی جاتی ہے۔

تقریر حضرت مولانا اظہار الحسن صاحب

"آپ حضرات اور ہم مولانا وحید الدین خاں صاحب کی والدہ ماجدہ کے جنازہ میں شرکت کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ مولانا وحید الدین خاں کی والدہ کا جنازہ ہے۔ حالاں کہ یہ سوچ غلط ہے بلکہ یہ جنازہ ہمارا اور آپ کا اور پورے انسانوں کا ہے۔ اور یہ جنازہ بتا رہا ہے کہ یہ وقت سب پر آرہا ہے۔ امیر ہو کہ غریب، کالا ہو کہ گورا، عربی ہو کہ عجمی، کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ آج آپ اس جنازہ کی نماز پڑھنے کے لیے آئے ہیں کل دوسرے لوگ آپ کی نماز جنازہ پڑھنے کے لیے آئیں گے۔ آج آپ اس جنازہ کو کاندھا دے رہے ہیں اور کل کو دوسرے لوگ آپ کی لاش کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوں گے۔ یہ جنازہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے:

واذا حملت الی القبور جنازۃ　　فاعلم بانك بعدها محمول

یہ مسہری جس پر مولانا کی والدہ آرام فرما رہی ہیں اس کے پائے پائے سے آواز آرہی ہے:

انظر الیّ بعقلك انا المهیأ لنقلك　　انا سریر المنایا کم سار مثلی بمثلك

یہ مسہری کہہ رہی ہے کہ اپنی عقل کی آنکھیں کھول اور غفلت کی چادر ہٹا اور دیکھ کہ مجھ کو تیرے مکان سے گورِ غریباں پہونچانے کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ میں موت کی مسہری ہوں۔ میری جیسی کتنی مسہریوں نے تجھ جیسے کتنے انسانوں کو گورستان میں پہونچا دیا ہے۔ ایک مرتبہ ایک بزرگ حضرت عبدالرحمٰن بن شخیر تشریف لے جا رہے تھے۔ سامنے سے ایک جنازہ گزر رہا تھا۔ ایک راہ گیر نے حضرت سے پوچھا کہ حضرت کس کا جنازہ ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ بھئی آپ ہی کا تو ہے۔ اس آدمی کو یہ بات ناگوار گزری اور کہنے لگا۔ "واہ جی میرا کیوں ہونے لگا" فرمایا بھیا تمہارا نہیں تو میرا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنازہ کو دیکھ کر یہ پوچھنا بیکار ہے کہ کس کا ہے۔ بلکہ جنازہ کو دیکھ کر یہ غور کرنا چاہیے کہ یہ وقت خود ہم پر آرہا ہے اور بہت جلد آرہا ہے اس کے لیے تیاری کرنی چاہیے۔ ہماری اس مسجد سے یہی آواز لگائی جا رہی ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی کے لیے تیاری کی جائے اور ہر شخص اس کی فکر کرے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ آواز عالم کے گوشہ گوشہ میں پہونچ رہی ہے اور دنیا کے گوشہ گوشہ سے آدمی اپنی آخرت کی تیاری کے لیے آ رہے ہیں اور تیاری کر رہے ہیں۔ ہماری بستی والوں سے بھی درخواست ہے کہ مسجد کی آواز کو آکر سنیں اور آخرت کی تیاری میں حصہ لیں۔"

مولانا اظہار الحسن صاحب قبلہ کا مزاج تقریر وغیرہ کا نہیں ہے ۔ یہ ان کے معمول کے لحاظ سے ایک خلاف توقع بات تھی ۔ حتیٰ کہ وہ مسجد اور مدرسہ سے باہر بھی بہت کم جاتے ہیں ۔ تاہم حضرت مولانا کی یہ تقریر اس موقع پر بے حد موثر ثابت ہوئی ۔ گویا کہ ماحول چارج ہو گیا ۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا کہ لوگ اس حقیقی کیفیت کے ساتھ نماز جنازہ ادا کر رہے ہیں جیسا کہ فی الواقع ادا کرنا چاہیے ۔ مولانا اظہار الحسن صاحب کے بروقت کلمات نے نماز جنازہ کو واقعی نماز جنازہ بنا دیا ۔

والد کے انتقال کے وقت والدہ کی عمر زیادہ نہیں تھی ۔ والد کے بعد بھی وہ ۵۵ سال تک زندہ رہیں ۔ تاہم انھوں نے صرف بچوں کے خیال سے دوسری شادی نہیں کی ۔ غالباً یہی وجہ تھی جس کی بنا پر والدہ کے مزاج میں کسی قدر سختی اور جھنجھلاہٹ آگئی تھی ۔ چنانچہ بعض اوقات لوگوں کو ان سے شکایت ہو جاتی تھی ۔ مگر ان کا باطن بہت صاف و شفاف تھا ۔ وہ نہ صرف نماز روزہ کی سختی سے پابند تھیں بلکہ دل کے اعتبار سے پورے معنوں میں مومنہ اور مسلمہ تھیں انھوں نے جان بوجھ کر کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہونچائی اور نہ کبھی جان بوجھ کر کسی کی بدخواہی کی ۔

والدہ کا ایک مزاج یہ تھا کہ وہ اپنا کام ہمیشہ خود کرنا پسند کرتی تھیں ۔ جب وہ تندرست اور طاقتور تھیں تو بڑے بڑے کام بھی تنہا کر ڈالتی تھیں ۔ بعد کو جب وہ کمزور ہو گئیں اس وقت بھی ان کا یہ مزاج باقی رہا ۔ ہم لوگ بہت کہتے کہ آپ کو جو کام یا ضرورت ہو اس کے لیے کہہ دیا کریں ۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ وہ اپنے کسی کام کے لیے دوسرے سے کہیں ۔ اسی مزاج کی وجہ سے بڑھاپے کی عمر میں کئی بار ایسا ہوا کہ وہ کسی کام کے لیے اٹھیں اور پھر گر پڑیں ۔ پھر بھی ان کا یہ مزاج آخر عمر تک باقی رہا ۔

والدہ کی محبوب دعاؤں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اللہ انھیں چلتی پھرتی حالت میں اٹھا لے ۔ ان کی یہ دعا بھی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی ۔ آخری چند دن کے سوا وہ اپنا سب کام خود کرتی رہیں ۔ آخر میں اگرچہ وہ پاؤں سے چلنے سے معذور ہو گئی تھیں ۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح اپنا ہر کام کر ڈالتی تھیں ۔

والدہ کے اندر خود غرضی اور مادہ پرستی بالکل نہیں تھی ۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی خدمت کرنے کے لیے تیار رہتی تھیں ۔ ان کا ایک محبوب طریقہ یہ تھا کہ غریب اور یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنے یہاں رکھ کر پرورش کرتیں اور اگر ممکن ہوتا تو ان کی شادی بھی کرا دیتیں ۔ پڑوس کے ایک شخص جوان کے یہاں

بطور باورچی کام کرتے تھے، ان کو انھوں نے اپنے گھر کے وسیع صحن کا بڑا حصہ صرف اس لیے دے دیا کہ وہ اپنے گھر کی توسیع کر سکیں۔

والدہ کے میکے کے لوگ بڑے زمیندار تھے۔ وہاں کی زمینداری میں ان کا تقریباً ۲۰ بیگھہ (پختہ) حصہ ہوتا تھا۔ مگر والدہ نے بطور خود اپنا حصہ چھوڑ دیا اور دست برداری کے کاغذ پر اپنی رضامندی سے دستخط کر دیے۔ وغیرہ وغیرہ

والدہ کی زبان پر سب سے زیادہ جو جملہ رہتا تھا وہ یہ تھا کہ "اللہ آخرت میں ٹھکانا دے"۔ وہ اکثر گہرے تاثر کے ساتھ اس دعائیہ جملہ کو دہراتی رہتی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کی یہ پکار سن لی اور ان کی نیک نفسی کی بنا پر انھیں آخرت میں اچھا ٹھکانا دیدیا۔ ان کے تمام آخری رسوم نہایت بہتر طور پر انجام پائے۔ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ ان دنوں بارش کا زمانہ تھا۔ روزانہ بارش کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مگر ۸ اکتوبر کو بارش رکی رہی۔ حالاں کہ ۸ اکتوبر سے پہلے بھی بارش جاری تھی اور ۸ اکتوبر کے بعد بھی بارش جاری رہی۔ مجھے بعد کو معلوم ہوا کہ والدہ کے انتقال کی خبر سننے کے بعد تبلیغی مرکز (نظام الدین نئی دہلی) میں ان کے لیے اجتماعی دعا کی گئی۔ اسی طرح اور بعض مساجد اور مدارس میں ان کے لیے خصوصی دعائیں کی گئیں۔

یہاں ایک خواب قابل ذکر ہے جو میری ڈائری میں ۲۸ مارچ ۱۹۷۷ کی تاریخ کے ساتھ درج ہے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ والدہ اس دنیا سے رخصت ہو کر آسمان کی طرف لے جائی جا رہی ہیں۔ وہ اوپر پہونچی ہیں تو ایک مقام آیا جہاں ایک سرنگ نما بالکل اندھیرا راستہ تھا۔ اس وقت والدہ کے بارہ میں اوپر سے آواز آئی کہ:

ان کو دوسری طرف دروازۂ نور پرلے جاؤ۔ ان کو وہاں سے داخلہ ملے گا

یہ خواب جو میں نے ۱۹۷۷ میں دیکھا تھا وہ گویا میرے لیے ایک پیشگی بشارت تھی کہ تمہاری والدہ کو موت کے بعد والی دنیا میں نورانی گھر میں جگہ ملنے والی ہے۔ خدایا تو میری والدہ پر اپنے نور کی بارش فرما۔ ان کو جنت کے اعلیٰ مقامات میں جگہ دے، اور ہم سب کو اپنی رحمتِ خاص سے بخش دے۔

ایک تجربہ

میری والدہ (زیب النساء) کا انتقال ۸ اکتوبر ۱۹۸۵ کو ہوا۔ ان کے انتقال پر دو ہفتے گزر چکے تھے۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۵ کی رات کو ساڑھے دس بجے میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا کچھ پڑھ رہا تھا۔ اچانک پاس کے کمرے سے والدہ کی آواز آنے لگی۔ آواز ہو بہو والدہ مرحومہ کی تھی۔ میں حیران ہو کر اٹھا اور کمرہ میں گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں والدہ مرحومہ کا ٹیپ بجایا جا رہا ہے۔ میرے بچوں نے ایک سال پہلے والدہ مرحومہ کی ۴۵ منٹ کی ایک گفتگو ٹیپ ریکارڈر پر ریکارڈ کر لی تھی۔ اس میں والدہ میرے بچوں کے ساتھ بات کرتی ہوئی اور ہنستی بولتی ہوئی سنائی دے رہی ہیں۔

میں بچوں کے ساتھ بیٹھ کر والدہ کا ٹیپ سننے لگا۔ میں سنتا جا رہا تھا اور میرے اوپر عجیب حالت طاری ہو رہی تھی۔ جس شخصیت کو میں ۸ اکتوبر کو خود اپنے ہاتھ سے قبر میں دفن کر چکا تھا، عین اسی شخصیت کی آواز ۲۵ اکتوبر کو بجنسہ اسی شکل میں سن رہا تھا۔ وہی لہجہ، وہی زبان۔ وہی انداز، غرض سب کچھ اس قدر مطابق اصل تھا جیسے کہ مرحومہ کمرہ میں بیٹھی ہوئی ہیں اور میں پہلے کی طرح ان کی اپنی آواز کو سن رہا ہوں جیسا کہ ان کی زندگی میں سنتا تھا۔

اس تجربہ نے ایک آیت کا مطلب میرے ذہن پر کھول دیا۔ سورہ الذاریات میں ان لوگوں کا جواب دیا گیا ہے جو بعث بعد الموت کے بارہ میں شبہ ظاہر کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں فرمایا گیا ہے کہ بے شک وہ یقینی ہے، اسی طرح جس طرح تم بولتے ہو۔ یہاں آیت کے الفاظ یہ ہیں :

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ. فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنْطِقُونَ (الذاریات ۲۲-۲۳)	اور آسمان میں تمہاری روزی ہے اور وہ بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ پس آسمان اور زمین کے رب کی قسم، بے شک وہ برحق ہے اسی طرح جیسے کہ تم بولتے ہو۔

اس آیت کی تفسیر میں عام طور پر مفسرین بس اتنا کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ وہ تمہارے نطق کی طرح برحق اور یقینی ہے (ای حق مثل نطقکم، تفسیر النسفی) میں نے اکثر تفسیروں میں اس آیت کا مطلب تلاش کیا مگر اس کی تشریح میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ مل سکا۔ مگر ۲۵ اکتوبر کی رات کو والدہ مرحومہ

کا ٹیپ سننا میرے لیے اس آیت کی تفسیر بن گیا۔ سچ ہے کہ قرآن کے عجائب اور معانی کبھی ختم نہ ہوں گے (لاتنقضی عجائبہ)

والدہ مرحومہ کا ٹیپ نطق کی شکل میں گویا ان کی زندگی کا اعادہ تھا۔ اس کو سنتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں زندگی بعد موت کے امکان کا عملی تجربہ کر رہا ہوں۔ جیسے ایک شخصیت کے وفات پانے کے بعد میرے سامنے اس کو دہرایا جارہا ہو۔ جیسے ایک زندگی پر موت واقع ہونے کے بعد اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو Replay کیا جارہا ہو۔

نطق (بولنا) انسانی شخصیت کا سب سے زیادہ نمائندہ وصف ہے۔ اسی لیے انسان کو حیوان ناطق کہا جاتا ہے۔ انسان کی موت کے بعد اس کے نطق کا اس طرح کامل طور پر محفوظ رہنا اور اس کا نہایت صحیح اعادہ ممکن ہونا بتاتا ہے کہ موت کے بعد بھی زندگی باقی رہتی ہے یا کم از کم اس کو دہرایا جاسکتا ہے میری والدہ مرحوم ہوچکی تھیں مگر وہ اپنی آواز کے روپ میں بدستور پوری طرح زندہ تھیں۔

جب میں والدہ مرحومہ کی ٹیپ کی ہوئی آواز سن رہا تھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے مرحومہ دوبارہ اٹھ کر پہلے کی طرح بولنے لگی ہوں۔ اگر میں آنکھ بند کر کے سنوں تو مجھے کچھ بھی فرق معلوم نہ ہوگا۔ میرے لیے یہ ٹیپ بعث بعد الموت کا ایک مشینی نمونہ بن گیا —— یہ واقعہ جو آج مشینی طور پر ہو رہا ہے۔ یہی کل حقیقی طور پر ہوگا۔ آواز کا یہ واقعہ آخرت کے واقعہ کا ابتدائی مظاہرہ ہے۔ انسانی ٹیپ خدائی ٹیپ کی پیشگی اطلاع ہے۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ آسمان میں تمہارا رزق بھی ہے اور تمہاری وہ حیات ثانی بھی جس کی تم کو خبر دی جارہی ہے۔ ٹیپ ریکارڈر کی ایجاد کے بعد یہ بات محض خبر نہیں رہی بلکہ ایک معلوم واقعہ بن چکی ہے۔ انسانی ساخت کا ٹیپ ریکارڈر چھوٹی سطح پر اسی حقیقت کا مظاہرہ کر رہا ہے جو زیادہ بڑی سطح پر کائنات میں موجود ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ خدا کی کائنات ایک عظیم ریکارڈر ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی مشین کسی انسان کے صرف جزئی پہلو کو ریکارڈ کرپاتی ہے۔ کائناتی ریکارڈر انسان کی پوری زندگی کو انتہائی کامل شکل میں ریکارڈ کر رہا ہے۔ اور جب قیامت برپا ہوگی تو کائنات خدا کے حکم سے ہر انسان کا اسی طرح اعادہ کر دے گی جس طرح آج ٹیپ ریکارڈر انسان کی آواز کا اعادہ کر رہا ہے۔

مسلم پریس

مسلم دنیا میں پریس کا دور انیسویں صدی میں مغربی فاتحین کے ذریعہ آیا۔ مسلمانوں کو ایک طرف غیر مسلم اقوام سے مغلوبیت کا تجربہ ہو رہا تھا۔ دوسری طرف عین اسی زمانہ میں وہ پریس کے دور میں بھی داخل ہو رہے تھے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم پریس اپنے آغاز ہی میں احتجاجی پریس بن کر رہ گیا۔ پریس کا کام صرف یہ رہ گیا کہ وہ اس رد عمل کی ترجمانی کرتا رہے جو مسلمانوں کے اندر سیاسی اور تہذیبی شکست کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔

بیسویں صدی کے آخر میں پہونچ کر بھی مسلم پریس کا یہ احتجاجی مزاج پوری شدت کے ساتھ باقی ہے۔ آج مسلم دنیا میں جتنے بھی اخبار یا رسالے نکلتے ہیں ان سب کا ایک مشترک نام رکھنا ہو تو یقیناً وہ احتجاج (Protest) ہوگا۔

مزید یہ کہ یہ احتجاج بھی عملاً صرف جھوٹے الفاظ کی بے اثر نمائش بن کر رہ گیا ہے۔ احتجاج کی قیمت اس وقت ہے جب کہ وہ واقعات کے درست جائزہ پر مبنی ہو۔ مگر مسلم صحافت کا حال سراسر اس کے خلاف ہے۔ آج تقریباً ہر مسلم پرچے میں دنیا کے مسلمانوں کے احوال پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ مگر یہ تبصرے ہمیشہ یک طرفہ، مبالغہ آمیز اور حقائق سے زیادہ لفاظی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں غالباً کسی بھی مسلم اخبار یا رسالہ کا کوئی استثنار نہیں۔

یہ بات مسلم صحافت میں اتنی زیادہ عام ہے کہ کسی بھی ملکی یا غیر ملکی زبان کے پرچے سے اس کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ یہاں ہم اپنی بات کی وضاحت کے لیے صرف ایک مثال نقل کرتے ہیں۔

ترجمان القرآن (لاہور) مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کا قائم کردہ ماہنامہ ہے جو نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے نکل رہا ہے۔ اس کی اشاعت (ستمبر ۱۹۸۵) کے ۲۰ صفحات کے اداریہ میں دنیا بھر کے مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیا گیا ہے اس اداریہ کا آغاز اس جملہ سے ہوتا ہے —— "اس مرتبہ ہم احوال عالم پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ

یہ اندازہ ہوسکے کہ اسلام اور مسلمانوں کو کیا درپیش ہے" (صفحہ ۲)

اس مفصل اداریہ میں ہندستان کے مسلمانوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اداریہ کا ایک جزء حسب ذیل ہے:

> (بھارت میں) پچھلے دنوں بڑا خوفناک واقعہ یہ ہوا کہ قرآن کو خلاف قانون قرار دلوانے کے لیے عدالت عالیہ میں استغاثہ لے جایا گیا۔ عدالت نے بھی کوئی باقاعدہ فیصلہ دینے کے بجائے معاملہ کو گول مول چھوڑ کر استغاثہ کو اپنے ریمارکس کے ساتھ محض روک دیا۔ گویا شرارت کا دروازہ اب بھی بند نہیں ہے۔ اس استغاثہ کے سلسلہ میں کم سے کم بنگلہ دیش میں بڑا بھاری مظاہرہ ہوا۔ البتہ پاکستان خاموش رہا۔ (صفحہ ۸)

"ترجمان القرآن" مسلم دنیا کا ایک مشہور اور ذمہ دار ماہنامہ ہے۔ مگر اس نے اپنے اداریہ میں ہندستانی مسلمانوں کے مذکورہ مسئلہ کے بارے میں جو الفاظ لکھے ہیں وہ سراسر خلاف واقعہ ہیں۔ یہ ماہنامہ اپنے آپ کو جس قرآن کا ترجمان بتاتا ہے اس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب تم کو کوئی خبر ملے تو اس کی مکمل تحقیق کرو (اذا جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا) اور یہ کہ درست بات کہو (قولوا قولاً سدیداً)۔ مگر حال یہ ہے کہ جس مقدمہ کو ہندستانی ہائی کورٹ نے قطعی خارج کردیا اس کی بابت یہ الفاظ لکھے گیے ہیں کہ عدالت نے اس کو گول مول چھوڑ دیا۔

مذکورہ قرآنی حکم کا تقاضا تھا کہ یہ ماہنامہ اس معاملہ پر رائے زنی کرنے سے پہلے اس کی پوری تحقیق کرتا اور چوں کہ یہ معاملہ ایک عدالتی معاملہ تھا اس لیے اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس عدالتی فیصلہ کو حاصل کرکے پڑھے جس کی روشنی میں وہ اپنی رائے دے رہا ہے۔ مگر ماہنامہ کے مذکورہ الفاظ تقریباً یقینی طور پر بتاتے ہیں کہ وہ عدالت کے فیصلہ کو پڑھے بغیر لکھے گیے ہیں راقم الحروف کی یہی رائے عام مسلم تبصرہ نگاروں کے بارے میں ہے۔ تقریباً ہر قابل ذکر مسلمان نے اس معاملہ میں رائے زنی کی ہے۔ مگر میری معلومات کے مطابق شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس نے مذکورہ قرآنی احکام پر باقاعدہ عمل کیا ہو۔

راقم الحروف کو جب اخبارات سے کلکتہ ہائی کورٹ کے مذکورہ فیصلہ کا علم ہوا تو اس

نے سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ وہ اس عدالتی فیصلہ کو حاصل کرے۔ میں نے اپنے کلکتہ کے ایک رفیق جناب قاری محمد اسماعیل ظفر ایم اے کو خط لکھا کہ وہ عدالت سے اس کی مکمل نقل حاصل کرکے روانہ کریں۔ انھوں نے فوراً اس کی کوشش شروع کردی۔ یہاں تک کہ انھوں نے فیصلہ کی مکمل نقل حاصل کرکے مجھے روانہ کی جو ۱۴ اگست ۱۹۸۵ کو مجھے دہلی میں مل گئی۔

جسٹس بمل چندر باسک (کلکتہ ہائی کورٹ) نے اپنا یہ فیصلہ ۱۷ مئی ۱۹۸۵ کو دیا ہے اور وہ ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس فیصلہ کے ۴۱ پیراگراف ہیں۔ جسٹس باسک تفصیلی جائزہ کے بعد اپنے فیصلہ کے پیراگراف نمبر ۳۹ میں کہتے ہیں کہ مذکورہ اسباب کے تحت یہ بات واضح ہے کہ اس عدالت کے حدود اختیار سے باہر ہے کہ وہ قرآن پر پابندی لگانے کا حکم جاری کرے جس کی کہ درخواست میں اپیل کی گئی ہے۔

اس کے بعد پیراگراف نمبر ۴۰ میں واضح طور پر یہ الفاظ ہیں کہ مذکورہ اسباب کی بنا پر یہ درخواست ڈسمس کی جاتی ہے:

For the aforesaid reasons this application stands dismissed.

کیسی عجیب بات ہے کہ ایک مقدمہ جس کو ہندستان کی عدالت نے خارج کردیا، اس کی بابت بالکل غلط طور پر یہ الفاظ لکھے گئے ہیں کہ عدالت نے باقاعدہ فیصلہ دیے بغیر اس کو گول مول حالت میں چھوڑ دیا اور اس طرح شرارت کا دروازہ کھلا رکھا۔ نیز اس سلسلہ میں بنگلہ دیش میں ہونے والے جھوٹے مظاہرہ کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے گویا کہ وہ کوئی قابل فخر اسلامی کارنامہ ہو۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اس قسم کے واقعات کی رپورٹنگ غیر مسلم پریس میں اس سے زیادہ صحیح ہوتی ہے جو نام نہاد مسلم پریس میں نظر آتی ہے۔ مسلم پریس کی تقریباً تمام رپورٹیں اسی طرح بے اصل ہوتی ہیں جس کا ایک نمونہ اوپر کی مثال میں نظر آتا ہے۔ یعنی واقعات کی صحیح تصویر دیے بغیر یک طرفہ طور پر فریق ثانی کو برا بتانا۔ اس قسم کا جھوٹا احتجاج نہ خدا کے نزدیک کوئی قیمت رکھتا ہے اور نہ خلق کے نزدیک۔ مسلمان اگر ایک ہزار سال تک اس قسم کا احتجاج کرتے رہیں تب بھی اس کا کوئی فائدہ انھیں ملنے والا نہیں۔

دین کی نصرت کرنے والے

عن ابی الولید عبادة بن الصامت رضی الله عنه قال : بایعنا رسول الله صلی الله علیه وسلم علی السمع والطاعة فی العسر والیسر والمنشط والمکره وعلی اثرة علینا وعلی ان لا ننازع الامر اهله الا ان تروا کفرا بواحا عندکم من الله فیه برهان وعلی ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی الله لومة لائم. (متفق علیه)

حضرت عبادہ بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اس پر کہ ہم سنیں گے اور مانیں گے تنگی میں بھی اور آسانی میں بھی۔ پسند میں بھی اور ناپسند میں بھی۔ اور اس پر کہ ہمارے اوپر (دوسروں کو) ترجیح دی جائے۔ اور اس پر کہ ہم صاحب حکم سے حکم میں نزاع نہ کریں گے الا یہ کہ تم کھلم کھلا کفر دیکھو جس کے لیے تمہارے پاس خدا کی طرف سے برہان ہو۔ اور یہ کہ ہم حق کے ساتھ بولیں گے خواہ ہم جہاں ہوں۔ ہم اللہ کے معاملہ میں ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

"بیعت" کے لفظی معنی بیچنے کے ہیں۔ اس سے مراد وہ عہد ہے جو ایک فرد اجتماعی ذمہ دار کے ساتھ اجتماعیت پر قائم رہنے کے لیے کرتا ہے۔ عہدِ اجتماعیت کو بیعت سے تعبیر کرنا اس کی شدت کو بتا رہا ہے۔ گویا بیعت سے وابستہ ہونے کے بعد فرد اپنی ذات کو اجتماعیت کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ اس کے بعد اس کی ذات اپنی نہیں رہتی بلکہ اجتماعی ادارہ کی ہو جاتی ہے۔

مذکورہ بیعت مدینہ کے مسلمانوں سے لی گئی جن کو انصار کہا جاتا ہے۔ یعنی خدا کے دین کی مدد کرنے والے۔ اس وقت اسلام کا قافلہ بالکل لٹی ہوئی حالت میں تھا۔ ایسے نازک وقت میں مدینہ کے اہلِ ایمان نے اس کی غیر مشروط مدد کرنے کا عہد کیا اور پھر ساری زندگی اس پر قائم رہے۔ انھوں نے نصرتِ دین کو اس کے آخری تقاضوں کی حد تک انجام دیا اسی لیے وہ خصوصی طور پر "انصار" کہے گیے۔

مدینہ کے مسلمانوں سے جن الفاظ میں نصرت دین کی بیعت لی گئی اس پر غور کیجیے۔ اس میں تمام وہ باتیں ہیں جن کی وجہ سے لوگ "بیعت" توڑ دیتے ہیں، جن کو عذر بنا کر وہ اجتماعیت سے الگ ہو جاتے ہیں

ایسی چیزوں پر سمع وطاعت کی پابندی کا اقرار کرانے کا مطلب یہ ہوا کہ ——— ساتھ نہ دینے والے حالات میں بھی ساتھ دو۔ وہ مواقع جن کے پیش آنے پر عام آدمی بدک جاتا ہے ان کے پیش آنے کے بعد بھی دینی قافلہ سے جڑے رہو۔ جن شکایتوں کو عذر بناکر لوگ الگ ہو جاتے ہیں ان شکایتوں کے باوجود اتحاد وتعاون کو نہ چھوڑو۔

وہ لوگ جن کا حال یہ ہو کہ آسانی میں ساتھ دیں اور مشکل کے وقت ساتھ نہ دیں۔ وہ اسی وقت تک ٹھیک رہیں جب تک معاملہ ان کی پسند کے مطابق ہو اور جب معاملہ ان کی پسند کے خلاف ہو تو بگڑ کر الگ ہو جائیں۔ جو ہمیشہ اپنے آپ کو اگلی نشست پر دیکھنا چاہیں اور پچھلی نشست پر بیٹھنا انھیں گوارا نہ ہو۔ جو عہدوں کی ایسی تقسیم کو قبول نہ کریں جس میں خود ان کی ذات کو اعلیٰ عہدہ نہ دیا گیا ہو۔ ایسے لوگ کبھی دین کی نصرت کی توفیق نہیں پاتے۔ ایسے لوگ صرف اپنی تاریخ بناتے ہیں۔ دین کی تاریخ بنانا ان کے لیے مقدر نہیں۔

ایسا ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے خیال کے مطابق ناانصافی محسوس کرے۔ وہ ایک چیز کو دیکھے اور بطور خود یہ سمجھے کہ یہ حق کے خلاف ہو رہا ہے۔ ایسے مواقع پر وہ اظہار خیال کر سکتا ہے۔ وہ سنجیدہ انداز میں ناانصافی کو بیان کر سکتا ہے۔ مگر ناانصافی کے نام پر اجتماعیت سے کٹنا کسی کے لیے جائز نہیں۔ فرد کو صرف "قول" کا حق ہے، اس سے آگے اسے کوئی حق حاصل نہیں۔

بیعت میں مزید یہ کہلایا گیا ہے کہ قافلۂ اسلام کے امیر کی اطاعت سے تم صرف اس وقت نکل سکتے ہو جب کہ تم اس کے اندر علانیہ کفر کا مشاہدہ کرو۔ اب اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ ایسے کفر کا واقعہ شاذ ہی کبھی پیش آتا ہے تو الشاذ کالمعدوم کے اصول پر اس کا مطلب عملاً یہ قرار پاتا ہے کہ تم کبھی بھی امیر کی اطاعت سے نہ نکلو۔ تم کسی حال میں بھی اس کی نافرمانی نہ کرو۔

اجتماعی زندگی فرد کی موت پر قائم ہوتی ہے۔ بہت سے افراد جب یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ اجتماعیت کی خاطر اپنی رائے کو قربان کریں گے۔ وہ اپنے آپ کو حذف کرکے اجتماعیت کا ساتھ دیں گے، اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی حقیقی اجتماعیت وجود میں آئے۔

ایسے ہی لوگ ——— اسلام کو زندہ کرتے ہیں۔ جن کے اندر یہ صفات نہ ہوں وہ صرف اسلام کو برباد کریں گے، وہ اس کے زندہ کرنے والے نہیں بن سکتے۔

خدا کی مدد

عالم اسلام پر مغرب کے حملہ کا آغاز سولھویں صدی عیسوی میں ہوتا ہے جب کہ پرتگالیوں نے یورپ اور ہندستان کے درمیان سمندری راستہ دریافت کرکے بحر عرب پر قبضہ کرلیا اور عربوں کی تجارت اس علاقہ سے کاٹ دی۔ سترہویں صدی میں اسٹیم انجن کی دریافت اور اٹھارویں صدی میں جدید ٹکنالوجی کا وجود میں آنا یورپ کے لیے طاقت وقوت کا نیا میدان کھل جانے کے ہم معنیٰ تھا۔ اس کے بعد ۱۸۶۹ میں جب نہر سوئز بنی اور اس نے بحر روم اور بحر احمر کے درمیان سیدھا سمندری راستہ کھول دیا تو عالم اسلام پر مغرب کے غلبہ کا عمل اپنی آخری انتہا کو پہونچ گیا۔ انیسویں صدی کے آخر تک ایشیا اور افریقہ کا کوئی مسلم ملک نہ تھا جو بالواسطہ یا براہِ راست طور پر مغربی استعمار کے قبضہ میں نہ آچکا ہو۔

مادی قوت کے اعتبار سے مسلم اقوام اور مغربی اقوام کا فرق صرف مقداری نہ تھا بلکہ نوعی تھا۔ یعنی عالم اسلام اگر "دستی ہتھیاروں" سے مسلح تھا تو عالم مغرب "دور مار ہتھیاروں" سے۔ ایسی حالت میں لوگوں کا یہ تاثر بظاہر بیجا نہ تھا کہ مغرب کا غلبہ اب ختم ہونے والا نہیں۔ مگر قدرت کا فیصلہ ظاہر ہوا۔ دوسری جنگ عظیم (۴۵-۱۹۳۹) میں مغربی طاقتیں خود آپس میں لڑ گئیں۔ تاریخ انسانی کی اس سب سے زیادہ بھیانک جنگ نے ان کو اتنا کمزور کر دیا کہ ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ ایشیا اور افریقہ کے مقبوضات سے واپس چلی جائیں۔

تاہم ایک شدید تر محاذ ابھی باقی تھا۔ یہ مغرب کی صنعتی برتری تھی۔ مسلم اقوام اپنے محدود وسائل اور ناکافی ٹکنکل صلاحیت کے ساتھ اس میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر ایلون ٹافلر کے الفاظ (۱۹۷۰) میں سوال یہ تھا کہ مسلم قومیں جب بہزار دقت اپنے آپ کو انڈسٹریل ایج میں پہونچانے میں کامیاب ہوں گی، اس وقت مغرب سُپر انڈسٹریل ایج میں پہونچ چکا ہوگا۔ عین اس وقت "پٹرو ڈالر" ایک خدائی کرشمہ بن کر ظاہر ہوا اور اس نے نہ صرف مسلم اقوام کی صنعتی پسماندگی کی تلافی کر دی بلکہ بہت سے پہلوؤں سے ان کو جدید اقتصادی دنیا میں برتری عطا کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ امت مسلمہ کتاب محفوظ کی حامل ہے۔ اس کے طفیل میں اللہ تعالیٰ نے اس کی دنیوی حفاظت کی ذمہ داری لے لی ہے۔ اسی خدائی حفاظت نے تاتاری حملے اور صلیبی لڑائیوں کے وقت مسلمانوں

کو محفوظ رکھا۔ اور اسی نے موجودہ زمانہ میں ان کو جدید طاقتوں کا شکار ہونے سے بچایا ہے۔

تاہم حفاظت کا یہ معاملہ صرف دنیوی پہلو سے ہے۔ آخرت کی نجات کے لیے اللہ تعالیٰ نے کسی سے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا ہے۔ آخرت کی نجات کا تمام تر انحصار، ذاتی اصلاح کے بعد، اس پر ہے کہ ہم خدا کی امانت کو اس کے دوسرے بندوں تک پہونچاتے ہیں یا نہیں۔ رسول نے جس طرح اپنے زمانہ کے لوگوں پر خدا کے دین کی گواہی دی، ٹھیک اسی طرح ہر دور کے مسلمانوں کو اپنے زمانہ کے لوگوں کے سامنے اس کا گواہ بن کر کھڑا ہونا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو صرف ذاتی اصلاح بھی ان کو خدا کے یہاں بازپرس سے نہیں بچا سکتی۔

ختم نبوت کے بعد امت مسلمہ نبوت کی قائم مقام ہے۔ اس کی کامیابی یا ناکامی اسی کارِ شہادت کی ادائیگی پر موقوف ہے جس پر نبی کا معاملہ موقوف ہوتا تھا۔ نبی اگر خدائی پیغام رسانی کے کام کو انجام نہ دے تو خدا کی نظر میں اس کی حیثیتِ رسالت ہی متحقق نہیں ہوتی تھی (مائدہ ۔ ۶۷) اسی طرح ہم اگر اپنے زمانہ کی قوموں پر دین کی گواہی دینے کا فریضہ ادا نہ کریں تو اندیشہ ہے کہ ہمارا امت محمدی ہونا ہی مشتبہ نہ ہو جائے اور آخرت میں ہم ناکام و نامراد قرار پائیں۔ اگر تمام مسلم قومیں اس کام کے لیے نہیں اٹھتیں تو کم سے کم کسی ایک قوم یا کسی ایک جماعت کا دعوت الی اللہ کے اس کام کے لیے اٹھنا ضروری ہے۔

قدیم زمانہ میں جب کہ سیاست کی بنیاد مذہب پر ہوتی تھی۔ ایک بے ضرر دعوتی تحریک کو بھی حکمراں طبقہ اپنے خلاف ایک خطرہ سمجھنے لگتا تھا۔ اور بہت جلد اس کو مٹانے کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں اس مقصد کے لیے اٹھنے والے لوگ آروں سے چیرے گئے۔ اور آگ میں جلائے گئے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مذہب اور سیاست کی علٰحدگی نے ہم کو دعوتی کام کا انتہائی قیمتی موقع فراہم کر دیا ہے اگر ہم مناظرہ بازی سے بچیں اور سیاسیات میں اُلجھنے کی غلطی نہ کریں تو آزادی فکر اور سائنسی طریق مطالعہ کے اس زمانہ میں ہر قسم کے خطرہ سے محفوظ رہ کر ساری دنیا میں اسلام کی اشاعت کا کام جاری رکھ سکتے ہیں۔

مزید یہ کہ جدید افکار نے اسلام کو لوگوں کے لیے قابل فہم بنانے کے بہت سے نئے امکانات کھول دیئے ہیں جو اس سے پہلے کبھی موجود نہ تھے۔ ان امکانات کو استعمال کیا جائے تو اسلام کو معجزاتی استدلال کے ساتھ جدید دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔

Ancient holy book 1300 years ahead of its time

TORONTO (CP) — The 1,300-year-old Koran contains passages so accurate about embryonic development that Moslems can reasonably believe them to be revelations from God, a Canadian embryologist says.

The Statement by Dr. Keith Moore of University of Toronto, corroborated by test-tube baby pioneer. Dr. Robert Edwards, comes after the pair spent two years studying the phenomenon at the request of Islamic scholars at King Abdul Aziz University in Jeddah, near Mecca.

"I am amazed at the scientific accuracy of these statements which were made in the seventh century," Moore said.

Moslems believe the Koran was revealed to the Prophet Mohammed by God, after which he propounded Islam, a religion that has the second-largest following in the world after Christianity.

Moore said the Koran verses describe semen "gushing" from the male upon ejaculation but fertilizing sperm being derived from only a small portion of the semen.

Moore writes: "It was not until the 18th century that Spallanzani showed experimentally that both male and female sex products were necessary for the initiation of development...

Another verse read: "God makes you in the wombs of your mother in stages, one after another, within three veils of darkness."

Moore said the three veils could reasonably be interpreted to mean the mother's abdominal wall, the wall of the uterus and the amniochorionic membrane.

Another verse read: "Thereafter. we created of the drop a thing which clings, a leech-like structure."

Moore and the others found the Arab leech bears a striking resemblance to the embryo at 42 days, and the embryo does cling to the wall of the uterus at this stage.

Among Mohammed's collected sayings, Moore found one that says 42 days after conception, God sends an angel to give the embryo human features such as eyes and ears.

Embryonic research shows that at 42 days eyes and ears are clearly visible.

The Citizen, Ottawa (Canada), November 22, 1984

Kor'an scores over Modern Science

A University of Toronto embryologist has made several trips to Saudi Arabia to help explain some of the verses from the Koran relating to human embryo development. Dr. Keith Moore's findings, corroborated by test-tube baby pioneer, Dr. Robert Edwards, reveal the verses contain an accurate description of the stage by stage development of the human embryo, something which was proposed by western experts only in 1940 and most of which has been proved only in the past decade and a half.

The Times of India (New Delhi), December 10, 1984

قرآن اور سائنس

۱۹۸۴ کے آخر میں ایک خبر مختلف اخبارات میں آئی تھی۔ کناڈا کے اخبار سٹی زن (۲۲ نومبر ۱۹۸۴) نے اس کی سرخی ان الفاظ میں لگائی :

قدیم مقدس کتاب اپنے وقت سے ۱۳ سو سال آگے

نئی دہلی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۰ دسمبر ۱۹۸۴) میں یہ خبر حسب ذیل سرخی کے ساتھ چھپی :

قرآن جدید سائنس پر بازی لے جاتا ہے

جنینیات کے ایک عالم جن کا تعلق کناڈا کی ٹورانٹو یونیورسٹی سے ہے ، انھوں نے سعودی عرب کے کئی سفر کیے ہیں تاکہ قرآن کی کچھ آیتوں کی تشریح کرنے میں مدد کریں۔ یہ آیتیں وہ ہیں جن میں انسانی جنین کے ارتقار کا ذکر ہے ۔

یہ ڈاکٹر کیتھ مور ہیں۔ ان کی تحقیقات جو ٹسٹ ٹیوب بے بی کے موجد ڈاکٹر رابرٹ ایڈورڈس سے مطابقت رکھتی ہیں ، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کی متعلقہ آیتیں انسانی جنین کے درجہ بدرجہ ارتقار کا نہایت صحیح بیان ہیں۔ یہ چیز وہ ہے جس کا ذکر مغربی ماہرین نے پہلی بار ۱۹۴۰ میں کیا تھا۔ اور اس سلسلہ کی اکثر تفصیلات صرف پچھلے پندرہ برسوں میں علمی طور پر ثابت کی جا سکی ہیں۔ ڈاکٹر مور نے لکھا ہے کہ ۱۳ سو سالہ قدیم قرآن میں جنینی ارتقار کے بارے میں اس قدر درست بیانات موجود ہیں کہ مسلمان معقول طور پر یقین کر سکتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے اتاری ہوئی کتاب ہے ۔

یہ دو برس پہلے کی بات ہے ، ٹورانٹو یونیورسٹی کے ایک ماہر جنینیات ایک غیر معمولی سائنسی مشن پر سعودی عرب گئے۔ ان سے قرآن کی چند آیات کی تشریح میں مدد چاہی گئی تھی ۔ یہ ڈاکٹر کیتھ مور تھے ـــــ اولین ٹسٹ ٹیوب بچے کی پیدائش کے محقق ڈاکٹر ایڈورڈ نے بھی ان کی توضیحات کی تصدیق کر دی تھی۔ ان دونوں سائنس دانوں نے مسلم علمار کو آیات قرآنی کے بارے میں اپنی دریافت سے حیران کر دیا تھا۔ وہی قرآن جس کو مسلمان تیرہ سو برس سے حفظ اور تلاوت کرتے چلے آرہے ہیں ۔

جو انھوں نے دریافت کیا تھا وہ یہ تھا کہ قرآن میں انسانی جنین کا جو نظریہ بیان کیا گیا ہے وہ اب ایک ناقابل تردید صداقت بن کر سامنے آیا ہے اور یہ کہ مغربی محققین پر اس حقیقت کا انکشاف ۱۹۴۰ میں ہوا

اس ضمن میں زیادہ تر معلومات تو محض گذشتہ پندرہ برس میں سامنے آئی ہیں۔ ڈاکٹر کیتھ مور ٹورانٹو یونیورسٹی کے شعبہ تشریح الاعضاء کے چیرمین ہیں۔ تخلیق انسانی سے بحث کرنے والی آیات قرآنی پر اپنا خصوصی مقالہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا،

"مجھے اس بات نے حیرت میں ڈال دیا، جب مجھے یہ پتہ چلا کہ قرآن نے ساتویں صدی عیسوی میں جو حقائق پیش کیے وہ کس قدر درست اور سائنسی صداقتوں کے حامل ہیں"۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن ساتویں صدی عیسوی میں خدا کی طرف سے اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتار اگیا۔ اس کے بعد انھوں نے اسلام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ آج اسلام عیسائیت کے بعد دوسرا بڑا مذہب ہے۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر مور یونائیڈ چرچ کے ممبر اور ایک بڑے پادری کے بیٹے ہیں۔ وہ اپنے عقیدے پر مطمئن ہیں اور ایک ملاقات میں بتا چکے ہیں کہ اسلام قبول کرنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں۔ ڈاکٹر مور کہتے ہیں کہ میں نے بائبل کے عہد نامہ قدیم اور جدید کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ لیکن قرآنی آیات سے ان کی کوئی مماثلت نظر نہیں آئی۔ جنینیات پر ان کی دو تصنیفات معیاری درسی کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ اور دنیا کی زبانوں میں ان کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر مور کہتے ہیں کہ جنین کے ابتدائی ۲۸ روز میں نمو کے متعلق قرآنی آیات نے جو حقائق بیان کیے ہیں وہ اتنے صحیح ہیں کہ انسانی عقل کو تعجب میں ڈال دیتے ہیں۔ ڈاکٹر مور کو یقین ہے کہ:

"قرآن کی آیات اور پیغمبر اسلام کے کچھ فرامین مذہب اور سائنس کے درمیان مدتوں سے حائل خلیج کو پاٹنے میں مدد کر سکتے ہیں"۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ خام چیر پھاڑ کے نتیجے میں یہ معلومات سامنے آگئی ہوں تو انھوں نے کہا کہ اس مرحلے پر جنین کی جسامت ایک ملی لیٹر کے دسویں حصے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ انسانی آنکھ کو ایک چھوٹے سے نقطے کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اس کی شناخت ایک طاقت ور خورد بین کے بغیر ممکن نہیں اور یہ بات اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے کہ سترھویں صدی عیسوی سے پہلے خورد بین ایجاد نہیں ہوئی تھی۔

دو برس پہلے ڈاکٹر کیتھ مور کو جدہ کی شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی نے مدعو کیا تھا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر لیارٹ ایڈورڈ راز کو بھی بلایا تھا۔ یہ وہی ڈاکٹر رابرٹ ہیں کہ جن کے کیمبرج یونیورسٹی میں کیے گئے تجربات کی بدولت پہلے ٹیسٹ ٹیوب بچے کی پیدائش عمل میں آئی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ٹی وی این پرشاد اور ڈاکٹر مارشل جانسن بھی مدعوئین میں شامل تھے۔ ڈاکٹر مور کہتے ہیں کہ اس موقع پر منعقدہ کانفرنس کے علماء نے ان

ون ماہرین کو قرآن کی متعدد آیات کے انگریزی میں تراجم پیش کیے اور ان سے رائے مانگی کہ آیا ان کی کوئی سائنسی
ہو سکتی ہے؟ ایک آیت جو پیش کی گئی وہ یہ تھی:
"وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل
بناتا چلا جاتا ہے۔" (الزمر ۶)
ڈاکٹر مور کہتے ہیں کہ ان تین تاریکیوں کے بارے میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان سے مراد پیٹ کی
دیوارہ رحم مادر کا پردہ اور بچہ دانی کی اندرونی جھلی ہے۔ ایک دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ بعد میں بوند
خون کے لوتھڑے (مضغہ) میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ عربی میں مضغہ کا لفظ جونک کے لیے آیا ہے۔ ڈاکٹر مور
ر دوسرے ماہرین کا خیال ہے کہ اب میں پائی جانے والی جونک اور ۲۴ دن کے جنین میں حیرت انگیز طور پر
نابہت پائی جاتی ہے مزید یہ کہ اس مرحلے پر جنین رحم کی دیوار سے جونک کی طرح لپٹ جاتا ہے۔
آگے کی ایک آیت کہتی ہے کہ یہ جونک نما مضغہ بعد میں چبائی ہوئی چیز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔
ں مرحلے پر جنین کی شکل کی وضاحت کرنے کے لیے ڈاکٹر مور نے پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی چیز تیار کی اور پھر
سے اپنے دانتوں سے چبایا اور پھر اسے بتایا کہ ۲۸ روز کے جنین کی شکل ہو بہو ایسی ہوتی ہے اور اس پر جو
نا نات پائے جاتے ہیں وہ بھی دانتوں کے نشانوں کے مماثل ہوتے ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا
ہے کہ اس مرحلے پر جسم کے چند ہی اعضاء کی شناخت ہو سکتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ صرف دل اور
نکھوں کے حصے کی پہچان ممکن ہوتی ہے۔
ڈاکٹر مور نے کہا کہ آیات قرآنی کہتی ہیں کہ تیزی سے نکلنے والے مادہ منویہ کے ایک انتہائی مختصر
حصے میں بار آور کرنے کی صلاحیت رکھنے والا عنصر پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مور نے اپنے مقالہ میں بتایا کہ جس
قیقت کی نشاندہی سپیلن زینی نے اٹھارھویں صدی عیسوی میں کی جب اس نے تجرباتی طریقے سے ثابت
یا کہ جب تک کہ نر اور مادہ کے جنسی تولیدی عناصر کی باہم آمیزش نہ ہو حیاتیاتی نمو نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے
ں سے گیارہ صدیاں پہلے مخلوط قطرہ (نطفہ امشاج) کی نشاندہی کر دی اور بتایا کہ مرد اور عورت کے نطفوں
کے باہمی ملاپ سے انسان کی تخلیق ہوتی ہے۔ اسی طرح ماہرین کے ذیل میں یہ اشارہ موجود ہے
کہ کس طرح ابتدائی حقیر بوند میں آدمی کا جامع نقشہ موجود ہوتا ہے۔ یہ بوند مستقبل کے تمام کردار اور
خصوصیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتی ہے۔

ایک امکان

اخرج ابو نعیم عن محمود بن لبید اخی بنی عبد الاشهل قال : لما قدم ابو الحیسم انس بن رافع مکۃ ومعہ فتیۃ من بنی عبد الاشہل فیھم ایاس بن معاذ رضی اللہ عنہ یلتمسون الحلف من قریش علی قومھم من الخزرج ۔ فسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھم فاتاھم فجلس الیھم فقال : ھل لکم الی خیر مما جئتم لہ فقالوا وما ذاک قال انا رسول اللہ بعثنی اللہ الی العباد ادعوھم الی اللہ ان یعبدوا اللہ ولا یشرکوا بہ شیئا وانزل علی الکتاب ثم ذکر الاسلام وتلا علیھم القرآن فقال ایاس بن معاذ وکان غلاما حدثا ای قوم ، ھذا واللہ خیر مما جئتم لہ

مدینہ کے مشرک سردار ابو الحیسم مدینہ سے مکہ آئے ۔ ان کے ساتھ بنو عبد الاشہل کے کچھ جوان تھے ۔ ان میں ایاس بن معاذ بھی شامل تھے (جو بعد کو مسلمان ہو گیے) وہ لوگ قبیلہ خزرج کے مقابلہ میں قریش کو اپنا حلیف بنانا چاہتے تھے ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی آمد کی خبر سنی تو آپ ان کے یہاں گیے ۔ آپ ان کے پاس بیٹھے اور فرمایا : تم لوگ جس مقصد کے لیے آئے ہو ، کیا اس سے بہتر چیز کی تمہیں رغبت ہے ۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیا چیز ہے ۔ آپ نے فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں ۔ اس نے مجھے بندوں کی طرف بھیجا ہے ۔ میں ان کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں ۔ اور خدا نے میرے اوپر کتاب اتاری ہے ۔ پھر آپ نے اسلام کا تذکرہ کیا اور ان کو قرآن پڑھ کر سنایا ۔ یہ سن کر ایاس بن معاذ نے کہا ، وہ اس وقت ایک نوجوان تھے ، کہ اے قوم ، یہ خدا کی قسم اس سے بہتر ہے جس کے لیے تم یہاں آئے ہو ۔

مکہ قدیم زمانہ میں عرب کا مرکز تھا ۔ مختلف بیرونی مقامات سے لوگ مکہ آتے رہتے تھے ۔ کوئی سیاسی مقصد سے آتا ، کوئی تجارتی مقصد سے ، کوئی مذہبی مقصد سے ۔ سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جب ایسی کسی جماعت یا کسی شخص کی آمد کی اطلاع ملتی تو آپ چل کر اس کے

پاس جاتے اور اس کے سامنے اسلام پیش کرتے۔ پھر کوئی مانتا اور کوئی انکار کر دیتا۔ دیگر اصحاب بھی اسی اسوہ پر عمل کرتے۔

موجودہ زمانہ میں مجموعی اعتبار سے عرب ملکوں کی یہی صورت ہو رہی ہے۔ یہاں دنیا بھر سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ آرہے ہیں۔ ان میں بہت بڑی تعداد غیر مسلموں کی ہوتی ہے۔ یہ لوگ معاش کے حصول کے لیے یا دوسرے مقاصد کے لیے عرب ملکوں میں آتے ہیں۔ اس طرح دوبارہ زیادہ بڑے پیمانہ پر وہی موقع پیدا ہو گیا ہے جو قدیم زمانہ میں رسول اور اصحاب رسول کو حاصل تھا۔

آج ضرورت ہے کہ عرب ممالک میں نہایت خاموشی اور نہایت منظم انداز میں اسی طرح لوگوں کے سامنے دین حق کی دعوت پیش کی جائے جس طرح دور اول میں پیش کی گئی تھی۔ انھیں بتایا جائے کہ تم لوگ یہاں پٹرو ڈالر کے لیے آئے ہو، مگر ہمارے پاس تمہارے لیے اس سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے۔ وہ اللہ کا سچا دین ہے جو آدمی کے لیے جنت میں داخلہ کی ضمانت ہے۔ پٹرو ڈالر تمہارے معیار زندگی کو کچھ بڑھا سکتا ہے۔ مگر خدا کا سچا دین اختیار کر کے تم اپنی ابدی زندگی کو لامحدود طور پر کامیاب کر سکتے ہو۔

اگر ایسا کیا جائے تو یقین ہے کہ ان میں "ایاس بن معاذ" کی طرح ایسے لوگ نکلیں گے جو کہہ پڑیں کہ ـــــ ای قوم، هذا واللہ خیر مما جئتم له (اے لوگو، یہ اس سے بہتر ہے جس کے ارادہ سے تم یہاں آئے ہو) اس طرح یہ ہوگا کہ عرب دنیا جو آج لوگوں کے لیے صرف پٹرو ڈالر حاصل کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہے وہ اس سے زیادہ بڑی دولت، دین حق کی دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے گی۔

اطلاعات بتاتی ہیں کہ اس وقت بھی عرب دنیا میں لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ بیرونی ملکوں کے جو لوگ عرب ممالک میں تلاش روزگار کے لیے جاتے ہیں وہ اپنی معاشی ضرورت کے تحت عربی زبان سیکھتے ہیں۔ وہ اسلامی تہذیب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ عربوں سے میل ملاپ کے دوران اسلام کے بارہ میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی ایک تعداد اسلام سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیتی ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کسی دعوتی جدوجہد کے بغیر اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اب اگر باقاعدہ طور پر دعوت و تبلیغ کی جدوجہد شروع کی جائے اور اس کو حکیمانہ انداز میں چلایا جائے تو یہ رفتار یقینی طور پر بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

سب سے بڑی خبر

۳۰ جون ۱۹۸۵ گوالیار کے لیے ایک تاریخی دن تھا۔ آج یہاں کے فوجی ہوائی اڈہ پر خصوصی سرگرمیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندستان نے جدید طرز کا جنگی جہاز (Mirage 2000) جو فرانس سے خریدا ہے اس کو ہندستانی ہوائیہ میں شامل کرنے کی رسم یہاں ادا کی جانے والی تھی۔

ہندستان کے ۱۲ ویں ائرچیف مارشل ایل ایم کتری (۱۹۸۵-۱۹۲۷) آج بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ انھوں نے اس تقریب میں پورے جوش کے ساتھ شرکت کی۔ مگر ائرچیف مارشل اس شاندار تقریب سے دہلی واپس لوٹے تھے کہ ان پر دل کا دورہ پڑا۔ انھیں تیزی سے فوجی اسپتال لے جایا گیا جہاں چند گھنٹہ بعد یکم جولائی ۱۹۸۵ کو ان کا انتقال ہوگیا۔

خبروں میں بتایا گیا ہے کہ ائرچیف مارشل ایل ایم کتری لائق ترین پائلٹ تھے (Ablest fighter pilot) تھے۔ انھوں نے کئی جنگوں میں دشمن کے خلاف فضائی لڑائی کا شاندار ریکارڈ قائم کیا تھا۔ مگر دشمن کے پُرشور جنگی جہازوں کو مار گرانے والا شخص موت کے خاموش حملہ کا مقابلہ نہ کرسکا۔ وہ شخص جس نے فضا میں بلند ہوکر اعلیٰ جنگی فتوحات حاصل کی تھیں وہ زمین پر موت کے خلاف جنگ میں اس طرح شکست کھا گیا جیسے کہ اس کے مقابلہ کے لیے اس کے پاس کوئی طاقت ہی نہیں۔

طاقت اور بے طاقتی کا یہ مقابلہ ہر روز کسی نہ کسی شکل میں زمین پر پیش آتا ہے۔ ہر روز کوئی "ائرچیف مارشل" موت کے خاموش حملہ کے مقابلہ میں یک طرفہ شکست کھا جاتا ہے۔ اور اس طرح اپنے تجربہ کی صورت میں دوسروں کے لیے ایک اعلان کرتا ہے، اس حقیقت کا اعلان کہ انسان ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں ہر فتح بالآخر کامل شکست پر ختم ہوتی ہے۔ زندگی اختیار سے بے اختیاری کی طرف سفر ہے۔ موت آدمی کو اسی حقیقت کی خبر دیتی ہے۔ مگر یہی خبر ہے جو آج کسی کو معلوم نہیں۔

۱۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۸۵ کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔ حسب معمول مرکز میں ماہانہ درس قرآن کا پروگرام ہوا۔ اس اجتماع کا اعلان دہلی کے متعدد اخبارات میں شائع ہو گیا تھا۔ (مثلاً پرتاپ اردو، نوبھارت ٹائمس ہندی، ہندستان ہندی، ہندستان ٹائمس انگریزی، اسٹیٹسمین انگریزی) صدر اسلامی مرکز نے سورہ الفتح کی ابتدائی آیات کی روشنی میں درس دیا۔ اس درس کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے۔ سامعین میں زیادہ تر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ سپریم کورٹ کے ایک غیر مسلم بیرسٹر بھی آنے والوں میں شامل تھے۔

۲۔ الرسالہ کیسٹ کا سلسلہ خدا کے فضل سے کافی پسند کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں بطور نمونہ ایک انگریزی خط کا ایک پیراگراف یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ یہ خط ہم کو بمبئی سے موصول ہوا ہے اور اس پر ۱۱ ستمبر ۱۹۸۵ کی تاریخ درج ہے:

Immediately after receiving the cassettes I heard it and I have been much impressed and influenced by the contents I think such lectures through the cassettes will heip to awaken the minds and hearts of the people. It will also remove the misunderstanding regarding Islam especially from the minds of the Muslims which is more essential at this time.

۳۔ الرسالہ کے مطالعہ سے لوگوں میں کس قسم کے اثرات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کی مثالیں روزانہ سامنے آتی رہتی ہیں۔ ایک صاحب جو باہر سے صدر اسلامی مرکز سے ملنے آئے تھے انھوں نے کہا کہ میرا تجربہ ہے کہ جو لوگ الرسالہ کا برابر مطالعہ کرتے ہیں ان میں سنجیدگی اور حقیقت پسندی پیدا ہو جاتی ہے۔ محبوب نگر سے ایک صاحب کا خط (۱۲ اپریل ۱۹۸۵) موصول ہوا ہے۔ اس خط کا ایک حصہ یہ ہے:

میں حیدرآباد بذریعہ ٹرین جانے کی تیاری میں تھا کہ الرسالہ اپریل ۱۹۸۵ آپہونچا۔ میں نے سوچا کہ ڈھائی گھنٹے کے سفر کا ساتھی مل گیا۔ ٹرین چلتی رہی۔ میں الرسالہ میں محو تھا۔ یہاں تک کہ آخری مضمون شروع ہوا۔ رقت طاری ہوتی گئی، آنسو رواں ہو گیے۔ گرد و پیش کی کچھ خبر نہ رہی، یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں سفر میں ہوں میرے اطراف کم از کم چار چھ مسافر تو مجھے دیکھ رہے ہوں گے۔ مضمون ختم ہوا تو پاس میں بیٹھے ایک غیر مسلم ہم سفر نے پوچھا کیا بات ہے

بھائی کوئی ٹریجڈی بھری کہانی پڑھ رہے تھے کیا؟" میں نے کہا نہیں یہ مذہبی پرچہ ہے۔ پھر میں نے ان کے کہنے پر مضمون کے بارہ میں مختصراً بتاتے ہوئے کچھ اقتباسات پڑھ کر سنائے جس سے وہ کافی متاثر ہو کر کہنے لگے "جو تحریک ایثار اور قربانی پر چلتی ہے وہ ضرور کامیاب ہوتی ہے"

۵ اکتوبر ۱۹۸۵ کو گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں سب تعلیم یافتہ حضرات شریک تھے۔ صدر اسلامی مرکز نے اسلامی عبادت کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے نماز کی حقیقت پر تقریباً ایک گھنٹہ گفتگو کی۔ اجتماع میں بعض غیر مسلم حضرات بھی شریک تھے۔

۔ "تعبیر کی غلطی" (مکمل) زیر کتابت ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی کتابت کی تکمیل کے بعد شائع کر دی جائے گی۔

۔ اسلامی مرکز کی مطبوعات کی اشاعت کا دائرہ خدا کے فضل سے دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے اپنے خط نمبر (F. No. 5-7/81-BPU) مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۸۵ کے تحت ماہنامہ الرسالہ کی خریداری منظور کی ہے۔ چنانچہ انھیں الرسالہ بذریعہ ڈاک بھیجنا شروع کر دیا گیا ہے۔

۷۔ مہاراشٹر اسٹیٹ بیورو آف ٹکسٹ بک پروڈکشن اینڈ کریکولم ریسرچ نے اپنے خط مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۵ ہم کو مطلع کیا ہے کہ انھوں نے اسکولی نصاب کی ایک کتاب میں الرسالہ کے بعض مضامین کو شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی طرف سے جو خط موصول ہوا ہے اس کا فوٹو مقابل کے صفحہ پر شائع کیا جا رہا ہے

۸۔ اطلاع ملی ہے کہ بعض مقامات پر کتب خانے یہ کر رہے ہیں کہ وہ الرسالہ کیسٹ ایک یا زیادہ تعداد میں منگاتے ہیں اور جو لوگ خرید نہیں سکتے ان کو معمولی رقم پر کرایہ پر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ لوگ بھی الرسالہ کیسٹ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں جو بیک وقت پوری رقم ادا کر کے کیسٹ کو خرید نہیں سکتے۔ یہ طریقہ بہت مفید ہے۔ ضرورت ہے کہ دوسرے مقامات پر بھی اس کو اختیار کیا جائے۔

۹۔ دسمبر ۱۹۸۵ میں الرسالہ کیسٹ کا پہلا سلسلہ پورا ہو جائے گا۔ یہ کل پانچ کیسٹ ہیں۔ ان کی تقریروں کو علحدہ کتابی شکل میں شائع کرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اس کا نام الرسالہ کیسٹ حصہ اول ہوگا انشاء اللہ العزیز۔

MAHARASHTRA STATE BUREAU OF TEXTBOOK PRODUCTION AND CURRICULUM RESEARCH

'Balbharati', Senapati Bapat Marg, Pune-411 004. Phone : Director-58235, Office : 54264.

No. Urdu/
Date : 15.10

Maulana Wahiduddin Khan
AL-RISALA Monthly
C-29 Nizamuddin West
NEW DELHI 110 013

Dear Maulana Saheb,

The Urdu Language Committee of the Bureau desires to include a passage of your travelogue as described by you in your esteemed journal,"AL-RISALA". The Committee has edited the report to suit to the age group of the students for Std. VII.

I am sending to you a copy of the edited piece for your approval with a request to allow the Committee to include the same in the proposed MSS of the Urdu reader for Std. VII.

Thanking you,

Yours faithfully,

Special Officer for Urdu

Controller, 'Neelam', 108, Dr. R. G. Thadani Road, Bombay-400 018 Phone : 375406 (P). 392981 (O)
Depot Manager, Textbook Stores and Distribution Centre, Balbharati, Senapati Bapat Marg, Pune-411 004. Phone : 54264.
Depot Manager, Textbook Stores and Distribution Centre, 10, Industrial Estate, S. Vivekanand Rd., Goregaon, Bombay-62
Depot Manager, Textbook Stores and Distribution Centre, Shri Datta Prasad, Dhantoli, Nagpur-440 001. Phone : 23078.
Depot Manager, Textbook Stores and Distribution Centre, Industrial Estate, Aurangabad 431 001. Phone : 2110.

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے نیو کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

کیسٹ

الرسالہ کیسٹ کی روانگی شروع ہوگئی ہے

انفرادی خریدار اطلاع بھیج کر جلد اپنی خریداری درج کرادیں۔

جو حضرات اس کی ایجنسی لینا چاہیں

وہ بھی اپنی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں۔

الرسالہ کیسٹ کی ایجنسی کم ازکم پانچ کیسٹوں پر دی جائے گی۔

کمیشن :

۲۵ کیسٹ تک —— ۲۰ فی صد

۲۵ کیسٹ سے زیادہ —— ۲۵ فی صد

(ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ)

الرسالہ کیسٹ

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

Regd. R.N. No. 28822/76

Number 109

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

THE INDIAN JOURNAL OF PUBLIC ADMINISTRATION

(Journal of the Indian Institute of Public Administration)

PRINCIPAL CONTENTS

Single Copy
Rs. 2 or 15s.
or U.S. $ [illegible]

Annual Subscription
Rs. 16 or £2. [illegible]
[illegible]

THE INDIAN JOURNAL OF PUBLIC ADMINISTRATION

[illegible]

[illegible]